تلامذۂ غالب

(ترمیم و اضافہ شدہ اشاعت)

مالک رام

ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی

تلامذۂ غالب

(ترمیم و اضافہ شدہ اشاعت)

مصنفہ

مالک رام

ادارۂ یادگارِ غالب

کراچی

فہرست

معروضہ ۱۵

دیباچہ طبع دوم ۱۷

دیباچہ طبع اول ۲۹

فہرست شعرا

۱ .... اثر .... سید شاہ امام الدین علی خان چشتی اجمیری ۳۷

۲ .... احسان .... حاجی احسان اللہ ڈیرہ دونی ۴۳

۳ ... احسن .... حکیم مظہر احسن خان رامپوری ۴۴

۴ .... اختر .... حکیم جمشید علی خان ۴۷

۵ .... اخگر .... حکیم فتحیاب خان رامپوری ۴۹

۶ .... اخگر .... مولوی فرزند علی عظیم آبادی ۵۲

۷ ... ادیب .... مولوی محمد سیف الحق دہلوی ۵۳

۸ .... اسمٰعیل .... مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی ۵۹

۹ .... اشرف .... مولوی مرزا اشرف بیگ دہلوی ۷۰

۱۰ ... اشرف .... اشرف حسین خان الہٰ آبادی ۷۳

۱۱ ... افضل .... میر افضل علی لکھنوی عرف سید صاحب ۷۵

۱۲ ... انجم .... محمد علی خان شیخو پوری ۷۸

۱۳ ... انور .... سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا دہلوی ۷۹

۱۴ ... آرام .... رائے بہار منشی شیو نراین اکبر آبادی ۸۶

۱۵ ... آزر .... نواب ذوالفقار علی خان دہلوی ۹۲

۱۶ ... آگاہ .... سید محمد رضا دہلوی ملقب بہ احمد مرزا خان ۹۳

۱۷ ... باقر .... شاہ باقر علی بہاری ۱۰۵

۱۸ ... بدری داس .... پنڈت ۱۱۲

۱۹ ... بسمل .... منشی شاکر علی (غلام بسم اللہ) میرٹھی ثم بریلوی ۱۱۳

۲۰ ... بیتاب .... صاحبزادہ عباس علی خان رامپوری ۱۱۶

۲۱ ... بیدل .... شیخ عبدالسمیع انصاری رامپوری ۱۲۱

۲۲ ... بیدل .... مولوی محمد حبیب الرحمٰن انصاری سہارنپوری ۱۳۰

۲۳ ... بے صبر .... منشی بال مکند سکندر آبادی ۱۴۶

۲۴ ... بے صبر .... عین الحق کاٹھوی ۱۶۳

۲۵ ... پیر جی .... قمر الدین دہلوی ۱۶۴

۲۶ ... تپش .... مولوی غلام محمد خان دہلوی ۱۶۶

۲۷ ... تپش .... سید مدد علی اکبر آبادی ۱۷۰

۲۸ ... تحسین .... قاضی عبدالرحمٰن پانی پتی ۱۷۵

۲۹ ... تفتہ .... منشی ہر گوپال سکندر آبادی ۱۷۸

۳۰ ... تمنا .... مولوی احمد حسین مرزا پوری ۱۸۷

۳۱ .. تمنا .... مولوی محمد حسین مرادآبادی ۱۸۷
۳۲ .. توفیق .... شاہزادہ بشیر الدین میسوری ثم کلکتوی ۱۹۱
۳۳ . ثاقب .... مرزا شہاب الدین احمد خان دہلوی ۱۹۴
۳۴ .. جم .... نواب سید محمد جمشید علی خان مرادآبادی ۲۰۰
۳۵ .. جنوں .... قاضی عبدالجمیل بریلوی ۲۰۴
۳۶ .. جوہر .... منشی جواہر سنگھ دہلوی ۲۰۸
۳۷ .. جوہر .... حکیم محمد معشوق علی خان شاہجہانپوری ۲۱۱
۳۸ .. حالی .... مولانا الطاف حسین انصاری پانی پتی ۲۱۶
۳۹ .. حباب .... پنڈت امراؤ سنگھ لاہوری ۲۳۱
۴۰ .. حزیں .... میر بہادر علی بریلوی ۲۳۳
۴۱ .. حسین .... بی خورشید جان دہلوی ۲۳۵
۴۲ .. .. حسین علی بیگ، مرزا ۲۳۷
۴۳ .. حقیر .... خوب علی دہلوی عرف میر چھوٹے صاحب ۲۳۸
۴۴ .. حقیر .... منشی نبی بخش اکبرآبادی ۲۳۹
۴۵ .. حیدر .... آغا حیدر علی بیگ دہلوی ۲۴۵
۴۶ .. خاور .... مرزا محمد اکبر خان قزلباش ۲۵۱
۴۷ .. خستہ .... محمد کریم الدین ۲۵۶
۴۸ .. خلیل وفوق .... محمد ابراہیم آروی ۲۵۷
۴۹ .. خضر .... مرزا خضر سلطان دہلوی ۲۶۰
۵۰ .. خورشید .... خورشید احمد لکھنوی ثم دہلوی ۲۶۲

۵۱ ... درد .... منشی ہیرا سنگھ دہلوی ۲۶۶

۵۲ .. ذکاو بیباک .... مولوی محمد حبیب اللہ مداری ثم حیدر آباد ۲۶۷

۵۳ . رابطہ .... مرزا احسن رضا خان دہلوی ۲۷۸

۵۴ .. راضی ... . دیوان جانی بہاری لال اکبر آبادی ۲۷۸

۵۵ .. راقم .... مرزا قمر الدین خان دہلوی ۲۸۳

۵۶ .. رسوا .... شیخ محمد عبدالمجید غازی پوری ۲۹۳

۵۷ .. رشکی .... نواب محمد علی خان جہانگیر آبادی ۲۹۵

۵۸ .. رضوان .... مرزا شمشاد علی بیگ دہلوی ۳۰۲

۵۹ .. رضوان .... نواب محمد رضوان علی خان مراد آبادی ۳۰۶

۶۰ ... رفعت وسرور ..... مولانا محمد عباس شروانی ۳۰۹

۶۱ ... رمز .... مرزا غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو دہلوی ۳۱۷

۶۲ .. رنج وطبیب ...... حکیم محمد فصیح الدین میرٹھی ۳۲۴

۶۳ .. رند .... جانی بانکے لال جی ۳۲۹

۶۴ .. زکی .... حکیم محمد اشفاق حسین مارہروی ۳۳۰

۶۵ .. زکی .... نواب سید محمد زکریا خان رضوی دہلوی ۳۳۵

۶۶ .. سالک .... مرزا قربان علی بیگ خان سالک دہلوی ۳۶۰

۶۷ .. سالم .... میر احمد حسین ۳۶۹

۶۸ .. سجاد .... سید معین الدین حیدر عرف سید سجاد مرزا دہلوی ۳۶۱

۶۹ ... سخن .... خواجہ فخر الدین حسین خان دہلوی ۳۸۶

۷۰ .. سرور .... دیبی پرشاد دہلوی ۳۹۲

۷۱ ... سرُور .... چودھری عبدالغفور ماہروی ۳۹۳

۷۲ .. سرُور .... آغا غلام حسین خان ۴۰۰

۷۳ . سرُور .... محمد امیر اللہ اکبر آبادی ۴۰۳

۷۴ . سروش .... صاحبزادہ عبدالوہاب خان رامپوری ۴۰۳

۷۵ . سلطان .... مفتی محمد سلطان حسن خان بریلوی ۴۰۵

۷۶ .. سوزاں .... حسیب الدین احمد انصاری سہارنپوری ۴۱۱

۷۷ . سوزاں ومداح .... محمد صادق علی گڑھ مکتیسری ۴۱۴

۷۸ . سیاح (عشاق) ... منشی میاں داد خان اورنگ آبادی ۴۱۶

۷۹ .. سید .... مفتی سید احمد خان بریلوی ۴۲۱

۸۰ .. سید .... قاضی سرفراز علی شاہجہانپوری ۴۲۵

۸۱ ... شاداں وخیالی .... مرزا حسین علی خان دہلوی ۴۲۹

۸۲ .. شاکر .... مولوی محمد عبدالرزاں مچھلی شہری ۴۳۶

۸۳ . شائق .... شاہ سردار گیلانی ۴۴۲

۸۴ . شائق .... سید شاہ عالم مارہروی ۴۴۳

۸۵ .. شائق .... خواجہ فیض الدین، عرف حیدر جان جہانگیر نگری ۴۴۸

۸۶ .. شرر .... سید محمد علی دہلوی ۴۵۲

۸۷ .. شفق .... نواب محمد سعد الدین خان بہادر ۴۵۳

۸۸ .. شوخی .... مظفر حسین خیر آبادی ۴۵۶

۸۹ .. شوخی، شوخ ...... نادر شاہ خان رامپوری ۴۵۷

۹۰ ... شوکت .... نواب یار محمد خان بھوپالی ۴۶۰

۹۱ .. شہاب .... شہاب الدین خان رامپوری ۴۶۳
۹۲ .. شہیر .... حافظ خان محمد خان رامپوری ۴۶۴
۹۳ .. شیر .... سید محمد شیر خان بہاری ۴۶۹
۹۴ .. شیفتہ و حسرتی .... نواب محمد مصطفیٰ خان دہلوی ۴۷۱
۹۵ .. صاحب .... نواب سید شیر زمان خان دہلوی ۴۹۵
۹۶ .. صاحب .... محمد حسین بریلوی ۵۰۱
۹۷ .. صادق (عزیز) ... محمد عزیز الدین بدایونی ۵۰۲
۹۸ .. صفیر .... سید فرزند احمد بلگرامی ۵۰۶
۹۹ .. صوفی .... شاہ فرزند علی منیری ۵۱۶
۱۱۰ .. صوفی .... محمد علی نجیب آبادی ۵۲۱
۱۰۱ .. ضیا .... منشی نور محمد ۵۲۲
۱۰۲ .. طالب .... سردار محمد خان ۵۲۳
۱۰۳ .. طالب .... مرزا سعید الدین احمد خان دہلوی ۵۲۳
۱۰۴ .. طالب .... سید شیر محمد دہلوی ۵۳۱
۱۰۵ .. طالب .... ڈاکٹر محمد حفیظ اللہ اکبر آبادی ۵۳۲
۱۰۶ .. طالب .... محمد ریاض الدین ۵۳۳
۱۰۷ .. طالب (شریف) . حکیم محمد شریف سیتاپوری ۵۳۴
۱۰۸ .. طرار .... سرفراز حسین دہلوی ۵۴۰
۱۰۹ .. طرزی (ثاقب) .. قطب الدین دلاور علی جعفری ہاپوڑی ۵۴۰
۱۱۰ .. ظفر .... ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ۵۴۹

۱۱۱ ... ظہیر .... منشی پیارے لال دہلوی ۵۶۳
۱۱۲ .. عارف .... میرزا زین العابدین خان دہلوی ۵۶۵
۱۱۳ .. عاشق .... شنکر دیال اکبرآبادی ۵۷۵
۱۱۴ .. عاشق .... محمد اقبال حسین دہلوی ۵۷۷
۱۱۵ .. عاشق .... محمد عاشق حسین اکبرآبادی ۵۸۰
۱۱۶ .. عاصی .... منشی شیام لال ۵۸۱
۱۱۷ .. عاقل .... سید محمد سلطان دہلوی ۵۸۳
۱۱۸ .. عباس .... عباس علی ۵۸۶
۱۱۹ .. عرشی .... سید احمد حسن قنوجی ۵۸۷
۱۲۰ .. عزیز (ولایت) ... محمد ولایت علی خان صفی پوری ۵۹۵
۱۲۱ .... عزیز .... میرزا یوسف علی خان بنارسی ۶۰۳
۱۲۲ .. عطا .... شیخ عطا حسین مارہروی ۶۰۶
۱۲۳ . علائی .... نواب علاء الدین احمد خان دہلوی ۶۱۵
۱۲۴ .. علی .... نواب علی بہادر (باندہ) ۶۲۳
۱۲۵ .. غفور .... عبدالغفار خان ۶۳۴
۱۲۶ .. فتنہ .... بی شامان جان (کلکتہ) ۶۳۵
۱۲۷ .. فداو جمالی .... سید احمد حسن سہوانی ثم بڑودوی ۶۳۶
۱۲۸ .. فدا .... صاحبزادہ فدا علی خان بہادر رامپوری ۶۴۶
۱۲۹ .. فسوں .... میر فسوں فرخ آبادی ۶۴۸
۱۳۰ .. فراق (رشکی) ..... قاضی محمد عنایت حسین بدایونی ۶۴۹

۱۳۱.. فگار .... منشی سید آل نبی شاہجہانپوری ۶۵۵
۱۳۲. فگار .... میر حسین علی دہلوی ۶۵۸
۱۳۳. فوق .... زین العابدین ۶۶۷
۱۳۴. فوق .... عبدالصمد میرٹھی ۶۶۸
۱۳۵. فوق .... ڈاکٹر مرزا محمد جان اکبرآبادی ۶۶۹
۱۳۶. فیضی .... فیض الحسن سروھنوی ۶۷۰
۱۳۷. قدر .... سید غلام حسنین بلگرامی ۶۷۱
۱۳۸... کاشف (سالک، فقیر). سید بدرالدین احمد عرف فقیر صاحب دہلوی ۶۷۷
۱۳۹. کرم .... شیخ کرم الٰہی فیروز پوری ۶۷۸
۱۴۰.. کلیم .... مولانا عبدالصمد علی گڑھی ثم اجمیری ۶۸۰
۱۴۱.. کوکب .... منشی تفضل حسین خان دہلوی ۶۸۶
۱۴۲. گوہر .... گوہر جان (کلکتہ) ۶۹۱
۱۴۳. لطیف .... لطیف احمد عثمانی ۶۹۲
۱۴۴. مائل .... میر عالم علی خان سہوانی ۶۹۴
۱۴۵.. مجروح .... میر مہدی حسین دہلوی ۶۹۷
۱۴۶. محشر و خانم جان.... عبداللہ خان رامپوری ۷۰۵
۱۴۷. .... محمد نجیب خان ۷۰۶
۱۴۸.. محمود .... محمد حسین نہٹوری بجنوری ۷۰۷
۱۴۹.. محمود .... محمد محمود الحق دہلوی ۷۱۷
۱۵۰. محو .... نواب غلام حسن خان دہلوی ۷۱۸

۱۵۱ .. مدہوش .... منشی محمد سخاوت حسین انصاری بداونی ۷۲۰
۱۵۲ . مشتاق .... بہاری لال دہلوی ۷۲۳
۱۵۳. مظہر .... حاجی محمد اسحاق عرف مظہر الحق دہلوی.......................... ۷۲۷
۱۵۴. معجز .... منشی آغا علی سہسوانی.... .... ۷۲۹
۱۵۵ . مغلوب .... سید افتخار الدین رامپوری.......................... ۷۳۰
۱۵۶ . مفتون.. .... پنڈت لچھمی نرائن فرخ آبادی ۷۳۱
۱۵۷ . مقصود .... مولوی مقصود عالم رضوی پہانوی.......................... ۷۳۵
۱۵۸ . منصور .... حافظ مصلح الدین اکبر آبادی ۷۴۰
۱۵۹.. مونس .... پنڈت شیو جی رام دہلوی ۷۴۱
۱۶۰.. میکش .... میر احمد حسین دہلوی ۷۴۴
۱۶۲... مکیش وجوی....... ارشاد احمد دہلوی ۷۴۶
۱۶۲.. مینا .... احمد حسین مرزا پوری.......................... ۷۴۸
۱۶۳. نادم .... فخر الدین رامپوری ۷۴۹
۱۶۴ . ناصر .... ناصر الدین حیدر خان عرف یوسف مرزا لکھنوی ۷۵۰
۱۶۵ . ناظم .... نواب محمد یوسف علی خان بہادر، رامپوری.......................... ۷۵۲
۱۶۶.. نامی .... دیبی دیال لکھنوی ۷۶۵
۱۶۷ . نحیف .... غلام محمد خان ۷۶۷
۱۶۸ . نامی .... محمد علی خاں مونگھیری ۷۶۸
۱۶۹.. نسیم .... نواب محمد حسین علی سلطان ۷۶۹
۱۷۰ . نشاط .... بابو ہر گوبند سہائے اکبر آبادی.......................... ۷۷۱

۱۷۱۔۔ نظام (مضطر، رعنا) ۔۔ نواب محمد مردان خان مراد آبادی ۷۷۷

۱۷۲۔ نیر .... حکیم محبّ علی کاکوروی ۷۸۲

۱۷۳۔ نیر رخشاں .... نواب ضیاء الدین خان بہادر دہلوی ۷۸۴

۱۷۴۔ .... واجد علی شاہجہان پوری ۷۹۶

۱۷۵۔ وحید .... وحید الدین احمد خاں دہلوی ۷۹۷

۱۷۶۔ وفاو طالب .... میر ابراہیم علی خاں سہسوانی ۸۰۰

۱۷۷۔ وفاو اختر و نزاکت ۔۔ خواجہ عبدالغفار جہانگیر نگری ۸۰۵

۱۷۸۔ وکیل .... منشی شکور احمد پانی پتی ۸۱۱

۱۷۹۔ ولی .... مولوی امو جان دہلوی ۸۱۲

۱۸۰۔ ہوشیار (بیمار) ..... مولوی حکیم محمد مراد علی ۸۱۴

۱۸۱۔۔ یکتا .... خواجہ معین الدین خان دہلوی ۸۲۳

ضمیمہ اول

قلق ۔ حکیم غلام مولیٰ عرف مولا نا بخش میرٹھی ۸۲۵

ضمیمہ دوم

طبع ثانی پر ایک نظر ۸۳۲

ضمیمہ سوم

۱۸۲۔۔ انجم .... محمد علی خاں شیخ پوری ۸۳۳

۱۸۳۔ بے صبر .... منشی بال مکند سکندر آبادی ۸۳۴

۱۸۴۔ تفتہ .... منشی ہر گوپال ۸۳۵

۱۸۵. حباب .... پنڈت امراؤ سنگھ ۸۳۷

۱۸۶. .... حسین علی بیگ مرزا ۸۳۸

۱۸۷. خاور .... مرزا محمد اکبر خاں قزلباش ۸۳۹

۱۸۸. ذکا .... مولوی حبیب اللہ مدراسی ۸۴۰

۱۸۹. رند .... جانی بانکے لال ۸۴۰

۱۹۰. سرور .... شیخ امیر اللہ اکبر آبادی ۸۴۱

۱۹۱. طرزی .... مولانا سید قطب الدین دلاور علی جعفری ہاپوڑی ۸۴۲

۱۹۲. عرشی .... احمد حسن ۸۴۳

۱۹۳. عزیز .... مرزا یوسف علی خاں بناری ۸۴۴

۔ علی .... نواب علی بہادر ۸۴۵

۱۹۵. فدا .... حکیم سید احمد حسین مودودی سہوانی ۸۴۵

۱۹۶. قدر .... سید غلام حسنین بلگرامی ۴۸۶

۱۹۷. محمود .... محمد حسین نہوڑی ۸۴۷

۱۹۸. محو .... نواب غلام حسن خاں دہلوی ۸۴۸

۱۹۹. معجز .... منشی آغا علی سہوانی ۸۴۸

۲۰۰ میکش .... میر احمد حسین دہلوی ۸۴۹

۲۰۱. میکش .... ارشاد احمد دہلوی ۸۴۹

۲۰۲. نسیم .... نواب محمد حسین علی سلطان ۸۴۹

۲۰۳. نشاط .... ہر گوبند سہائے ۸۴۹

۲۰۴. نظام .... نواب محمد مردان علی خاں ۸۵۰

۲۰۵. نیر .... حکیم محبّ علی کاکوروی ۸۵۱

۲۰۶. وحید .... وحیدالدین احمد خاں ۸۵۱

۲۰۷. ہوشیار .... مولوی حکیم محمد مراد علی ۸۵۱

۲۰۸. قلق .... حکیم غلام مولائی میرٹھی ۸۵۲

ضمیمہ چہارم

۲۰۹ .... میر افضل علی اکمل ۸۵۳

۲۱۰ .... منشی منصور علی خاں ۸۵۳

۲۱۱ .... قاضی شریف حسین خان شریف دہلوی ۸۵۳

۲۱۲ .... میجر جان جیکب ۸۵۴

۲۱۳ .... چوہدری عنایت الٰہی مارہروی ۸۵۵

۲۱۴ .... حکیم غلام نجف خاں ۸۵۵

۲۱۵ .... قاضی عابد علی خاں فریاد ۸۵۷

۲۱۶ .... منشی سہیل چند منشی ۸۵۷

۲۱۷ .... سید محمد زکریا شاہ نظام رامپوری ۸۵۸

۲۱۸ .... کلب علی خاں ۸۵۹

کتابیات ۸۶۲

معروضہ

ہماری تذکرہ نویسی نے متوازی طور پر ایک روایت کو جنم دیا ہے جو تلامذہ کے تذکروں کی صورت میں نظر آتی ہے۔اس روایت کے تحت کسی ایک شاعر کے تلامذہ کا تذکرہ بھی لکھا جانے لگا اور یوں میر، آتش، بکین، مصحفی، داغ، صفی اورنگ آبادی، انیس وغیرہ کے شاگردوں کے تذکرے لکھے گئے۔لیکن اس روایت کے ضمن میں جو اہتمام غالب کے شاگردوں کا تذکرہ لکھنے میں روا رکھا گیا اور جو تلاش و تحقیق غالب کے تلامذہ کے تعلق سے کی گئی وہ ایک مثال ہے اور اس میں بھی مالک رام نے تلامذہ غالب کے حوالے سے جو دادِ تحقیق دی ہے، وہ بھی ایک مثال ہے۔

مالک رام بلاشبہ اردو کے سب سے بڑے غالب شناس بلکہ ماہر غالبیات ہیں۔''ذکر غالب''،''دیوان غالب'' کی تدوین،''فسانۂ غالب''،''گفتارِ غالب''اور پھر متعدد تحقیقی مضامین اس ضمن میں ان کی نہایت محققانہ اور معتبر کاوشیں ہیں لیکن''تلامذۂ غالب''کو ان سب کے مقابلے میں زیادہ اہم اور وقیع کہا جا سکتا ہے۔ان کا یہ کام اولاً ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا جس میں انھوں نے غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کے حالات تحریر کیے۔غالب کے شاگردوں کے بارے میں یہ اس وقت تک کی تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ تھا، لیکن متعدد محققین نے اس کتاب پر لکھے جانے والے تبصروں میں اور اس کے ردِعمل میں تحریر کیے جانے والے مقالات میں مالک رام کی اس تصنیف میں تلامذہ کے تعلق سے ان کی تحقیق کی کمزوریوں، اغلاط اور خامیوں کی نشاندہی کی اور پھر تحقیقات کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلا جس میں ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر وحید قریشی، تمکین کاظمی، کلبِ علی خاں فائق، مشفق خواجہ، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، مرتضیٰ حسین فاضل، عبدالقوی دسنوی، اسمٰعیل پانی پتی، لطیف حسین ادیب، مرتضیٰ حسین بلگرامی وغیرہ کے مقالات نے''تلامذۂ غالب''کے ضمن میں

ایک وقیع مواد فراہم کر دیا۔ اس ضمن میں خصوصاً ڈاکٹر حنیف نقوی نے جو تحقیقی مقالات تحریر کیے، اور مالک رام کے اس کام کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی اور تصحیح کے ساتھ ساتھ نئے مصادر و ماخذ اور تحقیقی مواد سے بھی متعارف کرایا، ان کی بنیاد پر مالک رام نے، جو خود بھی اس موضوع پر اپنی مزید تلاش و تحقیق میں مصروف رہے تھے، اپنی اس کتاب پر نظر ثانی و اضافے کو ضروری سمجھا اور اس کی دوسری اشاعت کا اہتمام کیا، جو ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آئی۔

کتاب کی اس دوسری اشاعت میں شاعروں کی تعداد بڑھ کر ۱۸۱ ہوگئی، جب کہ اولین اشاعت کے دو ایک نام انھوں نے ناکافی شواہد کی بنیاد پر حذف کر دیے۔ مستقل تلامذہ کے علاوہ مالک رام نے اشاعتِ اول میں ۱۲۹ افراد کے حالات تحریر کیے تھے جو غالب کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔ اشاعت دوم میں ایسے افراد کی تعداد ۱۴۰ تھی۔ اشاعت دوم میں اگرچہ نئے مآخذ اور تازہ تر تحقیقات کی مدد سے اضافے ہوئے تھے لیکن اس میں بھی محققین نے دلچسپی لی اور متعدد مقامات پر ترمیم و تصحیح کی جانب مالک رام کو متوجہ کیا۔ اس ضمن میں بھی ڈاکٹر حنیف نقوی پیش پیش رہے۔

ان تحقیقات کے نتیجے میں "تلامذۂ غالب" پر اس قدر عمدہ معلومات فراہم ہوگئی ہیں کہ اب بمشکل ہی کسی اضافے یا ترمیم کا امکان ہے۔ مالک رام کا یہ اہم تحقیقی کارنامہ ایک عرصے سے "ادارۂ یادگار غالب" کے اشاعتی منصوبے میں شامل تھا، لیکن اشاعت اب ممکن ہوئی ہے۔ یہ اشاعت فاضل مصنف کی تحقیق نو اور ترمیم و اضافے کے بعد اور خود مصنف کی خواہش پر ادارۂ یادگار غالب کے اہتمام سے عمل میں آ رہی ہے۔ یہ اس تصنیف کی دراصل تیسری اور اولین پاکستانی اشاعت ہے۔ اس ضمن میں ادارہ "انفاق فاؤنڈیشن" اور "اکادمی ادبیات پاکستان" کی اعانتوں کا شکر گزار ہے۔

معین الدین عقیل

دیباچۂ طبع دوم

"ذکرِ غالب" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس کے بعد میں لاہور چلا گیا۔ ایک دن کمرے پر بیٹھا تھا کہ ایک صاحب دو قلمی کتابیں لے کر آئے۔ کہنے لگے: اِنھیں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ اِن میں ایک قتیل کا فارسی دیوان تھا، دوسرا واقف بٹالوی کا۔ بادامی رنگ کے مضبوط سیالکوٹی کاغذ پر پختہ نستعلیق خط میں لکھے ہوئے یہ دونوں نسخے بہت اچھی حالت میں تھے۔ بدقسمتی سے اُنھوں نے جو قیمت طلب کی، وہ میری مقدرت سے زیادہ تھی، اس لیے معاملہ نہ ہو سکا۔ لیکن اُن کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ قتیل کا کچھ کھوج نکالنا چاہیے، غالب نے اسے بار بار فرید آبادی لکھا ہے اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے بعض اور شہروں کے نام لیے ہیں۔ بہرحال چند ماہ کی تگ و دو کے بعد میں نے معلوم کرلیا کہ قتیل کا خاندان دراصل بٹالہ کا رہنے والا تھا، اور اِسی اثنا میں ان کا شجرۂ نسب بھی مل گیا۔

لیکن اب مجھے ایک اور خیال آیا کہ کیوں نہ غالب کے شاگردوں کے حالات جمع کیے جائیں چند ایک کے سوا دوسروں کے نام تک معلوم نہیں تھے، اور جن کے معلوم تھے، اُن کے بھی حالات پردۂ خفا میں تھے۔ میں نے تذکرے جمع کرنا شروع کیے اور کوئی سال بھر میں ان کا اچھا خاصا ذخیرہ یک جا کرلیا، کچھ اور متعلقہ کتابیں بھی دستیاب ہوگئیں۔

وسط ۱۹۳۹ء میں مجھے بسلسلۂ ملازمت ہندوستان سے باہر بھیج دیا گیا۔ میں ۳۱ جولائی ۱۹۳۹ء کو اسکندریہ (مصر) پہنچا۔ یکم اگست کو میں نے اپنے عہدے کا چارج

لیا تھا اور عین ایک ماہ بعد یکم ستمبر کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔ میں صرف تین سال کے لیے گیا تھا، لیکن دانہ پانی کی بات، میں اگلے پندرہ برس ملک سے باہر رہا اور اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ہندوستان واپس آیا۔ اس دوران میں دو دو تین تین مہینے کی رخصت پر دو مرتبہ وطن آنے کا موقع ملا، لیکن بقیہ وقت باہر ہی گزرا۔ یہ سارا زمانہ مغربی ایشیا کے ملکوں میں بسرا ہوا اور میں مصر، عراق اور ترکیا کی مثلث میں ہرزہ گردی کرتا رہا۔

یہ تمہیدی داستان میں نے اس لیے بیان کی کہ میں اپنا مختصر کتاب خانہ اِس سفر میں ساتھ لیتا گیا تھا، میں جہاں بھی گیا، یہ میرے ساتھ رہا۔ ''تلامذۂ غالب'' کی ترتیب و تدوین اُسی زمانے میں ہوئی۔ ترتیب و تدوین تو کیا، سچ یہ ہے کہ یہ بھی جنون کا ایک انداز تھا۔ نہ تمام ضروری کتابیں مہیا تھیں، نہ کوئی ایسا شخص قریب، جس سے مشورہ یا تبادلۂ خیالات کیا جاسکتا۔ بہرحال میں ہمت نہیں ہارا، جب کبھی فرائضِ منصبی سے کچھ فرصت ملتی، میں موضوع کے لیے مواد جمع کرتا رہا۔ ۱۹۵۴ء میں جب دلّی پہنچا تو مکان تلاش کرنے اور سامان کھلنے میں کچھ وقت لگا۔ ۱۹۵۵ء کے وسط میں ان منتشر یادداشتوں کو جمع کیا اور اب کتاب کا ڈول ڈالا۔ دوست احباب سے کتابیں مستعار لیں۔ حذف و اضافے کا کام جاری تھا کہ ایک دن عرش ملسیانی مرحوم ملنے آگئے۔ اُنھوں نے کاغذات دیکھے تو اصرار کیا کہ اِسے جوں کا توں شائع کر دیا جائے۔ بات دراصل یہ تھی، کہ میرے قیامِ دلّی کی میعاد غیر یقینی تھی۔ خدا معلوم، کب پھر بیرونِ ملک جانے کے احکام صادر ہو جائیں؛ وہ چاہتے تھے کہ میری موجودگی میں کتاب چھپ جائے۔ غرض مجھے اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور اشتم پشتم جو کچھ جمع ہو سکا، میں نے ان کے حوالے کیا اور اُنھوں نے اسے کاتب کو دے دیا۔ یہ ۱۹۵۶ء کے اواخر کی بات ہے۔

کاتب نے روایتی آہستہ روی سے کام لیا۔ دراصل حسبِ سنّت اُس کے پاس اور کتابیں بھی لکھنے کو تھیں۔ وہ ہر ایک کو چند ہفتوں کے بعد کچھ صفحے لکھ کر دے

دیتا، اور اُجرت لے لیتا۔ یوں کام جاری رہا اور بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، یعنی اکتوبر ۱۹۵۷ء میں میرے تبادلے کے احکام جاری ہوگئے۔ بعض نجی مجبوریوں کے باعث میرے لیے فوری طور پر باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ چناں چہ میں نے چند مہینے کی مہلت طلب کی، جو منظور ہوگئی۔ اِدھر عرش نے کاتب کو کچھ ڈرایا دھمکایا اور یوں کتاب ۱۹۵۸ء کے شروع میں شائع ہوئی۔ ہمارا قافلہ ۲۷ فروری کی شام کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوا تھا۔ عرش مرحوم نے اس کا نسخہ مجھے لاکر ریلوے اسٹیشن پر دیا تھا۔ اب کا گیا ہوا میں ۱۹۶۴ء میں وطن واپس آیا۔

اِن ۲۵ برسوں میں ''تلامذۂ غالب'' سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کتاب سے متعلق بھی، اور بعض شاگردوں سے متعلق انفرادی طور پر بھی۔ اِن میں سب سے مفید اور مفصل مضمون ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس ہندو یونی ورسٹی) کا تھا۔ میں نے کم و بیش سب مضامین سے استفادہ کیا ہے اور میں اُن احباب کا احسان مند ہوں، اگرچہ افسوس ہے کہ سب کے سب مشورے قبول نہ کر سکا۔

اب کے شاگردوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا ہے، پہلے ایڈیشن کے دو ایک نام حذف کرنا پڑے کیوں کہ مزید غور کرنے پر ان کے تلمذ کے لیے کافی ثقہ شہادت موجود نہیں۔

بعض حضرات نے کچھ شاگردوں کے تلمذ پر شبہے کا اظہار کیا ہے، انھوں نے اس کے لیے کسی دلیل یا ثبوت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر کسی تذکرہ نگار یا ثقہ راوی نے تلمذ کا ذکر کیا ہے، تو اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ تاریخ و سیرت میں راوی کی ثقاہت بہت اہم ہے۔ اگر آپ اس کی تغلیط کرتے ہیں، تو اپنے نظریے کی تصدیق کے لیے دلیل پیش کیجیے۔ آپ کی دلیل مضبوط ہوئی، تو ہم تذکرہ نگار یا راوی کے بیان کو رد کر دیں گے۔ لیکن محض یہ دعویٰ کر دینا کہ یہ بات ''میری نظر میں مشکوک ہے''، یہ تو کسی عنوان کافی خیال نہیں کیا جاسکتا۔

جو نام اضافہ ہوئے ہیں، ان میں دو تین ''مستاتیں'' بھی ہیں اور اتفاق یہ

ہے کہ سب کلکتہ کی۔ غالب اپنی پینشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتے گئے ہیں۔ تو اُن کی عمر یہی ۳۰ برس کے لگ بھگ تھی۔ جوانی ''دِوانی'' تو ہے ہی، خدا معلوم وہاں اُن پر کیا بیتی! ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ بعد کو یہ کہتے سُنے گئے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے، ہم نشیں!
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

تلامذہ کے لیے ایک بہت اچھا ماخذ گلدستے بھی ہیں۔ افسوس، کہ مجھے بہت دیر سے اس کا خیال آیا۔ اِس میں جناب عبدالصّمد خان (اردو ریسرچ سینٹر، حیدرآباد) نے بہت مدد کی۔ اُن کے پاس پرانے رسائل کا بہت اچھا اور بہت قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ افسوس کہ بوجوہ میں اُس سے پورے طور پر استفادہ نہ کر سکا۔ تاہم جو کچھ ہو گیا، میں اس کے لیے اُن کا شکر گزار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دور کے ''گلدستوں'' کو بغور دیکھا جائے تو ضرور کچھ اور نام مل جائیں گے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد آگئی:

میرزا غالب کی زندگی میں بعض اصحاب جو اُنھیں مہمل گو خیال کرتے تھے، اِس بات کا یوں اظہار کرتے تھے کہ شان دار اور بلند آہنگ الفاظ شعر میں جمع کر دیتے، جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے تھے، یعنی دیکھنے کو شعر ہے، وزن ہے، الفاظ سب با معنی، لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو کہ شعر صرف لفظوں کا مجموعہ ہے اور معنوں سے عاری ہے۔ حالی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے ایک دن میرزا سے کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آیا، اور یہ شعر پڑھا:

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے، گُل بھینس کے انڈے سے نکال

اس پردے میں مولوی عبدالقادر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ تمھارے دیوان میں اِس طرح کے بے معنی شعر ملتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالقادر کی ذُرّیت ختم نہیں ہوئی۔ میں نے

درخواست کی تھی، کہ جن اصحاب کے پاس پرانے گلدستے ہوں، وہ اُن میں سے غالب کے شاگردوں کے نام اور کلام تلاش کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اِس پر جناب اشفاق انجم نے مالیگاؤں سے لکھا کہ اُن کے پاس ماہانہ گلدستہ ''ترقیِ سخن'' بمبئی کا شمارہ نومبر ۱۹۱۴ء ہے، اس میں طرح:

''ہم تو ہر وقت تجھے یاد کیا کرتے ہیں'' پر ''جناب ڈاکٹر فدا حسین صاحب ارشد تلامذۂ حضرتِ غالب خلد آشیان مقیم بمبئی'' کی یہ غزل ملتی ہے:

ظلِ میموں لبِ صیّاد کیا کرتے ہیں
برقِ وارفتہ کو جلاّد کیا کرتے ہیں

بخیۂ سوزنِ دل چاک گریبان ہنوز
شادیِ مرگ کو ناشاد کیا کرتے ہیں

آرزو خانۂ غم مجمرِ الفت لبِ بام
روز آرائشِ صیّاد کیا کرتے ہیں

اخگرِ آہنِ فولاد شکیبائیِ قلب
کس تمنا سے تجھے یاد کیا کرتے ہیں

آہ مینا گرِ صد دیدۂ نقاشِ ازل
رند یوں سرو کو آزاد کیا کرتے ہیں

میر سامانیِ الفت سے سبکساری ہے
دادگر دیکھ کے بیداد کیا کرتے ہیں

قبلۂ معنی و ہم معنیِ میراثِ ازل
کس تصوّر میں تجھے یاد کیا کرتے ہیں

آستیں چاک، گریباں طرفِ جیب و گلو
وحشتِ دل مجھے برباد کیا کرتے ہیں

دولتِ نائلہ و رقبۂ سنجابِ جنوں
پیش آئینہ، صیّاد کیا کرتے ہیں

وہ فدائی ہیں فدا ہوتے ہیں زلفوں پہ صنم
نقدِ دل ہدیۂ بیدادؔ کیا کرتے ہیں

آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوں اور داد دیں:

بعض اصحاب کا اس پر اصرار ہے کہ الگزنڈر ہیدرلی آزاد (عرف الک صاحب) کو تلامذۂ غالب میں شمار کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک وہ غالب کے نہیں، بلکہ میرزا زین العابدین خان عارف کے شاگرد تھے۔ اسی لیے میں نے انھیں ''تلامذۂ غالب'' میں شامل نہیں کیا تھا۔ الک کا دیوان ان کی وفات (۷ یا ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء) کے بعد ان کے بھائی ٹامس ہیدرلی نے شائع کیا تھا۔ (مطبعِ احمدی، آگرہ: ۱۸۶۳ء)۔ اسے شوکت علی صاحب ساکن شاہ پور (فتح پور) نے مرتّب کیا تھا، جو اِن دونوں بھائیوں کے دوست تھے۔ دیوان کے شروع میں اُن کا فارسی میں دیباچہ بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

> الگزنڈر ہیدرلی کہ ذہن وذکا را در خلقش خمیر بود، و سعادت و مروّت در ضمیرش جاپذیر، درسنِ ہیزدہ سالگی بہ شنیدنِ اشعارات اساتذہ و متقدّمین و متاخرین طبع وقّادش در تحصیلِ کمالش توجّہ نمود۔ گاہ گاہ ہنگامِ فرصت بمطالعۂ تصانیفِ اوستادان پر داختے و بامحتشم الدّولہ، امیرالملک محمد اسداللہ خان بہادر سہراب جنگ غالب تخلص و نواب زین العابدین خان بہادر متخلص بہ عارف کہ ہردو حضرات از اکابر امرائے والا دُودمانِ دہلی بودند، بذریعۂ مراسلات و مکاتبات استمدادِ سخن داشتے۔

جناب شوکت علی کی باخبری کا یہ عالم ہے کہ وہ غالب کی زندگی میں اُن کے خطاب سے بے خبر ہیں، نجم الدولہ کو محتشم الدولہ، دبیر الملک کو امیر الملک اور نظام جنگ کو سہراب جنگ لکھتے ہیں۔ بے شک الک کے غالب سے مراسم تھے، ممکن ہے، دونوں میں خط وکتابت بھی رہی ہو۔ غالب نے اُن کی وفات پر اپنے افسوس کا اظہار کیا ہے۔

مجروح کو لکھتے ہیں:

> الور میں بھی وبا ہے۔ الگزنڈر ہڈرلی مشتہر بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف، وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس جُرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ اردوئے معلیٰ: ۱۳۹)

کیا وہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ میرا شاگرد تھا، یا اچھا شاعر تھا! نہیں اُنھیں اگر غم ہے، تو اس کا کہ الور راج میں میرا متوسّط مر گیا۔ شوکت علی صاحب اسی دیباچے میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> بیشتر تصانیفِ نتائجِ افکارِ خویش بنظرم درآورد و بمزید مہر و محبت خاطر را عزیز داشتے و ہمّت برخوشدلی و کامرانیم گماشتے... چنداں کہ مرا پروانہ جمالِ جانفزا ے خود کردہ، ہر روز ابکارِ افکارِ خویش محوِ نظارہ ام می ساخت۔

عارف کا ۱۲۶۸ھ میں انتقال ہوا، اور غالب کا سترہ برس بعد ۱۲۸۴ھ میں۔ شاید یہ خیال ہو سکتا تھا کہ عارف کے بعد الک نے غالب سے مشورہ کیا ہو، لیکن شوکت علی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ اپنا کلام مجھے دکھاتے رہے۔ اس صورت میں غالب سے اصلاح لینے کا کون سا محل تھا!

لیکن اِس سلسلے میں فیصلہ کن الک کے بڑے بھائی ٹامس ہیدرلی کا بیان ہے۔ صاحب البیت ادری مافیہ (گھر کا مالک جانتا ہے کہ اس کے گھر میں کیا ہے) کے مصداق اُن سے زیادہ کسے معلوم ہوگا کہ اُن کا چھوٹا بھائی کس کا شاگرد ہے۔ (یاد رہے کہ خود ٹامس ہیدرلی بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام کا مختصر مجموعہ (قلمی) دلّی یونی ورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے، ٹامس ہیدرلی کا اُردو دیباچہ بھی الک کے دیوان کے شروع میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں:

> نواب زین العابدین خان دہلی کے امیر زادۂ عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے، اور جناب نجم الدولہ اسد اللہ خان بہادر

غالب کے شاگرد تھے، وہ اُس کے (یعنی الگزنڈر ہیدرلی کے)
اوستاد تھے، اور اوس نوجوان کو اپنے استاد اور اپنے اوستاد کے
اوستاد کے انداز پیشِ نظر تھے اور اکثر اون کے اشعار یاد تھے۔

کیا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت درکار ہے کہ الک کے اُستاد کون تھے!
''ارمغانِ گوکل پرشادؔ'' میں بھی انھیں عارف کا شاگرد لکھا ہے۔ غرض میرے نزدیک الک غالب کے شاگرد نہیں۔

اب چونکہ الک سے متعلق بات ہو رہی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور بات بھی کہہ دوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ زین العابدین خان عارف پہلے شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے تھوڑی سی مدّت میں شاہ نصیر کے رنگ میں ایک دیوان (مطلعِ مہرِ سعادت) مرتّب کرلیا تھا۔ نصیر کے دکن چلے جانے کے بعد اُنھوں نے غالب سے مشورہ کرنا شروع کیا۔ اب رنگِ سخن بدل گیا۔ اُنھوں نے پہلا دیوان نظری کردیا اور غالب کی پیروی کرنے لگے۔ سوال یہ ہے کہ اُن کا وہ پہلا دیوان (مطلعِ مہرِ سعادت) کہاں گیا؟

الک کے دیوان میں ۱۶۴ غزلیں ہیں۔ صرف ردیف الف کے چند مطلعے دیکھیے:

صدف سے بہرِ ہم چشمی گہر نکلا تو کیا نکلا
ترے دنداں کو کب پہنچا، اگر نکلا تو کیا نکلا

☆

پلکوں پہ مرے لختِ جگر آئے ہیں کیا کیا
بے برگ درختوں میں ثمر آئے ہیں کیا کیا

☆

زلفوں کا ترے جو ہمیں مائل نظر آیا
زنداں میں سراپا بسلاسل نظر آیا

آج جو تیغا ترا کھڑکا، کھڑک کر رہ گیا
ڈر کے دل قاتل مرا دھڑکا، دھڑک کر رہ گیا

☆

ہر کسی کو تو بقدرِ طاقت و ہمت جگا
اپنی راحت کے لیے مت طالبِ راحت جگا

☆

چل گیا ہے کوئی شاید کہ عمل تھوڑا سا
مہرباں اپنے پہ پایا اُنھیں کل تھوڑا سا

☆

بحر جب شرمِ گدائی کا پسینہ بن گیا
تیر کر کچکول قسمت سے سفینہ بن گیا

☆

نوید اے دل! کہ رفتہ رفتہ گیا ہے ان کا حجاب آدھا
ہزار مشکل سے بارے اُلٹا انھوں نے رُخ سے نقاب آدھا

☆

کفش زرّیں نکا نہیں ہے نعلِ آہن زیرِ پا
ماہِ نو کا ہے گماں اے شوخِ پُرفن زیرِ پا

اگر اِن غزلوں کو دیوانِ شاہ نصیر میں شامل کردیا جائے، تو کسی کو وہم بھی نہیں گزرے گا کہ یہ کسی اور کا کلام ہے! بعض شکوک و شبہات گناہ کے درجے میں آجاتے ہیں۔ اِس علم کے باوجود میں یہ پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ کہیں عارف نے اپنا دیوان (یا اس کا بیش تر حصہ) الک کے حوالے تو نہیں کر دیا تھا؟

''تلامذۂ غالب'' کے شائع کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان میں سے جن اصحاب کے ورثا یا نام لیوا اب موجود ہیں، اُن میں سے بعض نے از خود لکھا، اور پھر

میری درخواست پر حتی الوسع حالات مکمل کرنے میں دستِ تعاون بڑھایا، بعض نے کلام بھیجا، ایک آدھ کے پاس تصویر تھی، وہ مہیا کی۔ میں اُن سب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اُنھوں نے بقولِ استاد نامِ نیکِ رفتگاں کو ضائع ہونے سے بچایا اور علم و ادب کی خدمت گھاتے میں۔ ان میں سے مندرجۂ ذیل حضرات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

جناب کرار احمد کرار نوری، کراچی (آگاہ)

جناب زبیر حسین رضوی، کراچی (زکی رضوی بدایونی)

جناب شہاب دہلوی، بھاول پور (زکی رضوی بدایونی)

جناب سید مصطفیٰ میرزا شریر دہلوی (سجاد میرزا)

جناب خواجہ منہاج الدین حسین (سخن)

میں اِن سب کا ممنونِ احسان ہوں۔

اِن کے علاوہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری (کراچی)، جناب سردار علی احمد خان (لاہور)، جناب ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس)، ڈاکٹر نجم الاسلام (حیدرآباد۔ سندھ)، جناب زبیر حسین رضوی (کراچی)، پروفیسر مختار الدین احمد (علی گڑھ)، جناب محمد مشتاق شارق (میرٹھ)، جناب ضیاء الدین انصاری (علی گڑھ)، جناب ایم حبیب خان (نئی دلّی)، حکیم سیف الدین احمد (میرٹھ)، ڈاکٹر لطیف حسین ادیب (بریلی)، جناب شمس بدایونی (بدایوں)، جناب راج نرائن راز (نئی دلّی) نے کتابیں مہیّا کیں، یا اور طرح سے معاونت فرمائی۔ اُن کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

طبع اوّل میں شائع شدہ ذکا کی تصویر خارج کرنا پڑی۔ اصلی تصویر بہت مدھم تھی۔ ایک فوٹو گرافر نے اُسے ٹھیک کر دینے کا ذمّہ لیا۔ لیکن اُس نے جو کچھ کیا، اب کیا کہوں! اُس کی بنائی ہوئی تصویر کی اصل سے مشابہت ہی نہیں تھی۔ اگر چھپنے سے پہلے میں نے اُسے دیکھا ہوتا، تو کبھی اسے شاملِ کتاب نہ کرتا، بہرحال اب اسے خارج کر رہا ہوں۔

بعض تلامذہ ایسے ہیں، جنھوں نے ایک سے زیادہ تخلص اختیار کیے۔ ایک

طبقہ تو اُن حضرات کا ہے جنھوں نے پہلے ایک تخلص کے تحت شاعری کی، بعد کو اُسے ترک کردیا اور دوسرا تخلص اختیار کرلیا۔ ایسے حضرات کا متروک تخلص بریکٹ میں دیا گیا ہے۔ مثلاً فراق (رشکی)، جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کا ابتدائی تخلص رشکی تھا، جسے ترک کر کے وہ فراق کے تحت لکھنے لگے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے، جہاں شاعر بہ یک وقت آخر تک ایک سے زیادہ تخلص کے تحت لکھتے رہے۔ ایسی صورت میں تمام تخلص یکے بعد دیگرے درج عنوان ہیں مثلاً ذکا وبیباک، اِس سے مدعا یہ ہے کہ شاعر نے آخر تک دونوں تخلص استعمال کیے۔

اب کے سات نئی تصویریں شاملِ تذکرہ ہو رہی ہیں۔ وفا کی تصویر کے علاوہ اور سب پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں۔ یہ مندرجۂ ذیل ذرائع سے حاصل ہوئی ہیں۔

(۱) آگاہ، سید محمد رضا دہلوی (احمد مرزا خان)۔ جناب کرار نوری، کراچی (آگاہ کے پرپوتے)

(۲) فراق (رشکی)، قاضی محمد عنایت حسین بدایونی۔ جناب شمس بدایونی ایڈیٹر ''روشن'' (تماہی) بدایوں

(۳) علی، نواب علی بہادر (باندہ)۔ ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (فروری، ۱۹۵۸ء)

(۴) راضی، جانی بہاری لال ماہنامہ زمانہ (کان پور) ستمبر ۱۹۳۷ء (بشکریہ جناب فرّخ جلالی۔علی گڑھ)

(۵) ہوشیار (بیمار) محمد مرادعلی گلدستۂ ہوشیار

(۶) مدہوش، محمد سخاوت حسین بدایونی جناب شمس بدایونی، ایڈیٹر ''روشن'' (تماہی)، بدایوں

(۷) وفا واختر، خواجہ عبدالغفار جہانگیر نگری پروفیسر کلیم سہرامی راج شاہی یونی ورسٹی، بنگلا دیش

پروفیسر کلیم سہرامی نے وفا کی تصویر اپنے ایک مضمون کے ساتھ تماہی ''غالب نامہ'' نئی دلی کے شمارہ (۴:۲) میں شائع کی ہے۔

میں اِن اصحاب کا شکر گزار ہوں کہ اُن کی بدولت قارئین اُن تلامذۂ غالب سے بھی روشناس ہو گئے۔

یہاں ایک امر کی نشان دہی غالباً بے محل نہیں ہوگی۔ حیدرآباد سے ''ذکرِ سالک'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں سالک کی تصویر بھی شامل ہے۔ لیکن اس میں مصنّفِ کتاب کو سہو ہوا، یہ سالک کی نہیں، بلکہ میرزا سراج الدین احمد خان سائل دہلوی کے عہدِ شباب کی تصویر ہے۔

مالک رام

نئی دلّی

یکم جنوری ۱۹۸۴ء

دیباچہ طبع اوّل

کلام دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے: خیال اور اُس کا لباس یعنی وہ الفاظ جن میں اُسے ادا کیا گیا ہے۔ جب تک یہ الفاظ صرف بامعنی ہیں اور ان کی ترتیب میں سُرتال کا لحاظ نہیں رکھا گیا، یہ نثر کہلاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ موسیقی کے اصول پر یعنی کسی خاص وزن کے مطابق ہوں، تو ایسے کلام کو شعر کہتے ہیں۔

جب کسی نے کہا تھا: الشعراء تلامیذ الرحمٰن، تو اس کا مقصود صرف اتنا تھا، کہ شاعرانہ صلاحیت اور شعری ذوق انسان پیدائش سے ساتھ لاتا ہے، یا یوں کہیے کہ جہاں تک نفسِ شاعری کا تعلق ہے یہ بھی نبوت کی طرح ایک وہبی چیز ہے اور اِسے اکتساب سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ رہا اُس کا خارجی لباس یعنی الفاظ، تو ظاہر ہے کہ، یہ چیز علم و فن سے تعلق رکھتی ہے اور دوسرے علوم و فنون کی طرح اِسے بھی باقاعدہ حاصل کرنا پڑے گا۔

کلامِ موزوں، عروض کے بغیر ناممکن ہے۔ عروض ایک وسیع اور پیچ دار فن ہے، ایسا وسیع اور پیچ دار کہ بعض اوقات بڑے بڑے پختہ کار اور مشاق شاعروں سے بھی عروض کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح معانی و بیان، محاورہ و روزمرّہ، فصاحت و بلاغت کے ایسے بیسیوں باریک نکتے ہیں کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے وہ ذہن نشین نہیں ہو سکتے۔ اِن تمام علوم میں مہارت پیدا کرنے کے لیے کسی استاد کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا صرف مناسب ہی نہیں، اشد ضروری بھی ہے۔

شاعری میں باقاعدہ استادی شاگردی کا سلسلہ فارسی زبان کے علاوہ اور کہیں

نہیں ملتا۔ اُردو نے جہاں اور کئی چیزیں فارسی سے مستعار لیں، وہیں یہ رسم بھی لے لی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اِسے مناسب حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ بات بہت مفید ہو سکتی ہے۔ اگر استاد، شاگرد کے کلام پر فنی پہلو سے اصلاح دے، اُسے عروض کے نکات بتائے، زبان کی انوٹوں اور نزاکتوں سے آگاہ کرے، فصاحت کے مدارج کی تعلیم دے، دوسرے لفظوں میں اگر وہ اپنے خیالات اور رجحانات شاگرد پر نہ ٹھونسے، بلکہ صرف اس کی ذاتی صلاحیتوں کی تربیت کرے اور اس کی مخفی شاعرانہ قوتوں کے اُبھارنے میں اُس کی مدد کرے، تو ایسا شاگرد استاد سے استفادہ کرنے کے بعد ماہرِ فن ہو جائے گا اور اگر واقعی فطرت نے اُس میں صحیح شاعرانہ ذوق ودیعت کیا ہے، تو اُس کی شاعری غیر معمولی طور پر کامل عیار ہو جائے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ غالب کے شاگردوں میں بہت کم اپنے استاد کے رنگ میں کہنے والے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ غالب اِس نکتے کو خوب سمجھتے تھے کہ چہرے مُہرے کی طرح ہر شخص اپنا مزاج اور مذاق بھی قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے۔ اِن میں سے کسی کو بھی بدلنے کی کوشش کرنا، اُسے مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ شاگرد کے کلام کے ظاہری در و بست اور فنی و لغوی اسقام کی اصلاح کی جائے، لیکن اُس کے طرزِ سخن کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے، تا کہ اُس کی انفرادیت پختہ ہو جائے۔ اِسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں غالب کے شاگردوں میں اتنے زیادہ صاحبِ طرز شاعر ملتے ہیں۔ انور، تفتہ، ثاقب، حالی، رشکی، زکی، سالک، سخن، شاداں، شیفتہ، عارف، عرشی، مجروح، ناظم، ان میں سے ہر ایک کا رنگ الگ ہے۔ اپنی اپنی جگہ ہر ایک پختہ کار اور صاحبِ فن اُستاد ہے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے غالب کے شاگردوں میں کچھ ایسے اصحاب کا ذکر کیا ہے، جو میرے نزدیک درست نہیں۔ اس لیے میں نے اُنھیں اس تذکرے میں شامل نہیں کیا۔ مثلاً نساخ نے مرزا باقر علی خان کامل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے، حال آنکہ وہ قربان علی خان سالک کے شاگرد تھے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے نظام رامپوری کو

غالب کا شاگرد بیان کیا ہے، وہ شیخ علی بخش بیمار کے تلامذہ میں سے تھے۔ ضیغم حیدرآبادی اور حسرت موہانی نے منشی بنواری لال شعلہ کو تلامذۂ غالب میں شامل کرلیا ہے، وہ تفتہ اور بے صبر کے شاگرد تھے۔ ایک جدید تذکرہ (مشرقی بنگال میں اُردو) کے مصنف نے سید محمود آزاد (سید محمد آزاد "نوابی دربار" والے کے بڑے بھائی) کو غالب کا شاگرد لکھا ہے (ص ۷۲-۷۳) یہ بھی ٹھیک نہیں۔ قطع نظر اِس سے کہ کسی تذکرہ نویس نے آج تک اِس کا ذکر نہیں کیا، من جملہ اور باتوں کے صرف ایک ہی بات اِس کی تغلیط کے لیے کافی ہے۔ قاطع برہان کے معرکے میں آغا احمد علی احمد نے جو کتاب "مؤیدِ برہان" کے نام سے لکھی تھی، اس کے آخر میں "برادر عزیزم سیّد محمود المتخلص بہ شید اسلمہ اللہ تعالیٰ" کی منظوم تقریظ اور تاریخ موجود ہے (اُن دنوں وہ شیدا تخلص کرتے تھے)۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ آزاد اپنے اُستاد کے خلاف ایک کتاب اور اُس کے مصنف کے ساتھ اِس طرح اعلانیہ اپنی عقیدت اور دوستی کا اظہار کرتے! پھر مزید ستم یہ کیا ہے کہ غالب کے سفرِ کلکتہ کے دوران میں سید محمود کی اُن سے ملاقات بیان کی ہے۔ سید محمود ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے اور غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس بھی آچکے تھے۔ اِسی طرح بعض اور اصحاب کو بھی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔

نواب کلب علی خان خلد آشیان نے ابتدا میں ایک فارسی نثر غالب کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ بدقسمتی سے اِس پہلی اصلاح ہی پر ایک ناخوش گوار بحث چھڑ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے بعد انھوں نے کوئی اور چیز میرزا کے پاس نہیں بھیجی۔ اِسی طرح دربار رام پور کے میر منشی سہیل چند نے بھی ایک خاص موقعے پر چند شعر کہے اور غالباً اُن پر غالب سے اصلاح بھی لی؟ لیکن نہ وہ شاعر تھے، نہ یہ اصلاح کا تعلق ہی کوئی چیز تھی۔ اُنھوں نے تفننِ طبع سے چند شعر کہے اور غالب نے بھی اُسی طرح اصلاح دے دی۔ اس لیے میں نے یہ دونوں نام بھی اس تذکرے میں شامل نہیں کیے۔

اب بھی میں اس تذکرے کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ ایسے بھی شاعر تھے کہ اُن کا صرف تخلص ہی معلوم ہو سکا، نام اور کلام تک رسائی نہ ہوئی۔ مثلاً آزردہ وغیرہ۔ میں نے دانستہ اِس سلسلے میں اُن کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ محض فہرست کو لمبا کرنا مقصود نہیں تھا۔ بعض اصحاب ایسے تھے کہ اُن کا نام اور تخلص دونوں معلوم ہو گئے، اگرچہ نہ مفصّل حالات ملے، نہ زیادہ کلام ہی ہاتھ لگا۔ مثلاً حسام، درد، طالب، رابط، سالم وغیرہ۔ انھیں البتہ میں نے سلسلے میں درج کرلیا ہے۔ میری موجودہ مشغولیتوں کے پیشِ نظر غیرمعمولی تاخیر کے بغیر اِس کام کی کماحقہٗ تکمیل ناممکن تھی۔ اس لیے میں نے فی الحال اِسی پر قناعت کی۔ اگر بعد کو مزید حالات مل سکے یا کلام تک دسترس ہو گئی، تو طبعِ ثانی میں اضافہ کردوں گا۔ ان شاء اللہ۔

انتخابِ اشعار کا معاملہ ذاتی ذوق اور پسند پر منحصر ہے۔ اس لیے جہاں تک کیفیت کا سوال ہے، اِس کے لیے ''رسوائی'' کے شدید اندیشے کے باوجود مجھے کسی عذر کی ضرورت نہیں۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ جو شعر انتخاب میں آئے ہیں، اُن کے علاوہ اور کلام میسّر ہی نہیں ہوا۔ اس لیے لینے اور ترک کردینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض شعرا کے انتخاب سے متعلّق یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ بہت طولانی ہے۔ تو اس سے غرض یہ ہے کہ ان لوگوں کے دیوان رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ اگر ان کے اچھے کلام کا معتدبہ حصہ اِسی طرح ایک جگہ محفوظ کر دیا جائے، تو شاید مفید ثابت ہو۔

اب مجھے ایک خوش گوار فرض ادا کرنا ہے یعنی جن اصحاب سے اِس تذکرے کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح مدد ملی، اُن کا شکریہ۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر (پٹنہ) اور مولانا امتیاز علی خان عرشی (رام پور) اور ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) نے نہ صرف کتابیں مستعار دیں، بلکہ اپنے مشوروں سے بھی مستفید فرماتے رہے۔ کتابیں مہیّا کرنے میں متعدد دوسرے احباب نے بھی مدد فرمائی۔ ان میں سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور (حیدرآباد) اور سید جمیل الدین (بمبئی) مولانا امداد صابری (دہلی) اور

جناب رحمت قطبی (دہلی) اور جناب فرخ کنول (علی گڑھ) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علائی کا کلام اُن کی غیر مطبوعہ بیاض سے لیا گیا ہے، جو ہز ہائنس نواب مرزا امین الدین احمد خان بہادر ثانی (لوہارو) بالقابہم کی نوازش سے دیکھنے کو ملی۔ میں نے منشی مہیش پرشاد مرحوم کی یادداشتوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ تفتہ کے حالات کی تحقیق کے لیے سکندر آباد گیا تو وہاں کی کوچہ گردی میں جناب شیو راج بہادر مرحوم (دہلی) میرے شریکِ غالب رہے تھے۔

یہاں آپ کو نہ صرف کئی نئے شعرا کے نام اور حالات ملیں گے، بلکہ بعض ایسے شعرا کے حالات بھی مکمل اور مفصل نظر آئیں گے، جن کے نام پہلے سے تذکروں میں موجود ہیں، آپ کو اِن میں بہت سی نئی باتیں ملیں گی۔ میں نے ہر ایک ترجمے کے آخر میں اپنے مآخذ کا ذکر کردیا ہے۔ مثلاً جوہر شاہجہانپوری کا تذکرہ، یہ اُن کے عزیزوں سے لے کر اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خان دل نے لکھ کر بھیجا۔ اسی طرح آرام کے حالات اور تصویر اُن کے پوتے بابو پرتھی ناتھ صاحب آگرہ سے دستیاب ہوئی، اور نشاط کے اُن کے پوتے جناب شیام نرائن سرین (ڈیرہ دون) سے۔ طرزی و ثاقب کے مفصل حالات جناب سیّد معشوق حسین اطہر ہاپوڑی مرحوم نے مرحمت فرمائے تھے، اِس سلسلے میں کچھ معلومات سید محمد جلیل ہاپوڑی مرحوم سے بھی دستیاب ہوئیں۔ رنج میرٹھی کی تصویر اور حالات اُن کے پر پوتے حکیم سیف الدین احمد سلمہٗ (میرٹھ) کا عطیہ ہیں۔ جناب قاضی عنایت حسین رشکی کے حالات اور کلام جناب قاضی غلام سجاد بسمل بد ایونی نے عنایت فرمائے۔ شاکر کے حالات اُن کے صاحب زادے جناب ہادی مچھلی شہری (کراچی) نے ارسال فرمائے۔ بعض معلومات جناب احترام الدین احمد شاغل (جے پور) نے مہیا فرمائیں۔ بھوپال کے بعض شاگردوں سے متعلق کچھ تفاصیل اور رفعت اور شوکت کی تصویریں جناب محمد اظہر نادم سیتاپوری کے طفیل دستیاب ہوئیں۔

تصاویر:

کتاب میں جن اصحاب کی تصویریں شامل ہیں، ان میں سے بعض کے ہم

پہلے سے رُوشناس ہیں، لیکن اگر اُن کی بھی کوئی نئی تصویر ملی، تو اُسے ترجیح دی گئی ہے، تاکہ ایک نئی چیز منظرِ عام پر آجائے۔ بعض شعرا کی تصویریں بالکل نئی ہیں اور پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں۔ مثلاً تفتہ، زکی، رشکی، رمز، رفعت، رنج، شوکت، وفا وغیرہ۔ یہ سب تصویریں مجھے مندرجہ ذیل ذرائع سے دستیاب ہوئی ہیں:

آرام	جناب بابو پرتھی ناتھ صاحب، آگرہ (آرام کے پوتے)
ادیب	مخزن (لاہور)، مئی ۱۹۰۵ء
اسمٰعیل	جناب خان بہادر محمد اسلم سیفی، میرٹھ (اسمٰعیل کے صاحب زادے)
تفتہ	جناب پرتھی ناتھ صاحب، آگرہ (آرام کے پوتے) اصل فوٹو غالباً آرام کا کھینچا ہوا ہے۔
حالی	جناب خواجہ غلام السیدین مدظلہٗ (بہ وساطت جناب حامد علی خاں (جامعی)
حیدر	یادگارِ ضیغم
راقم	اُردو (سہ ماہی)، اپریل ۱۹۳۱ء
رشکی	نواب محمد اسمٰعیل خان بہ القابہ، میرٹھ (نواب محمد اسحاق خان مرحوم کے صاحب زادے اور رشکی کے بھتیجے)
رفعت	سیف بھوپالی: مرزا ابو القاسم محتشم (خلف رفعت) کے نواسے (بہ وساطت جناب نادم سیتا پوری)
رمز	عجائب گھر، لال قلعہ، دہلی (بشکریہ، محکمۂ آثارِ قدیمہ، حکومتِ ہند)
رنج و طبیب	حکیم سیف الدین احمد، میرٹھ (رنج کے پر پوتے)
زکی	شاملِ دیوان
سخن	احوالِ غالب (بشکریۂ انجمن ترقّی اُردو، علی گڑھ) یہ تصویر قاضی عبدالودود بیرسٹر کو سیّد فصیح الدین بلخی سے ملی اور انھیں سخن کے صاحب زادے خواجہ معین الدین حسین نے دی تھی۔

سیاح	شاملِ دیوان (بشکریہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو، حیدرآباد)۔
شوکت	جناب میاں محمد مکرّم خان بھوپال (شوکت کے پوتے)، (بہ وساطت جناب نادم سیتاپوری)
صفیر	آج کل (ماہانہ) فروری ۱۹۵۶ء (بشکریہ پبلی کیشن ڈویژن، حکومتِ ہند)
طالب	تاریخِ ادبِ اُردو مؤلفہ جناب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
ظفر	عجائب گھر، لال قلعہ، دہلی (بشکریہ محکمہ آثارِ قدیمہ، حکومتِ ہند)
علائی	اردو (سہ ماہی) جنوری ۱۹۴۴ء
مجروح	تاریخ ادبِ اُردو۔ مؤلفہ جناب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
محمود	یادگارِ ضیغم
مشتاق	شاملِ دیوان
ناظم	رضا لائبریری رام پور
نشاط	آج کل (ماہنامہ) فروری ۱۹۵۵ء (بشکریہ پبلی کیشن ڈویژن، حکومتِ ہند)۔
نظام	کلّیاتِ نظام
نیّر رخشاں	مرزا ناصرالدّین احمد خان (خسرو مرزا، باقر علی خان کامل کے نواسے)
وفا	ذخیرۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم (بشکریہ انجمن ترقی اُردو۔ علی گڑھ)

میں اِن تمام حضرات کا ممنونِ احسان ہوں اور اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے کتب یا حالات یا تصاویر مہیّا کر کے اِس کتاب کی تکمیل میں اعانت فرمائی۔

مالک رام

نئی دلی

۱۵ دسمبر ۱۹۵۷ء

اثر... سیّد شاہ امام الدّین علی خان چشتی اجمیری

اثر خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان کے چشم و چراغ اور قاضی سیّد منیر الدین کے بیٹے تھے۔ حضرت خواجہ غریب نواز اُن سے بیس پشت اوپر ہیں۔ ۱۴ شوال ۱۲۶۳ھ (۲۵ دسمبر ۱۸۴۷ء) کو اجمیر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم نجی انتظام میں پائی، فارسی میں اعلیٰ اور عربی میں متوسط استعداد تھی۔ مولوی مظفر حسین شوخی خیر آبادی اور حکیم محمد حسن امروہوی آپ کے اساتذہ میں تھے۔ خود شوخی بھی غالب کے شاگرد تھے۔

پندرہ سال کی عمر میں تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ پہلے اجمیر ہی میں بہ مشاہرہ پچاس روپے نائب تحصیل دار مقرر ہوئے۔ ترقی ہوئی، تو تحصیل دار بن کر مدّتوں اضلاع میں تعینات رہے۔ جب بست سالہ بندوبست کا انتظام ہوا، تو اس میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے اور رفتہ رفتہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (E.A.C) درجۂ اول تک ترقی کر کے بہ مشاہرہ ۴۰۰ روپے اجمیر میں مقیم رہے۔ اپنی دیانت داری اور فرض شناسی سے نیک نام اور اقران و مماثل میں ممتاز رہے۔ ۱۹۰۸ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے، ۲۰۰ روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی۔

جب سیّد غیاث الدّین علی خان سجّادہ نشین درگاہِ اجمیر نے انتقال کیا، تو ۲۰ جمادی الاوّل ۱۳۲۷ھ (۱۰ جون ۱۹۰۹ء) کو اس بلند مقام کے لیے اثر کا انتخاب ہوا۔ تاریخ ہوئی: مسند نشین خواجہ ہندالولی ہوے (۱۳۲۷ھ) تین سال بعد ۱۱ جمادی الثانی ۱۳۳۰ھ (۲۹ مئی ۱۹۱۲ء) کو اجمیر ہی میں رحلت کی۔ اُن کے شاگرد خواجہ اکبر حسین

چشتی اجمیری اکبر نے تاریخ کہی:

نورِ چشمِ معیں کا ماتم ہے
جتنا غم کیجیے، وہ ہے تھوڑا
جس سے رونق تھی بزمِ خواجہ کی
وہی دستِ اجل نے گُل توڑا
گئے سوئے عدم امام الدّین
ہم کو رونے کے واسطے چھوڑا
مصرعِ سالِ موت لکھ، اکبر!
آج بے وقت تو نے منھ موڑا
(۱۳۳۰ھ)

لاولد فوت ہوئے۔ اس لیے ان کے بعد سیّد شرف الدّین علی خان سجادہ نشینِ درگاہ ہوے، یہ مرحوم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ شاعری کا شوق ۱۳۔۱۴ سال کی عمر میں ہوا اور اس میں اولاً مشورہ مظفرحسین شوخیؔ خیر آبادی سے رہا، بعد کو غالب سے رجوع کیا۔ افسوس، دیوان اُن کی زندگی میں نہیں چھپا۔ نواب شیر محمد خاں بہادر والیِ ریاست پالن پور (گجرات) کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے بہت عقیدت تھی اور وہ اکثر زیارت کے لیے اجمیر آیا کرتے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں اُنھوں نے اثر کا کلام سنا تو اس کے جمع کرنے اور چھپوانے کا ایما فرمایا۔ چناں چہ اثر نے اُسے مرتب کر کے نواب صاحب بہ القابہ کے پاس بھیج دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ دیوان زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکا اور اثر کا انتقال ہو گیا اور اُس کے بعد نواب صاحب موصوف بھی رہ گرائے عالمِ جاودانی ہوگئے۔ بالآخر اُن کے جانشین نواب سرطالع محمدّ خان بہادر کے زمانے میں ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا (مطبع زبان پریس، آگرہ)۔ کتاب کے نام ''دیوانِ اثر المسمیٰ باسمِ تاریخی چراغِ چشت'' (۱۹۰۷ء) سے غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک، یہ ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں مرتب ہو گیا تھا۔ لیکن چھپنے کی نوبت تیرہ برس بعد آئی۔ اُن کی

ایک کتاب ''معین الاولیا'' (حالات خواجہ غریب نوازؒ) اُن کی زندگی میں شائع ہوئی (۱۳۱۴ھ) کلام بہت پختہ ہے۔ ہر شعر سے شاعر کی قدرتِ زبان ظاہر ہے۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس میں کوئی خاص بات نہیں ملتی۔ حضرت سلطان الہند سے جا بجا اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ بعض پوری کی پوری غزلیں اُن کی مدح میں کہی ہیں۔ اُردو کے علاوہ فارسی اور ہندی سے بھی شغف تھا۔ ان دونوں زبانوں کا کلام شاملِ دیوان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی سے بھی خاصی واقفیت تھی۔

ہم نہ کہتے تھے اثرؔ اُس بُتِ ناداں سے نہ مل
چار ہی دن میں یہ کیا ہو گیا نقشا تیرا

☆

وصل کی خواہش، وفا کا حوصلا جاتا رہا
دل لگانے کا مزا، او بے وفا، جاتا رہا
اب ستم پر بھی نہیں مائل طبیعت یار کی
دوستی کیا، دشمنی کا بھی مزا، جاتا رہا
بے خودی کا ہو بُرا، یہ بھی خبر ہم کو نہیں
دل گیا یا جاں گئی، کیا جانے کیا جاتا رہا
رنج کا یا رشک کا باقی نہیں اب دل میں نام
تم گلے سے آملے، سارا گلا جاتا رہا
اے اثرؔ، دل کے چلے جانے کا کیا اتنا ملال
ایک دن جانا ہی تھا، جاتا رہا، جاتا رہا

☆

غایتِ بندگی، عشقِ خداوندی ہے
اک جہاں بندۂ بے دام ہمارا نکلا

☆

بے پردہ جلوہ گر ہے وہ مہرِ سپہرِ حسن
غیراز نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

☆

ہم کریں ضبط، محبت میں یہ امید نہ تھی
کام مشکل تھا، یہ اللہ نے آسان کیا

☆

بعد مدت کے ملی آج ملاقات کی رات
اب کہاں جاؤ گے، رہ جاؤ یہیں رات کی رات

☆

قسمت جدا جدا ہے، مقدر جدا جدا
ناکامِ عیش ہم ہیں، عدو کام گارِ عیش

☆

یہ تو مانا کہ محبت میں اثر کچھ بھی نہیں
پھر یہ کس بات کے جھگڑے ہیں، اگر کچھ بھی نہیں

☆

دیکھنا، اب یہ نئی چھیڑ نکالی ہے، اثر!
مجھ سے جب ملتے ہیں، غیروں کا گلا کرتے ہیں

☆

ہے باعثِ حجاب، فقط عالمِ حجاب
پردہ نہ ہو تو کوئی بھی پردہ نشیں نہیں

☆

ہمیں اور انھیں لوگ سمجھا رہے ہیں
محبت میں کیا کیا مزے آ رہے ہیں

☆

تغافل کب تلک، غفلت کہاں تک، کچھ خبر بھی ہے
تمھیں جو دیکھ کر جیتے تھے، اب وہ تم پہ مرتے ہیں

☆

دل بہت بے قرار رہتا ہے
آپ کا انتظار رہتا ہے
نشۂ حسن کیا قیامت ہے
اس کا برسوں خمار رہتا ہے
دیدۂ دل بشکلِ آئینہ
محوِ دیدارِ یار رہتا ہے
کچھ نہیں سوجھتا محبت میں
بھوت سر پر سوار رہتا ہے
آج کل وہ ہیں، اور ہم ہیں اثرؔ!
لطفِ بوس و کنار رہتا ہے

☆

جان پر آن بنی ضبطِ محبت میں اثرؔ!
ایسی کم بخت محبت سے عداوت اچھی

☆

خدا بچائے، محبت بُری بلا ہے، اثرؔ!
بتوں سے دل نہ لگانا کہیں خدا کے لیے!

☆

علاوہ جان کے، ایمان کا بھی ہے نقصان
اثرؔ بتوں سے نہ ملنا کہیں خدا کے لیے

☆

جان جائے گی محبت میں کسی روز اثرؔ!
سوجھتا ہے یہ اِس آغاز کا انجام مجھے

☆

ہجر میں جان بھی نہیں جاتی
اب یہ آفت سہی نہیں جاتی

☆

اِس دل کا اثرؔ! ہم کو کچھ بھید نہیں کھُلتا
یہ نالۂ شب کیوں ہے، آہِ سحری کیوں ہے!

☆

صورت سے اثرؔ کے ہیں عیاں عشق کے آثار
منھ زرد ہے، لب خشک ہیں، آنکھوں میں نمی ہے

☆

کبھی بے چین ہے دل، اور کبھی بے تاب ہے جاں
بیٹھے بیٹھے نہیں معلوم، یہ کیا ہوتا ہے

☆

نہ کرے وہ اگر وفا نہ کرے
ہم شکایت کریں، خدا نہ کرے
آخرِ کار دل دیے ہی بنی
کوئی کب تک ترا کہا نہ کرے
نہ کرے، وہ اگر وفا، نہ سہی
کہیں ایسا نہ ہو جفا نہ کرے
تیری چاہت سے موت بہتر ہے
تجھ کو چاہے کوئی، خدا نہ کرے

(دیباچۂ دیوانِ اثرؔ، اُردو ادب (سہ ماہی)، ۱۹۶۴ء ا: ۸۰۔ ۱۲۷،
خم خانۂ جاوید، ا: ۱۳۵۔۱۳۷)

احسان... حاجی احسان اللہ ڈیرہ دونی

(تذکرہ ''یادگارِ ضیغم'' میں نام احسان علی خان دیا ہے، یہ غالباً غلط ہے)
حجِ بیت اللہ سے مشرف ہوے تھے۔ تجارت ذریعۂ معاش تھی۔

میں نے کہا کہ غیر کے کوچے میں کیوں گئے
کہتے ہیں کس ڈھٹائی سے، پھر تم کو کیا غرض!

☆

ٹوٹے گا رنگ تار کے زنّار کی طرح
کھینچا اگر خیال میں تصویرِ یار کو

☆

ہاتھ میں شانہ ہے، اور پیشِ نظر آئینہ
بڑے سامان سے ہیں گیسو سنورنے والے
ساتوں افلاک جلا کر ابھی کر ڈالیں خاک
ہم سے دو ایک ہوں گر آہوں کے بھرنے والے

☆

توجّہ وہ جو بھولے سے ہمارے حال پر کرتے
تو ممکن تھا تسلی میں ہم اپنے دن بسر کرتے
نہ اتنا ہو سکا احباب سے، افسوس، اے احسان!
کبھی جا کر ہمارے حال کی اُن کو خبر کرتے

[یادگارِ ضیغم:۴۱، خم خانۂ جاوید، ۱:۱۶۱، پیامِ یار (جولائی ۱۸۸۴ء):۳]

احسن... حکیم مظہر احسن خان رامپوری

حکیم محمد مجتبیٰ کے بیٹے اور حکیم محمود خان کے پوتے تھے۔ رام پور میں تقریباً ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ اگر چہ خاندانی پیشہ طبابت تھا، لیکن اس کے ساتھ تجارت کو بھی کسب معاش کا وسیلہ بنایا، لکڑی کا کاروبار کرتے تھے۔ ماہر خوش نویس بھی تھے۔ عہدِ کلب خانی کا رام پور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا ملجا و ماوا تھا۔ اُنھوں نے رام پور کے تمام اساتذہ خصوصاً میر عوض علی عدیل سے نستعلیق میں اور منشی عطا حسین سے شکستہ میں استفادہ کیا اور ہفت قلم کہلائے۔ اس کے علاوہ فارسی اور عربی مولوی عبدالمجید خان اور سید علی حسین اور مولوی نور النبی سے پڑھی۔ عروض کی تعلیم مولوی جمال شاہ اور منشی مظفر علی اسیر سے حاصل کی۔ عروضِ سیفی کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا غالب کی وفات کے بعد اسیر سے اصلاح بھی لیتے رہے۔ ایک مختصر قرابا دین بھی اُن سے یادگار ہے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے، اور دونوں میں صاحبِ دیوان تھے۔ افسوس، کچھ شائع نہ ہو سکا۔

آخر زمانۂ حیات میں پیلی بھیت میں قیام اختیار کرلیا اور وہاں کچھ تجارت اور زمیں داری بھی کر لی تھی۔ ۱۳۰۲ھ میں یہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار ''خورشیدِ آفاق'' نکالا، اسے اپنے ذاتی ''مطبع مظہری'' میں چھاپتے تھے۔ پیلی بھیت میں ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔ ۱۵ مارچ ۱۸۹۱ء کو ۴۷ برس کی عمر میں انتقال کیا اور پیلی بھیت ہی میں دفن ہوئے:

یا رب! ہوئی ہے عمر اِسی شغل میں بسر
کوثر پہ اہتمام ہو مجھ بادہ خوار کا

☆

نامہربانیوں پہ تو مرتا ہے اک جہاں
کہیے کہ کیا غضب ہو، اگر مہرباں ہوں آپ!

☆

بات کرنے میں تو شرماتے ہو تم!
ظلم کرنے میں نہیں آتا لحاظ؟

☆

ایک ہیں غیر کہ رہتے ہیں وفا پر ناخوش!
ایک ہم ہیں کہ جفا پر بھی تری شاد رہے

☆

کبھی زندہ، کبھی مردہ ہیں جب سے تیری فرقت میں
قیامت ایک سنتے تھے، یہاں ہر دم قیامت ہے

☆

پیشِ نگاہ چہرۂ پُرنورِ یار ہے
موسیٰ ہیں ہم، یہ جلوۂ پروردگار ہے

☆

آنکھیں اُٹھا کے دیکھ لو للّٰہ اک نظر
بندہ بھی چشمِ لطف کا اُمیدوار ہے
اتنا تو میرے عشق نے آخر اثر کیا
مضطر ہوں میں یہاں، وہ وہاں بے قرار ہے
ہر دم ہے جاں کنی ترے عاشق کے واسطے
کہتے ہیں جس کو مرگ، غمِ انتظار ہے

☆

روے تو بینم و از فرطِ نزاکت ترسم
کہ نظر نیز نہ گردد بتو بارِ عارض

(تذکرۂ کاملانِ رام پور ۳۹۳۔۳۹۴،خم خانۂ جاوید ا: ۱۷۲۔۱۷۳،
انتخابِ یادگار،۲: ۷۔۸، یادگارِ ضیغم، ا: ۵۳۔۵۴)

اختر... حکیم جمشید علی خان

گلدستہ ''نشوونما''، بریلی کے شمارۂ ستمبر ۱۹۰۳ء (ص ۳) پر یہ طرحی غزل ملتی ہے۔

لِلّٰہ باز آئیں نہ جور و جفا سے آپ
مرتے ہیں مرنے والے تو اپنی قضا سے آپ
دو دن میں انقلاب! طبیعت میں ہو گیا
کل آشنا تھے، آج ہیں نا آشنا سے آپ

ق

بچپن کا عذر، مانا کہ تھا مانعِ وصال
اب نوجوان ہو گئے فضلِ خدا سے آپ
پھر بھی ہے وہ ہی مدِّ نظر ہم سے دور باش
اپنے ہی ننھے بچے ہیں گویا ذرا سے آپ
فرمایئے تو حضرتِ دل کی بساط کیا
اور اس پہ بل کی لیتے ہیں زلفِ دوتا سے آپ

ق

اختر، یہ کیا غضب ہے کہ کل خانقاہ میں
بیٹھے تھے لَو لگائے ہوئے کبریا سے آپ
مسواک و خرقہ، سبحہ و دستار و جبّہ سے
معلوم سب کو ہوتے تھے اک پارسا سے آپ

یا آج مے کدے میں یہ سر ہے بپائے خُم
سرخوش ہیں دورِ بادۂ عشرت فزا سے آپ
بیٹھے ہو آہ، بیعتِ دستِ سُبو کیے
ایسے تو منحرف نہ تھے راہِ ہدیٰ سے آپ
کچھ خوف بھی تو چاہیے روزِ شمار کا
کچھ شرم بھی تو کیجیے حضرت، خدا سے آپ
ہم کو بھی دیکھنی ہے رعونت حضور کی
کب تک کھنچیں گے اخترِ جادو نوا سے آپ

(بحوالۂ سہ ماہی اُردو، کراچی۔ ۴۵: ۲: ۲۲۳۔۲۲۴)

اخگر... حکیم فتحیاب خان رامپوری

قوم کے پٹھان تھے، شاعری گویا ورثے میں پائی۔ ان کے دادا محمد خان علم (ف: ۱۲۶۸ھ) تھے، اور والد ظفر یاب خان جو مظفر خان کے نام سے مشہور ہوئے، اُن کا زیادہ زمانہ نواب عبداللہ خان بہادر (نواب محمد سعید خان والیِ رام پور) کے بھائی اور نواب ناظم فردوس مکان کے چچا) کی رفاقت میں بحیثیتِ ناظر دلّی اور میرٹھ میں بسر ہوا۔ یہ بھی شاعر تھے، گرم تخلص تھا اور بقولِ امیر مینائی طبیعت بھی گرم پائی تھی۔ عربی فارسی کے فاضل عالم اور صاحبِ دیوان تھے، جس میں ۳۰۔ ۴۰ ہزار شعر سے کم نہیں ہوں گے۔ ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔ ۶۰ برس کی عمر میں ۱۰ر جمادی الثانی ۱۲۸۵ھ (۲۸ ستمبر ۱۸۶۸ء) کو جے پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

اخگر ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ رسی تعلیم مختلف استادوں سے ہندستان کے طول و عرض میں پھر کر حاصل کی۔ بڑے سیلانی آدمی تھے۔ طبابت میں بھی دسترس تھی اور اِس فن میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ڈھاکا یونی ورسٹی کے سابق پروفیسر خان بہادر مولوی فدا علی خان، ایم اے اِنھیں اخگر کے بیٹے تھے۔ یہ بھی شاعر تھے، پہلے گرم اور اخگر کی مناسبت سے شعلہ تخلص کرتے رہے، پھر اُسے بدل کر فدا کرلیا تھا۔ بنکم چندر چٹرجی کا ایک مشہور ناول بشا برکھا ہے، فدا نے اِس کا ترجمہ ''دِس کا رُوکھ'' کے نام سے کیا تھا۔ یہ چھپا ہوا موجود ہے۔

اخگر کا انتقال ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں چنسرہ (ہوگلی) میں ہوا تھا، اور وہیں

سپردِ خاک ہوئے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:

قابو نہ تھا جو دل پہ، تو انگر! بتایئے
جانا ہی اس کے پاس تمھیں کیا ضرور تھا؟

دلِ ناکام کو پھر اُن نگاہوں کی تمنا ہے
جگر میں ڈوب جانا، پھر وہ یاد آتا ہے نشتر کا

☆

قاتل تھا تُو تَو گرچہ نہ۔ بندہ تھا کشتنی
ظالم کیا نہ پاس، کچھ اپنے بھی نام کا!

☆

نہ آئے تم، تو نہ گھر سے مرے سدھاری رات
مری طرح ہے، مگر مختصر تمھاری رات
سیاہی دونوں میں ٹھیری موافقت کا سبب
ہمارے بخت کی دم ساز ہے ہماری رات

☆

حشر کہنے سے کھٹکتا ہوں، خدا خیر کرے
ہے قیامت، نہ ہوا واں بھی جو پرُساں کوئی

☆

طرفگی حُسن کی اور عشق کی نیرنگی، واہ!
دیکھے آئینہ کوئی، اور ہو حیراں کوئی
عمر کو صحبتِ انساں ہی میں گزری اپنی
پر تماشا ہے، کہ دیکھا نہیں انساں کوئی

جاؤ کوئے غیر میں، اے نالہ ہاے نارسا!
اپنے ہی سر پر تھے تم، محشر اٹھانے کے لیے

[انتخابِ یادگار، ۲: ۱۲، تذکرۂ کاملانِ رام پور: ۳۲۴، معارف (۷۱): ۲۸۳ـ ۲۹۹، ایضاً (۷۷) ۳۰۸ـ ۳۱۳، مشرقی بنگال میں اُردو: ۱۳۹]

اخگر ... مولوی فرزند علی عظیم آبادی

موضعِ یوسف پور کے رہنے والے تھے جو عظیم آباد کے نواح میں ہے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد مرزا پور میں سکونت اختیار کرلی، یہیں مدتوں وکیلِ عدالت رہے۔ اِن کے خاندان کے لوگ اب تک وہاں مقیم ہیں۔

خود نما تھا سب حسینانِ زمن میں آئنہ
ہے مگر حیران تیری انجمن میں آئنہ

گرمیِ آہِ شرربارِ دلِ مغموم سے
شعلۂ جوّالہ ہے بیت الحزن میں آئنہ

عکسِ عارض جلوہ افزا ہے جو طشتِ آب میں
صاف یہ آیا تصور، ہے لگن میں آئنہ

لاکھوں وعدے اے خود آرا! آہ عاشق سے کیے
پر کسی دن بھی تو اس کی انجمن میں آئی نہ

رُخ کی شاگردی جو اے اخگر ہوئی مدِّ نظر
ہو گیا استاد محبوبی کے فن میں آئنہ

[مرقعِ ادب، ۲: ۲۰۔ ۲۲، سخنِ شعرا: ۱۹، تذکرۂ نادر: ۲۲ (دیوانِ غریب)۔ ہماری زبان، ۲۲ مئی ۱۹۶۳ء: ۸]

ادیب ... مولوی محمد سیف الحق دہلوی

ان کے والد مولوی احسان الحق، مفتی محمد اکرام الدین خان بہادر صدر امین دہلی کے بیٹے تھے۔ سلسلۂ نسب ان کا شیخ عبدالحق محدّث دہلوی تک پہنچتا ہے۔

شیخ محدّث دہلوی کا نامِ نامی محتاجِ تعارف نہیں۔ ہندوستان میں علمِ حدیث کو رواج دینے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ ان کے جدِّ اعلیٰ آقا محمد سب سے پہلے بخارا سے واردِ ہندوستان ہوئے۔ یہ علاء الدین خلجی (۱۲۹۶۔ ۱۳۱۶ھ) کا زمانہ تھا۔ مولوی احسان الحق اِن آقا محمد کی نویں پشت میں تھے۔ اُن کے چار صاحب زادے ہوئے۔ خان بہادر مولوی محمد انوار الحق (۱۳۲۰ھ) یہ مدّتوں راجپوتانہ ریذیڈنسی میں میرمنشی رہے۔ اُن سے چھوٹے مولوی محمد وحید الحق تھے۔ مولوی محمد سیف الحق ادیب تیسرے تھے۔ سب سے چھوٹے خان بہادر مولوی محمد شرف الحق تھے جو حیدرآباد دکن میں مہتممِ بندوبست رہے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کی اولاد اب بھی وہاں موجود ہے۔

مولوی سیف الحق ادیب ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ دلّی کے علما کی خدمت میں رہ کر علومِ متعارفہ حاصل کیے۔ نہایت ذہین اور ذکی الفہم تھے، بہت جلد طاق ہوگئے۔ جولانیِ طبع نے شاعری کی طرف مائل کیا اور اصلاح کے لیے غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کلام کی اُپج دیکھ کر میرزا نے فرمایا: ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' میرزا غالب کے بعد چندے میرزا یوسف علی خان عزیز (اور شاید قربان علی بیگ سالک) سے بھی مشورہ کیا۔

شروع میں عدالتِ منصفی دہلی میں بہ عہدۂ نائب ناظر ملازم ہوئے، لیکن

طبیعت نہ جمی۔ نوکری چھوڑ، ایک اخبار ''میوگزٹ'' چھاپنے لگے۔ جب یہ اخبار بند ہو گیا تو مختلف پرچوں اور رسالوں میں مضمون لکھتے رہے۔ ۱۸۷۴ء میں انجمنِ مفید عام، قصور (ضلع لاہور) میں سکتری کا عہدہ قبول کرلیا اور انجمن کے ماہانہ رسالے کی ادارت کا کام بھی کرتے رہے۔ لیکن جلد ہی یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے سررشتہ تعلیم میں ملازم ہو کر لاہور آگئے اور اس کے بعد یہاں کے اخبار ''کوہِ نور'' کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چند دن کے لیے ''رفیقِ ہند'' کے جواب میں ایک ماہانہ رسالہ ''شفیقِ ہند'' بھی نکالا، جس کے ساتھ دو ضمیمے ''نسیمِ صبح'' اور ''شامِ وصال'' بھی چھپتے تھے۔ جب یہاں سے طبیعت بالکل اُچاٹ ہوگئی تو حیدرآباد دکن پہنچے اور ساڑھے چار سو روپیہ ماہانہ پر پریس رپورٹر مقرر ہوگئے۔ داغ جب پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد گئے ہیں، تو اُنھیں کے ہاں ٹھہرے تھے۔ اُن دنوں ادیب بازار شیدی عنبر میں رہتے تھے۔ بازار شیدی عنبر آج بھی اسی نام سے موجود ہے، اس مکان کی ہیئت البتہ بہت کچھ بدل چکی ہے۔

صرف ۴۵ برس کی عمر تھی جب کثرتِ شراب نوشی کی علت میں ۵ ستمبر ۱۸۹۱ء (۳۱ صفر ۱۳۰۹ھ) کو دہلی میں انتقال کیا۔ قطب میں اپنے جدِ اعلیٰ محدث دہلوی کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔☆[۱]

ادیب کا نکاح سید امیر علی کی صاحب زادی حمیدی بیگم سے ہوا تھا۔ اس بیوی سے انھوں نے چار جسمانی یادگاریں باقی چھوڑیں۔ تین لڑکے، محمدؐ اکرام الحق، محمدؐ اسلام الحق اور (خان بہادر) محمدؐ انعام الحق اور ایک لڑکی فہمیدی بیگم۔ محمدؐ اکرام الحق کا تخلص عجیب تھا۔ پھر ظفر کیا۔ ظفر حق ان کا تاریخی نام تھا، یعنی ان کی پیدائش (۱۹ رجب) ۱۲۸۸ھ (۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء) کو ہوئی۔ وہ مدتوں ریاستِ حیدرآباد میں محکمہ کروڑ گیری میں ملازم رہے۔ ان کے صاحب زادے اظہر حق صاحب ۱۹۵۷ء میں حیدرآباد میں موجود تھے۔ محمدؐ اسلام الحق بھی شعر کہتے تھے، سلیم تخلص تھا۔

ادیب بہت اچھے خوش نویس☆[۲] تھے فنِ تاریخ گوئی میں بھی اچھی مہارت

تھی۔ تحقیقِ لفظی کا بہت خیال رہتا تھا، اس موضوع پر بلند پایہ مضامین اُن کے قلم سے نکلے۔ مزاج میں ظرافت تھی، اس لیے مجلس میں خوب چمکتے تھے۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتے تھے، اسی سبب جلسوں میں اُن کی مانگ رہتی تھی۔ اُن کے ترقی پسند رجحان کا ثبوت اِس سے ملتا ہے، کہ جب آزاد اور حالی انجمنِ پنجاب، لاہور میں نئی شاعری کی بنیاد ڈال رہے تھے، تو ادیب کی کوشش سے دہلی سوسائٹی کی سرپرستی میں بھی مناظمے ہونے لگے، جن میں مصرعِ طرح کی جگہ کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ نساخ کے تذکرے "سخن شعرا" کا جو نسخہ شاہ بہاء الدین دہلوی معروف بہ عبداللہ شاہ بشیر (شاہ نصیر دہلوی کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدین صغیر کے حقیقی نواسے) کے پاس تھا۔ اِس کے حاشیے پر اُنھوں نے بہت قیمتی اضافے کیے، اور کئی شعرا کے حالات کا اپنی طرف سے اضافہ کیا تھا۔ یہ نسخہ حسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گیا، اِس پر جناب مشفق خواجہ، کراچی نے مفصّل مقالہ قلم بند کیا جو سہ ماہی اُردو، کراچی کے، غالب نمبر (۴۵:۱۔ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء) بعنوان "غالب اور تلامذۂ غالب" شائع ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادیب نے ایک تذکرۂ شعرا بھی مرتب کیا تھا۔ بشیر نے اِس تذکرے کے لیے متعدد قطعاتِ تاریخ کہے تھے، مثلاً

مرتب ساخت در ایامِ نیکو
ادیب افسانۂ شیریں مقالاں
بجستم سالِ اتمامش زہاتف
کہ ہست ایں قصۂ صاحب کمالاں
بگفتا: کاے بشیرِ خستہ خاطر
بگو: گلدستۂ نازک خیالاں"
(۱۲۸۹ھ)

گویا یہ تذکرہ ۱۲۸۹ھ میں مکمل ہوا، ہنوز اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

ادیب کا کلام دتی کے روزمرّہ اور محاورے کی جان ہے، معاملہ بندی اور

بے ساختگی اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ افسوس وارستہ مزاجی اور لا اُبالی طبیعت نے اُنھیں اپنا کلام مرتب کرنے کی فرصت نہ دی، ورنہ کام کی چیز ہوتا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یوں ہوا حال ستم سے، ترے سودائی کا
آپ ہی شوق ہے گویا تجھے رسوائی کا

☆

موت آگئی مجھے، سرِ شامِ فراق میں
دشمن نے آج کام کیا، دوست دار کا
ہو جان پر جو ایک مصیبت تو رویئے
دل بھی یہاں ملا، تو ترے اختیار کا
راہِ وفا پہ گر نہیں آتے ہیں وہ، نہ آئیں
دل ہی کہیں ہو کاش، مرے اختیار کا
کر چشم و دل کی خیر، خدا سے طلب ادیب!
لپکا بُرا پڑا ہے تجھے انتظار کا

☆

جس کو مارا، وہ اُف نہیں کرتا
ہاتھ ہلکا ہے میرے قاتل کا

☆

آئے تھے جب، تو لائے تھے کیا ساتھ واں سے ہم
حرمان ویاس لے کے چلے ہیں، یہاں سے ہم
کب تک عتاب، ایک کرم کی نگاہ بھی
تنگ آگئے ہیں اب ستمِ آسماں سے ہم
خالی خیالِ یار سے دل، ایک دم نہیں
رہتے ہیں اپنے گھر میں بھی، اک میہماں سے ہم

سب کچھ، ادیب! عشق نے جی سے بھلا دیا
جانا کہاں ہے اور تھے آئے کہاں سے ہم

☆

ہے مری طرح سے الطاف کی اس پر بھی نظر
حال پر غیر کے آتا ہے ترحّم مجھ کو

☆

غیر تک پوچھتے ہیں، "ہوگئی حالت کیسی!"
ڈال دی آپ نے ہم پر یہ مصیبت کیسی!
کہہ دیا اس نے کہ "اب یہ بھی نہ دیکھو گے کبھی"
جب کہا میں نے کہ "منھ دیکھے کی الفت کیسی!"
ایک تو ذکرِ عدو، اس پہ بگڑنا، کہ سنو
ٹوٹتی ہے یہ قیامت پہ قیامت کیسی!
غیر سے چار گھڑی کو بھی جدا ہو، تو کہوں
کہ گزرتی ہے کسی کی شبِ فرقت کیسی!
آج دو ٹوک کیے لیتے ہیں اُن سے ناچار
بن گئی اپنے ہی دم پر، تو مروّت کیسی!

☆

مبارک ہو، ملتے ہو گر دشمنوں سے
تمھاری یہی نیک نامی کریں گے

☆

گویا مرا قصور تھا، ایسا خجل ہوا
جب شکوۂ جفا پہ وہ بولے: "خطا ہوئی"
اب کیا عوض میں بوسے کے، لو گے کسی کی جان؟
بندہ نواز! کہہ تو چکا میں: "خطا ہوئی"

☆

خط دے کے میرا اُن کو، الجھیو نہ نامہ بر!
ایسا نہ ہو، کہ میری بلا تیرے سر پڑے

☆

لے جاؤ میرے سینے سے ناوک نکال کے
پر دل نکل نہ آئے کہیں، دیکھ بھال کے

[مرآۃ حقائق: ۱۴۹۔ ۱۵۰، خم خانۂ جاوید، ۱: ۲۵۲۔ ۲۵۷، تذکرۂ محبوب الزمن، ۲۳۹۔ ۲۴۱) قاموس المشاہیر، ۱: ۷۳، منتخب اللطائف (متعدد صفحات): تحریک ماہانہ (اپریل ۱۹۵۹ء): ۳۱۔۳۲]

حواشی

☆۱۔ مولوی محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے تذکرۂ شعرائے دکن (۲۴۰) میں لکھا ہے کہ ''حیدرآباد دکن میں مسافرِ عدم ہوئے''۔ یہ ٹھیک نہیں۔ انتقال دہلی میں ہوا تھا، اور یہیں دفن ہوئے۔

☆۲۔ تذکرۂ شعرای فارسی ''منتخب اللطائف'' تالیف رحم علی خان ایمان، تہران سے باہتمام سیدّ محمد رضا جلالی نائینی و دکتر سید امیر حسن عابدی شائع ہوا ہے (۱۳۴۹ شمسی) اس کا اصلی خطی نسخہ دتی یونی ورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے، جس کا عکس یہ مطبوعہ نسخہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی زمانے میں ادیب کے پاس رہا ہے، اِس کے حاشیے میں جا بجا ادیب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں محفوظ ہو گئی ہیں۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں خطِ نستعلیق میں پوری جہارت حاصل تھی۔

اسمٰعیل... مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں اپنے خاندانی مکان واقع محلہ مشائخان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ پیر بخش تھا، جن کا سلسلۂ نسب محمدؐ بن ابوبکر صدّیقؓ سے ملتا ہے۔ اِن کے جدِّ اعلیٰ قاضی حمید الدین خجندی مغلیہ خاندان کے بانی بابر بادشاہ کے ہمراہ ۱۵۲۶ء میں ہندوستان آئے۔ فتح ہند کے بعد بابر نے اُنھیں یک ہزاری منصب دے کر قصبہ سیکری کا چودھری بنا دیا۔

مولانا اسمٰعیل کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دس برس کی عمر میں قرآنِ ناظرہ ختم کیا۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو مرزا رحیم بیگ رحیم کے مدرسے میں فارسی کی مزید تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ یہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے۔ خان بہادر مولانا محمد اسلم سیفی (مولانا اسمٰعیل کے خلفِ اصغر) ''حیاتِ اسمٰعیل'' میں لکھتے ہیں:

> اُس زمانے کا ذکر ہے کہ مرزا غالب نے قاطعِ بُرہان کے نام سے ایک رسالہ برہانِ قاطع کے خلاف شائع کیا تھا۔ یہی وقت تھا کہ مرزا رحیم بیگ کے مکتب میں مولانا (محمد اسمٰعیل) متعلم تھے۔ مرزا رحیم بیگ نے مرزا غالب کی قاطعِ بُرہان کے جواب میں ایک رسالہ ساطع برہان تصنیف کیا تھا۔ مولانا کے سپرد یہ خدمت تھی کہ مختلف کتبِ لغات سے الفاظ تلاش کرتے اور اُن کے معانی سُناتے رہیں اور کبھی کبھی مسودات بھی تحریر کیا کریں۔ (ص ۹)

یہاں حضرت سیفی کو غلط فہمی یا سہو ہوا ہے۔ جس زمانے میں مولانا اسمٰعیل،

مرزا رحیم بیگ کے مدرسے میں طالب علم تھے، اس وقت تک مرزا غالب کی قاطعِ برہان عالمِ وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں مرتب ہوئی اور پہلی دفعہ ۱۸۶۲ء میں چھپی، جب کہ مولانا کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی۔ خود جناب سیفی کے بیان کے مطابق مولانا محمد اسمٰعیل اس سے دو برس پہلے ۱۸۶۰ء میں انسپکٹر مدارس کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ قاطعِ برہان کی اشاعت کے زمانے میں مولانا اسمٰعیل، رحیم بیگ کے مکتب میں متعلّم نہیں تھے، اس لیے وہ الفاظ کی تلاش اور مسودات کی تحریر کی خدمت بجا نہیں لا سکتے تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۷ء تک اس دفتر میں ملازم رہے اور یہ سارا زمانہ میرٹھ سے باہر نہیں گئے۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء تک تین برس سہارن پور ضلع اسکول میں صدر مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے۔ غالب پہلے جنوری ۱۸۶۰ء میں رامپور گئے ہیں اور دوسری مرتبہ اپریل ۱۸۶۵ء میں۔ دوسرے سفر میں میرزا میرٹھ میں نہیں ٹھیرے۔ البتہ پہلے سفر میں رامپور سے واپسی پر دو دن کے لیے نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ کے ہاں اُترے ہیں، اس وقت مولانا محمد اسمٰعیل کی عمر صرف سولہ برس کی تھی، اور ابھی اُنھوں نے شاعری شروع بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے ان دونوں سفروں میں اُستاد اور شاگرد کی ملاقات کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کبھی نہیں ملے، اس لیے مولانا نے مشورۂ سخن خط و کتابت ہی سے کیا ہوگا۔☆[۱]

مولانا ۱۸۷۱ء میں سہارنپور سے واپس میرٹھ آئے اور پہلے ضلع اسکول میں اور پھر نارمل اسکول میں فارسی کے معلّم رہے۔ ۱۸۸۷ء میں وہ اِسی عہدے پر آگرہ نارمل اسکول میں منتقل ہوگئے اور اِس کے بعد بارہ برس تک آگرے میں مقیم رہے۔ مولانا کی شہرت بحیثیت شاعر اسی زمانے میں ہوئی، جب اُن کی بعض نظمیں مولانا وحید الدّین سلیم کے پرچے "معارف" (علی گڑھ) میں شائع ہوئیں۔ آگرے ہی سے وہ ۱۸۹۹ء کے اواخر میں ملازمت سے پنشن لے کر اپنے وطنِ مالوف واپس آئے اور عمر کے باقی ایام یہیں میرٹھ میں بسر کیے۔

اُنھوں نے قیامِ آگرہ کے زمانے ہی میں ابتدائی درجوں کے لیے کتابوں کا ایک سلسلہ لکھا، جو مدّتوں یوپی کے مدارس میں داخلِ نصاب رہا اور اہلِ نظر کی رائے ہے کہ آج تک اِن سے بہتر کتابیں بچوں کے لیے نہیں لکھی گئیں۔

۱۹۱۲ء میں اُنھیں حکومتِ ہند کی طرف سے اپنی علمی خدمات کے اعتراف میں خان صاحب کا خطاب ملا تھا۔

۱۹۱۴ء میں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی تحریک پر طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو کے تمام کلام کی تصحیح و طباعت کا کام شروع ہوا تھا۔ ملک کے مختلف اصحابِ قلم حضرات کے ذمّے ایک ایک کتاب لگائی گئی تھی۔ مثنوی ''قران السعدین'' جو حاکمِ بنگالہ نصیر الدین محمود بغرا خان اور معز الدین کیقباد بادشاہِ دہلی کی ملاقات کے حال پر مشتمل ہے، مولانا کے حصّے میں آئی۔ افسوس کہ اُنھیں اِس کا مطبوعہ نسخہ دیکھنا نصیب نہ ہوا، یہ اُن کی وفات کے چند ماہ بعد ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ لیکن جو محنت اور جگر کاوی اُنھوں نے اِس کی تصحیح اور تنقید میں کی ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آخری ایام میں وہ حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری مرتب کر رہے تھے کہ موت کا بُلاوا آ گیا۔

معمولی علالت کے بعد یکم نومبر ۱۹۱۷ء (۱۴ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ) کو جمعرات کے دن عصر کے وقت وفات پائی۔ اسی دن مغرب کے قریب جنازہ اٹھا اور شہر کے باہر ایک خاص قطعۂ زمین میں دفن ہوئے، جو باغپت اور غازی آباد سے آنے والی سڑکوں کے چوراہے کے قریب پڑتا ہے۔ لوحِ مزار پر حسب ذیل کتبہ ہے:

پیدائش: ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء

وفات: یکم نومبر ۱۹۱۷ء

اے ادیبِ علم و دانش، بانیِ فضل و کمال

اے خطیبِ خطبۂ خلق و ادب حلم و حیا

پیشوائے قوم مولانا محمدؐ اسمٰعیل
ماہتابِ برجِ حکمت، آفتابِ فلسفہ

یہ دونوں اشعار اس مرثیے سے ماخوذ ہیں جو منشی عنایت نبی ارشد نے مولانا کی وفات پر کہا تھا۔

وفات کے وقت عمر چند دن کم ۷۳ برس کی تھی۔ اپنے پیچھے اولاد میں دو لڑکے محمد محمود اور محمد اسلم اور ایک صاحب زادی قیوم النسا یادگار چھوڑی۔

کلّیاتِ اسمٰعیل کا پہلا ایڈیشن اُن کی زندگی میں (۱۹۱۱ء) چھپا۔ لیکن یہ بہت ناقص تھا۔ دوسرا ایڈیشن ان کے صاحب زادے جناب محمد اسلم سیفی نے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا اور اس کے شروع میں ''حیاتِ اسمٰعیل'' کا اضافہ کیا۔

مولانا اسمٰعیل نے اُردو، فارسی نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا۔ میں نے کلام میں صرف اُن کی غزلوں کا انتخاب لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کا اصلی کارنامہ اُن کی وہ نظمیں ہیں، جو اُنھوں نے اپنی ناقابلِ تقلید اور عدیم المثال طرز میں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ بچوں کے لیے کوئی چیز لکھنا کس قدر مشکل ہے، اس کا اندازہ کچھ اسی کو ہو سکتا ہے جس نے کبھی یہ کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس کے لیے بچوں کی ذہنیت اور نفسیات کا گہرا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ محض پند و نصائح اور آسان زبان اِس کے لیے کافی نہیں، بلکہ موضوع کو ایسے طریقے سے پیش کرنا کہ بچے کی سادہ طبیعت خود بخود اس کی طرف مائل ہو اور نصیحت اُس کے دل پر نقش ہو جائے، یہ اصل بات ہے۔ مولانا محمدؐ اسمٰعیل اس مقصد میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہے ہیں۔

اُن کی غزلوں اور نظموں کا دل پسند موضوع تصوّف اور اخلاق ہے۔ ایک تو طبیعت فطری طور پر نیک تھی، اس پر دورِ آخر کے مشہور ولی اللہ حضرت سید غوث علی شاہؒ پانی پتی☆[۲] کی بیعت نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ اُنھوں نے اپنے مرشد کے حالات نثر میں ''تذکرۂ غوثیہ'' کے عنوان سے لکھے ہیں۔☆[۳] اس کتاب کی دل کشی کی کماحقہٗ تعریف نہیں ہو سکتی۔ زبان کے لحاظ سے ایسی بے ساختہ اور موضوع کے لحاظ

سے ایسی پرخلوص کتابیں اُردو میں بہت کم تصنیف ہوئی ہیں۔

جن اصحاب نے اُردو شاعری کو اپنے ڈگر پر ڈالا، اُن میں مولانا اسمٰعیل صفِ اوّل کے لوگوں میں سے ہیں۔ جب ۱۸۷۴ء میں محمد حسین آزاد لاہور میں انجمنِ پنجاب کی قیادت میں نئے رنگ کے مشاعروں کی بنیاد رکھ رہے تھے، اسی زمانے میں اسمٰعیل بھی نئے نئے مضمونوں پر نظمیں تصنیف کر رہے تھے، جیسا کہ ان کے مجموعۂ کلام ''ریزۂ جواہر'' (مطبوعہ ۱۸۸۰ء) سے ظاہر ہے۔ قادر الکلامی، محاورہ بندی، برجستگی اور آمد، کسی بات میں وہ اپنے معاصرین سے پیچھے نہیں، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ بہت ہی کم اِس میں اُن کی برابری بھی کر سکتے ہیں۔

اُردو غزلوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:

میرے سوا حریفِ ستم کوئی بھی نہ تھا
اب مہربان ہو گئے یہ کیا غضب ہوا!

☆

ہے بے لب و زبان بھی غُل تیرے نام کا
محرم نہیں ہے گوش، مگر اس پیام کا
میں بے قرار، منزلِ مقصود بے نشاں
رستے کی انتہا، نہ ٹھکانا مقام کا

☆

اس انجمن میں جایئے، اب کس اُمید پر!
ہم بیٹھنے نہ پائے کہ وہ بدگماں اُٹھا
وصل و فراق وہم سہی، دل لگی تو ہے
پھر ہم کہاں جو پردۂ رازِ نہاں اُٹھا
پروانے کی تپش نے خدا جانے، کان میں
کیا کہہ دیا کہ شمع کے سر سے دھواں اُٹھا

☆

بنائیں بگڑیں ہوئی کو تو ایک بات بھی ہے
بگاڑنا نہیں مشکل بنی بنائی کا
اٹھا حجاب، تو بس دین و دل دیے ہی بنی
جنابِ شیخ کو دعویٰ تھا پارسائی کا

☆

کام اگر حسبِ مُدّعا نہ ہوا
تیرا چاہا ہوا، بُرا نہ ہوا
سخت فتنہ جہان میں اُٹھتا
کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا

☆

نقابِ جور میں روُپوش، اک لطفِ نہاں نکلا
وہ میرے حال پر مجھ سے زیادہ مہرباں نکلا
نہ تھا بزمِ احباؔ ہی میں، تیرا ذکر دشمن بھی
بیاں کرتا سرِ بازار، تیری داستاں نکلا
حجابِ شاہدِ مطلق نہ اٹھا ہے، نہ اٹھے گا
جسے ہم لامکاں سمجھے تھے، وہ بھی اک مکاں نکلا

☆

میں کبھی کا مر بھی رہتا، نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا
یہ جو عشق جانستاں ہے یہ وہ بحرِ بے کراں ہے
نہ سنا کوئی سفینہ، کبھی اس سے پار ہوتا
کبھی بھول کر کسی سے، نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا، تمھیں ناگوار ہوتا

☆

ساقی ادھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں
کچھ مستیٔ نگہ بھی ملادے شراب میں

☆

بس، اے رنگ و بُو، تو نہ کرناز بے جا
خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

☆

جو تشریف لاؤ، تو ہے کون مانع!
مگر خوئے بد کو بہانے بہت ہیں
کرو دل کے ویرانے کی کنج کاوی
دبے اس کھنڈر میں خزانے بہت ہیں
نہ اے شمع! رو رو کے مر، شام ہی سے
ابھی تجھ کو آنسو بہانے بہت ہیں
بس اک آستانہ، ہے سجدے کے قابل
زمانے میں گو آستانے بہت ہیں

☆

اتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں
آگے حواس گم، خردِ نارسا کے ہیں
کھٹکا بھی کچھ ہوا نہیں اور دل اُڑا لیا
یہ سارے ہتھکنڈے تری زلفِ دوتا کے ہیں
تو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا
ورنہ دیارِ حسن میں رسمِ ستم نہیں
سر ہی کے بل گئے ہیں سدا، رہروانِ عشق
حیرت زدہ نہ بن، کہ نشانِ قدم نہیں

کیسی طلب، کہاں کی طلب، کس لیے طلب!
ہم ہیں، تو وہ نہیں ہے، جو وہ ہے تو ہم نہیں

☆

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں
ہم سے پوچھو، تو آدمی ہی نہیں
یا وفا ہی نہ تھی زمانے میں
یا مگر دوستوں نے کی ہی نہیں
بندگی کا شعور ہے جب تک
بندہ پرور! وہ بندگی ہی نہیں

☆

خوفِ ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال
مشکلیں، جب بندھ گئی ہمّت، سب آساں ہوگئیں
کیا اُنھیں اندوہِ ہنگامِ سحر، یاد آگیا!
شام ہی سے بزم میں شمعیں جو گریاں ہوگئیں
اک فرشتے بھی تو ہیں، جن کو نہ محنت ہے نہ رنج
خواہشیں دل کی بلائے جانِ انساں ہوگئیں
تھی وہ توفیقِ الٰہی، میں نے سمجھا اپنا فعل
طاعتیں بھی میرے حق میں عینِ عصیاں ہوگئیں

☆

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
ہے یہ تیری ہی صدا، غیر کی آواز نہیں

☆

بے حوصلگی ہے گلۂ تلخیِ دوراں
جو دیں اسے پی جائیے، گو زہر ملا ہو

تنگی سے نہ دل تنگ ہو، جا شکرِ خدا کر
اے خوش! وہ دلِ تنگ کہ راضی برضا ہو
گاہک ہی نہ ہو کوئی، تو ہے عرضِ ہنر ہیچ
اے وائے! گلِ تازہ جو صحرا میں کھلا ہو

☆

پھر کچھ کچھ ان کے وعدے پہ اب اعتبار ہے
مایوسِ مرگ پھر دلِ امیدوار ہے
چل بے کدے کو، بیٹھ نہ گوشے میں تنگ دل
زاہد! وسیع رحمتِ پروردگار ہے

☆

البتہ اس کے فضل پہ موقوف ہے نجات
کچھ زہدِ خشک میں ہے، نہ دامانِ تر میں ہے

☆

ہے رگِ ہر برگ میں رنگِ بہار
دیکھنے کو چشمِ بینا چاہیے

☆

ہے تو اغیار سے خطاب مگر
میری ہر بات کا جواب بھی ہے
واں برابر ہے خلوت و جلوت
اس کی بے پردگی حجاب بھی ہے

اب فارسی کی دو غزلوں کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

اے رُوئے تو بے نقاب تا کے
برخود تپد آفتاب تا کے

بشکن سرِ زلفِ تابدارت
دلہا ہمہ پیچ و تاب تاکے
در روزِ شمار کمپرسم
گیرم زغمت حساب تاکے
حسن تو نقاب در نتابد
شوخی تو در حجاب تاکے
صد قفل زدم درِ تمنا
دل بستہ فتح باب تاکے
زاہد! بہ نوائے خارج آہنگ
دل برکنی از رباب تاکے

☆

ہر چند مرانیست بتو ہیچ کلامے
ہر دم ز تو صد بار پیامے وسلامے
گفتم بتو، ازلب نہ بروں آمدہ حرفے
رفتم بتو، از جائے نہ برداشتہ گامے
آنگاہ کہ ناگاہ، بہ بے گاہ رسیدیم
سالیست، نہ ماہیست، نہ صُبحیست، نہ شامے
منزل گہِ ما را، نہ سلوکیست، نہ رسمے
نے ہم سفرے ہست، نہ میلے، نہ مقامے
آں مے کہ بخوردیم، نہ درخوردِ عوام ست
خمخانۂ ما را، نہ خمے ہست، نہ جامے
صد فتنہ برانگیختہ، ناکردہ نگاہے
صد مرحلہ طے ساختہ ناکردہ خرامے
(حیاتِ اسمٰعیل)

حواشی

☆۱۔ بعض حضرات کو اسمٰعیل کے تلمذِ غالب میں بھی شبہ ہے۔ میں جن ایام میں تلامذۂ غالب کی تدوین کے سلسلے میں سرگرداں تھا، میرا میرٹھ بھی جانا ہوا تھا۔ میں بارہا اسمٰعیل کے صاحب زادے جناب محمد اسلم سیفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ ایک دن ہم دونوں گھر سے باہر نکل رہے تھے کہ وہ صحن میں رُک گئے اور کہا: ابا مرحوم نے اسی جگہ کھڑے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے مرزا غالب سے اصلاح لی ہے۔
حسرت موہانی نے بھی اسمٰعیل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے، اور حسرت کے اسمٰعیل سے ذاتی تعلقات تھے۔
☆۲۔ حضرت سیّد غوث علی شاہ۔ خورشید علی نام ابو الحسن کنیت اور سید غوث علی شاہ عرف تھا۔ سلسلۂ نسب ۱۸ پشتوں میں حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی تک پہنچتا ہے۔ آپ کے اجداد میں حضرت سید محمد غوث سب سے پہلے ہندوستان آئے وہ روم سے خراسان اور وہاں سے ملتان پہنچے (اخبار الاخیار) ملتان سے نقلِ مکان کر کے اوچہ تشریف لے گئے، اور وہیں انتقال فرمایا۔ اُن کے پوتے سید مصلح الدین ناصر الحسن عرف میر میران لاہور میں بس گئے۔ اُن کی اولاد میں سے اک بزرگ ۱۸۵۷ء سے پہلے مونگیر ضلع بہار کے قصبۂ استھاوان چلے گئے۔
سیّد غوث علی شاہ یہیں استھاوان میں ۷ ستمبر ۱۸۰۴ء (یکم جمادی الآخر ۱۲۱۹ھ) کو عالمِ وجود میں آئے۔ ۱۲ برس کی عمر تھی، جب اپنے والد سید احمد علی رسالدار کی معیت میں لاہور گئے اور تعلیم کی غرض سے مختلف اکابر کی خدمت میں رہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا فضل امام خیر آبادی اُن کے استادوں میں تھے، اور یہ خود مولانا فضل حق کے ہم سبق تھے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد مختلف مقامات کی سیر کر کے علومِ باطنی حاصل کیے اور ۶۰ برس کی عمر میں مستقلاً پانی پت میں مقیم ہوگئے۔ یہیں ۶ مارچ ۱۸۸۰ء (۲۶ ربیع الاول ۱۲۹۷ھ) کو وصال ہوا۔ مزار شہر کے باہر ہے، جہاں سالانہ عُرس ہوتا ہے "اوبود شہنشہِ حقیقت" تاریخ ہے۔ یہ غالب کے دوستوں میں سے تھے اور آپس میں دید و باز دید کے تعلقات تھے۔ (تذکرۂ غوثیہ)
☆۳۔ یہ کتاب سید گل حسن شاہ صاحب کی تصنیف خیال کی جاتی ہے کیوں کہ اُنھیں کا نام مصنف کی حیثیت سے سرورق پر لکھا ملتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ سید گل حسن شاہ جس خطۂ ملک کے رہنے والے تھے، وہاں کی زبان کا اس سے کیا تعلق، جو کتاب میں استعمال ہوئی ہے، میں نے کتاب کا اصلی مسودہ خود مولانا اسمٰعیل مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ان کے صاحب زادے جناب سیفی صاحب کے پاس دیکھا تھا۔ جس کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا کہ کتاب مولانا اسمٰعیل کی لکھی ہوئی ہے۔

اشرف... مولوی مرزا اشرف بیگ دہلوی

دلّی کے ایک شریف اور معزّز خاندان کے فرد تھے۔ ان کا تاریخی نام ''اشرف بیگ خان'' تھا، جس سے ان کی تاریخِ ولادت ۱۲۶۴ھ (مطابق ۱۸۴۷۔ ۱۸۴۸ء) برآمد ہوتی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ بدقسمتی سے والد ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے میں کام آئے۔ اس وقت تک وہ قرآن ختم کر چکے تھے اور فارسی کا ابتدائی نصاب بھی مکمل ہو چکا تھا۔ جب شہر میں امن و امان بحال ہوا، تو اُن کے اعزہ نے اُنھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔

اُن کے دادا مرزا فاضل بیگ جموں میں ملازم تھے۔ انھیں شاہی میں موسس الدّولہ اساس الملک، مثبت جنگ خطاب عطا ہوا تھا۔ اس ہنگامے کے دوران میں بھی وہ جموّں ہی میں مقیم رہے۔ دلّی میں حالات معمول پر آگئے، تو وہ وطن لوٹے۔ یہاں آکے دیکھا کہ لوگوں نے ان کے پوتے کو مشنری اسکول میں بٹھا دیا ہے۔ اس پر وہ کچھ ناراض ہوئے اور پہلا کام یہ کیا کہ اشرف بیگ کو وہاں سے اٹھا کے دوبارہ ان کی عربی فارسی تعلیم کا انتظام کیا۔

اشرف نے فارسی کی تکمیل اپنے دادا مرزا فاضل بیگ سے کی۔ ابتدائی عربی مفتی صدر الدین خان آزردہ اور اعلیٰ نصاب مدرسہ عرب سرائے کے مولوی اسمٰعیل سے پڑھی۔ فاضل بیگ آخری زمانے میں دلّی کی سکونت ترک کر کے بستی حضرت نظام الدّین میں منتقل ہوگئے تھے۔ انھیں ایام میں عرب سرائے کا مدرسہ بھی وہاں سے اُٹھ کر بستی نظام الدین میں آگیا، اس سے اشرف بیگ کو مولوی اسمٰعیل سے استفادہ کرنے کا موقع

میسر آگیا۔

جب یہ عربی فارسی کی تحصیل کر چکے، تو مولوی اسمٰعیل نے مرزا فاضل بیگ پر زور ڈالا کہ وہ اشرف بیگ کو سرکاری مدرسے بھیج دیں، تاکہ یہ انگریزی بھی پڑھ سکیں۔ یہاں اُنھوں نے بہت ترقی کی، وہ اپنے دور کے کامیاب طالب علم گردانے جاتے تھے۔

عنفوانِ شباب ہی میں اشرف بیگ کی حالی سے ملاقات ہوئی۔ غالباً حالی کے زیرِ اثر ہی انھوں نے شعرگوئی شروع کی اور غالب کا تلمذ اختیار کیا۔ غالب کے انتقال پر وہ چندے شیفتہ سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ لیکن شیفتہ بھی غالب کے بعد زیادہ نہیں جیے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے بعد اُنھوں نے کسی اور سے اصلاح لی یا نہیں!

انھوں نے اس کے بعد ثریا جاہ کی ملازمت اختیار کرلی۔ اُسی زمانے میں اُنھوں نے اپنے نام پر "اشرف الاخبار" جاری کیا۔ ۱۸۷۱ء میں ثریا جاہ ٹونک چلے گئے اور اشرف بیگ کو بھی اُن کے ہمراہ جانا پڑا۔ اس پر اُنھوں نے "اشرف الاخبار" مشہور مطبع محمدی کے مالک ریاض الدّولہ محمدّ مرزا خان کے حوالے کردیا۔ مطبعِ محمدّی کا نام غالب کے کئی خطوط میں آیا ہے۔ قاطع برُہان کے مناقشے میں اُنھوں نے جو اُردو خط ساطع برہان کے مصنّف مرزا رحیم بیگ میرٹھی کو لکھا تھا، یہ "نامۂ غالب" کے عنوان سے مطبع محمدّی ہی میں چھپا تھا۔ اشرف الاخبار کا نام بھی غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ جب وہ بہت کم زور ہوگئے اور بیمار رہنے لگے، تو اُنھوں نے ایک اعلان بطور اعتذار اکمل الاخبار کے علاوہ اشرف الاخبار میں بھی شائع کرایا تھا۔ اشرف الاخبار میں وہ کبھی کبھار مراسلے اور مضمون بھی چھپوانے رہتے تھے۔ محمدّ مرزا خان کو اُنھوں نے ایک جگہ اپنے سبھی بھائی کا نواسہ کہا ہے، لیکن یہ رشتہ ٹھیک سے متعین نہیں کیا جاسکا۔

ٹونک کے سفر سے واپسی کے بعد اشرف نے شادی کی۔ اُنھیں ایام میں اُنھوں نے حکیم محمدّ علی خان سے طب کی باقاعدہ تعلیم پائی اور اُنھیں کے ساتھ مطب

بھی کیا۔

۱۸۷۹ء میں اشرف کو سررشتۂ تعلیم پنجاب کے بک ڈپو میں اسسٹنٹ مترجم کی اسامی کی پیش کش ہوئی جس پر وہ لاہور چلے گئے۔ یہاں انھیں ترجمہ شدہ کتابوں پر نظرثانی کر کے ان کی زبان درست کرنا پڑتی تھی۔ اسی زمانے میں وہ محکمۂ تعلیم کے مشرقی علوم والسنہ کے امتحانوں کے ممتحن بھی رہے۔

لیکن لاہور کی آب و ہوا اُنھیں راس نہ آئی، اور وہ بیمار رہنے لگے۔ اس پر بادلِ ناخواستہ وہ اس ملازمت سے مستعفی ہوگئے، لاہور کو خیرباد کہا اور دلّی واپس آگئے۔ اب اُنھوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرلیا، اور گورنمنٹ اسکول میں فارسی کے مدرّسِ دوم مقرر ہوگئے۔ وہ اسی عہدے پر تھے، جب ان کا اکتوبر ۱۸۸۲ء میں انتقال ہوا۔

[اکمل الاخبار، دلّی، ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۲ء (مضمون ''مولوی مرزا اشرف بیگ خان مرحوم، از مولوی محمدّ سعید) بحوالۂ پگڈنڈی امرتسر، سالنامہ ۱۹۵۹ء (''مضمون: '' میرزا اشرف بیگ اور اشرف الاخبار از عتیق صدیقی]

اشرف... اشرف حسین خان الٰہ آبادی

غالب ایک خط میں میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

بھائی، بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے، ایک مثنوی میں نے اُس کی تعریف میں لکھی ہے، اور ''چراغِ دیر'' اُس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے، اُس کو دیکھنا۔ اشرف حسین خان صاحب میرے دوست ہیں۔ فتنہ و فساد کے زمانے سے بہت پہلے اُن کا خط اور کچھ اُن کا کلام میرے پاس آیا ہے، تم اُن کو میرا سلام کہنا... الخ (دوشنبہ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء)

غالب نے جب یہ خط سیاح کو لکھا ہے، تو وہ بنارس میں تھے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ سیاح نے اپنے خط میں اشرف حسین خان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا (اور ممکن ہے کہ اشرف نے اُن سے غالب سے اپنے پرانے تعلق کی طرف اشارہ کیا ہو) جس پر غالب کو یہ پرانا قصہ یاد آگیا: ''گلستانِ سخن'' میں ان کا ذکر بالفاظِ ذیل ملتا ہے:

اشرف تخلص نواب اشرف حسین خان، نوابزادۂ شہر الہ آباد، بالفعل انقلابِ روزگار سے محکمۂ عدالتِ دیوانی بنارس میں عہدۂ نظارت پر مامور ہے... مشورہ سخن کا مہدی حسین خان تصدیق تخلص سے کرتا ہے، لیکن طرزِ سخن سے ہنوز نومشقی نمایاں ہے۔

تھمتا نہیں ہے اشک مری چشمِ زار کا
مشکل ہے ٹوٹنا مرے اشکوں کے تار کا

ہے چرخ پر کبھی، تو کبھی کوہ و دشت میں
اک جا نہیں مقام ہمارے غبار کا

☆

برامیدِ وصلِ مہرویانِ عالم تا سحر
داغِ دل شمعیست، اشرف! درشبِ ہجرانِ ما

☆

تا دستِ من بدامنِ جاناں نمی رسد
دردِ شبِ فراق بداماں نمی رسد
پاسخ نمی رسد چو ز یارانِ رفتہ باز
افغانِ ما بشہرِ خموشاں نمی رسد
(اردوے معلّٰی: ۱۰، گلستانِ سخن: ۱۴۲ نیز ۱۷۳)

افضل... میر افضل علی لکھنوی عرف سیّد صاحب

نساخ اپنے تذکرے "سخنِ شعرا" میں لکھتے ہیں:

افضل تخلص سیّد افضل علی خان عرف سیّد صاحب خلف الرشید سیّد قاسم علی خان قاسم باشندۂ لکھنؤ۔ اپنے والدِ ماجد سے کسبِ سخن کیا ہے۔ راقم کے دوستوں میں ہیں۔

"سخنِ شعرا" کے مطبوعہ نسخے کے حاشیے میں شاہ بہاء الدین دہلوی معروف بہ عبداللہ شاہ بشیر لکھتے ہیں:

افضل تخلص، میر افضل علی خلف میر قاسم، سکنہ لکھنؤ۔ دلّی میں بھی رہتے ہیں، شاگرد غالب (۱۲۹۴ھ) میں عمر اِن حضرت کی قریب چالیس کے ہے۔ آدمی عاشق مزاج فارسی دان ہیں۔ اکثر فارسی اشعار کہتے ہیں، گاہ گاہ ریختہ بھی لکھتے ہیں۔

دونوں متفق ہیں کہ وہ سیّد تھے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اگر اُنھیں یا اُن کے والد کو "خانی" کا خطاب نہیں ملا تھا، تو اُن کے نام کے ساتھ لفظ "خان" کا اضافہ جیسا کہ نساخ نے کیا، درست نہیں ہوگا۔

قاسم سے متعلق نساخ کہتے ہیں کہ وہ بہت روز تک تحصیل داری پر مامور رہے اور کریم الدین لکھتے ہیں کہ "تحصیل محالاتِ سرکار انگریزی" پر مامور تھے۔ دونوں متفق ہیں کہ اُنھیں موسیقی میں اچھی مہارت حاصل تھی۔

غالباً افضل نے اولاً اپنے والد میر قاسم علی قاسم سے استفادہ کیا اور بعد کو

غالب کی شاگردی اختیار کرلی۔

افضل کو شاعری ورثے میں ملی، ان کے والد میر قاسم علی کا تخلص قاسم تھا اور دادا میر حیدر علی کا حیدر۔ یہ خاندان دراصل لاہور کا رہنے والا تھا اور یہ لوگ حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی کی نسل سے تھے۔ افضل کی ولادت بشیر کے اندازے کے مطابق تقریباً ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴۔ ۱۸۳۵ء میں ہوئی ہوگی۔

ان کا فارسی کلام دستیاب نہیں ہوا۔ نساخ نے ان کے مندرجۂ ذیل اُردو شعر اپنے تذکرے میں دیے ہیں، جو افضل نے خود انھیں مہیا کیے تھے:

ہے وصفِ رُوے یار، نہ لو نام ماہ کا
کیا ذکر اس مقام پر اس رُوسیاہ کا

☆

روشن ہمارا نام زمانے میں کب ہوا
یاں گُل چراغِ زیست سرِ شام ہو گیا
اس وقت اپنے بام پہ آیا وہ رشکِ ماہ
افضل! جب آفتاب لبِ بام ہو گیا

☆

مانی نہ ایک بات، نہ ٹھیرے وہ دو گھڑی
منّت کی لاکھ ہم نے، خوشامد ہزار، رات

☆

اتنے خط بھیجے ہیں لکھ لکھ کر کہ ہیں یکدست شل
نامہ بر کے پانو، مجھ خستہ جگر کی انگلیاں

☆

افضل! میں کیوں کہ زانو نہ پیٹوں کہ یاد ہے
باتیں وہ کرنا یار کا، زانو پہ دھر کے ہاتھ

☆

جھانکتے ہیں وہ روزنِ در سے
نقشِ دیوار ہم ہیں ششدر سے
دل سے شکوہ زبان تک آکر
بن گیا شکر آپ کے ڈر سے

☆

ہم وہ رندِ بادہ کش ہیں، ساقیا! تو دیکھ لے
مے ٹپکتی ہے ہمارے زخم کے انگور سے

☆

کل سے بے کل ہوں، بھلا خاک مجھے کل آئے
کل سے وعدہ تھا، نہ آج آئے نہ وہ کل آئے
کیا مزہ ہو کہ وہ دربان سے اپنے کہہ دیں
کوئی یاں آنے نہ پائے، مگر افضل آئے

☆

شوخی غضب اس شوخ کی خلقت میں بھری ہے
بجلی ہے، شرارہ ہے، چھلاوہ ہے، پری ہے

[تذکرۂ بشیر بحوالۂ ''غالب اور تلامذۂ غالب'' از مشفق خواجہ مشمولۂ سہ ماہی اُردو، کراچی (غالب نمبر ۱۹۶۹ء: جنوری تا مارچ): ۲۳۳، سخنِ شعرا: ۴۰۔ ۴۱، ۳۷۸، ۱۳۲، طبقات الشعراے ہند: ۳۸۰، خم خانہ جاوید، ا: ۳۶۱]

انجم... محمد علی خان شیخپوری

ضلع مونگیر (بہار) کے قصبے شیخ پورہ کے رہنے والے تھے۔ چہار شنبہ ۲۵ شوال ۱۳۰۸ھ (۳ جون ۱۸۹۱ء) کو وفات پائی، آہ غروب انجم، سے تاریخ نکلتی ہے۔

افسوس کہ اُن کا کلام نہیں ملا۔ اپنے استاد بھائی ہرگوپال تفتہ کی وفات پر دو قطعاتِ تاریخ کہے تھے، جو اودھ اخبار، لکھنو میں چھپے تھے، وہی درج ذیل ہیں:

انتقال از تپِ وبائی کرد
تفتہ شاگردِ حضرتِ غالب
گفت سالِ وفاتِ او انجم
"وائے صد حیف نائبِ غالب"
(۱۲۹۶)

ہاں مگر تفتہ مُرد در دہلی
مردوزن اشک ریز می آیند
سالِ او ریخت از لبِ انجم
"مُردہ نامِ سخنوری از ہند"
(۱۲۹۵=۱۲۹۶)

[بیاض جابر علی خان بحوالۂ معاصر (۱۸) ۱۴۷، اودھ اخبار ۱۳ دسمبر ۱۸۷۹ء (بشکریۂ ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس ہندو یونی ورسٹی]

انور... سیّد شجاع الدین عرف امراؤ مرزا دہلوی

ان کے والد مشہور خوش نویس یاقوت رقم ثانی میر جلال الدین حیدر تھے۔ انور راقم الدولہ سیّد ظہیر الدین عرف نواب مرزا ظہیر کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب سعید الدین احمد خاں صاحب نے اپنے والد نیّر رخشاں سے ان کی شاگردی کے سلسلے میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> جب مرزا زین العابدین خان عارف کو خط نسخ سیکھنے کا شوق ہوا تو وہ سیّد جلال الدین یاقوت رقم ثانی استاد ظلِ سبحانی بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن دنوں عارف کی شاعری کا عام شہرہ تھا۔ اِدھر میر جلال الدّین کے اِن دونوں صاحب زادوں کو شاعری کی چیٹک تھی اور وہ ایک اچھے استاد کی ٹوہ میں تھے۔ میر جلال الدین کو یہ اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اُنھوں نے عارف سے کہا کہ میں آپ کو یوں تو شاگرد کرتا نہیں، ہاں تبادلہ کرتا ہوں۔ یعنی میں آپ کو نسخ کی تعلیم دوں گا اور اس کے اصول بتاؤں گا۔ آپ میرے دونوں لڑکوں کو شاعری کے رموز بتائیں اور شاعر بنادیں۔ عارف مرحوم نے منظور کرلیا اور معاملہ اس پر طے ہوگیا۔ اگرچہ عارف نے ایک سال کے بعد سلسلۂ تعلیم ختم کردیا اور اُستاد نے سند لکھ دی، لیکن ظہیر اور انور مدّتوں عارف سے اصلاح لیتے رہے۔ چوں کہ دونوں جوہرِ قابل تھے تھوڑے ہی

دنوں کی مشق سے کچھ کا کچھ ہو گئے۔ جب بہادر شاہ ظفر کو ان کا
معلوم ہوا تو اُنھوں نے ان دونوں کو استاد ذوق کے سپرد کر دیا۔

لیکن طالب کا یہ بیان کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ انور کی ولادت تقریباً ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷۔ ۱۸۴۸ء) میں ہوئی۔ عارف کا انتقال اپریل ۱۸۵۲ء میں اور ذوق کا نومبر ۱۸۵۴ء میں ہوا، گویا عارف کی وفات کے وقت انور کی عمر پانچ برس سے زیادہ کی نہیں تھی، اور ذوق کی رحلت کے وقت وہ تقریباً سات برس کے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اِس زمانے میں اُن کا شعر کہنا اور اِن دونوں اساتذہ سے اصلاح لینا محال ہے۔

طالب ہی کی روایت ہے کہ داغ بھی شروع میں کامل تین برس تک عارف سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ اس زمانے میں اُن کا تخلص مرزا تھا جو نیّر رخشاں کا دیا ہوا تھا۔ بعد کو ولی عہد مرزا فخرو نے اُن کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم سے نکاح کیا تو یہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ قلعے میں اٹھ گئے۔ مرزا فخرو نے اُنھیں بھی ذوق کے حوالے کر دیا۔ داغ تخلص بھی ذوق نے دیا تھا، یہ گویا مرزا فخرو پر چوٹ ہے۔ خدا معلوم، اس میں کتنی سچائی ہے!

دیوانِ ذوق کا جو ایڈیشن ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں شائع ہوا تھا۔☆[1] اُس کی ترتیب میں غلام رسول ویران اور ظہیر کے ساتھ انور بھی شریک تھے۔ اِس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے بہت کچھ تصرّف کر کے بلکہ، اپنی طرف سے اضافے کر کے وہ دیوان شائع کیا جو متداول ہے۔☆[2]

اگرچہ ظہیر نے بھی انور کے دیوان کے آخر میں انور کے تلمّذِ ذوق و غالب کا ذکر کیا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا، انور کا تلمّذِ ذوق محال ہے۔ وہ دراصل غالب ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ نہایت ذہین اور طبّاع تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی، ورنہ یقیناً بہت ترقی کرتے۔

۱۸۵۷ء کے بعد پہلے رام پور اور وہاں سے جے پور گئے۔ وہیں ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں ۳۸ برس کی عمر میں خدا کو پیارے ہوئے۔ بقول لالہ سری رام اُن کے

دو مکمل دیوان ضائع ہوگئے۔ جن میں سے ایک خاص حمد و نعت اور تصوّف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا‘‘۔ خدا مغفرت کرے لالہ سری رام موصوف کو، اُنھوں نے بڑی محنت سے ایک دیوان مرتب کر کے ’’نظمِ دل فروز معروف بہ دیوانِ انور کے نام سے مطبع رفاہِ عام لاہور سے شائع کرایا۔ (۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۹ء) ورنہ ان کا کلام دیکھنے کو آنکھیں ترستیں۔ بہت پُرگو تھے۔ دیوان میں شاید ہی کوئی زمین ایسی ہو، جس میں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ تک موجود نہیں۔ زبان پر قدرت، روزمرہ اور آمد، معاملہ بندی اور لطیف طنز اُن کے کلام کا جوہر ہیں۔

انتخاب ملاحظہ ہو:

وہ آنکھیں نہیں، ہائے کیا ہو گیا
وہ کافر تو اب کچھ نیا ہو گیا
تمھیں یاں تک آنا قیامت سہی
ہمیں جی سے جانے میں کیا ہو گیا؟

☆

نظر ملتے ہی وہ کچھ ہو گیا، جو کچھ کہ ہونا تھا
پشیماں ہو رہا ہے دیدۂ انجام بیں کیا کیا

☆

کہیں سرِ طُور جلوہ افگن، کہیں دیرِ اُن سے روشن
وہاں تو ہے جاے مسکن، ہمیں تو رکھا نہیں کہیں کا

☆

تھک کے بیٹھے ہو درِ صومعہ پر کیا انور!
دو قدم اور کہ یہ خانۂ خمار رہا

☆

کیسی حیا، کہاں کی وفا، پاسِ خلق کیا
ہاں یہ سہی، کہ آپ کو آنا یہاں نہ تھا
کچھ اپنے دل کے ولولے، کچھ زاہدوں کی ضد
سر پھوڑتے کو ورنہ وہی آستاں نہ تھا
میں اور روزِ وصل، عدو اور شب فراق
یاں آسماں نہ تھا، کہ وہاں آسماں نہ تھا

☆

جان سننے والوں کی واعظ لبوں پر آگئی
واہ، کیا کہتا ہے حضرت، آپ کی گفتار کا!

☆

تم آج ہی چل پھر کے، مٹادو نہ یہ جھگڑا
کیوں کل پہ رکھو شورشِ غوغاے قیامت!

☆

وہ دن گئے، کہ مصر کو پہنچا کوئی بخیر!
تم ورنہ آفتِ رہِ صد کارواں ہو آج
ہاں روئدادِ بزمِ عدو، کیوں کہو، مگر
یہ تو کہو، کہ شب کو کہاں تھے، کہاں ہو آج

☆

کوئی تڑپے نہ کیوں تاب و تواں تک
نہ پوچھیں گے، نہ دیکھیں گے کہاں تک!

☆

کچھ کچھ جو چھیڑ لطف کی، کم کم عتاب میں
جی ہے امید و یاس سے کس کس عذاب میں

یہ مستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں
گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

☆

جو کہے سچ ہے، نہ مے پی، نہ کہیں دل اٹکا
گفتگو کچھ سخنِ ناصحِ ناداں میں نہیں
ہے تذبذب کہ انھیں دیکھ کے کچھ کہہ نہ اٹھوں
گرچہ اب تک کوئی لغزش مرے ایماں میں نہیں

☆

نظر ہو، تو نظر آتی ہے، کیفیت دو عالم کی
چلو انور! تماشا دیکھ آئیں بزمِ رنداں میں

☆

گویا کہ سب غلط ہیں مری بدگمانیاں
دیکھے تو کوئی شکل تمھاری حیا کے ساتھ
ہر ہر قدم پہ بیٹھتا آتا ہے، راہ میں
لایا ہوں کس کی بزم سے دل کو لگا کے ساتھ

☆

کچھ ہم رُکے رُکے رہے، کچھ وہ کھچے کھچے
ارمان جی کے جی ہی میں، کیا کیا یہاں رہے

☆

کچھ تو مل جائے لبِ شیریں سے
زہر کھانے کی اجازت ہی سہی
دل میں یاں آ کے نکلنا کیسا
اے، وہ ارمانِ شہادت ہی سہی

☆

بے طرح پڑتی ہے نظر اُن کی
خیر، دل کی نظر نہیں آتی

☆

ربط بڑھ جائے تو حسن و عشق کی ہے شان ایک
جو نفس ہے سینۂ عاشق میں شمعِ طور ہے

☆

نہ میں سمجھا، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے
میں اِس برہم مزاجی کے تصدّق
الجھتے ہیں وہ زلفِ عنبریں سے
کہاں کی دل لگی، کیسی محبّت!
مجھے اک لاگ ہے جانِ حزیں سے
وہ کچھ بے تابیاں، بگڑے سے تیور
لڑائی میں مزا ہے اس حسیں سے
اِدھر لاؤ ذرا دستِ حنائی
پکڑ دیں چور ہم دل کا یہیں سے

☆

قہر ہیں مستی میں وہ انگڑائیاں
خالی ہاتھوں لڑتے ہیں تلوار سے

☆

شکایت کی تمھارے آستاں کی
زمیں بھی سوچتی ہے آسماں کی

یہ حالت ہے مرے دردِ نہاں کی
کہ صورت دیکھتے ہو رازداں کی

☆

جاں بخش ہے گفتار، تو لب چشمۂ حیواں
پھر کہیے کہ اُن پر کوئی کس بات پہ مر جائے

☆

یہ خوشی کم ہے کہ ہم اس بزم میں
اک طرف بیٹھے تو ہیں ناشاد سے

[قلمِ دلفروز (دیباچہ) خم خانۂ جاوید، ا: ۴۸۱۔ ۴۸۹،
قاموس المشاہیر، ا: ۱۱۴]

حواشی

☆ا۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ دیوانِ ذوقؔ کا یہ پہلا ایڈیشن تھا لیکن میرے اپنے کتاب خانے میں دیوان کا ایک ایسا نسخہ موجود ہے جو مطبع محمدی، دہلی (محمد مرزا خان) سے مارچ ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اور لطف یہ کہ اس میں ویرانؔ وظہیر والے نسخے سے ایک شعر زیادہ نہیں۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ ترتیب اس میں بالعکس ہے یعنی ویرانؔ کے ۱۸۶۳ء والے نسخے میں پہلے قصائد ہیں اور پھر غزلیات: ۱۸۵۹ء کی اس اشاعت میں پہلے غزلیات ہیں پھر قصائد آخر میں۔ مجھے شبہہ گزرتا ہے کہ ۱۸۵۹ء کی تاریخ جعلی ہے۔ یعنی چوں کہ ویرانؔ وغیرہ نے اپنا دیوان رجسٹری کرالیا تھا، اس لیے مطبع محمدی کے نسخے کے ناشر نے قانونی گرفت سے بچنے کے لیے ترتیب بدل دی اور تاریخ پہلے کی ڈال دی، ورنہ یہ نسخہ ۱۸۶۳ء کے بعد چھپا تھا۔

واللہ اعلم

☆۲۔ آزاد کے مرتبہ دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۱ء میں مطبع اسلامیہ، لاہور سے باہتمام مولوی کرم بخش صاحب مالک ومہتمم طبع ہوا: اس کے آخری صفحے پر اُن کے صاحب زادے محمد ابراہیم کے دستخط ہیں۔

آرام... رائے بہادر منشی شیونرائن اکبرآبادی

خاندان کے کائستھ اور ماتھر ذات کی مانک بھنڈاری اَل کے چشم و چراغ تھے۔ اِن کے بزرگ اصل میں اجمیر کے رہنے والے تھے، جہاں سے ۱۷۸۴ء کے لگ بھگ اِن کے پردادا رائے اُجاگر چند نقلِ مکان کر کے آگرے آئے اور یہاں اپنی قابلیت سے بنارس کے جلاوطن راجا چیت سنگھ کے وزیر بن گئے۔ رائے اُجاگر چند کے صاحب زادے رائے بنسی دھر نے بھی آگرے میں نام پیدا کیا۔ وہ بالترتیب داروغۂ پولیس، ناظر، محکمۂ نمک کے سپرنٹنڈنٹ اور آخر میں کوتوالِ شہر رہے۔ سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہو کر غالب کے نانا میرزا غلام حسین خان کمیدان کی جاداد کے منصرم بن گئے۔ اُنھوں نے خود بھی خاصی بڑی جاداد پیدا کرلی تھی، جس سے وہ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ رائے بنسی دھر کے بیٹے آرام کے والد منشی نندلال بھی پہلے آگرہ منصفی میں ناظر رہے، پھر راجا جوتی پرشاد کی سرکار میں مختارِ عام مقرر ہوئے۔اُن کی وفات پر تفتہ نے مرثیہ لکھا تھا، جو اُن کے دیوان میں موجود ہے۔

منشی شیونرائن آگرے ہی میں ۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ بہت صغر سنی میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اُن کی پرورش اور تربیت زیادہ طور پر منشی کنھیالال کے ہاتھوں ہوئی جو اُن کے دادا رائے بنسی دھر کے چھوٹے بھائی تھے۔☆

آرام کی تعلیم بہت اچھے پیانے پر ہوئی۔ وہ ابتدائی مدارج طے کر کے ۱۸۴۷ء میں آگرہ کالج میں داخل ہوگئے۔ یہاں اُنھوں نے انگریزی اور فارسی کی تکمیل کی۔ انگریزی میں وہ مشہور انگریز اُردو لغت نویس س۔و۔فیلن صاحب کے شاگرد تھے۔ کالج

سے تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۵۶ء میں وہ اُسی جگہ ۳۵ روپے مشاہرے پر انگریزی کے مدرّس مقرر ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے میں انھوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ جہاں تک بن سکا، حکام کی مدد کرتے رہے، اِس کے صِلہ میں اُنھیں بعد میں دو مہینے کی تنخواہ بطورِ انعام عطا کی گئی تھی۔

۱۸۵۸ء میں وہ کالج کی نوکری ترک کر کے آبکاری کے محکمے میں ملازم ہوگئے۔ یہاں سے دل اکھڑا تو محکمۂ انکم ٹیکس میں پہنچے اور اِس کے بعد منصفی میں۔ دو ایک سال میں وہ سو روپیہ در ماہہ برچنگی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں اُنھوں نے بہت قابلِ تعریف کام کیا، جس سے محکمے کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا۔ اِسی تجربے کا نتیجہ تھا کہ بعد میں دھول پور اور قرولی کی ریاستوں نے بھی اُنھیں اپنے ہاں اس محکمے کی تنظیم کے لیے طلب کیا۔

لیکن ان کے اصلی جوہر آگرہ میونسپلٹی کی سکتری کے زمانے میں کھلے۔ یہاں اُنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کیا اور کمیٹی کا سارا انتظام ایسی مضبوط بنیادوں پر رکھ دیا کہ اس سے کمیٹی کی آمدنی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ اُسی زمانے میں رفاہِ عام کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لیا، جس سے شہر کے باشندے اُن کے شیدا ہوگئے۔ ۱۸۶۸ء اور پھر ۱۸۷۸ء کے قحط کے دنوں میں اُنھوں نے مختلف امدادی کام شروع کر کے لوگوں کے لیے روزی کا سامان مہیّا کیا اور اس طرح ہزاروں آدمیوں کو موت کے منھ سے بچا لیا۔ سکتّری کے زمانے کی نمایاں خدمات کا اعتراف حکومتِ وقت کی طرف سے بھی ہوا۔ اوّل ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار میں اُنھیں خلعت اور سندِ خوشنودی عطا ہوئی اور اِس کے بعد ۱۸۸۷ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی منائی گئی تو انھیں رائے بہادر کے خطاب اور دربار میں کرسی نشینی کے اعزاز سے نوازا گیا۔

رائے بہادر منشی شیونرائن کی ہر دل عزیزی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ وہ شہر بھر میں ''منشی جی'' کے نام سے مشہور تھے۔ کمھار اُن کے مٹی کے کھلونے بنا کے بیچتے تھے،

اور یہ ''منشی جی'' کے نام سے پکتے تھے۔

منشی شیونرائن کی علمی سرگرمیاں بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں۔ ۱۸۵۸ء میں جب وہ ابھی مشکل سے ملازمت میں داخل ہوئے ہی تھے، اُنھوں نے اپنے خرچ پر مفیدِ عام اسکول جاری کیا۔ وہ نہ صرف اِس کی مالی امداد ہی کرتے، بلکہ خود یہاں پڑھاتے بھی تھے۔ اُن کی نیک نیتی اور خلوص کی برکت کہ یہ مدرسہ آج تک جاری ہے اور اب اس میں ترقی ہو کر دسویں درجے تک تعلیم کا انتظام ہے۔ اُنھیں فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ فوٹوگرافی میں کامل دستگاہ تھی اور اِس سلسلے میں اُنھوں نے کئی نمایشوں میں انعام حاصل کیا۔ وہ اچھے نقشہ نویس بھی تھے۔ ہیئت اور نجوم میں بھی خاصا دخل تھا اور زائچہ بنانے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کی علمی سرگرمیوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ایک مطبع مفید خلائق کے نام سے قائم کیا۔ غالب کی دو کتابیں۔ دستنبو فارسی (۱۸۵۸ء) اور دیوانِ اُردو (۱۸۶۳ء) بھی اس مطبع سے شائع ہوئیں۔ دو پرچے بھی اِسی مطبع سے شائع ہوتے تھے ایک پندرہ روزہ گلدستہ ''معیار الشعرا'' اور دوسرا ماہانہ ''مفید خلائق'' ''معیار الشعرا'' کے مدیر مولوی محمدّ ابو الحسن (مدرس مدرسۂ عالیہ، آگرہ) تھے اور ''مفیدِ خلائق'' کی ادارت کے فرائض آرام کے ذمّے تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو ''مفیدِ خلائق'' کے ساتھ ہندی زبان کا ضمیمہ ''سروپ کارک'' کے عنوان سے چھپتا رہا۔ گل دستے کے لیے کبھی کبھی غالب بھی اپنا کلام بھیجتے رہے۔ اسی مطبع سے ۱۸۵۸ء میں ایک ماہانہ پرچہ ''رسالۂ بغاوتِ ہند'' کے عنوان سے شائع ہوتا رہا، اِس کے ایڈیٹر آرام کے دوست ڈاکٹر مکند لال تھے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی تحریک کے حالات قسط وار چھپتے رہے تھے۔

آرام کا کلام زیادہ دستیاب نہیں ہوا۔ ایک غزل کے علاوہ جو حسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گئی، صرف چند متفرق شعر ملے۔ یا تو زیادہ کہتے نہیں تھے، یا پھر اُسے مرتّب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی، اور جو کچھ کہا ضائع ہو گیا۔ اُنھوں نے ایک انگریزی کتاب (Four Messengers) کا ترجمہ ''قاصدانِ شاہی'' کے عنوان سے

مسٹر کین کی مدد سے کیا تھا، ۱۸۵۹ء میں چھپا تھا۔ اس کی زبان کی اصلاح غالب نے کی تھی۔ اسی زمانے میں اس کا ہندی ترجمہ بھی ''راج دوتوں کی کتھا'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اُردو کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ میرے پاس اِس کے پانچویں ایڈیشن (۱۸۹۲ء) کا نسخہ ہے۔ آرام ۱۸۹۸ء میں کمیٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے، دو سو ماہانہ پنشن مقرر ہوئی، لیکن اِس کے بعد وہ زیادہ جیے نہیں۔ ۱۸۹۶ء سے انھیں گردے میں پتھری کی شکایت تھی، یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا اور وہ یکشنبہ ۴ ستمبر ۱۸۹۸ء کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اپنی یادگار سات لڑکیاں اور دو لڑکے (بابو رگھوناتھ پرشاد اور بابو رام چند) چھوڑے۔ دونوں سرکاری ملازمت میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدوں تک پہنچے۔ ان کی اولاد آگرے میں موجود ہے۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں، تصوّف کی طرف میلان پایا جاتا ہے:

غضب ہے، مدّعی ہے جو، وہی پھر مدّعا ٹھہرے
جو اپنا دشمنِ دل ہو، وہی دل کی دوا ٹھہرے

نہ ٹھہرے نا اُمیدی اس کے، دل میں اور کیا ٹھہرے
کہ جس کا بعد مرنے کے حصولِ مدّعا ٹھہرے

یہ دنیا اک سرا ہے، آخر اس کو چھوڑ جانا ہے
اگر دو چار دن آکر یہاں ٹھہرے تو کیا ٹھہرے

کٹے ہیں سر بہت، تیغِ جفا سے بے گناہوں کے
عجب کیا ہے، اگر قاتل کا کوچہ کربلا ٹھہرے

جما نقشہ ترے عشاق کا اس خاکساری سے
ترے کوچے میں جو ٹھہرے مثالِ نقشِ پا ٹھہرے

اِدھر وہ آتے کو ہیں، اور اُدھر وقتِ سفر آیا
عجب مشکل، نہ وہ آئیں، نہ دم بھر کو قضا ٹھہرے

اُسی کو زندگی کا لطف ہے اِس دہرِ فانی میں
کہ جو نزدیک انھوں کے بھلا اور باخدا ٹھہرے
قیام اپنا ہو، اس محنت سرائے دہر میں کیوں کر
جہاں آفت ہی آفت ہو، وہاں آرام کیا ٹھہرے

☆

آرام، دل کا چین گیا، اب سکوں گیا
ہم تو بلا میں پھنس گئے، جب سے جنوں گیا

☆

اندازِ جلوہ سازیِ سینا ندیدہ ام
غش کردہ ام، فروغِ تجلی ندیدہ ام

☆

سوگوارِ دلِ مرحوم منم، اے آرام!
باعثِ گریہ چہ گویم، بہ چرا می نالم

☆

کسے از قلقلِ مینا نہ پرسد
چرا تو گریۂ مستانہ کردی

(شعر وسخن: ۱۵۔ ۱۶، ماتھر پتر کا (انگریزی) دسمبر ۱۹۲۵ء، نیز جنوری و فروری ۱۹۲۶ء خطباتِ گارساں دتاسی: ۲۷۶، ۳۰۶، ۴۶۹، خم خانۂ جاوید، ۱: ۱۷)

حواشی

☆۱۔ انھیں سے متعلق حالی نے یہ واقعہ ''یادگارِ غالب'' میں لکھا:

''منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنھیا لال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے، جو میرزا

صاحب کے ہم عصر تھے، ایک بار دلّی آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی، وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا، وہ اردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے وہ مثنوی میرزا کو لا کر دی اور وہ اُس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا:

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می کشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

لالہ صاحب کا بیان تھا کہ میرزا صاحب کی عمر جب کہ یہ مثنوی لکھی تھی، آٹھ نو برس کی تھی۔" (یادگارِ غالب: ۱۲۱)

آزر... نواب ذوالفقار علی خان دہلوی

نواب حیات علی کے بیٹے اور معتمد الدولہ نواب احمد علی خان خلف یعقوب علی خان کے پوتے تھے۔ آخر الذکر کے بھائی (شاہ ولی خان) احمد شاہ ابدالی کے وزیر تھے، اور وہ خود دلّی کے قلعہ دار تھے۔

شکر پر، واں زبان کٹتی ہے
شکوہ کرنے کی کیا مجال ہمیں

☆

ہوے ناخوش، تپاں دیکھا جو مجھ کو
خدنگِ غمزہ نے گویا خطا کی

☆

مرے ستانے نے کام اس سے اک جہاں کے لیے
جو میں نہ ہوں، تو نہ ہو گردش آسماں کے لیے

(تذکرۂ اہلِ دہلی: ۱۳۰، سخنِ شعرا: ۱۹، خم خانۂ جاوید، ۱: ۵۲)

آگاہ... نواب سیّد محمدؐ رضا دہلوی ملقّب بہ احمد مرزا خان

اِن کے والدامیر میرزا تھے، اور دادا نواب معظّم الدولہ محمد علی خان۔ اُن کے جدِّ اعلیٰ نواب روشن الدّولہ سیّد مظفر علی خان عہدِ محمدؐ شاہ میں بخشی تھے۔ آگاہ ۱۲۵۵ھ/ ۹۳ ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور ''غدر'' تک وہ بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے صاحب زادے خضر سلطان کے مصاحب رہے۔ ان کی دادی کو حکومت کی طرف سے ضلع میرٹھ میں دو گانو صدر پور اور رئیس پور جاگیر میں ملے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ جاگیر ضبط ہوگئی، ادھر خضر سلطان انگریز کی گولی کا نشانہ بنے۔ غرض کہ اب آگاہ کے لیے بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔

اب دلّی میں زندگی دشوار ہوگئی تھی۔ تلاشِ روزگار میں یہاں سے نکلے، تو جے پور پہنچے۔ ظہیر و انور پہلے سے آچکے تھے۔ ظہیر ان کے برادرِ نسبتی بھی تھے، یعنی آگاہ کی ہمشیر ظہیر کے حبالۂ عقد میں تھیں، انھوں نے بھی کچھ مدد کی۔ مہاراجا سوائی رام سنگھ نے آگاہ کا وظیفہ مقرر کردیا اور یوں زندگی قدرے آسان ہوگئی۔ جوہرِ قابل تھا، رفتہ رفتہ ان کا سکّہ بیٹھ گیا، امرا و عوام سب حلقوں میں مقبول ہوگئے۔

جمعہ قبلِ فجر ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۳۶ھ (۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء) جے پور ہی میں انتقال کیا۔ گھاٹ دروازے کے باہر کے قبرستان میں دفن ہوئے تھے، اب قبر کا نشان نہیں ملتا۔ (وفات، قاموس المشاہیر: ۱۹۱۱، ادبِ عزیز: ۱۹۱۶ء غلط)

آگاہ بڑے پُرگو تھے۔ اُن کے دو دیوان تھے، ایک غزلیات کا، دوسرا نعتیہ کلام کا۔ دونوں کے قلمی نسخے ان کے پرپوتے سیّد کرار میرزا، کرار نوری (کراچی) کے پاس تھے۔ نعتیہ دیوان ایک صاحب نے اُن سے لے کر امریکا پہنچا دیا۔ دیوانِ غزلیات ہنوز ان کی تحویل میں ہے، اور اُن کی عنایت سے مجھے اُسے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

یہ دیوان فل اسکیپ سائز کے ۲۸۵ صفحات کو محیط ہے۔ (درمیان سے چند صفحات ساقط ہو گئے ہیں) ایک صفحے پر ۱۹۔ ۲۰ شعر ہیں۔ اِس میں سے نعتیہ غزلیں قلم زد کردی گئی ہیں اور حاشیے میں لکھا ہے: ''دیوانِ نعت میں درج ہے''، لیکن ایسی غزلیں کم ہیں۔ پورے دیوان میں تقریباً ۵۵۰۰ اشعار ہوں گے۔ بعض زمینوں میں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ تک ہے، ایک جگہ چہار غزلہ بھی ہے۔ بہت سی غزلیں غالب کی زمینوں میں ہیں۔ دیوان لکھا ہوا تو کسی اور کا ہے، بلکہ ایک سے زیادہ شخصوں کے قلم سے ہے، لیکن کلام میں ردّوبدل اور اصلاحوں کا انداز بتاتا ہے کہ اسے آگاہ نے خود دیکھا ہے کیوں کہ اس طرح کی تبدیلیاں بلکہ شعروں کو حذف تک کر دینا کسی اور سے ممکن نہ تھا۔

یہ انتخاب اسی دیوان سے لیا گیا ہے چوں کہ مذاقِ سخن یکسر بدل گیا ہے۔ اب اس کے شائع ہونے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے۔ اسی لیے میں نے معتدبہ انتخاب شاملِ تذکرہ کرلیا ہے۔

اب کہاں آگاہ غالب سا شفیق
روئیے دل کھول کر اُستاد کو

☆

جو کہہ نہ سکے غیر، وہ میری ہے کہانی
جو آ نہ سکے لب پہ، وہ افسانہ ہے اس کا

☆

ہم تو ہلاکِ بادۂ الفت ہوئے مگر
تو بھی نہیں رہا دلِ ناشاد کام کا
ہنگامِ عرضِ حال یہاں عجز و انکسار
اک خامشی جواب وہاں ہر پیام کا

☆

رہ گئی واماندگی میں آبروے بے کسی
ہو گیا سایہ مجھے کافی تری دیوار کا

☆

حشر پر رکھیے نہ موقوف، تلافیِ جفا
یاں کب انصاف ہوا ہے کہ مرا واں ہوگا
خاکِ پائے اسد اللہ سے ہوں میں آگاہ
شیرِ قالیں بھی مرا، شیرِ نیستاں ہوگا

☆

مجھ تک بھی نوبت آئے گی، ہوتی ہے کچھ امید
اچھا ہوا، جو غیر سے وعدہ وفا ہوا

☆

گھر غیر کا ہو راہ میں، یہ بھی مری قسمت
لایا تو اسے کل، جذبِ محبت کا یہیں تھا
پوچھو نہ شبِ غم کے تم اندوہ کا عالم
ہر بار مرے لب پہ دمِ باز پسیں تھا

☆

اب غیر کے جو حال پہ ہے وعدہ فراموش
مجھ پر بھی وہ تھا لطف، پر اتنا تو نہیں تھا

☆

ہجر کے ہاتھوں کچھ ایسا زیست سے بیزار تھا
غیر کے بدلے بھی، کل مرنے پہ میں تیار تھا
حضرتِ دل! بزم میں وہ وعدہ کرتا اس طرح!
مصلحت سے غیر کی یہ بھی قریبِ یار تھا

☆

کیا جب عرضِ حال اپنا، تو بولے وہ خفا ہو کر
تمھاری تو ذرا سی بات کا دفتر نکل آیا

☆

بے وفا و بے مروّت سنگ دل، نا آشنا
جس کے یہ انداز ہوں، اے دل! وہ کس کا آشنا
کب وفا کرتے ہو وعدہ، یہ بھی تھی اک دل لگی
بن گئے جو تم مرے وقتِ تقاضا آشنا
آج بزمِ غیر میں ملتی نہیں کیوں مجھ سے آنکھ
بندہ پرور! آپ کا میں بھی کبھی تھا آشنا
یا الٰہی، کوئی برآئی نہ غم میں آرزو
یوں ہی اچھا ہے، رہے گر دل تمنا آشنا
اِس زمانے میں نہ دیکھا کوئی بھی آگاہ، صاف
جس کو دیکھا، اپنے مطلب کا ہی دیکھا آشنا

☆

اک تم کہ باز آئے جفا سے نہ ایک روز
اک ہم کہ آپ سے نہ کبھی داد کی طلب

☆

ہوں گے اچھے عدو، تو اپنے لیے
ہم بُرے ہی سہی، بھلا صاحب!

☆

گر "نہیں" ہے، تو سمجھ لے کہ یہاں جان نہیں
اور جینے کے لیے ایک تری "ہاں" ہے بہت
دل میں تو حشر کی ٹھوکر سے نہ ڈرنا آگاہ!
دست گیری کو مری شاہِ خراساں ہے بہت

☆

جب چھٹ گیا وہ کوچہ، تو پھر کیا جہاں کی قید
یہ پوچھنا ہی دل سے کہ جاؤں کہاں عبث
مخفی رہے گا بوالہوس و شیفتہ کا حال
دشمن سے پہلے آج مرا امتحاں عبث

☆

ڈرتا ہوں اس خوشی میں کہیں دم نکل نہ جائے
پھر ان کو التفات ہے اور کس قدر ہے آج

☆

ان بتانِ ہند سے، اللہ ہر اک کو بچائے
طرفہ کرتے ہیں ستم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ
گاہ دیتے ہیں یہ بوسہ ڈال کر گردن میں ہاتھ
گاہ لیتے ہیں قسم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ
گاہ کہتے ہیں خدا الفت کی آفت سے بچائے
ہوگئے پابندِ غم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ
گاہ دکھاتے ہیں یہ عاشق کو برائے دل کشی
جلوۂ رقص و نغم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ بھر کر سانس ٹھنڈا کہتے ہیں یہ کیا ہوا
پھنس گئے آفت میں ہم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ اس اندازِ الفت سے یہ دیتے ہیں فریب
آپ پر مرتے ہیں ہم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ کرتے ہیں گریز ایسے کہ خالق کی پناہ
گاہ جاتے ہیں یہ تھم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ روتے ہیں یہ ہنگامِ سحر وقتِ وداع
چلتے ہیں ایک اک قدم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ ان کے جی میں آجائے، تو شامِ وصل سے
ناک میں کرتے ہیں دم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ کرتے ہیں تنفّر بادہ و مینا سے یہ
اور کبھی ہم بزمِ جم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ اپنی ہر ادا سے کرتے ہیں عاشق کو رام
اور کبھی کرتے ہیں دم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

الغرض دیکھو ہمیں، آگاہ! ہم کیا چیز ہیں
دیتے ہیں ایسوں کو دم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

☆

ناکام ایک ہم ہی رہے، ورنہ بزم میں
تھے لطف بار بار نہ کس کس کے حال پر

☆

ہجر میں موت بھی نہیں آتی
اور نہ ان پر ہے اختیار افسوس

پھر کسی بے وفا کے کوچے میں
ہو کے جاتے ہیں بے قرار افسوس

☆

پیشِ دشمن چاہتے ہیں وہ خطاؤں کا ثبوت
پوچھتے یوں ہیں کہ گویا میں کہوں: ہاں ہوگئیں
جو نگاہیں اٹھ نہ سکتی تھیں خدایا! شرم سے
بے حجابانہ وہ کیوں کر دل میں پنہاں ہوگئیں
ہم نہ کرتے عشق پر آگاہ، اس کو کیا کریں
وہ ادائیں دل فریبِ جان و ایماں ہوگئیں

☆

دور تر کچھ رہِ الفت سے نہیں راہِ عدم
منزلِ عشق کے دوچار قدم ہوتے ہیں
بے خودی کا تو بھلا ذکر ہی کیا ہے، اے دوست!
تم ہی تم ہوتے ہو آپے میں جو ہم ہوتے ہیں

☆

شکر ہے لگ گئی ٹھکانے سے
ہم ہوے خاک کوئے جاناں میں
کس کی توبہ، کہاں کا زہد، آگاہ!
آؤ چل بیٹھو، بزمِ رنداں میں

☆

ہیں جرعہ خوارِ ساغر صہبائے حق پسند
بے خود سدا ہیں بندگیِ بوتراب میں
پہلے فنا سے ہو کے فنا، دیکھ اپنا رنگ
کیا کچھ نہیں ہے قطرہ و موج و حباب میں

دی ہو خدا نے آنکھ جو بینا، تو دیکھ لے
حیرت بھری ہوئی ہے نگاہِ حباب میں
آگاہ! کب چھٹا درِ شاہنشہِ نجف
جنّت ہمیں ملی قدمِ بوتراب میں

☆

غیر اُس انجمنِ ناز سے ٹلتا ہی نہیں
یہ بھی کیا دم ہے ہمارا کہ نکلتا ہی نہیں
ایک ہم ہیں کہ گھلے جاتے ہیں یوں شمع صفت
اور اک دل ہے تمھارا کہ پگھلتا ہی نہیں
دیکھ کر ضبط مرا، کل یہ کہا ساقی نے
ہے عجب طرح کا انساں کہ ابلتا ہی نہیں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ نہ آؤ گے کبھی
دم کچھ ارماں تو نہیں ہے کہ نکلتا ہی نہیں

☆

مرتا بنِ آئی کیوں کہ ہے کوئی، یہ نکلا منھ سے تھا
ابرو کے اک اشارے سے اس نے کہا کہ یوں
ابرِ سیہ سے ماہ کا پوچھے نکلنا گر کوئی
زلف کو اپنے چہرے پر ڈال کے پھر بتا کہ یوں

☆

ہر ادا میں ہے نہاں جور کرشمہ میں ستم
ایسے دیکھے ہی نہیں بے سبب آزار کہیں
جب کھلے دردِ محبت کی حقیقت، ظالم!
کاش ہو میری طرح تو بھی گرفتار کہیں

☆

شیخ جی! سوچتے کیا ہو کہ پیے جامِ شراب
رہنِ مے جبّہ و دستار کروں یا نہ کروں

☆

جب نہیں اُس میں کچھ وفا، ایسے سے دل لگائے کیوں
آپ سے آپ آدمی موت کے منہ میں جائے کیوں؟
جب نہیں تم میں کچھ وفا، کس کو ہے پاس وضع کا
دل کو ہے کیا غرض پڑی، صدمۂ غم اٹھائے کیوں؟
اُن سے ہے کیا بگڑ گئی! مجھ کو بتاؤ تو سہی
آگہِ خستہ! آج تم کرتے ہو ہائے ہائے کیوں؟

☆

کی ہے یاں ترکِ وفا کس نے، جو یوں کہتے ہو
''دل میں جس کے نہ ہو الفت، وہ بشر کچھ بھی نہیں''
دارِ فانی نفسِ چند کا اک وقفہ ہے
غافل! اس کو نہ سمجھ گھر کہ یہ گھر کچھ بھی نہیں
کردیا خاک تپِ ہجر نے، کیا دیکھتے ہو!
اب تو اس راکھ میں آتش نہ شرر کچھ بھی نہیں
تھا مگر خواب ایک افسانۂ الفت، اے دل!
کہ تصوّر کے سوا شام و سحر کچھ بھی نہیں
اس طرح پوچھتے ہیں حال وہ دل کا، گویا
مجھ کو معلوم ہے، اور ان کو خبر کچھ بھی نہیں
داغِ دل، دردِ جگر، نالۂ پیہم، غمِ یار
اب بھی سب کچھ ہے مرے پاس، اگر کچھ بھی نہیں

ہے کہاں ہستیِ موہوم کو آگاہ! ثبات
تم تو کہتے تھے، بہت کچھ ہے، مگر کچھ بھی نہیں

☆

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے فرحت دل میں
ہنس کے کہتے ہیں، اسے رنج والم کچھ بھی نہیں

☆

جگر میں آبلہ، ناسور دل میں، سینے میں زخم
کرشمے سب یہ تمھاری نگاہِ ناز کے ہیں
کبھی خفا، کبھی راضی، کبھی خوشی، کبھی چپکے
نئے نئے ترے انداز اب تو ناز کے ہیں

☆

وہ اب آئے، وہ اب آتے ہیں، شبِ ہجر میں ہم
دل کو اس طرح سے تسکین دیا کرتے ہیں

☆

تھا کبھی جلوہ دہِ بزمِ ملائک اور اب
گلشنِ دہر کے شامل خس و خاشاک میں ہوں
آرزوئے دلِ ناکام بر آئے کیوں کر!
واں تو اقرار میں انکار ہے اور ہاں میں نہیں

☆

تھیں ظلمتیں فراق سے پہلے کہاں نصیب
یہ تیرہ روزیاں مرے بختِ سیاہ کو

☆

دیتی پتا کہیں کا یہ چشمِ شرگیں ہے
وہ آگیا پسینہ، پونچھو ذرا جبیں کو

☆

ہو جائے اُن سے صلح، تو جی میں ہے ہم نشیں!
اب اس زمین پہ رہیے جہاں آسماں نہ ہو
بیکار وہ ادا ہے، نہ ہو جس میں دل کشی
بے لطف ہے وہ غمزہ اگر جانستاں نہ ہو
آئینۂ صفات سے پیدا ہو عکسِ ذات
گر دل میں رنگِ کش مکش این و آں نہ ہو

☆

پھر دل لگی ہے اس بتِ نامہرباں کے ساتھ
پھر دشمنی سی ہوگئی اپنی جہاں کے ساتھ
آگاہ! ترکِ عشق ہی جب کر چکے، تو پھر
کیوں مہربانیاں بتِ نامہرباں کے ساتھ

☆

کیا فرق کریں قہر و ترحّم میں جب اُن کی
دم بھر میں نظر کچھ ہے، تو دم بھر میں نظر کچھ

☆

عدو کے قتل نے کیسے مٹا دیے دل سے
وہ ولولے کہ جو تھے اپنے امتحاں کے لیے

☆

قابو میں نہ پایا اُسے جس دل پہ نظر کی
تاثیر یہ دیکھی نگہِ سحر اثر کی

جینے سے سروکار، نہ مرنے سے تعلّق
کچھ عمر عجب طرح سے فرقت میں بسر کی
بے مہر فلک کا نہ کرو شکوہ تم آگاہ!
مر مر کے ہوئی شام، تو رو رو کے سحر کی
پوچھو نہ کچھ ایامِ جدائی کی حقیقت
گنتی میں سمجھتا ہے تمھیں اہلِ ہنر کی

☆

نہ گزری لطف سے گر ایک دم بھی حضرتِ خضر!
تو کہیے، خاک، مزا عمرِ جاوداں کا ہے
جوابِ نامہ کی امید نے کیا ہے یہ محو
ہر آدمی کو سمجھتا ہوں، یہ وہاں کا ہے

(خم خانۂ جاوید، ا: ۱۰۹، ۱۱۰، گلستانِ سخن، ۱۲۷، بزمِ سخن: ۸-۹، یادگارِ ضیغم: ۳۸۵، قاموس المشاہیر، ا: ۱۱، تذکرہ شعرائے جے پور: ۵۵۔ ۵۸، خطوطِ کرار نوری، کراچی، ادبِ عزیز: ۲۸۰، ۳۶۳)

باقر... شاہ باقر علی بہاری

ضلع گیا (بہار) میں پیربگہ ایک مختصر سا قصبہ ہے۔ باقر یہاں کے ایک مشہور خاندان مشائخین کے چشم و چراغ تھے۔ والد کی طرف سے سلسلۂ نسب حضرت مخدوم العارفین جلال الدین محمدؒ کبیر الاوَلیا گازرونی پانی پتی کے واسطے سے حضرت رکن الدین عبدالرحمٰن الکبیر مدنی تک اور والدہ کی طرف سے حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادرؒ جیلانی تک پہنچتا ہے۔

اُن کے مورثِ اعلیٰ خواجہ رکن الدین عبدالرحمٰن الکبیر، خلیفہ منصور عباسی (۱۳۶-۱۵۸ھ) کے زمانے میں حکومت کی سخت گیری کے باعث مدینہ منورہ سے نقلِ مکان کر کے گازرون (فارس) چلے آئے تھے۔ بعد کو اُن کے اخلاف یہاں سے سرخس منتقل ہوگئے۔ اِس خاندان کے جو بزرگ سب سے پہلے ہندوستان آئے، ان کا نام خواجہ شہاب الدین عبدالرحمٰن ثانی تھا۔ وہ غالباً سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ ۴۰۳ھ (۱۰۱۲ء) میں یہاں آئے۔سلطان نے اُنھیں پانی پت کی حکومت اور قضات سپرد کی۔ وہ عمر بھر یہیں رہے اور یہیں دفن ہوئے۔ ان کی دسویں پشت میں حضرت جلال الدین محمدؒ کبیر الاولیا ہوئے، جو اپنے زمانے کے مشہور ولی اللہ گزرے ہیں۔ ان کی تیسری پشت میں حضرت مخدوم شاہ داوٗد طلبِ علم کی غرض سے نکلے اور صوبۂ بہار میں، جو اُس وقت علم و فضل کا مرکز تھا، پہنچے۔ اِس طرح اس خاندان کی ایک شاخ پانی پت سے بہار منتقل ہوگئی۔

جناب باقر کے والد بزرگوار حضرت شاہ وارث علی اُنھیں اسلاف کے نام لیوا

تھے۔ ان تک کسی نے ملازمت کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا، صرف عبادت و ریاضت اور درس و تدریس اُن کا معمول رہا۔ سب سے پہلے جس نے اس خاندان میں ملازمت کا پیشہ اختیار کیا، وہ شاہ وارث علی ہی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی حکمتِ عملی کے تحت چاہتی تھی کہ یہاں کے معزز- اور صاحب اثر اور باوقار لوگ اُس کی ملازمت میں شامل ہو جائیں، تاکہ عوام میں اس کی ساکھ قائم ہو جائے۔ چنانچہ بعض مجبوریوں کے باعث شاہ وارث علی بھی سر رشتۂ عدالت میں منسلک ہوگئے۔ اُن کی ملازمت کا سارا زمانہ آرہ میں گزرا، بیس برس یہاں رہے۔ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے، تو اپنے وطن پیر بگہ چلے آئے اور یہیں ۲ دسمبر ۱۸۳۳ء (۱۹ رجب ۱۲۴۹ھ) کو واصلِ حق ہوئے۔

حضرت شاہ وارث علی کی اولاد میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں بڑے شاہ حسین علی تھے اور چھوٹے ہمارے صاحبِ ترجمہ شاہ باقر علی۔

باقر ۱۹ جون ۱۸۳۱ء (۸ محرم ۱۲۴۷ھ) کو بروز یکشنبہ پیدا ہوئے۔ یہ اپنے والد کی سب سے چھوٹی اولاد اور اُن کی وفات کے وقت صرف ڈھائی برس کے تھے، چنانچہ اُن کی تعلیم و تربیت اُن کی والدہ نے کی۔ سب سے پہلے قرآنِ کریم حفظ کرایا۔ پھر گھر ہی پر ایک استاد سے فارسی کی تکمیل کرائی۔ اِس کے بعد عربی پڑھنا شروع کی تھی، کہ یہ سلسلہ رک گیا اور ایک زمانے تک اُنھیں دوبارہ اس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ یہ اُنھوں نے بہت مدت بعد مولانا مہدی حسن سے پڑھی۔ اس دوران میں اُنھوں نے لکڑی، پٹہ، گتکہ وغیرہ کے فن خلیفہ مداری اور میر یار محمدؒ سے حاصل کیے۔ پھر تیر اندازی، شمشیرزنی، نیزہ بازی، شہسواری، بانک، بنوٹ، میر کریم اللہ سے سیکھے اور کافی بڑی عمر میں اپنی ملازمت کے زمانے میں ایک شخص امراؤ خان بھوپالی سے بندوق چلانا اور نشانہ لگانا سیکھا۔ غرض کہ جملہ فنونِ سپہ گری، اور مردانہ کھیلوں میں طاق تھے۔

باقر بھی اپنے والد اور بڑے بھائی کی طرح انگریزی حکومت کے ملازم رہے۔ ۱۸۵۹ء میں ان کی سب سے پہلی تقرری سر رشتۂ افیون میں گماشتے کی حیثیت

سے آرہ میں ہوئی۔ یہاں سے ۱۹ برس کے قیام کے بعد ۱۸۷۸ء میں بڑہروا (ضلع موتی ہاری) تبادلہ ہوا۔ پھر ۱۸۸۲ء میں پٹنہ آئے اور یہیں سے ۱۸۸۹ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ اس کے بعد مستقل سکونت آرہ میں اختیار کرلی۔

ملازمت سے پنشن پا لینے کے بعد اُن کی تن درستی خراب رہنے لگی۔ معدے نے کہ ام الامراض ہے، بہت تکلیف دینا شروع کی۔ کبھی شدید قبض ہو جاتا اور کبھی شدید اسہال۔ غرض صحت روز بروز کم زور ہونے لگی۔ وہ ایک خانوادۂ تصوف کے چشم و چراغ اور خود صاحب حال بزرگ تھے۔ عقائد کے لحاظ سے سنی حنفی اور حضرت شاہ قیام اصدق (متوفی ۲۱ رمضان ۱۳۰۱ھ / ۱۵ جولائی ۱۸۸۴ء) سے طریقۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت اور خود اُن کے خلیفہ اور صاحب اجازت تھے۔ اس لیے اوراد و وظائف اور ریاضت کا معمول بیماری کے ایام میں بھی نہیں چھوٹا۔ وفات سے ایک دن پہلے یک بہ یک فرمایا کہ مجھے ایک ضروری کام سے گیا جانا ہے۔ چنانچہ بستر وغیرہ بندھوایا، اور گاڑی سے گیا پہنچ گئے۔ اگلے دن اسہال شروع ہوگئے۔ طبیعت پہلے ہی سے نڈھال تھی، رہی سہی کسر اسہال نے پوری کردی۔ طاقت بالکل زائل ہوگئی۔ اسی حالت میں شبِ جمعہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء (۲۴ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ) کو وفات پائی۔ جنازہ پیر بگہ لایا گیا اور یہاں اپنے خاندانی قبرستان میں اپنی والدہ کی قبر کے متصل دفن کیے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

باقر نے تین نکاح کیے۔ پہلی شادی کے وقت اُن کی عمر صرف ۱۷ برس کی تھی۔ یہ بیوی بہت جلد فوت ہوگئیں، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا نکاح دو ڈھائی سال بعد اسی مرحومہ کی چھوٹی بہن سے ہوا۔ اُن سے دو لڑکیاں باقر کے بعد زندہ رہیں۔ تیسرا نکاح شیخ امیر اللہ صدیقی کی صاحب زادی سے ہوا۔ یہ بزرگ بہرائچ کے رہنے والے اور راجا صاحب نانپارہ کے وہاں ملازم تھے۔ اس نکاح سے باقر کے تین بیٹے اور ایک بیٹی اُن کی وفات کے وقت موجود تھے۔ سب سے بڑے جناب عطا حسین جنھوں نے اُن کا دیوان مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ پہلے حکومتِ ہند

کے محکمۂ ریلوے میں ملازم ہوئے اور بعد کو حیدرآباد دکن چلے گئے۔ دوسرے فرزند خان بہادر مولوی عبدالصمد صاحب ڈپٹی کلکٹر اور تیسرے ڈاکٹر عبدالکریم بھی گورنمنٹ میں ملازم رہے۔

باقر نے قاطع بُرہان کے معرکے میں بھی حصہ لیا تھا۔ غالب نے مؤیّد بُرہان کی تصنیف پر ایک قطعہ لکھا تھا (انشا کردہ است۔ غوغا کردہ است) جس پر یہ شعری مباحثہ شروع ہوگیا۔ اس موقعے پر باقر نے دو قطعے عبدالصمد فدا سلہٹی (شاگرد مولوی احمد علی احمد جہانگیرنگری) کے جواب میں اور ایک منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی (شاگرد ناطق مکرانی) کے جواب میں لکھے تھے۔ آغا علی شمس نے ایک مضمون اُردو نثر میں لکھا تھا، جس میں غالب کے کلام پر اعتراض کیے تھے۔ باقر نے اس کا جواب فارسی نثر میں دیا۔ باقر کے یہ منظومات اور مضمون ہنگامۂ دل آشوب میں شامل ہیں اور وہیں سے دیوانِ باقر میں بھی نقل کیے گئے ہیں۔

باقر نے شاعری گویا ورثے میں پائی تھی۔ ان کے والد شاہ وارث علی بھی شاعر تھے۔ اشکی تخلص تھا، اُنھوں نے اپنے کلام پر اصلاح شیخ محمدؔ وجیہہ الدین عشقی (خلف شیخ غلام حسین مجرم عظیم آبادی) سے لی تھی۔ عشقی اپنے وقت کے استاد تھے۔ گارساں دتاسی کا تذکرہ بہت حد تک عشقی کے تذکرے سے ماخوذ ہے۔

خان بہادر سیّد علی محمدؔ شاد کے استاد شاہ الفت حسین فریاد، اُن ہی اشکی کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔☆

باقر اُردو میں کم اور زیادہ فارسی میں کہتے تھے۔

اُنھوں نے غالب سے اپنے تلمّذ اور اُن سے اپنی عقیدت کا اظہار بارہا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہمچو غالب درجہاں یک نکتہ سنجے برنخاست
من فدائے لطفِ او، باقر کہ اُستادِ من است

ہست فیضِ نظرِ حضرتِ غالب، باقر
شورِ نظمِ تو کہ در ملک و جہان افتاد است

ہنگامۂ دل آشوب، کے قطعے میں لکھتے ہیں:

باقر از شکرانہ ایں، کے تواں آمد بروں
کہ مرا تلمیذِ غالب حق تعالیٰ کردہ است

پھر یہی نہیں، غالب کی وفات کے بعد بھی اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے: کہتے ہیں:

باقر! برخیز و برخواں پیش او، از گفتہ ات
از پئے اصلاح، روحِ غالب استاد آمدہ

۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ھ) کی ایک غزل کا مقطع ہے:

کجا شد غالب شیریں نوا، باقر کہ آہ اکنوں
صدازاں طوطیِ ہندِ خوش الحانم نمی آید

نمونۂ کلام یہ ہے:

اے جان و دلم سوختہ آزارِ محبت
جاناں چہ کنم، پیشِ تو اظہارِ محبت
آغوشِ من و شاہدِ صد گونہ تمنا
بالینِ من و سایۂ دیوارِ محبت
اے باقرِ دل خستہ! چنیں حال تو چونست!
شاید کہ دلت گشتہ گرفتارِ محبت

☆

بگفتمش، کہ مبر نام و ننگِ من، فرمود
برو، برو کہ نخواہیم نام و ننگ ترا

☆

ذرۂ دردے طلب، تا محرمِ رازے شوی
حاصلِ ایں زہدِ تو، زاہد! ثوابے بیش نیست

☆

اے سنگدل! یکے نشنیدی و مدّتے
باقر برآستانِ تو فریاد کرد و رفت

☆

توانم داشتن درسینہ رازِ عشق را پنہاں
چہ سازم، ضبطِ عشق از چشمِ گریانم نمی آید
زدستِ وحشتِ دل نیست یک روزے نصیبِ من
کہ صد چاک از گریباں تا بدامانم نمی آید
چہ می پرسی ز احوالم، چہ گویم باتو، اے ظالم!
چہا جورے، کہ ازدستِ تو برجانم نمی آید
کجاشد غالبِ شیریں نوا، باقر کہ آہ اکنوں
صدا زاں طوطیِ ہندِ خوش الحانم نمی آید

☆

ایں قدر جور و جفا، بردلِ رنجور مکن
ہر چہ خواہی بکن، از پیشِ خودم دور مکن

☆

ہوشم بربود آں صنمِ جلوہ طرازے
جا دو روشے، ماہ وشے، مایۂ نازے
جاے کہ تو باشی و منِ خستہ جگر ہم
سر سبز شود گلشنِ رازے و نیازے

کوتاہ کنم دامن صحراے طلب را
گردست دہد سلسلۂ زلف درازے

☆

شکلِ تصویر ہو خاموش، تماشا کیا ہے!
بیٹھے بیٹھے کھچے جاتے ہو، یہ نقشا کیا ہے!

☆

تمھاری دید کی حسرت میں دیکھو جان جائے گی
کھلی رہ جائیں گی آنکھیں، نکل جائے گا دم اپنا
کلیجہ تھامے ہاتھوں سے، مرے گھر روز آؤ گے
کسی دن تو اثر دکھلائے گا اندوہ و غم اپنا

(مقدمۂ دیوانِ باقر، تاریخِ شعرائے بہار، ص ۶۵،۸۷، حیاتِ فریاد، ۱۵۵۔۱۶۸، نگار (اپریل ۱۹۵۳ء)، ص ۴۱۔۴۲، ہنگامۂ دل آشوب، مسلم شعرائے بہار، ۱: ۷۱، دودِ چراغ محفل: ۱۴۱۔۱۹۴)

حواشی

☆۔ سید علی محمد شاد عظیم آبادی نے ''حیاتِ فریاد'' میں لکھا ہے کہ اشکی دلّی گئے تھے اور وہاں انھوں نے خواجہ میر درد کی شاگردی [illegible] کی۔ یہ بے اصل ہے، درد نے ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) میں انتقال کیا۔

بدری داس... پنڈت

''پنڈت بدری داس ڈاک منشی، کرنال با آں کہ مجھ سے اُس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، مگر میں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام میرے پاس اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے کے میں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا کرو۔''

[خطِ غالب بنام تفتہ، اردوے معلی: ۶۸]

بسمل... منشی شاکر علی
(غلام بسم اللہ) میرٹھی ثم بریلوی

اِن کے والد میر منشی سرفراز علی بانس بریلی کے رہنے والے، قوم کے کمبوہ، کمسٹریٹ میں سر رشتہ دار تھے۔ دراصل اِس خاندان کا مسقط الراس مارہرہ تھا۔ اور یہ اسی خاندانِ کمبوہ کے چشم و چراغ تھے، جس کے ایک فرد چودھری عبدالغفور سُرور (تلمیذِ غالب) بھی تھے۔ یہ بسلسلۂ ملازمت باہر رہے اور پھر اِنھوں نے بریلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالب کے پہلے مجموعۂ خطوطِ اُردو ''عودِ ہندی'' کے ناشر منشی ممتاز علی میرٹھی منشی سرفراز علی کے بیٹے تھے۔ وہ بسمل کے علاّتی بھائی تھے، یعنی سرفراز علی کی ایک بیوی سے ممتاز علی تھے، دوسری سے بسمل۔

بسمل میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ شاکر علی اصلی نام تھا۔ غلام بسم اللہ تاریخی نام ہے (۱۲۳۹ھ)۔ اُن کی تعلیم بیش تر مارہرہ اور بریلی میں ہوئی۔ عربی بعد کو مفتی محمدؐ سلطان حسن خان سلطان صدرالصدور (تلمیذِ غالب) سے حاصل کی، جب وہ میرٹھ میں منصف تھے۔ مدّتوں مظفرنگر اور میرٹھ میں ناظرِ عدالت رہے۔ اس لیے عام طور پر دوستوں میں ناظر صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ غالب نے اُنھیں ''سکترِ شاعراں'' کا خطاب دے رکھا تھا۔

مذہب سے بہت دلچسپی تھی۔ دو مرتبہ حج کیا۔ حضرت شاہ عبدالرحمٰن شاہجہانپوری

سے بیعت تھے۔ اسی لیے آخر میں نعت گوئی سے زیادہ شغف ہو گیا۔ ان کا رسالہ ''نالۂ بسمل''☆[1] چھپ چکا ہے۔ (۱۸۹۶ء) جس میں موذنِ رسول، حضرت بلال کا قصہ مسدس کی شکل میں لکھا ہے۔ اس کے آخر میں ایک نعتیہ قصیدہ اور قدسی کی مشہور نعت کی تضمین بھی شامل ہے۔

پنشن لینے کے بعد بریلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہیں زیرِ جامع مسجد آج بھی ان کے خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔ ۱۸۹۸ء (۱۳۱۵ھ) میں وفات پائی۔ محو بریلوی نے تاریخ کہی ''اِنّ العاقبت للمتقین''۔ اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

غالب کی تقلید کا بہت شوق تھا اور اُن کی طرحوں میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ غالب کی ایک زمین میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

شب وفورِ اشک سے گردوں کفِ سیلاب تھا
دورۂ چشمِ کواکب، حلقۂ گرداب تھا
واں حنا بندی، عناں گیرِ خرامِ ناز تھی
یاں تنِ کاہیدہ، غرقِ اشکِ خونِ ناب تھا
واں رُخِ پُرنور تھا، صبحِ امیدِ زندگی
یاں ہر اک داغِ جگر، خورشیدِ عالم تاب تھا
حسنِ تمکیں آزما کو، پاسِ خودداری اُدھر
خانہ زادِ عشق کو، ملحوظ یاں آداب تھا
اُن کو پاسِ ننگ دامن گیر، مجھ کو پاسِ وضع
وہ اُدھر بے تاب تھے اور میں اِدھر بے تاب تھا
میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر
بسترِ سنجاب تھا، نے بالشِ کم خواب تھا

[یادگارِ ضیغم: ۶۸، خم خانۂ جاوید، ا: ۵۹۰۔ ۵۹۱، غالب اور عصرِ غالب: ۲۳۱،۲۳۲، ہماری زبان (۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء) ص ۹]

حواشی

☆ا۔ نالۂ بسمل سے متعلق خود بسمل نے غالب کا ایک لطیفہ بیان کیا ہے، جو لطف سے خالی نہیں۔ چوں کہ لوگ عام طور پر اسے نہیں جانتے، اس لیے اسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

بسمل نے "نالۂ بسمل" اصلاح کی غرض سے غالب کے پاس بھیجا۔ بسمل صاحب خوش خط نہیں تھے، اور یوں بھی اُس زمانے میں یاے معروف و مجہول میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بسمل نے ایک جگہ "بندے" کو بندی لکھا۔ مصرع یہ تھا:

بندی کو مولا نے کیا سرفراز

میرزا نے املا کی تصحیح کر کے "بندے" کر دیا اور لکھا کہ "عیاذاً باللہ"، آپ کا یہ عقیدہ ہے؟" (غالب اور عصر غالب (از ڈاکٹر محمد ایوب قادری): ۲۳۳)

بیتاب... صاحب زادہ عبّاس علی خان رامپوری

رام پور کے حکمران خاندان کے فرد تھے۔ اُن کے والد نواب محمد عبدالعلی خان بہادر، نواب فردوس مکان محمد یوسف علی خان بہادر کے حقیقی چچا تھے۔

چوں کہ انتخابِ یادگار کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۶۶ برس کی بتائی گئی ہے، اس لیے تقریباً ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء۔۱۸۱۰ء) میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ۱۸۳۷ء تک دہلی میں مقیم رہے، پھر لکھنؤ چلے گئے۔ اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ کلام پر حکیم مومن خان مومن دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کی وفات (۱۸۵۲ء) کے بعد کسی سے مشورہ نہیں کیا لیکن غالب کے دوسرے سفرِ رام پور (۱۸۶۵ء) کے بعد اُن کے شاگرد ہوگئے۔ اپنا دیوان بھی اُن کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیج دیا، اور اُن کی وفات تک خط و کتابت کے ذریعے مشورہ بھی کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد رام پور میں حاکمِ صدر بنائے گئے تھے، فروری ۱۸۸۳ء تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔ ۶ جون ۱۸۸۳ء (مطابق ۲۹ رجب ۱۳۰۰ھ) کو ظہر کے وقت فوت ہوئے۔ دیوان ''گلدستۂ باغِ جناں'' کے عنوان سے شعبان ۱۳۰۱ھ میں چھپا تھا۔ گلزارِ عشق اور بہارِ عشق دو قصے بھی لکھے تھے، جو طبع نہیں ہوئے، ان کے قلمی نسخے رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہیں۔

اُن کے چھوٹے بھائی صاحب زادہ محمد عنایت علی خان بھی فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور عنایت تخلص کرتے تھے۔ بقولِ شیفتہ و کریم الدین فارسی کلام صہبائی کو اور اُردو میر حسن تسکین (شاگرد نصیر و مومن) کو دکھلاتے تھے۔ لیکن

امیر مینائی کہتے ہیں کہ مومن سے مشورہ تھا۔ یہ ۱۴ اگست ۱۸۴۸ء (۱۴ رمضان ۱۲۶۴ھ) کو زہر خورانی سے دہلی میں فوت ہوئے۔ درگاہِ حضرت خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہیں۔

بیتاب کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ہر بات میں برہم کوئی اتنا نہیں ہوتا
آپس میں، ذرا سمجھو تو، کیا کیا نہیں ہوتا!
یوں، کون ستاتا ہے مری جان کسی کو
خوبی پہ جسے اپنی بھروسا نہیں ہوتا
کچھ بن گئی ہے ایسی ہی دم پر مرے، ورنہ
مرنا تو کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا

☆

کروں اللہ سے فریاد، تمھارا ہو کر
تمھیں منصف ہو کہ پھر میں رہوں کس کا ہو کر
خیر گزری، کہ ذرا چونک کے پھر لگ گئی آنکھ
رہ گیا یوں ہی سا کچھ حشر کا غوغا ہو کر

☆

دوستی اپنی، خدا کے لیے، تہ کر رکھیے
نہیں بھاتا ہے مجھے، ناصحو! اتنا اخلاص

☆

بیتاب! دردِ عشق کہاں، اور ہم کہاں
بیٹھے بٹھائے ٹوٹ پڑا، ناگہاں فلک

☆

اِن بے وفائیوں کا دکھاتا ذرا مزہ
ہوتا ذرا بھی دل، جو مرے اختیار میں

☆

بیتاب کا بھی رندو! معلوم ہے پتا کچھ
ہم اُس کو دیکھتے تھے، اکثر اِس انجمن میں

☆

پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ نکالی، خدا سے ڈر
ظالم! ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں

☆

کون کہتا ہے کہ یاں آنے کا دستور نہیں
بات تو یہ ہے کہ ملنا اُنھیں منظور نہیں

☆

یا بند ناصحوں کی زباں کردے، اے خدا!
یا مجھ کو دے یہ صبر، کہ بیٹھا سنا کروں
بہرِ خدا بتا تو دے اتنا بھی، ناصحا!
اُس کو کروں نہ یاد، تو پھر کیا کیا کروں!

☆

ہزار صبر کرو، لاکھ بے قرار نہ ہو
نہیں وہ چیز محبت کہ آشکار نہ ہو

☆

ہمیں کرنا تھا جو، وہ کر بیٹھے
آپ باتیں بنائیں، گھر بیٹھے

☆

وفا دار، ناصح! مبارک تمھیں
ہمیں تو وہی بے وفا چاہیے
مقابل میں تیرے تو، اے پند گو!
تجھی سا کوئی بے وفا چاہیے

بجا ہیں تمھارے سب ارشاد پر
ذرا اور کی بھی سنا چاہیے

☆

زباں سے نام اُس کا دم بدم ناصح لواتا ہے
خدا کے واسطے چپ رہ، کلیجہ منھ کو آتا ہے

☆

گو صبر ہے عُشاق کا شیوہ، پہ ستم گر!
جب جی ہی پہ بن جائے تو پھر کیا نہیں کرتے
بیتاب! یہ کیا قہر ہے، او جان کے دُشمن!
ہر بات پہ یوں پھوٹ کے رویا نہیں کرتے

☆

پاس رکھنے کا جو بیتاب! کریں وہ دعویٰ
صحبتِ غیر بھی، ناچار گوارا ہو جائے

☆

کیا کہے جاتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر بتاؤ
آپ عقبیٰ میں تو ناصح رہے کام آنے سے
مل گیا راہ میں بت خانہ بھلے سے زاہد!
کعبے سے جا ہی چکے تھے ترے بہکانے سے

☆

ذکر اُس کا ہو، کچھ بھی فرمائے
کاش ناصح ہی دل کو بہلائے
اور اُن کا گلا ہوا اُلٹا
کر کے شکوہ بھی اُن سے پچتائے

☆

معمور ہے خدا کی عنایت سے مے کدہ
ساقی اگر نہیں ہے نہ ہو، مے سے کام ہے
بیتاب! پی، خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ
یہ خُم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

☆

آج پیغام بر! نہ کچھ کہنا
ہیں وہ ہم پر بہت خفا بیٹھے
یہ بھی قدرت خدا کی، اے بیتاب!
تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

(گلشنِ بے خار: ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۷، طبقات الشعرائے ہند: ۳۷۶، انتخابِ یادگار: ۷۶۔ ۸۱، ۲۳۳۔ ۲۳۴، اخبار الصنادید: ۱۷۳، خم خانۂ جاوید، ۶۳۴)

بیدل... شیخ عبدالسمیع انصاری رامپوری

قصبۂ رام پور منھیاراں (ضلع سہارن پور) کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد شیخ محمدؐ یوسف مشہور طبیب تھے۔ سلسلۂ نسب صحابیِ رسول حضرت ابو ایوبؓ انصاری سے ملتا ہے۔

بیدل کی ابتدائی تعلیم نجی طور پر ہوئی۔ اِس کے بعد چندے مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے استفادہ کیا، اور بالآخر ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳۔۱۸۵۴ء) میں مزید کسبِ علم کی غرض سے دلّی کا رُخ کیا۔ یہاں اُس وقت مولوی امام بخش صہبائی اور صدر الصدور مولوی صدر الدین آزردہ کا طوطی بولتا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی فارسی کی تکمیل صہبائی سے کی اور عربی اور حدیث و تفسیر کی آزردہ سے۔ ان کے علاوہ اساتذۂ عہد، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولوی سعادت علی سہارنپوری، مولانا شیخ محمدؐ تھانوی اور مولانا محمدؐ قاسم نانوتوی سے بھی کچھ استفادہ کرنے کی روایت موجود ہے۔ یوں وہ علومِ مروّجہ میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔

قیامِ دلّی کے زمانے ہی میں شعر و شاعری سے رغبت پیدا ہوئی، تو میرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان کی شاگردی اختیار کر کے اُردو میں شعر کہنے لگے۔

سات برس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسبِ معاش کا مرحلہ پیش آیا۔ سب سے پہلے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰۔ ۱۸۶۱ء) میں رڑکی (ضلع سہارن پور) میں ایک برہمن ٹھیکے دار کے بیٹے ناہر سنگھ کی تعلیم و تربیت پر مامور ہوئے۔ نوجوان ناہر سنگھ ان کی

بزرگی اور زہد و ورع اور دین داری و تقویٰ سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔ خلیل الرحمٰن اُس کا اسلامی نام رکھا گیا تھا۔ جب یہ خبر ناہر سنگھ کے خاندان تک پہنچی، تو اُنھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ عبدالسمیع کو ملازمت سے برطرف کردیا۔ ناہر سنگھ پر بھی بہت سختی کی گئی، لیکن اُس نے استقامت کا ثبوت دیا، اور اپنے اعتقاد پر قائم رہا۔☆[۱]

مولوی عبدالسمیع رڑکی سے نکلے، تو اپنے وطن پہنچے۔ حسنِ اتفاق سے انھیں ایام میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی☆[۲] ہندستان آئے ہوئے تھے۔ اپنی تعلیم و تربیت اور اُفتادِ طبع کے زیرِ اثر عبدالسمیع اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حاجی صاحب نے اُن کے علم و تقویٰ سے متاثر ہو کر اُنھیں اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرلیا۔ روایت ہے کہ عبدالسمیع صاحب نے حاجی صاحب موصوف کی بیعت قصبۂ جھنجھانا (ضلع مظفرنگر) میں اُسی درخت کے نیچے کی تھی، جہاں کسی زمانے میں خود حاجی صاحب نے اپنے پیرِ طریقت حضرت میاں نور محمد جھنجھانوی کی بیعت کی تھی۔ اِس کے بعد حاجی صاحب نے اُنھیں خلافت سے بھی مشرف فرمایا۔

میرٹھ (یو پی) کے رؤسا میں شیخ الٰہی بخش (ف: ۲۱ مئی ۱۸۸۳ء) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُنھوں نے اپنی دولت رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اُن کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اِس پر اُنھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حافظ عبدالکریم (ف: ۷ نومبر ۱۹۰۵ء) کے تینوں بیٹوں (غلام محی الدین، وحید الدین، بشیر الدین) کی تعلیم و تربیت اپنے ذمّے لے لی۔ اُنھیں ان تینوں صاحب زادوں کے لیے ایک صاحبِ استعداد اور موزوں استاد کی ضرورت تھی۔ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ مولوی عبدالسمیع بیدل فارغ ہیں، تو اُنھوں نے مولوی صاحب کو میرٹھ آنے کی دعوت دی، جو بیدل نے قبول کرلی۔ اِن تینوں لڑکوں نے نہ صرف اُن سے فارسی، عربی اور دینیات کی تعلیم پائی، بلکہ بعد کو بیعتِ طریقت بھی کرلی۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ پیش آیا، جس سے بیدل کے تقویٰ اور محتاط طبیعت کا

مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔

بیدل کے تقرر پر یہ طے ہوا تھا کہ اُنھیں بارہ روپے مشاہرہ کے علاوہ رہنے کو مکان اور ''روٹی'' بھی دی جائے گی۔ چنانچہ کھانے کے وقت چپاتی اور مختلف قسم کے سالن خوان میں پیش ہوئے۔ آپ نے چپاتی اٹھا لی اور اسے پانی کے ساتھ نوش فرما لیا۔ خوان واپس پہنچا، تو باورچی نے تعجب کیا اور صورتِ حال حافظ عبدالکریم صاحب کے گوش گزار کردی۔ حافظ صاحب نے خیال کیا کہ شاید کھانا مولوی صاحب کے پسندِ خاطر نہیں تھا، جس سے اُنھوں نے اسے واپس کردیا۔ حافظ صاحب نے باورچی کو حکم دیا کہ آئندہ زیادہ پُرتکلف کھانا مولوی صاحب کے لیے پکایا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی، لیکن خوان اب بھی جوں کا توں حسبِ سابق واپس آگیا۔ اس پر حافظ عبدالکریم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کو کھانے میں جو چیز پسند ہو، اس کے پکانے کا حکم دے دیجیے۔ تو کہا کہ مجھے تو ہر ایک چیز پسند ہے، کھانا میری پسند اور ضرورت کے مطابق ہے۔ جب پوچھا گیا کہ آپ پھر صرف روٹی پر کیوں اکتفا کرتے ہیں، اور سالن واپس کر دیتے ہیں؟ تو کس سادگی سے جواب دیا کہ تقرری کے وقت تنخواہ میں صرف ''روٹی'' طے ہوئی تھی، سالن لینے کا میرا کوئی حق نہیں تھا، لہٰذا میں نے اس کے لینے سے اجتناب کیا۔ اِس پر حافظ عبدالکریم نے عرض کیا کہ ''روٹی'' میں چپاتی اور سالن دونوں شامل ہیں۔ اِس کے بعد انھوں نے دونوں چیزیں قبول کرلیں۔

اُن کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ باہر سے گراں قدر مشاہروں پر ملازمت کی دعوتیں آئیں، لیکن اُنھوں نے ہمیشہ انکار کردیا، بلکہ روایت یہ ہے کہ ریاست ٹونک کی مدرسۂ عالیہ کی صدارت اور چار سو ماہانہ کی پیش کش کی بھی پروا نہ کی۔ حافظ عبدالکریم نے یہ سنا تو اُنھوں نے چاہا کہ آپ نقصان میں کیوں رہیں آج سے ہماری طرف سے ۴۰۰ روپیہ ماہانہ قبول کرلیں، اُنھوں نے اس سے بھی انکار کردیا۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے آخری ۴۲ برس میرٹھ میں بسر کیے۔ یہیں منگل یکم محرم ۱۳۱۸ھ (یکم مئی ۱۹۰۰ء) کو رہگرائے عالمِ بقا ہوئے۔ قبرستان حضرت مخدوم شاہ ولایت کے احاطے میں دفن ہوئے۔

اولادِ جسمانی میں صرف ایک صاحب زادے محمد میاں تھے، جنھوں نے دلّی جا کر حکیم عبدالمجید خان (خلفِ حکیم محمود خان) سے طب پڑھی اور میرٹھ واپس آ کر اپنا مطب قائم کیا۔ اُنھیں پہلوانی کا بھی شوق تھا، بڑے تن و توش کے خوش خوراک آدمی تھے۔ ٦ محرم ١٣٥٩ھ (١٤ فروری ١٩٤٠ء) کو انتقال کیا، اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوے۔

شاعری کے آغاز میں بیدل بھی رہی غزل کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ لیکن جوں جوں مذہب سے شغف بڑھتا گیا اور بالخصوص حاجی امداد اللہؒ سے بیعت کے بعد، نعت و منقبت سے زیادہ مزاولت رہنے لگی۔ ان کی مندرجۂ ذیل ١٢ مطبوعات کا پتا چل سکا ہے۔ جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، بیش تر مذہبی موضوعات خاص کر نعت و مولود سے متعلق ہے، (٢) مناظرہ کے تحت آتی ہے، اور (٧) نصاب سے متعلق ہے، یہ رسالہ ایک ہفتے میں لکھا گیا ہے:

١۔ دافع الاوہام، فی محفل خیر الانام (لکھنؤ: ١٢٩٦ھ)
٢۔ انوارِ ساطعہ دربیانِ مولود و فاتحہ (میرٹھ: ١٣٠٢ھ)
٣۔ راحۃ القلوب فی مولد المحبوب (دہلی: ١٢٩٠ھ)
٤۔ بہارِ جنت (میلاد شریف) (کان پور: ١٣١٠ھ)
٥۔ سلسبیل فی مولد ہادی سبیل (میرٹھ: ١٣١٢ھ)
٦۔ نورِ ایمان (میرٹھ: ١٣١٢ھ)
٧۔ حمدِ باری
٨۔ طرازِ سخن (مجموعۂ کلام) (میرٹھ: ١٣١٤ھ)
٩۔ جوہرِ لطیف (نعتیہ مثنوی) (میرٹھ: ١٣٢٧ھ)
١٠۔ فیضانِ قدسی (فضائلِ آیۃ الکرسی) (دلّی: ١٩٢٧ء)
١١۔ وسیلۂ مغفرت (مجموعۂ ادعیہ)
١٢۔ مظہر الحق

اُن کا بیش تر منظوم کلام اُن کی آخری ایّام کی بے توجہی کے باعث ضائع ہو گیا۔ اُن کے شاگرد خان بہادر شیخ بشیر الدین جن کی تعلیم و تربیت ہی بیدل کی نگرانی میں ہوئی تھی، بعد کو شعر بھی کہنے لگے تھے۔ وہ تسخیر تخلّص کرتے اور اصلاح بھی بیدل سے لیتے تھے۔ اُنھوں نے جہاں تہاں سے کلام جمع کیا اور اسے طرازِ سخن، کے عنوان سے شائع کردیا۔ ۴۸ صفحات کا یہ مختصر کتابچہ پہلی مرتبہ محمود پریس، میرٹھ سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

شرر افشاں اِدھر لب ہیں، اُدھر آنسو برستے ہیں
تماشا جس طرح برسات میں ہو برق و باراں کا

نمودِ ذرّہ بے خورشید کب ممکن ہے اے بیدل!
سبب حسنِ قدم ہے گرمیِ بازارِ امکاں کا

☆

کیا کہوں جو خاکساری میں ہے، اے بیدل بہلد
مل کے دانہ خاک میں کیا سبز و رعنا ہوگیا

☆

مت خون پہ بیدل کی کمر باندھ، کہ وہ تو
اک طائرِ بے بال ہے سو بھی کوئی دم کا

☆

کوئی حسرت نہیں نکلتی ہائے
مدّعا کوئی بر نہیں آتا

☆

شبنم کو رونا آتا ہے انجام دیکھ کر
غفلت سے مسکراتا ہے غنچہ گلاب کا

وحدت کی رمز کھل نہ سکے بے فنا ہوئے
دریا سے وصل ٹوٹ کے ہووے حباب کا

☆

تھا ابھی وصل، پھر جو آنکھ کھلی
یار آغوش سے جدا دیکھا
دارِ فانی میں آدمی کیا ہے
بہتے پانی میں بلبلا دیکھا

☆

کیا کہوں کس کس مصیبت سے چلا پیمانہ رات
چرخ نے گھیرا تھا چکّر باندھ کر خم خانہ رات
کیا مصیبت میں کسی کا ساتھ دیتا ہے کوئی!
دل کو سمجھے تھے یگانہ، ہو گیا بیگانہ رات

☆

شمشیرِ الم دیکھ کے غش آئے ہے جن کو
یارب! مجھے لائیں گے وہ کیوں کر تہِ خنجر!

☆

گر بلا وہ ہیں تو ہم بھی ہیں جفا کش، دیکھیں
پیچ و خم دیں گے ہمیں آپ کے گیسو کب تک؟

☆

غم نہیں ہے کہ اضطراب نہیں
جان پر میری کیا عذاب نہیں

☆

دل دیا حق نے وہ، کہ ہے بے تاب
آنکھ وہ دی کہ جس کو خواب نہیں

یاں یہ نوبت کہ سانس گنتے ہیں
واں وہ غفلت کہ کچھ حساب نہیں
اپنے عاشق کی بے کلی مت پوچھ!
دن کو آرام شب کو خواب نہیں
شعلہ رو تیری گرم خوئی سے
کون سا دل ہے جو کباب نہیں
مختصر ہے یہ حال بیدلؔ کا
تن میں طاقت، جگر میں تاب نہیں

☆

وہ آویں، نہ آویں مگر منتیں ہم
جو اپنی سی ہوتی ہے کر دیکھتے ہیں
وہ دیکھے نہ دیکھے، مگر ہم تو بیدل!
اسی کو بس آٹھوں پہر دیکھتے ہیں

☆

جب دوڑتے ہیں نفع کو، پاتے ہیں ضرر کو
تقدیر کھڑی ہنستی ہے تدبیرِ بشر کو
بیدل! میں کبھی کوچۂ دلبر میں نہ جاتا
لایا مجھے میرا دلِ بے تاب اِدھر کو

☆

زہد کا زعم، نہ طاعت پہ ہے تکیہ ہم کو
کچھ خدا ہی کے کرم پر ہے بھروسا ہم کو

☆

آجانا دم کا زیست، نکل جانا موت ہے
ہر دم معاملہ ہے بقا و فنا کے ساتھ
دل کی عبث تلاش ہے، پہلو میں دل کہاں
بیدل! تمھارا دل تو گیا دل ربا کے ساتھ

☆

نہ سہتے رہ کے گلشن میں، جفائے باغباں لیکن
رگِ گل کی محبت رشتہ بندِ پائے بلبل ہے

☆

اے دل، تو ہی پھر بندِ قفس توڑ، تڑپ کر
وہ تو نہ کبھی حشر تک آزاد کریں گے

☆

پھر دیدۂ تحقیق کو وحدت پہ نظر ہے
ہیں ذرّہ و خورشید برابر کئی دن سے

☆

نہ دل لگاؤ، یہ دلّی کے لوگ ہیں بیدل!
اب آگے مانو نہ مانو، یہ کہہ دیا ہم نے

☆

انیسِ قدسیاں تھی ہائے اس عالم میں جاں میری
ہوئی مٹی خراب اس خاک میں آکر کہاں میری

☆

گلی، بازار، کوچے میں، جدھر جائیں، جہاں سنیے
وفا کا میری شہرہ ہے، تری بیداد کا غل ہے

☆

کی شفا کی جو دُعا، اور ہوا درد نصیب
ہائے، میں کیا کہوں اللہ سے اور کیا ہو جائے!

[حیاتِ بشیر: ۶۶۔ ۸۲ (حاشیہ)!۔ غالب اور عصرِ غالب: ۱۶۵۔۱۷۶، اردوئے معلیٰ، دلّی (شمارۂ اول: غالب نمبر ۱۹۶۰ء): ۱۰۹۔ ۱۱۷]

حواشی:

☆۱۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سوانح عمری میں جن مولانا خلیل الرحمٰن کا ذکر آتا ہے، وہ یہی صاحب ہیں۔ اُنھوں نے بعد کو علومِ اسلامیہ میں مہارت پیدا کرلی اور پھر ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلے گئے۔ وہاں حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور اُن سے خلافت پائی۔ مکہ ہی میں فوت ہوئے۔

☆۲۔ مولانا امداد اللہ دوشنبہ ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ (۱۸ اپریل ۱۸۱۸ء) نانوتہ (ضلع سہارن پور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد امین العمری تھانوی تھے۔ مولانا امداد اللہ نے فارسی کی رسمی تعلیم کے بعد مولانا قلندر بخش جلال آبادی سے مثنوی مولانا روم پڑھی۔ پھر دلّی آئے اور شیخ نصیر الدین شافعی مجاہد کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور اُن کے شہید ہو جانے کے بعد اولاً چندے تھانا بھون میں رہے، پھر شیخ نور محمد جھنجھانوی کی خدمت میں پہنچ کر ان کی بیعت کرلی، اور اُن کے حکم کی تعمیل میں ارشاد و تلقین میں جٹ گئے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بیش تر علما و صلحا نے مولانا امداد اللہ کو اپنا امیر منتخب کرلیا تھا۔ لیکن شاملی (ضلع مظفر نگر) کے معرکے میں دیسی فوج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مجبوراً اس کے بعد بیش تر علما روپوش ہوگئے اور کچھ اصحاب نے ملک سے ہجرت کرنے میں عافیت دیکھی۔ اُنھیں میں مولانا امداد اللہ بھی تھے۔ اُنھوں نے وطن سے نکل کر مکۂ مکرمہ میں سکونت اختیار کرلی۔ اسی سے صفت "مہاجر مکی" گویا ان کے نام کا جزو بن گئی ہے۔ یہاں اُنھوں نے مجاہدات و عبادات سے وہ مقام حاصل کرلیا جس نے اُنھیں مرجع اصحابِ علم و یقین بنا دیا۔ علمائے عصر میں سے ایک بڑی تعداد نے اُن کی بیعت کرلی تھی۔

اُنھوں نے تصنیف و تالیف میں بھی اپنے آثار چھوڑے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب تصوّف اور معرفت کے مضامین سے مملو ہیں۔ "ضیاء القلوب" فارسی میں اور "ارشادِ مرشد" "گلزارِ معرفت" "تحفۃ العشاق"، "جہادِ اکبر"، "غذائے روح"، "درود نامۂ غم ناک" وغیرہ اُردو نظم میں ہیں۔

چہار شنبہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ (۱۸ اکتوبر ۱۸۹۹ء) مکۂ معظمہ میں رحلت کی۔ قبرستانِ جنت المعلیٰ میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ (نزھۃ الخواطر،۸: ۷۰۔۷۲)

بیدل (رسوا)... مولوی ابوالحسنات محمدؐ حبیب الرحمٰن انصاری سہارنپوری

مشہورعالم مولانا حاجی احمد علی محدّث سہارنپوری کے صاحب زادے تھے جو خاندانِ ولی اللٰہی میں شاہ محمد اسحاق صاحب کے نام ور شاگردوں میں ہوئے ہیں۔ مولانا احمد علی اپنے دور کے مشاہیر میں سے تھے۔ اُن کے علم وفضل سے بہت لوگوں نے استفادہ کیا۔ مولانا شبلی نعمانی بھی اُن کے شاگردوں میں سے تھے۔ اُن کی وفات ۱۲۹۷ھ میں ہوئی۔ نسّاخ نے تاریخ کہی!

چوں آں احمد علیِ نیک باطن
بسوئے خلد زیں دارالفنا رفت
برائے سالِ ترحیلش بہ نسّاخ
مَلَک گفتا: ''زدنیا مقتدا رفت''

ان کے تین بیٹے حیدرآباد دکن گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اُن میں سب سے بڑے تھے۔ یہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳۔۱۸۴۴ء) میں پیدا ہوئے۔ ظہور الدین احمد، تاریخی نام ہے، ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴۔ ۱۸۹۵ء) میں نواب عماد الملک ناظمِ تعلیمات حیدرآباد دکن کے بلاوے پر وہاں گئے، اور مدرسۂ عالیہ نظام میں ۲۵۰ روپے مشاہرے پر فقیہ اوّل کے عہدے پر تقرر ہوا۔ بتدریج مددگار مہتمم بن گئے اور تنخواہ چار سو ہوگئی۔ اسی عہدے پر تھے، جب ۱۹۱۹ء میں انتقال ہوا، وہیں حیدرآباد میں مدفون ہیں۔ قیامِ دکن کے

ابتدائی زمانے میں اُنھیں کچھ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل ابھی غالب شناسی کارواج نہیں ہوا تھا، اور وہاں بھی ذوق کی استادی مسلّم تھی۔ ایسے میں بھلا غالب کے کسی شاگرد کی کیا پرسش ہوتی۔ حسنِ اتفاق سے اُنھیں ایام میں بیدل کی مہاراجا سرکشن پرشاد کے دربار تک رسائی ہوگئی۔ مہاراجا بہادر کی خدمت میں پیش کردہ پہلے ہی قصیدے کا ایک بند تھا:

غالب کی رزم بزم کا ادنیٰ ساخوشہ چیں
ہے بیدلِ شکستہ قدم بوسِ آستاں
لکھے جو رزم، خوف سے رستم اچھل پڑے
ترتیب بزم دے تو زمیں پر بنے جناں
پر شکر ہے کہ شاعرِ دریوزہ گر نہیں
کرتے ہیں آپ قدر جو ہوتے ہیں قدرداں

مہاراجا بہادر کے علاوہ اُنھوں نے نظامِ دکن میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم کی مدح میں بھی متعدد قصیدے کہے۔ تقریبِ سالگرہ پر قصیدہ پیش کرنا اُن کے معمول میں شامل تھا۔ مہاراجا بہادر کی سرکار سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہوگیا تھا۔

بیدل کا خط بھی بہت پاکیزہ تھا، نستعلیق اور شکستہ دونوں بہت عمدہ لکھتے تھے۔ ناخن سے لکھنے کی مشق ایسی بے مثال تھی کہ دیکھنے والے اَش اَش کر اٹھتے تھے۔ روایت ہے کہ جو غزلیات حضورِ نظام کی خدمت میں پیش کرتے، وہ عموماً ناخن ہی کی لکھی ہوتی تھیں۔

بیدل بڑے جیّد عالم تھے۔ بعض کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ مثلاً مسندِ امام ابوحنیفہ، ''تاریخ تیموری''، ''مقاماتِ بدیع ہمدانی''۔ یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک رسالہ ''فضیلتِ علم'' بھی لکھا تھا، جو سلسلہ وار ماہانہ پرچے ''دبدبۂ آصفی'' میں چھپتا رہا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی وفات کے بعد چندے ''دبدبۂ آصفی'' اور ''محبوب الکلام'' کی ادارت بھی کرتے رہے۔ یہ دونوں پرچے مہاراجا سرکشن پرشاد کی سرپرستی میں شائع

ہوتے تھے۔

غالب کے علاوہ حسین علی خان شاداں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ طبیعت مشکل پسند اور مضمون آفرین پائی تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے میں خاص ملکہ تھا۔ دکن میں اُن کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔

تلامذہ اور احباب کے اصرار کے باوجود کبھی اپنے کلام کو مرتب کرنے پر متوجہ نہ ہوے۔ اس لیے افسوس کہ بہت کلام ضائع ہوگیا۔ اُن کی وفات کے بعد عقیل ندوی نے اُن کے منتشر کاغذات کو جمع کیا تھا۔ قصائد تو کسی حد تک محفوظ تھے اور تلاش سے دستیاب ہوگئے، لیکن غزلیات صرف ایک ابتدائی نامکمل بیاض اور رسائل سے جمع ہوئیں۔ عقیل نے شروع میں ایک دیباچے کا اضافہ کیا جس میں کچھ حالات بھی شامل کیے ہیں۔

یہ قلمی دیوان میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں تقریباً ۱۶۰ غزلیات ہیں۔ متفرق اشعار بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ آخر میں قصائد اور قطعات کی اچھی خاصی تعداد ہے، جو اُنھوں نے حضور نظام اور مہاراجا بہادر اور بعض دوسرے عمائدِ دکن کے لیے کہے۔ یہ نسخہ ایک مثنوی پر ختم ہوتا ہے۔ اس دیوان سے ایک اور بات معلوم ہوئی کہ وہ پہلے رسوا تخلّص کرتے تھے۔ کئی غزلوں کے مقطعے میں یہ تخلّص استعمال ہوا ہے، مثلاً

ہے عبث شکوۂ ویرانیِ دل اے رسوا!
جس جگہ عشق رہا، کب وہ گھر آباد رہا

☆

ہے عبث رسوا کو اوس کا انتظار
وہ تو آغوشِ تصور میں بھی آکر کم رہا

☆

دل پھنسا زلفِ گرہ گیر میں رسوا! (کذا)
بعد مجنوں کے ہوئی مجھ کو یہ زنجیر نصیب

☆

کون پہلو سے گیا ہے مرے اُٹھ کر رسوا!
منھ کو آتا ہے مرے، لختِ جگر آپ سے آپ

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُنھیں نعت سے بہت شغف تھا۔ معدد غزلیات پوری کی پوری اسی صنف میں ملتی ہیں۔ بسا اوقات رسمی غزل لکھتے لکھتے بھی درمیان میں دو ایک شعر نعت میں کہہ جاتے ہیں۔ اب انتخابِ کلام ملاحظہ ہو:

روح سے حضرتِ غالب کی مدد ملتی ہے
بیدلِ خستہ ہے اک طفلِ دبستاں اب تک

☆

معطّر ہو کلام اپنا نہ کیوں بوئے مضامیں سے
چنے ہے پھول بیدل حضرتِ غالب کے گلشن سے

☆

نازش نہ کیوں ہو تیرگیِ بخت پر مجھے
ہم رنگ ہو گیا تری زلفِ سیاہ کا

☆

بل بے جور، اُف رے ستم، اب بھی سنبھل، او بیدل
لاکھ تڑپا کیا، پر اس نے نہ دیکھا، دیکھا!

☆

نکہتِ گل کی طرح، ہوں وہ خودی سے باہر
پابہ زنجیر رہا، تو بھی میں آزاد رہا

☆

تیرِ مژگاں سے ستم گار مرے سینے میں
زخم تھا، زخم سے ناسور ہوا، خوب ہوا!

☆

تیرِ مژگاں! دل میں میرے کیا اثر پیدا کیا
مرغِ بسمل کی طرح یہ رات بھر تڑپا کیا
سر برہنہ، اشک جاری، زرد چہرہ ہے ترا
سچ بتا اے شمع! ماتم تو نے یہ کس کا کیا

☆

عبث ہو دنیا پہ جان دیتے، نہیں ہے بیدل ثبات اس کو
یہاں کے جھگڑوں کو ہیچ پایا، یہاں کا دھندا سراب دیکھا

☆

ہاتھ اوچھا پڑا ہے قاتل کا
رہ گیا دل میں حوصلہ دل کا
عمر محوِ سفر ہے، عمر ہوئی
اور پتا کچھ نہیں ہے منزل کا
کیوں کہا، نامہ بر! وہاں جا کر
غیر ہے ہائے، حال بیدل کا

☆

گر ملاحت سے وہ قاتل نمک افشاں ہوتا
حشر تک زخم نہ منّت کشِ درماں ہوتا
لذّتِ لختِ جگر، خارِ تمنا کی خلش
خواہشِ زخم کہ پہلو میں نمک داں ہوتا

☆

تنگیِ زخم سے ارمانوں کے عقدے نہ کھلے
کاش، دل بھی مرا ہم رنگِ گریباں ہوتا

☆

لڑتے ہیں عبث شیخ و برہمن پسِ دیوار
مسجد نہ کسی کی ہے، نہ بت خانہ کسی کا

☆

عہدِ پیری ہے بے پر و بالی
اب گلہ کیا شکستہ پائی کا
برقِ نظارہ سوز ہے وہ نگاہ
صاد ہے جس پہ اک خدائی کا

☆

رونے سے فائدہ تجھے کیا چشمِ نم ہوا
کچھ دل کی آگ کم ہوئی، کچھ درد کم ہوا؟

☆

خانۂ دل میں مرے عشق کو جب بار نہ تھا
جان بیزار نہ تھی، دل پہ کوئی بار نہ تھا

☆

بے تابی و سوزش ہے فقط آپ کا صدقہ
ہاں، درد ہے غم خوار پرانا مرے دل کا

☆

امیدیں توڑنی، دل خون کرنا، بدگماں رہنا
ترے انداز سیکھے یاس نے، اے جانِ جاں کیا کیا
نہیں دل میں بجز، خونِ تمنا، نام تک باقی
کیا ہے خانمانِ آرزو کو بے نشاں کیا کیا

☆

روز کرتے ہو تازہ تازہ ستم
کس سے سیکھی ہے یہ جفا صاحب!
کیجیے التفات غیروں پر
بے کسوں کا بھی ہے خدا، صاحب!

☆

عشق آتا ہے تو ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں
دین و ایماں، دل و دیدہ و جگر، آپ سے آپ

☆

رُوکشِ ارماں، حریفِ آرزو، پامالِ رشک
کیا ہیں محسودِ تمنا، خفتگانِ کوئے دوست

☆

بیدل! اور کہہ سکے نہ منھ سے کچھ
بے خودی خاک میں ملائی رات

☆

آئے گا بہرِ سیرِ چمن کیا نگار آج
پھرتی ہے ہر روش پہ نسیمِ بہار آج

☆

عیشِ دنیا ہیچ ہے، اور پوچ ہے اس پر غرور
آج ہم غم ناک ہیں، اور کل عدو غم ناک تھا
دل لگایا دہر سے، افسوس، بیدل! کیا کیا
لطف تھا جب تک کہ دامانِ تمنا چاک تھا

☆

مایۂ حسن پرستی نہ رہا میرے بعد
حسن بھولا رہِ انداز و ادا میرے بعد
ہاتھ پتھر کے تلے آگیا اب تو اپنا
خون روتی ہے شب و روز حنا میرے بعد
یہ پشیمانی مری موت پہ، اللہ اللہ!
اب نہیں ہوتے کسی پر وہ خفا میرے بعد
مجھ سا بیدل! ستم و جور کا خوگر نہ ملا
وہ ہوئے شیفتۂ طرزِ وفا میرے بعد

☆

کس قدر دستِ جنوں سے ہوں پریشاں العیاذ
الاماں کہتا ہے دامن، اور گریباں العیاذ
ہوں وہ مجنوں، دشت گردی سے مری
کہہ رہے ہیں سب کے سب خارِ بیاباں العیاذ
جائے عبرت ہے کہ رسوا سا جواں
عشق میں تیرے پھرے یوں دیدہ گریاں العیاذ

☆

رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے غم لہو ہو کر
انیسِ جسم ہوا درد مو بہ مو ہو کر
یہ بے خودی ہے حریفِ خودی کہ جیتا ہوں
نصیبِ شیشہ و جام و مے و سبو ہو کر
ہوئے شگفتہ وہ آخر نسیمِ حسرت سے
جو غنچے رہ گئے سربستہ آرزو ہو کر

پسِ فنا بھی یہ باقی ہے شوقِ پابوسی
تری گلی میں گئی خاک کو بہ کو ہو کر
کسی کی زود پشیمانی میرے مرنے پر
دلِ عدو میں کھٹکتی ہے آرزو ہو کر
حریمِ کعبۂ غیرت سے مت نکال قدم
جیا تو خاک جیا تنگِ آبرو ہو کر
جب آیا سامنے بیدل، تو آگیا غصہ
ہوا نہ آئنہ معتوب رو بہ رو ہو کر

☆

مضطرب دل میں کبھی، اور کبھی باہر بے چین
نظریں پھرتی ہیں ترے شوق میں اندر باہر

☆

میری ہی جانِ حزیں تھی نذرِ اندازِ وفا
یاد وہ کرتے ہیں مجھ کو طرزِ دشمن دیکھ کر
فکرِ عمرِ جاوداں، اور چند روزہ زندگی
پاؤں پھیلاتے ہیں، بیدل! طولِ دامن دیکھ کر

☆

وحدت ہے مراکیش، موحّد کے ساتھ ہوں
راہب سے ہوں قریب نہ ہوں برہمن سے دور

☆

ظلم ہے، جور ہے، جفا ہے عشق
سخت کافر ہے، بد بلا ہے عشق

سہل تم نے سمجھ لیا ہے عشق
جاں رُبا اور غم فزا ہے عشق
تیرے بیمار کب پنپتے ہیں
تو ہی کہہ، تیری کیا دوا ہے عشق
حضرتِ دل! یہ کیوں ہے بے تابی
پھر کہیں تجھ کو ہو گیا ہے عشق
دیکھنا کیسے ہوتے ہو رُسوا
ابھی نامِ خدا ہوا ہے عشق

☆

پسِ مردن، مری جاں! آدمی کی قدر ہوتی ہے
کرو گے تم وفاؤں کو ہماری یاد مدّت تک

☆

اے جذبِ محبت کے تلاطم، تو کدھر ہے
دریا رہے امّید کا پایاب کہاں تک!
ہستی کے سمندر میں خدایا، مری قسمت
اب دیکھیے پیدا کرے گرداب کہاں تک!
کھلتا نہیں یہ بھید کسی طرح کسی پر
ہیں عالمِ اسباب کے اسباب کہاں تک!

☆

کیوں نہ پروازِ طبیعت مے کشی سے ہو فزوں
ڈالتے ہیں آگ پر جس وقت مے، اڑتی ہے آگ
کم نہیں دوزخ سے بے مغزوں کی صحبت، الاماں
جب نیستاں میں پہنچتی ہے، تو چیخ اٹھتی ہے آگ

خاکساری سے نہیں مٹتا فروغِ عزّو جاہ
راکھ کے نیچے دبانے سے کہیں بجھتی ہے آگ!

☆

نہ پوچھو بیدلِ خستہ کی حالت
جگر پامال، تن لاغر، خفا دل

☆

یار ہے خواب میں، بیدار کروں یا نہ کروں
فتنہ خوابیدہ ہے، ہشیار کروں یا نہ کروں
وعدہ وہ کرکے نہ آئے، مگر اللہ رے رعب
خوف ہے جی میں کہ تکرار کروں یا نہ کروں

☆

تیری شوخی کا اثر ہے، ساقیِ سیماب وش
کیفِ ہم رنگی ترے بادہ گساروں میں نہیں
راستی حرفِ غلط تھا، محو دونوں سے ہوا
تیرے وعدوں میں نہیں، میرے ستاروں میں نہیں

☆

باتیں، کبھی ایما، کبھی دزدیدہ نگاہیں
مضمون تو کچھ بھی نہیں، عنوان بہت ہیں

☆

عمرِ بے اعتبار کی باتیں
ہیں سرِ رہ گزار کی باتیں
کب وہ سنتا ہے، تو نے کیوں اس سے
دلِ اُمیدوار! کی باتیں

☆

یا رب! کیے گناہ جنونِ شباب میں
ناکردہ جو ہیں، درج ہیں فردِ حساب میں
بہلا رہا ہوں دل کو، امیدِ جواب میں
تسکینِ تشنگی ہے فریبِ سراب میں
ساقی! ادھر تو دیکھ کہ میں دیر مست ہوں
کچھ مستیٔ نگاہ ملادے شراب میں
تمہید بے خودی ہو کہ تمکینِ ضبط ہو
واں ایک بے نیازی ہے سب کے جواب میں
پامالِ یاس، کشتۂ غم، تشنہ آرزو
یہ جانِ ناتواں ہے مری کس حساب میں
بیدل! بچو کہ فکرِ فضیلت فضول ہے
فاضل کسی جگہ بھی نہیں ہے حساب میں

☆

کوئی غصہ نہیں عتاب نہیں
خامشی کا مگر جواب نہیں
دل بشوقِ خرامِ حشر آہنگ
کب ہم آغوشِ اضطراب نہیں
خندہ ہائے نمک فشانِ عدو
مرہمِ زخمِ انقلاب نہیں
بل کی لیتے نہیں ہیں اہلِ کمال
زلف پابندِ پیچ و تاب نہیں

☆

نہ وہ رنگت، نہ وہ نکہت، نہ وہ شوخی، نہ ادا
غنچۂ حسرتِ دل صحنِ گلستاں میں نہیں
جنبش اعضا میں نہیں، تاب رگِ جاں میں نہیں
تار جز تارِنفس اپنے گریباں میں نہیں
راستی حرفِ غلط تھا کہ مٹا دونوں سے
میری قسمت میں نہیں، آپ کے پیماں میں نہیں
سازِ ہستی کو ہے جس طرح فنا ہم آہنگ
مستتر ہے، بتِ طنّاز! تری ہاں میں نہیں

☆

ہماری آنکھ کب آغوشِ انتظار نہیں
اُمیدِ یاس سے کس وقت ہم کنار نہیں
خس آشیاں کے لیے چنیے کس تمنّا پر
تمھاری برق مزاجی کا اعتبار نہیں
حریمِ کعبہ سے پوچھو غمِ فراقِ بتاں
سیاہ پوش یہ کیوں ہے، جو سوگوار نہیں

☆

بے خودی سے بڑھ کے خودداری بنی ہے راہزن
طور کا جلوہ نظر آنے لگا ہر سو ہمیں

☆

ہم موحّد ہیں، نہیں صورت پرستی اپنا کیش
اس لیے تصویر اپنی ہم نے کھنچوائی نہیں
کیا لڑکپن، کیا جوانی، کیا بڑھاپا ہم نشیں!
چیز جو ہم سے گئی، وہ لوٹ کر آئی نہیں

☆

چین دن کو ہے مجھے، نے اے ستم گر، رات کو
دن کو تنکے چنتا ہوں،گنتا ہوں اختر رات کو

☆

کچھ ناز ہو، کچھ غمزہ ہو، کچھ شرم و حیا ہو
معشوق کی یہ شان نہیں، ظلم و جفا ہو

☆

اخفائے راز باعثِ صد التفات ہے
اے نالۂ رسا! کبھی پیغام بر نہ ہو
رازِ نہفتہ کھل گیا چینِ جبیں سے آج
کیوں نازشِ عتاب ہو، الفت اگر نہ ہو

☆

یاد ہے جوششِ وحشت ترا احساں مجھ کو
فکرِ داماں ہے، نہ ہے فکرِ گریباں مجھ کو
جان بھی اپنی ہوئی اب تو وبالِ خاطر
دل نہ آتا تھا نظر جان کا خواہاں مجھ کو
تابہ کے آتشِ خس پوش چھپے گی، بیدل!
پاسِ رسوائی نے کھویا، دلِ سوزاں مجھ کو

☆

تمنائے نظر یاں یہ کہ میں ہوں، کوئے جاناں ہو
تقاضائے جنوں واں وہ کہ تو ہو، اور بیاباں ہو
خدا یا، درد دے اور درد کی کچھ ایسی اُلفت دے
نہ درماں کی تمنا ہو، نہ دردِ دل کا درماں ہو
یہ چلتا پھرتا سایہ ہے، ابھی کچھ ہے، ابھی کچھ ہے
عبث حسنِ دو روزہ، پر بتو! تم اتنے نازاں ہو

مزہ جب مشعرہ میں ہے، غزل پڑھنے کا اے بیدل
محمدّ یار احقر ہوں، حبیب الدین سوزاں ہو

☆

وہ ولولہ، وہ جوشِ جوانی، وہ دن کہاں
کچھ دم رہے ہیں یاس کے، بیدل گزارنے

☆

میری حالت پہ واں نظر نہ ہوئی
آہ منّت کشِ اثر نہ ہوئی
وصل میں ہجر کی تسلّی کیوں
غیر کی رات کیا بسر نہ ہوئی
شکوۂ جور گو اِدھر نہ ہوا
پر وفا پر نظر اُدھر نہ ہوئی
آنکھ بے صبر ہو کے پھوٹ پڑی
پردہ دار اپنی چشمِ تر نہ ہوئی
دل سے کہتا رہا فسانۂ ہجر
قصہ گوئی میں بھی سحر نہ ہوئی

☆

تمھیں کہو کہ شکایت ہے جا بجا کس کی
ہوئی زمانے میں یوں شہرتِ جفا کس کی
اُچٹ کے دل سے جگر میں گیا خدنگِ نگاہ
نشانہ کون تھا، اور آگئی قضا کس کی

☆

ترا وہ حسن کہ ہنگامہ طلب عالم سے
مرا وہ دم کہ چلا میری نظر سے پہلے
تجھ کو پیغام سفر دیتی ہے، بیدل! پیری
کرتے کچھ فکرِ سفر، وقتِ سفر سے پہلے

•

[تزکِ محبوبیہ، ۲ (دفترِ ہفتم): ۳۳-۳۴، خم خانۂ جاوید، ا: ۶۷۲-
۶۷۴، دارالعلوم کے سپوت: ۸۳، دیباچۂ دیوان بیدل (قلمی)]

بے صبر... منشی بال مکند سکندر آبادی

یہ بھی اسی سکندر آباد (ضلع بلندشہر۔یو پی) کے رہنے والے، ایک بھٹناگر کائستھ خاندان کے فرد تھے، جہاں کے منشی ہرگوپال تفتہ (تلمیذِ غالب) تھے، بلکہ تفتہ اُن کے ماموں تھے۔ بے صبر کے والد کا نام رائے کانھ سنگھ تھا۔ (خم خانۂ جاوید، ا: ۶۸۲ میں نام کانجی مل، یہ غلط معلوم ہوتا ہے) یہ خاندان دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا، اُنھیں وہاں کے ایک مقام ''ڈگال''☆ سے منسوب کیا گیا ہے۔ خدا معلوم، یہ لوگ کس زمانے میں اور کیوں وہاں سے نقلِ مکان کر کے یو پی چلے آئے، لیکن بہرحال اس سے ان کی آل ''ڈگالیہ'' پڑ گئی۔

بے صبر نے بکرمی سمبت میں اپنی تاریخِ ولادت ایک قطعے میں یوں لکھی ہے:

مرا سالِ ولادت ہندوی میں
جو کوئی صورتِ معنی میں پاوے
تو کردے قافیے کو دُور، تا ہوں
ہزار و ہشت صد و نہ آوے
(۱۸۶۹ بکرمی)

(بکرمی سمبت ۱۸۶۹ مطابق ہے، ۱۸۱۲۔۱۸۱۳ عیسوی کے)

بے صبر کی تعلیم بہت معقول تھی۔ یوں بھی اُس عہد میں کائستھوں میں فارسی، عربی پڑھنے کا عام رواج تھا کیوں کہ یہ لوگ بالعموم حکومتِ وقت کی ملازمت میں داخل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۶ برس کی عمر میں اُنھوں نے فارسی اور عربی کے علاوہ ریاضی

میں بھی معقول دست گاہ حاصل کرلی۔ نجوم، ہیئت، منطق اور تصوّف و ویدانت سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو اپنے ماموں ہرگوپال تفتہ سے رجوع کیا اور اُن سے عروض اور رموزِ شاعری کی تعلیم حاصل کی۔ بعد کو تفتہ کی ترغیب اور ایما ہی پر غالب کا تلمذ اختیار کیا۔ غالب کے متعدد خطوں میں اُن کا ذکر ہے۔

سترہ سال کی عمر تھی، جب انگریزی عمل داری میں محکمۂ پرمٹ میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن یہاں سے دل اُچاٹ ہو گیا، تو اُسے چھوڑ کر سہارن پور کلکٹری میں نوکری کرلی۔ ۱۸۶۱ء میں جوان بیٹے کی موت سے دل شکستہ ہو کر ۱۸۶۳ء میں پنشن پر میرٹھ میں خانہ نشین ہو گئے۔

اُن کی اولاد میں چار بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ خود چوتھے بیٹے سری کرشن سروپ کی ولادت پر قطعۂ تاریخ کہا تھا:

فرزندِ چارمی چو بمن داد کردگار
ہر دم زدیدنش دلِ من شاد می شود
بے صبر چوں بظاہری و معنوی بجست
"سالِ ہزار دو صدو ہفتاد می شود"
(۱۲۷۰ھ): (۱۸۵۳ء)

ان کے نام تھے: (۱) ہرسروپ۔ یہ ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ بے صبر نے اِن کی تاریخِ ولادت کہی تھی: سن یک ہزار و دو صد و شصت
(۱۲۶۰ھ)

ہرسروپ کا بے صبر کی زندگی ہی میں ۱۸۶۱ء/ ۱۲۷۹ھ میں انتقال ہو گیا۔ اسی کی وفات کے بعد اُنھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا۔ بے صبر نے خود اِن کی وفات کی دو تاریخیں کہی تھیں:

عیسےٰ نے دی صدا کہ: "ہوا ہاے کیا غضب" (۱۸۶۱ء) اور
"ہے ہے دریغا وائے وائے" (۱۲۷۹ھ)

برہما سروپ: یہ ۱۹۰۴ بکرمی / ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ اِن کی تاریخِ ولادت کہی تھی:

پسر یہ واہ ہوا فخرِ خانداں پیدا (۱۹۰۴ بکرمی)

یہ بے صبر کی وفات کے بعد تک زندہ رہے۔

۳۔ کرشن چندر سروپ: اِن کی تاریخِ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ بھی بے صبر کی وفات کے بعد زندہ تھے۔ شعر بھی کہتے تھے، منیر تخلص تھا۔

۴۔ بنی سروپ: یہ سب سے چھوٹے تھے۔ ان کا ۱۸۷۳ء میں انتقال ہوا، جب ان کی عمر صرف ۲۰ برس کی تھی، اِن کی ولادت ۱۸۵۳ء کی ہے۔

بے صبر کے نام لیوا آج بھی سکندرآباد میں موجود ہیں، اور خاندان ماشاء اللہ بہت خوش حال اور فارغ البال ہے۔

بے صبر بڑے قادر الکلام اور پُرگو تھے۔ ان کی تصانیف میں مندرجۂ ذیل کتابوں کا پتا ملا ہے:

اُردو کے تین دیوان (۱) دیوانِ عام (غزلیات، رباعیات، قطعات)، (۲) دیوانِ خاص (غزلیات) (۳) دیوان قصایدِ اُردو (۵۴ قصائد، ترکیب بند، ترجیع بند)، (۴) دیوانِ فارسی (غزلیات، قطعات، رباعیات، تضمین)

تین مثنویاں: (۱) لختِ جگر (تاریخی نام: ۱۲۵۳ھ)، (۲) اخگرِ عشق، اس کی تاریخ بے صبر نے خود کہی تھی:

جس کا سن ''لالۂ پرداغ'' ملا
۱۲۷۳

پر وہ لالہ بسرِ باغ ہوا
۱۲۷۵=۲+

تیسری مثنوی کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

''سراپا سخن'' میں ''یادگارِ فرزنداں میں نوحہ و سراپا بطرز جدید'' کہا ہے (ممکن ہے، یہ تیسری مثنوی ہو)

نثر میں (۱) ''ادیب البنات'' میں مستورات کو تہذیب الاخلاق کی تلقین کی گئی ہے (۲) ''گلستانِ ہند'' جو شیخ سعدی کے تتبع میں ہے۔

''بدیع البدائع'' میں کلام کے مروّجہ صنائع و بدائع کا ذکر ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف کہی تھی:

پے تاریخِ ختمِ ایں رسالہ
بسالِ عیسوی دل در شمار است
بگویم از سرِ بہجت کہ بے صبر
''بنام ایزد عجب باغ و بہار است''
(۱۸۷۰=۱۸۶۸+۲)

اس میں صنائع کی مثالیں فارسی شعرا کے علاوہ اردو میں سرتاسر اپنے کلام سے مہیا کی ہیں، جس سے خود ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ اگرچہ جیسا کہ دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ۴۸ صفحات کا مختصر رسالہ حسب منشا و اشتہار لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی (یو پی) ۱۸۷۰ء میں تصنیف ہوا تھا، لیکن یہ اگست ۱۸۸۵ء میں مطبع دبیر ہند، بلند شہر میں طبع ہوا۔

اپنے استاد کے عاشق زار تھے۔ ایک قصیدہ ''پرکالۂ آتش'' میں اُن سے متعلق کہتے ہیں:

جس کا غالب ہے تخلص، اسد اللہ ہے نام
یہ تو ہے کفر جو کہیے کہ ہے یزداں میرا
پر ہے ہادی مرا، رہبر مرا، استاد مرا
قبلہ ہے، کعبہ ہے، دیں میرا ہے، ایماں میرا
مجھ کو گویا ہے حدیث اس کا جو ہے اردو کلام
فارسی اس کا وہ دیوان ہے قرآں میرا

انوری ہے مرا، اور وہ ہے مرا خاقانی
آگرہ، خاور ہے اور دلّی، ہے شرواں میرا
فاریاب اس کا ہے گھر، کوچہ ہے اُس کا ساوج
ہے ظہیر اپنا وہی، اور ہے وہی سلماں میرا
درِ عرفی و شفائی پہ جبیں سا نہیں میں
کعبہ شیراز ہے، نے قبلہ، صفا ہاں میرا

☆

ایک دوسرے قصیدے ''دودِدل'' میں کہتے ہیں:

سودا و میرو مصحفی و جرأت اور درد
مجھ کو نہیں ہے کام کچھ اُن رفتگاں کے ساتھ
ممنون و مومن، آتش و ناسخ، نصیر و ذوق
کچھ واسطہ نہیں ہے اُن اہلِ زباں کے ساتھ
جو مہر کو ہے ذرّے سے نسبت، وہی مجھے
نسبت ہے میرزا اسد اللہ خاں کے ساتھ
غالب ہے غالب الشعرا کا مرے لقب
رشتہ تلامذہ کا ہے اس نکتہ داں کے ساتھ
اس شاہِ ملکِ نظم سے ہے مجھ کو مشورہ
مثلِ بزر جمہر ہوں نوشیرواں کے ساتھ
ایراں کو عہدِ غالبِ عالی جناب میں
تابِ مقاومت نہیں ہندوستاں کے ساتھ

ایک قطعے کے چند شعر دیکھیے:

میں اپنے جان و دل سے ہوں فدائے میرزا غالب
سراپنا ہے سدا قربانِ پائے میرزا غالب

نہ کیوں نام اُس کا سب ناموں پہ غالب ہو کہ دنیا میں
ہوئی نام آوری پیدا برائے میرزا غالب
اگر ملکِ سخن کی سلطنت بخشے مجھے خسرو
نہ لوں میں کیوں کہ ہوں میں تو گدائے میرزا غالب
کسی کی طبع، اے بے صبر! ایسی ہے، نہ فکر ایسی
زہے فکرو زہے طبعِ رسائے میرزا غالب

غالب کی وفات پر قطعاتِ تاریخ کہے تھے:

ہماں میرزا غالب اُوستادِ من
بجان آفریں، جاں چو آخر سپرد
پرسیدم از دل سنِ رحلتش
بنالید و گفت: ''آہ غالب بمُرد''
(۱۲۸۵)

اسد اللہ خاں وہ غالب، آہ
جس سے اہلِ کمال تھے مغلوب
جب سدھارے بسوے خلد، ہوے
سخن اُن کے الم میں سینہ کوب
اس سپہرِ سخن کے اختر کا
مجھ کو سالِ غروب تھا مطلوب
کہا عیسیٰ نے از سرِ حسرت
''ہوا حیف آفتابِ ہند غروب''
(۱۸۶۹=۱۸۶۱+۸)

اُس صاحب کمال کا ۷۵ برس کی عمر میں جمعہ ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء (۲۷ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ) شیوراتری کے دن میرٹھ میں انتقال ہوا۔ اُن کے

صاحب زادے منشی کرشن سروپ منیر نے قطعہ کہا:

بے صبر چوں ز عالمِ فانی بخلد رفت
عالم بچشمِ اہلِ بصیرت سیاہ شد

بازم مپرس حالِ دلِ بیقرارِ من
دُور از سرم چوسایۂ آں قبلہ گاہ شد

اے سایۂ سعادتِ ازلی، کجاشدی
باز آکہ حالِ منشیانت تباہ شد

بارے بگو کہ تاچہ گناہ دیدۂ زمن
اے دیدہ ام بخاکِ رہت فرشِ راہ شد

سالِ وفاتِ توزکہ پرسم کہ بعدِ تو
ایں سلسلہ گستہ چومتروک راہ شد

چوں فکرِ سال ناختم اندر جگر خلید
ازیمنِ برکتت سوے غیبم نگاہ شد

ہاتف بگفت ترک دو کردہ بسالِ ہند
بستہ درِسخن چو فنا فی اللہ شد

اعدادِ حرفِ اوّلیں ابیات کن شمار
سنِ شریف داں کہ چہ سپیدو سیاہ شد

اس کے پہلے مصرعوں کے حرفِ اوّل جمع کرنے سے ان کی عمر کے سال (۷۵) معلوم ہوتے ہیں۔ میں نمونہ کلام ذرا طویل دے رہا ہوں کیوں کہ ان کا کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔

میرا سر آج زیرِ خنجر ہے
کون دنیا میں میرا ہم سر ہے

میرا سر اس کی راہ کا ہے سنگ
آتے ٹھوکر ہے، جاتے ٹھوکر ہے
دشتِ وحشت میں ہوں میں سرگرداں
پاؤں میں میرے ایک چکّر ہے
گر سرِ بے گنہ کشی ہے، تو آ
طشت ہے، سر ہے، اور خنجر ہے
ہم سری سرو گر کرے اس سے
اس کا دعویٰ غلط سراسر ہے
اشک و لختِ دل اور داغوں سے
گہر و لعل و زر میسر ہے
منّتِ خار و سنگ کا احساں
پاؤں پر میرے، میرے سر پر ہے
خیلِ عشاق کا میں ہوں سردار
کہ سرِ دار پر مرا سر ہے
سنگِ در پر ترے بوقتِ سجود
سرِ شاہ و گدا برابر ہے
خاک اس کی گلی کی، اے بے صبر!
سرورانِ جہاں کی افسر ہے

☆

اے وائے کہ ہیں ایک ہم، اور کام بہت
درپیش ہے راہِ عدم، اور کام بہت
رہنا ہے یہاں دم کے دم، اور کام بہت
افسوس، زندگی ہے کم، اور کام بہت

☆

اس آفتِ جاں سے کر کے یاری ہم نے
حاصل نہ کیا جز آہ و زاری ہم نے
معلوم مصیبتیں نہ یہ عشق کی تھیں
دل دے کر کی یہ اپنی خواری ہم نے

☆

دیکھوں قیامت آتی ہے کیا میری جان پر
پھر سینے میں نہیں مرے دل کو قیام آج

☆

کہا جو میں نے، ستم جو سنے نہ تھے، دیکھے
کہا کہ سنتا ہے [کیا؟] دیکھیو، ابھی کیا ہے!

☆

وعدہ جو شام کا ہے، تو بے تابیوں سے ہم
شامت میں ہیں کہ دیکھیے، کب ہوگی شام آج

☆

بگاڑی بات میری، اور بنائی اس سے بات اپنی
رقیبوں کی بن آئی ہے، خدا کی کیا خدائی ہے

☆

کرتے کرتے خودپرستی، ہو گیا میں بُت پرست
کفر حد سے جب کہ گزرا، بس وہی ایماں ہوا

☆

اس قدر دل میں میرے درد ہوا
کہ سحر ہوتے ہوتے سرد ہوا

آتی ہے آمدِ خزاں کی خبر
رنگِ رُوئے بہار زرد ہوا
پہنچا کب منزلِ مراد کو جو
راہِ الفت میں رہ نورد ہوا

☆

کونسا آپ کا کیا نہ کیا
وہ تو فرماؤ، میں نے کیا نہ کیا
تو نے سمجھا مجھے برابرِ غیر
سب برابر ہوا، کیا نہ کیا
تو نے کس دن بلایا جو میں نے
پاکو سر، سر کو اپنے پا نہ کیا

☆

نہ کعبے میں، نہ بت خانے میں دیکھا
سماں جو دل کے کاشانے میں دیکھا

☆

کہتا تھا ہو کے باغ سے مرغِ چمن جدا
یارب! نہ ہو کسی سے کسی کا وطن جدا

☆

اس کوچے میں جائیں گے نہ ہم ہم سے نہ ہوگا
کیا کھائیں قسم، پاسِ قسم ہم سے نہ ہوگا

☆

لہو بدلے آنسو کے آنے لگا
مرا گریہ اب رنگ لانے لگا

☆

دعویٰ، اے لعبتِ ناخدا ترس
نہ خدائی کا کر، خدا سے ڈر
حال سن کر کہا کہ جھوٹ نہ بول
قصہ کر مختصر، خدا سے ڈر
کر نہ دل کو خراب، خانہ خراب
ہے خدا کا یہ گھر، خدا سے ڈر

☆

چشمِ دزدیدہ، یاد رکھیو کہ ہے
سادھ کا ایک چور کے سو روز

☆

نہ کسی دوست تلک جاؤں، نہ غم خوار کے پاس
یا تو تنہا ہی رہوں، یا رہوں دل دار کے پاس
اٹھ گئے آج تو کچھ جلد، خدا خیر کرے!
آن کر حضرتِ عیسیٰ ترے بیمار کے پاس

☆

گر ترے وصفِ مژہ پر دل نے دو چار حرف
تیر پر بھیجے ترا، اور سناں پر چار حرف

☆

خالی اُلفت سے زمانے میں ہے کون
مفت بد نام ہے نامِ عاشق

☆

مجھ خضر کو راہ دکھائے گا کب تلک
قاصد! تو سچ بتا کہ وہ آئے گا کب تلک!

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر
مانند شمع مجھ کو جلائے گا کب تلک!
تہمت لگا کے شکوے کی چپ تم کرو کے ظلم
شکوہ کوئی زباں پہ نہ لائے گا کب تلک

☆

رہتے ہیں منتظر ترے لاکھوں ہی راہ میں
جانے فسوں ہے کیا تری کافر نگاہ میں!

☆

نہ کوئی دوست رہا ہے نہ اب رفیق اپنا
بُرے دنوں میں، یہ سچ ہے کسی کا کوئی نہیں
زمانہ ہو گیا عشقِ بتاں میں کافر اب
رفیق غیرِ خدا، شیخ جی کا کوئی نہیں

☆

شعر گوئی کو اب فراغ کہاں
میں کہاں، دل کہاں، دماغ کہاں!
میری قسمت میں خونِ دل کے سوا
بادہ وشیشہ و ایاغ کہاں!

☆

جو قتلِ دل ہے تریاں زدہ تو بس ہوا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
رموزِ عشق کو سمجھے ہوئے ہو تم، بے صبر!
جناب حضرتِ ناصح کی بات کیا سمجھو

☆

کبھی آتے ہو تم، نہ جاتے ہو
صرف باتیں ہی تم بناتے ہو
موسمِ گل میں مثلِ برق و سحاب
کچھ ہنساتے ہو کچھ رُلاتے ہو

☆

میں بچھڑا حق سے، بت بچھڑا مجھ سے
جاؤں اب میں پناہ میں کس کی!

☆

نہ کسی یار سے نہ ہمدم سے
دوستی اب تو ہے فقط غم سے
تجھ کو کس سروقد کا ہے بے صبر!
کہ تو آزاد ہے دو عالم سے

☆

آپ تو واں گئے اور ہم کو یہاں چھوڑ گئے
ہائے کیا کر گئے تم، ہم کو کہاں چھوڑ گئے

☆

مدعا گر ہے تو یہ ہے عاشقِ دل گیر کا
اشک میں ہوتا اثر کا، آہ میں تاثیر کا
بے خودانِ عشق کو کیا حاجتِ ترکِ لباس
تن سے پیراہن جدا ہوتا نہیں تصویر کا
آدمی کی کٹتی ہے بے صبر! کس سختی سے عمر
پیر ہوتا طفل کا، لانا ہے جوئے شیر کا

☆

عیاں جب اپنا فروغِ جمال تو نے کیا
تمام کر دیا مہ کو، کمال تو نے کیا

☆

زبس ہر چیز کی قدر اس کی ضد سے ہوتی ہے ظاہر
ہوئی جس روز سے شادی، نہ ہم نے لطفِ غم پایا

☆

فتورِ پیری نے آکے قویٰ میں ڈال دیا
سحر نے تفرقہ مہماں سرا میں ڈال دیا

☆

تجھ سے کیا اس کا گلہ، کیا ترا احساں مجھ پر
غیر پر تیر چلایا تھا، مرے آن لگا

☆

کر کے مجھ کو قتل، وہ مغرور بولا غیر سے
تھا بہت اس کو بھی اپنی سخت جانی پر گھمنڈ

☆

کچھ میں کہتا ہوں، تو کہتے ہیں کہ: ''کیا چاہتے ہو؟''
''چپکے بیٹھے نہیں رہتے ہو، اٹھا چاہتے ہو''
تم نہ بولے، تو نہ بولا کوئی تم سے بے صبر!
اب کہا چاہتے ہو کچھ، تو سنا چاہتے ہو

☆

غیر کو دیکھنا بچشمِ عتاب
دیکھنے کا بہانہ تو دیکھو

☆

تیغ ابرو شہرۂ آفاق ہے
چشم بددور! اپنے فن میں طاق ہے

☆

یاد جب مجھ کو یار آتا ہے
گریہ بے اختیار آتا ہے

☆

ابھی تو گزرے ہیں دن ایک دو، ابھی کیا ہے
دلا! تو بیٹھا کوئی دن تو رو، ابھی کیا ہے

☆

زمیں سے آسماں، اور آسماں سے لامکاں پہنچے
تلاشِ یار میں دیکھو، کہاں سے ہم کہاں پہنچے

☆

سوزِ جگر یہ اپنا نہیں، خود بخود ضرور
یہ آگ تو کسی کی لگائی ہوئی سی ہے
بوٹا سا قد، چھریرا سا تن، چمپئی سا رنگ
بھولی سی صورت، آنکھ لجائی ہوئی سی ہے

☆

وہ جوشِ خوں نہیں، محتاج ہو جو نشتر کا
نہ نکلے توڑ کے جو رگ کو، وہ لہو کیا ہے
گر افتخار ہے معشوق کا، تو عاشق سے
نہیں جو میں ترے نزدیک کچھ، تو تو کیا ہے
نہیں ہے صبر، تو بے صبر! ہے تلاش عبث
جو چیز کھوئی گئی، اُس کی جستجو کیا ہے

☆

آخر ترے غم میں مر گئے ہم
بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم
بے صبرا! نہ جان کا کیا خوف
اس کوچے میں بے خطر گئے ہم

☆

اس دل نے کیا خراب مجھ کو
دکھلائے نہ کیا عذاب مجھ کو
بے صبرا! میں زندگی سے ہوں تنگ
دے موت خدا شتاب مجھ کو

☆

جاناں دہدم شراب و نوشم
ایں کفر بدیں نمی فروشم
بر ساقی و بادہ، باد قرباں
نقدِ دل و دین و صبر و ہوشم
دستِ من و دوشِ عیش کامروز
دستِ صنم است زیبِ دوشم
از نغمہ زباں مباد خاموش
گوید بدم آرکے خموشم
یار و مے و مطرب است بے صبرا!
باید کہ نہ جز نشاط کوشم

[تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود: ۳۳ ـ ۳۷، بہار سخن: ۸۶ ـ ۸۷،

خم خانۂ جاوید، ۱: ۶۸۲۔۶۸۳، اُردو ادب (تماہی)، ۶: ۳: ۹۴۔
۱۱۹، (مضمون بال مکند بے صبر، از قاضی معراج دھول پوری)،
کلیاتِ بے صبر (قلمی)]

حواشی:

☆۔ پنجاب (پاکستان) کے ضلع گجرات کی تحصیل پھالیہ میں ایک مختصر قصبہ "دگل" ہے۔ یہ پھالیہ سے کوئی دو میل جنوب کی طرف واقعہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ "دگال" سے یہی جگہ مراد ہو۔

بے صبر... عین الحق کاٹھوی

ضلع میرٹھ (تحصیل باغپت) میں ایک قصبہ کاٹھ ہے، وہیں کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر سرکاری ملازمت میں بسر کی۔ بعد کو ریاست نانپارہ (یو پی) میں بہرائچ کے قریب ایک گاؤں رام پور ٹھیکے پر لے لیا۔ یہیں ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

فارسی کی تعلیم بہت اعلیٰ تھی، بلامبالغہ ہزارہا شعر یاد تھے۔ ایک ''تذکرۃ الشعرا'' مرتب کیا۔ ایک کتاب ''سرقہ شعری'' کے نام سے لکھی تھی۔ دونوں کے مسوّدے بہرائچ میں حضرت سالار جنگ مسعود غازی کے کتب خانے میں ہیں۔

[از جناب بدر الدّین صاحب مرحوم سجادہ نشین رٹول (ضلع میرٹھ)]

• پیرجی ... پیر قمر الدین دہلوی

کتب فروشی اور معلّمی ذریعۂ معاش تھا۔ غالب کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک سے بھی اصلاح لی۔ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰۔ ۱۸۸۱ء) میں فوت ہوئے۔ غالب رام پور سے شمشاد علی بیگ رضوان کو لکھتے ہیں (۴ نومبر ۱۸۶۵ء):

پیرجی بہت یاد آتے ہیں، ان کو دعا کہنا (اُردوئے معلّیٰ: ۲۳۸)

یہاں پیرجی سے یہی پیر جی قمر الدّین مراد ہیں۔ صرف چند شعر اور ایک غزل ملی:

گو پیرجی سے تم کو محبت نہیں، نہ ہو
کیا اعتقاد بھی نہیں ان کی جناب میں

☆

وہ کیا غیر سے رشتۂ مہر توڑیں
کہ یہ بھی نزاکت کے شایاں نہیں ہے
مرے دل کو ہو کس طرح سے مسرّت
کہ اس بزم میں ہائے رضواں نہیں ہے
ہر اک شعر اس کا ہے گنجِ معانی
مقرّر یہ غالب ہے، شاداں نہیں ہے

(رضوان سے شمشاد علی بیگ رضوان اور شاداں سے حسین علی خاں شاداں مراد ہیں۔)

بیاں کیوں کر ہو دکھ مجھ سے، ستم گر! سوزِ پنہاں کا
کہ تیرے ہجر میں کیا حال ہے میرے دل و جاں کا
مجھے جمعیتِ کونین حاصل سر بسر ہوتی
اگر پابند ہوتا آپ کی زلفِ پریشاں کا
مرے گریہ کے طوفاں نے ڈبویا خانۂ دشمن
نہ ہوں ممنون کیوں کر اپنے جوشِ چشمِ گریاں کا
ترے رُوئے منوّر کی وہ تابش ہے کہ، اے جاناں!
مقابل ہو سکے، منہ یہ کہاں مہرِ درخشاں کا
ہوئے جو تارکِ دنیا، ملی ہے عشق کی دولت
نہیں، اے ہمدمو! یہ کام ہر اک فردِ انساں کا
رہ و رسمِ محبت سے خبر تم کو نہیں اصلا
ٹھکانا زاہدو! کیا ہے تمھارے دین و ایماں کا
کیا وعدہ بھی آنے کا، اگر اس نے، خدا شاہد
یقیں ہم کو نہیں، ہمدم! کسی کے عہد و پیماں کا
اٹھائے گر نقاب اپنے رُخِ پُر نور سے جاناں
بسنتی رنگ ہو جائے حیا سے ماہِ تاباں کا
ملا کر آنکھ، چھینا اہلِ عالم کا دلِ خود بیں
لقب ہو دل ربا کیوں کر نہ تیری چشمِ فتاں کا
یہ کیوں کر رنگ و بو پھولوں کی نقشِ آب ہو ہمدم!
کہ طرّہ کھل گیا ہے آج پھر اس سنبلستاں کا
تجھے کیوں، پیرجی! روزِ جزا کا ڈر ہے عصیاں سے!
شفاعت کو ہے کافی واسطہ شاہِ رسولاں کا

[خم خانۂ جاوید، ۲: ۱۳، مشاعرۂ دہلی، جون ۱۸۷۸ء (بحوالۂ خط ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس)، ماہِ نو (ماہنامہ) کراچی، جنوری/ فروری ۱۹۶۹ء،۶۲]

تپش ... مولوی غلام محمدؔ خان دہلوی

یہ دراصل دلّی کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں نواب اکبر علی خان بہادر کے زمانے میں دربارِ پٹودی میں بزمرۂ شعرا ملازم ہوئے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو لکھنؤ پہنچے اور وہاں آٹھ برس تک منشی نول کشور کے مشہور ''اودھ اخبار'' کے ایڈیٹر رہے۔ اپنے زمانے کے مشہور صحافی تھے۔ جب ۱۸۷۷ء میں ''اودھ اخبار'' سے الگ ہوئے تو لکھنؤ ہی سے اپنا ذاتی ہفتہ وار پرچہ ''مشیرِ قیصرِ ہند'' جاری کیا۔ یہ اخبار بہت دن چلا۔ اس کا پہلا پرچہ یکم ستمبر ۱۸۷۷ء کو شائع ہوا تھا۔ جب امیر مینائی کی امیر اللغات کی دونوں جلدیں شائع ہوئی ہیں تو اس پرچے میں ایک مسلسل مضمون اس کی اغلاط سے متعلق نکلتا رہا تھا۔

۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲-۱۹۰۳ء) میں فوت ہوئے۔ عیش باغ لکھنؤ میں مدفن ہے۔

نظم و نثر، اُردو، فارسی، عربی اور تاریخ گوئی میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ اخیر میں شعر گوئی تقریباً ترک کر دی تھی، صرف نثر لکھتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

سادگی میں بھی نکلتے ہیں ترے لاکھ بناؤ
بن گئے حسنِ خداداد کا زیور گیسو

منفعل ہوتے ہیں بد ملتے ہیں جب نیکوں سے
سرنگوں ہیں ترے رخسار کے اوپر گیسو

گرد مہ کے ہیں، دھواں دھار گھٹائیں اتنی
کاکل و ابرو و خط، زلفِ معنبر گیسو

مست ہو جائیں نہ کیوں، آہوے تاتار و ختن
ہوں ہوا دارِ صبا، جب ترے کھل کر گیسو

☆

سچ تو یہ ہے کہ نہ حور اچھی نہ جنت اچھی
سامنے میرے اگر ہو تری صورت اچھی
کیا بیاں کیجیے، کس طرح کٹی ہجر کی رات
شبِ فرقت سے تو ہے صبحِ قیامت اچھی
شکوۂ جور و ستم سن کے زباں سے میری
بولے وہ: عشق میں جتنی ہو مصیبت اچھی

☆

زاہدو! ذکرِ خدا ہم کیا کریں
ہے بتوں کی یاد ہر دم، کیا کریں!
اپنے غم میں مر رہے ہیں آپ ہم
غیر کے مرنے کا ماتم کیا کریں!
میرے مرنے کی خبر سُن کر، تپش!
بولے وہ بے ساختہ: ''ہم کیا کریں!''

☆

ناصح! جو راز عشق کا کچھ جان جایئے
کیسی ملامت، آپ ہمیں بان جایئے
اُس حوروش نے آ کے کہا لاش پر مری
مشکل ہوئی اب آپ کی آسان، جایئے
عشق بتاں سے کیجیے توبہ، تپش ضرور
کعبہ شریف ہو کے مسلمان، جایئے

☆

ہمیں دل لگانے کی فرصت نہیں
حسینوں سے ملنے کی عادت نہیں
زمانے میں کیا حسنِ صورت نہیں
مگر سیرت و آدمیت نہیں
تجھے زاہدِ خشک! کیوں کر ہو عشق
مقدّر میں تیرے یہ نعمت نہیں

☆

محبّت ہے ان کی عداوت کے بعد
عداوت ہے لطف و عنایت کے بعد
نہ اب تفرقہ ڈال، اے آسماں!
ملے ہیں بہت رنج و حسرت کے بعد
لگانا نہ دل، اے تپش! تم کہیں
نہیں خیر عشق و محبّت کے بعد

☆

اپنا مقصود ہے دیدار صنم اے واعظ
حور کیا چیز ہے، اور خواہشِ جنّت کیسی
اپنے مرنے کا نہیں غم، مگر اس کا ہے الم
چھپ گئی آنکھوں سے وہ چاند سی صورت کیسی
میری غم خوار ہے، دل سوز ہے، اک شمعِ مزار
رات بھر اشک فشاں ہے سرِ تربت کیسی

☆

بہ قبضہ، مطلعِ پُرنور آفتابِ ظفر
بہ لمعۂ نظر افروز، مشرقِ تنویر

بود بہ معرکہ از بس غذائے تیغش خوں
بکف چو نبض طپد، موجِ جوہرِ شمشیر
ہلال پیکر و خورشید لمعہ، سعدسرش
ستارہ جو ہرو سیماب چشمہ، برق خمیر
بشرحِ گرم رویہاے برقِ طبع سمند
عنانِ خامہ طپد، ہمچو نبض در تحریر

[یادگارِ ضیغم: ۴۳۰، گلدستۂ سخن، ۱۸۔ ۲۰، آبِ بقا: ۱۷۰، قصایدِ مدحیۂ نظام، ۳۷۸، اردو کے اخبار نویس: ۲۹۱۔ ۲۹۷، پیامِ یار: (دسمبر ۱۸۸۹): ۲]

تپش ... سیّد مدد علی اکبر آبادی

اصل اُن کی ایران سے ہے۔ اُن کے والد کا نام میر نجف علی جعفری سبزواری تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق سے ملتا ہے۔ تپش تقریباً ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰۔ ۱۸۲۱ء) میں آگرے میں پیدا ہوئے اور وہیں محلّہ زین خانہ میں سکونت رہی۔ معلّمی پیشہ تھا۔ عربی، فارسی دونوں زبانوں میں معقول دستگاہ تھی۔ فارسی مولوی قمر الدین خان سے اور عربی تاملاحسن اور صحیح مسلم مفتی ریاض الدین خان سے پڑھی۔ شروع میں میاں نظیر اکبر آبادی کے صاحب زادے خلیفہ گلزار علی اسیر سے چند غزلوں پر اصلاح لی۔ بعد کو مرزا غالب کے شاگردوں میں شامل ہوگئے۔ اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شیعی مذہب کے پیرو تھے۔

متعدد تصانیف مثلاً خزینۃ القواعد، فاتح الاذہان، محارباتِ ہند (۱۲۲۸ھ تا ۱۲۸۶ھ) جغرافیۂ منظوم، رسالہ مظہرِ علم در حساب، ہدایت الانام بہ منقبت چہار دہ معصومین، ان سے یادگار ہیں۔ ایک رسالے میں اردو محاوروں سے متعلق دادِ تحقیق دی تھی، اسے مولوی غلام جیلانی وکیل عدالت صدر دیوانی کی نذر کیا تھا۔ منشی شیونراین آرام (شاگردِ غالب) نے جو گلدستہ معیار الشعرا جاری کیا تھا، اس کی تہذیب و ترتیب کا کام بھی تپش سے متعلق رہا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف علوم سے دلچسپی تھی۔

خم خانۂ جاوید میں تپش کا حال طپش تخلص کے تحت بھی لکھا گیا ہے۔ صحیح تپش

ہے (جیسا کہ مدد علی نے خود لکھا ہے) کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

یار نے سن کے مرے نالے، تجاہل سے کہا
"کوئی تو روتا ہے، واللہ مقرر باہر"

☆

بے اثر ہوتی نہیں، سنتے ہیں آہِ عاشقاں
پھر یہ کیا ہے، آہ کا اپنی اثر ہوتا نہیں

☆

تری ہے عفو کی عادت، مری ہے عصیاں کی
کیا ہے کس لیے پھر موردِ قصور مجھے
فراق و درد و الم، غم، ستم، فغان و تپش
یہ ساتوں گھیرے ہیں ہفتے سے بے قصور مجھے

☆

کبھی ناداں بنے ہم گاہ فخر الاذکیا ٹھہرے
کبھی رندِ شرابی اور کبھی ہم پارسا ٹھہرے
گدا تیرے کرم سے خسروِ حاجت روا ٹھہرے
"تری دیوار کے سائے تلے آکر ہما ٹھہرے"
اسیرانِ محبت کوچۂ دل دار میں جا کر
کبھی رسوا ہوئے، گہ موردِ لطف و عطا ٹھہرے
نہ ہووے تا بہ امکاں عاشق و معشوق ہرجائی
گلِ خورشید کیا ممکن جو گردش سے ذرا ٹھہرے
جو کامل ہیں ملائم گفتگو کرتے ہیں ہر اک سے
روئی پھر کیوں نہ منھ پر شیشۂ مے کے بھلا ٹھہرے

مرے اعمال نامہ سے نہ ہو چیں برجبیں، زاہد!
یقیں ہے یاں عنایاتِ جنابِ کبریا ٹھہرے
چرائی تھی کچھ آب اس کے رخِ تاباں کی خنجر نے
بتاؤ، کیوں نہ صاحب! زخمِ دل میرا ہرا ٹھہرے
بسانِ دانۂ تسبیح جس کو ہو سدا گردش
قضا کے ہاتھ پھر کیوں کر نہ اس کا فیصلہ ٹھہرے
کدورت اختلاطِ ظاہری میں آہی جاتی ہے
نہ کیوں پھر شاخِ پیوندی کا پھل خوش ذائقہ ٹھہرے
غم و درد و الم، رنج و مصیبت ساتھ ہیں میرے
خدا جانے یہ کس منزل پہ جا کر قافلہ ٹھہرے
جو جاؤں ان کے در تک، تو نہیں آنے وہ دیتے ہیں
کروں گر جبر دل پر، تو گماں اُن کو بُرا ٹھہرے
نہ باندھیں ہاتھ بے تقصیر جو پہلے سے یہ گل رو
تو ناحق خلق میں بدنام کیوں دُزدِ حنا ٹھہرے
رقیبِ روسیہ کا خوف، درباں کا رہا کھٹکا
کبھی ہم بھولے بھٹکے جو ترے کوچے میں آٹھہرے
بلاؤ یا نکالو، بیٹھنے دو یا کھڑا رکھو
میں راضی ہوں اسی میں، آپ کی جس میں رضا ٹھہرے
رہوں چپکا تو کہتے ہیں! زباں کیا کٹ گئی تیری
کبھی کچھ بولتا ہوں تو وہ شکوہ اور گلا ٹھہرے
اکڑ کر قدِ دل بر سے نہ پھل کچھ سرو نے پایا
مقابل مہرِ تاباں کے سہا ہووے، تو کیا ٹھہرے

زمیں سے تا فلک سب، رہ گئے اپنا سا منھ لے کر
ضعیف الخلق تھے، پر ہم بھی مقبولِ خدا ٹھہرے
احد میں میم داخل اور احمد میں احد شامل
جلیں جس جا پرِ جبریل، واں کب دوسرا ٹھہرے
کہا فرقت میں دل رکھنے کو، گردن کے قریب آ کر
نہ ہم تم سے الگ ٹھہرے، نہ تم ہم سے جدا ٹھہرے
زہے قسمت، تپش اس کی محمد جس کا حامی ہو
نصیبہ ور وہ ہے، جس کا علی مشکل کشا ٹھہرے

☆

صفا اگر طلبی، زاہدا بمشربِ ماست
بجز ریا، دگر از فرشِ بوریا مطلب

☆

حشمت افزا، مملکت بخش و خود آرائے دگر
نیست در اقلیمِ خوبی چوں تو دار ائے دگر
بردلم افتادہ از جعدش بلا ہائے دگر
"درسرم از نکہتِ زلف است سودائے دگر" (طرح)
از ہوائے عارضِ تو روضۂ رضواں شگفت
مشک بیزاز کاکلت گردیدہ صحرائے دگر
آں چناں بگریستم آخر بیادِ روئے دوست
جوش زد از سینۂ من موجِ دریائے دگر
از جبین و چشم و عارض و زقدم تا فرقِ او
من بطرزِ نو رقم سازم سراپائے دگر

دیدہ ام کز راستیِ قدِ محشر زاے او
در زمین و آسماں افتادہ غوغاے دگر

عاشقِ شوریدہ و رُسواے خاص و عام را
از متاعِ دردِ خوبان ست سوداے دگر

گرچہ بگرفت ازدہانم نعمتہاے خوانِ غیب
از رباطِ فضلِ خود بخشید آلاے دگر

گل شدہ ازمردنِ غالب، چراغِ شاعری
اے تپش! در خلق مثلش کیست یکتاے دگر

[شعر و سخن: ۳۳ـ ۳۵، گلستانِ بے خزاں: ۵۷، خم خانۂ جاوید، ۲: ۳۵ـ ۳۶، نیز ۵: ۳۴۷، اسعد الاخبار، آگرہ: ۲۴ اپریل ۱۹۴۹ء (ص ۴)، ایضاً: ۲۴ جون ۱۹۴۹ء (ص ۱۴)]

تحسین... حافظ قاضی عبدالرحمٰن پانی پتی

یہ اولاد میں تھے حضرت محمدؐ جلال الدین کبیر الاولیا کی۔ گویا ان کا اور غالب کے ایک دوسرے شاگرد باقر بہاری کا خاندان ایک ہے۔

ان کے والد مولوی عبدالہادی تھے۔ پانی پت کے مشہور عالم قاضی محمدؐ ثناء اللہ بھی اسی خاندان کے فرد ہیں، وہ ۱۱۴۳ھ میں پیدا ہوئے، سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد مختلف اشغال میں لگے رہے۔ آخر میں دہلی پہنچے اور حدیث کی تکمیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے کی۔ نقش بندی سلسلے میں خواجہ محمدؐ عابد سنامی سے اور اُن کی وفات کے بعد حضرت مرزا جانِ جاناں مظہر سے بیعت ہوئے۔ مظہر نے اُنھیں ''علم الہدیٰ'' کا لقب عطا فرمایا تھا۔ اِس کے بعد واپس پانی پت آگئے اور ساری عمر افتاء و ارشاد اور درس و تدریس میں گزری۔ اُن سے تیس سے زیادہ کتب یادگار ہیں۔ ان میں سے درسی کتاب مالا بدمنہ اور حنفی نقطۂ نگاہ سے تفسیر مظہری (عربی) خاص طور پر مشہور ہیں۔ ندوۃ المصنفین نے اس تفسیر کا اردو ترجمہ بھی چھاپ دیا ہے۔ غرۂ رجب ۱۲۲۵ھ (۲ اگست ۱۸۱۰ء) کو فوت ہوئے۔ مولوی محبّ اللہ پانی پتی نے آیتِ قرآن ''وَھُم مکرمون فی جنّت النّعیم'' سے تاریخ نکالی۔

تحسین نے ضروری علوم دلّی میں حاصل کیے تھے۔ حافظِ قرآن تھے۔ تمام عمر یادِ خدا اور زہد و تقویٰ و قناعت میں بسر کردی۔ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں بعارضۂ ذات الصدر انتقال فرمایا۔ حالی سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے، حالی کے دو فارسی خط اُن کے نام شائع ہو چکے ہیں۔ دیوان شائع نہیں ہوا، اگرچہ اس کی موجودگی کا علم

ہے۔ فارسی کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ نمونہ کلام یہ ہے:

توزخمِ خنجرِ قاتل نخوردی
چہ دانی لذّتِ بسمل شدن را
بسودا قوتِ دستم گر این ست
تو انم چاک زدجیبِ کفن را
دروغے کرد از صدقِ محبت
بمزون زندہ نامِ کوہکن را

☆

گرخوش و نغز ند حوراں باتوارزانی ہمہ
بامنِ مجنوں رہا کن، واعظ! آں مہ پارہ را
شورِ قلقل بود تحسیں! شب درونِ خانہ ات
داشتی مہماں کدا میں شاہدے خوارہ را

☆

آنانکہ حق جلوۂ جانانہ شناسند
درسنگِ حرم، آتشِ بت خانہ شناسند
زاہد! نشوی منکرِ رنداں کہ بمستی
رازِ دو جہاں، از خطِ پیمانہ شناسند
دانند کہ آوارگیم از پےِ کاریست
فریاد کہ مجنو نم و فرزانہ شناسند

☆

مطلب زمے پرستاں قدحِ شراب، کانیاں
ندہند جزبہ رندے کہ ز اہلِ راز باشد
چکنم چوزلفِ خوباں، زحرم کشد بہ دیرم
حزر از خمِ کمندے، کہ چناں دراز باشد

زرقیب تا بہ تحسیں، چہ تفاوت است دانی
اگرت میانِ عشق و ہوس امتیاز باشد

☆

آنم کہ حریفم نگہِ عشوہ گراں را
تیزاستِ گرایں دشنہ مراہم جگرے ہست

☆

خشک شدداممنِ تر، بادۂ نابے ساقی
داغم از زہدِ ریائی دمِ آبے ساقی
زلفِ ترسا بچگانم سوئے میخانہ کشید
ورنہ من بودم و کنجے و کتابے، ساقی!
بودبا چشم تو بحثے بہ تغافل مارا
غمزہ طے کرد ز شوخی بجوابے ساقی!

[صبحِ گلشن: ۸۲-۸۳، تذکرۂ علمائے ہند: ۳۸، حیاتِ نو، ۱۹۳۴ء-۱۹۳۵ء، صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء (غالب نمبر حصہ چہارم): ۱۰۷-۱۱۰]

تفتہ... منشی ہرگوپال سکندر آبادی

دلی سے ۴۰۔ ۴۵ میل شمال کی طرف ایک اچھا خاصا قصبہ سکندر آباد (ضلع بلند شہر) ہے، جسے سکندر لودھی (۱۴۸۹۔ ۱۵۱۷ء) نے بسایا تھا۔ اُسی کے زمانے میں ایک بھٹناگر کائستھ خواجہ دیپ چند (خلف امردیو) فیروز آباد (مضافاتِ آگرہ) سے نقلِ مکان کر کے یہاں بس گئے۔ چنانچہ اُن کے خاندان والوں کی آل آج تک ''فیروز آبادی'' ہے۔ اس خاندان کو ۵۴۰ بیگہ پختہ معافی اور عہدۂ قانون گوئی موروثی ملا تھا۔

خواجہ دیپ چند کی اولاد میں ایک صاحب موتی لال ہوئے ہیں۔ اُن کے آٹھ بیٹے تھے جن کی اولاد اٹھ گھرے کہلاتی ہے۔ منشی ہرگوپال انھی موتی لال کے بیٹے تھے۔ ۱۷۹۹۔ ۱۸۰۰ء (۱۲۱۴ھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمۂ بندوبست میں مدتوں قانون گو رہے۔ لیکن شاعری کے شوق میں نوکری کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لیے ریاست جے پور میں بھی ملازمت کا تعلق ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کھکھیڑ بھی زیادہ دن تک نہ سہہ سکے اور جلد ہی مستعفی ہوگئے۔ کبر سنی میں ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ) کو سکندر آباد ہی میں بعارضۂ تپِ وبائی وفات☆[1] پائی۔ بدری کرشن فروغ نے تاریخ کہی:

ستمبر ستمہا بعالم گذاشت
کہ از دہر سوے جناں تفتہ رفت
دوم روز در دہر ماتم دوچند
ز جورِ فلک الاماں تفتہ رفت

کنوں کو بحالِ جہاں مہرباں
ز اہلِ جہاں مہرباں تفتہ رفت
بخوں گشتہ پرچشم افلاکیاں
جہاں راست وردِ زباں "تفتہ رفت"
سن عیسوی گفتم آخر فروغ
"چہ سوے جناں" زیں جہاں تفتہ رفت
(۱۸۷۹ء)

مولوی ممتاز احمد تھانوی نے ہجری میں کہی:

سالِ نقلش با دلِ زار ازخرد
من شنیدم "بے سر و پا شد سخن"
(۱۲۹۵+۱=۱۲۹۶ھ)

اولاد میں دو لڑکے (امراؤ سنگھ اور پیتمبر سنگھ) اور ایک لڑکی تھی۔ چھوٹا لڑکا پیتمبر سنگھ ۱۸۵۵ء (۱۲۷۱ھ) میں فوت ہوگیا۔ اُس کی وفات نے ان کی کمر توڑ دی۔ اسی موقعے پر اُنھوں نے (۲۲۲) شعر کا وہ طویل مرثیہ لکھا تھا، جو اُن کے دیوان دوم میں موجود ہے۔ گلستان کی تضمین بھی اُسی کی یادگار کے طور پر لکھی تھی جیسا کہ اس کے آغاز میں صراحت کی ہے۔ صاحب زادی کا بھی اس کے بعد جلد ہی انتقال ہوگیا۔[☆۲] امراؤسنگھ اُن کے بعد زندہ رہے۔ اُنھوں نے سنبلستان کے آخر میں اسی صاحب زادے کی شکایت لکھی ہے۔ اُن کی اولاد اس وقت سنگرور (ریاست جیند) میں موجود ہے۔

تفتہ ابتدا میں رامی تخلص کرتے تھے۔ حسین قلی خان نے اپنے تذکرے (نشترِ عشق) میں لکھا ہے کہ نور العین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعرگوئی کا شوق پیدا کیا۔ چوں کہ ذکاوت اور استعداد سے بہرۂ وافر ملا تھا، اس لیے تھوڑی سی توجہ اور مشق سے بہت جلد ترقی کر گئے۔ نشترِ عشق میں جو انتخاب دیا ہے،

اس میں تخلص رامی ہی ہے، مثلاً

رامیِ تو کز غمت بیمار بود
عاقبت امروز، از دنیا گزشت
ز رامیِ تو چو ما سرگزشت پرسیدیم
کشید آہ و گریباں درید و ہیچ نگفت

اوائلِ مشق میں مرزا محمد حسن قتیل کی شاگردی اختیار کی۔ لیکن یہ اُن کی وفات (۱۲۳۳ھ) کے وقت صرف ۱۹ برس کے ہوں گے، اس کے بہت دن بعد جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو اُنھوں نے تخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنادیا۔ تفتہ اُستاد کے محبوب شاگردوں میں سے تھے اور اُنھوں نے اُن کی تہذیب و تحسین میں کوئی دقیقہ فردگزاشت نہیں کیا۔ تفتہ نے تمام عمر فارسی میں بسر کردی۔ اُردو میں اُن کے صرف ایک قطعے کا پتا چلتا ہے جو اُنھوں نے استاد کے انتقال پر لکھا تھا:

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچ مداں نام ور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پا وسر ہوئے

فارسی میں بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا۔ چار دیوان ہیں۔ دیوان اول اسعد الاخبار آگرہ میں چھپا تھا۔ اس کے صرف ۳۰۰ نسخے چھپے تھے اور منشی محمد ظہور علی خان صاحب بہادر نائب اور مختارِ کل سرکار ٹونک نے ازراہِ قدر دانی اس کے مصارف طبع میں اعانت فرمائی تھی۔ اس کا چھاپا ۱۸۴۸ء میں شروع ہوا اور یہ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور اس کی قیمت چار روپیہ فی نسخہ تھی۔ اُن کے علاوہ راے جگل کشور صاحب وکیل محکمۂ عالیہ صدر دیوانی نے بھی بنظرِ اعانتِ مطبع اس کی بیس جلدیں خریدی تھیں (اسعد الاخبار، دسمبر ۱۸۴۸ء) اس دیوان میں ہرزمین میں دو غزلہ ہے اور اس کے

شروع میں غالب کا لکھا ہوا دیباچہ ہے (جو پنج آہنگ اور کلیاتِ نثرِ غالب میں بھی شامل ہے)

دیوانِ دوم مطبع کوہ نور، لاہور، ۱۸۵۷ء میں چھپا تھا۔[☆۳]

دیوانِ سوم کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کا نسخہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ البتہ تذکرۂ صبحِ گلشن اور تذکرہ روزِ روشن کا بیان ہے کہ یہ دیوان تمام تر خلاقِ معانی کمال اسماعیل اصفہانی کی زمینوں میں ہے اور تفتہ نے ہر جگہ خوب دادِ سخن دی ہے۔

دیوانِ چہارم کا چھاپا مارچ ۱۸۶۹ء (یعنی غالب کی وفات کے ڈیڑھ دو مہینے بعد) مکمل ہوا۔ یہ منشی شیونرائن آرام (شاگردِ غالب) کے مطبع مفید خلائق، آگرہ میں طبع ہوا تھا۔

تفتہ نے سعدی کی بوستان کے تتبع میں بھی ایک مثنوی لکھی، جس کا نام انھوں نے غالب کے کہنے پر ''سنبلستان'' رکھا تھا۔ یہ مثنوی ۱۲۷۷ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں حمدِ الٰہی کے بعد اپنے موحد ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

منم آں کہ ناید زمن جز گناہ
گناہ ازمن و جملہ عفو از اللہ
شود عاقبت رحمتش حامیم
کہ اسلامیم من، نہ اصنامیم
خود آں واحدا گو کہ در ہر لباس
مراجملہ خوانند واحد شناس

آگے نعت کے یہ اشعار ملتے ہیں:

محمدؐ فرستاد و رحمت نمود
محمدؐ طریقِ شریعت نمود
محمدؐ فرستادۂ آں کہ بست
دل اندر محمدؐ زروزِ الست

امامِ رسل، اشرفِ انبیا
مقدم نشینِ صفِ انبیا
ہمہ خُلق و شفقت، ہمہ عدل و داد
تو گوئی کہ از غایتِ اتحاد
خدا جملہ صرفِ محمدؐ نمود
خدائی و غیر از خدائی کہ بود
بآں دلکشی نقشِ او برکشید
کہ از نقشِ دیگر قلم در کشید
کند امتِ خویش را محترم
بود روزِ محشر شفیع الامم
مرا روزِ محشر سیہ باد رُو
اگر در شفاعت کنم جز باُو
عقیدت کہ با او مرا بودہ است
کرابودہ است و کجا بودہ است
زمانیکہ نامش بگیرد کسے
لبش گیرم از ذوق و بوسہ بسے
چنانست شیریں کہ بنود مرا
زنامِ محمدؐ لب از ہم جدا
ازیں پس من و بارگاہِ فیع
بوجہے کہ دارم محمدؐ شفیع
بہ عشقش ہمہ عمرم آید بسر
بود محوِ او سر بسر دل دگر
دمِ مرگ گردد زُخم سوے او
کہ فرض است کردن سوے قبلہ رو

پس از نعت او ازمنِ کامجو
درود از سرِ صدق برآلِ او
درودِ خدا بر ده ودو امام
بحقِ محمدؐ علیہ السلام

اِس کے بعد سببِ تالیف میں لکھتے ہیں کہ سخت تشویش اور پریشان حالی میں علی گڑھ گیا۔ وہاں مولوی محمد ظہور علی صدر الصدور کول نے اپنے صاحب زادے وارث علی کو میرے بلانے کو بھیجا۔ میں حاضر ہوا۔ بہت محبت اور تپاک سے میرا خیرمقدم کیا۔ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے اس درجہ مانوس ہوگئے کہ بالآخر اُنھوں نے تفتہ سے علی گڑھ میں مستقل قیام کی فرمایش کردی۔ تفتہ کو سرِ تسلیم خم کرتے ہی بنی۔ مولوی محمد ظہور علی نے اُن کے لیے رہنے کو مکان اور کھانے پینے کا مناسب انتظام کردیا اور یوں تفتہ بے غل وغش اطمینان سے علی گڑھ میں رہنے لگے۔

اس سے پہلے مولوی ظہور علی کا جواں سال بیٹا محمد سلیمان انھیں داغِ مفارقت دے چکا تھا اور وہ اُس کی دائمی جدائی سے بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے تھے۔ اُنھوں نے تفتہ سے فرمایش کی کہ وہ ایک مثنوی قلم بند کریں، جس میں محمد سلیمان کا ذکر ہو، تاکہ اُس کی یادگار قائم رہے اور وہ خود اس کے پڑھنے سے اُس کی یاد تازہ رکھ سکیں۔ چنانچہ جس طرح اُنھوں نے اپنے بیٹے پیتمبر سنگھ کی وفات پر گلستان کی تضمین لکھی تھی، محمد سلیمان کے لیے بوستان کے جواب میں سنبلستان قلم بند کی۔ یہ ۴۶۰ صفحات پر مشتمل کتاب پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۶۵ء کی انھوں نے سعدی کریما کی تضمین بھی کی تھی۔ یہ بھی چھپ چکی ہے۔

اس خردار سے بطورِ نمونہ چند شعر درج کرتا ہوں:

رہانداز چنیں بے دانشی ہایت خدا اے دل
بدامش افتی و دیگر طمع داری رہائی را

☆

چند گویی کہ نشاں نیست ز خونیں کفناں
مگر ایں لالہ، کہ بینی، ز شہیدانِ تو نیست

☆

دردے کہ جانِ مابلب آرد، دوائے ماست
مرگے، کہ روبما بنماید، شفائے ماست

☆

تیغ افتاد از کفِ قاتل
زندگانی وبالِ گردن کیست
می دود چار سو، نمی دانم
برق گرمِ تلاش خرمن کیست

☆

ایں اگر گویم، کرا آید یقیں
قصدِ جانم، یار جانی می کند
دل کہ بامرگ آشنائی داشتہ ست
زندگانی، جاودانی می کند

☆

سالکانِ تفتہ جاں، تنہا نہ منزل سوختند
راہ رادر آتش افگندند و منزل سوختند
عاشقاں گرمِ تماشا، چوں شدند از فرطِ شوق
برزخ معشوق دیدند آنچہ حایل، سوختند
بگذر از دیوانگانِ خود، کہ ایں آتش دماں
طوق را کردند خاکستر، سلاسل سوختند

حالِ باغ ازمن مپرس، اے محفلِ عیشِ تو گرم
لالہ ہا، بے تو، برنگِ شمعِ محفل سوختند
مشربم گیرد بزہد و اتقا آتش فگن
تفتہ! باحق ساختند آناں کہ باطل سوختند

☆

اے تماشا گاہِ ایں دل روے تو
عالمے در دل تماشا کردہ ایم
ما نہ تنہا دیدہ پُرنم کردہ ایم
آنچہ نتواں کرد، آں ہم کردہ ایم
دارد از خود رفتگی ہا، عالمے
رفتہ ایم و سیرِ عالم کردہ ایم

[تواریخ بلند شہر: ۱۳۱، صبح گلشن: ۸۶۔ ۸۷، روز روشن، ۲۳۶۔ ۲۳۷، خُم خانۂ جاوید، ۲: ۱۱۵۔ ۱۱۶، گلشنِ ہمیشہ بہار: ۹۹، اسعد الاخبار: دسمبر ۱۸۴۸ء، بزمِ فروغ: ۴۵، مضمون ہرگوپال تفتہ از پروفیسر مختار الدین احمد (غیر مطبوعہ)]

حواشی

☆۱۔ اگرچہ غالب کے ایک دوسرے شاگرد محمد علی خاں انجم نے تفتہ کے قطعۂ تاریخ وفات میں کہا ہے: ہاں، مگر مرد تفتہ در دہلی، لیکن یہ ٹھیک نہیں، وفات سکندر آباد میں ہوئی، جیسا کہ تواریخ بلند شہر میں ہے۔ انجم کو وفات کی خبر کسی نے دلی سے دی ہوگی اور انھوں نے خیال کرلیا کہ وفات بھی دلی ہی میں ہوئی۔

☆۲۔ بے محل نہیں ہوگا، اگر یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کردیا جائے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ مرحوم ڈاکٹر سرشانتی سروپ بھٹناگر جو ہندوستان کے مایۂ ناز سائنس دان تھے، اور جن کا یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو انتقال ہوا، تفتہ کے نواسے تھے۔ یہ غلطِ محض ہے۔ واقعہ یہ ہے: سکندر آباد کے کائستھوں ہی میں ایک صاحب دل سکھ رائے تھے جو اگرچہ یقیناً اسی خواجہ دیپ چند کی نسل سے ہوں گے جو تفتہ کے بھی مورثِ اعلیٰ تھے، لیکن جن کا بہرحال تفتہ سے کوئی قریبی تعلق نہیں تھا۔ ان دل سکھ رائے کے تین لڑکے تھے: تنا لال اور منا لال اور پیارے لال۔

آخر الذکر (پیارے لال) کی اولاد میں دو صاحب زادے (دیوی دیال اور جوالا دیال) اور دو صاحب زادیاں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحب زادی (پاربتی دیوی) موگا (ضلع فیروز پور۔ پنجاب) کے لالہ پرمیشوری سہائے ایم اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول بھیرہ (پنجاب) سے بیاہی گئیں (پرمیشوی سہائے کے والد لالہ منوہر لال تحصیل دار دہنک تھے) ان کے تین بچے ہوئے دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ لڑکوں کے نام تھے شانتی سروپ اور جیتی سروپ۔ یہی شانتی سروپ ہمارے سرشانتی سروپ بھٹناگر ہیں۔ دوسرے بھائی آج کل بلند شہر میں مقیم ہیں (یہ حالات مجھے سرشانتی سروپ بھٹناگر کی خالہ انار دیوی کی بیٹی پریم کماری سے معلوم ہوئے) تعجب ہے کہ سرشانتی سروپ نے اپنی زندگی میں اس کی تردید نہ کی بلکہ جب مولوی عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی نے ان کے دیوان لاجونتی کا مقدمہ لکھا اور اس میں ان کے تفتہ کا نواسہ ہونے کا ذکر کیا، تو اسے جوں کا توں رہنے دیا۔

☆۳۔حکیم خلیل الرحمٰن (پہلی بھیت) کے پاس تفتہ کے دیوان دوم کا وہ نسخہ تھا جو خود تفتہ کے پاس رہا تھا۔ خلیل صاحب کا بیان تھا کہ اس کے حاشیے پر کچھ ایسا کلام بھی ہے جو طبع نہیں ہوا اور تفتہ نے خود درج کیا تھا۔

(زمانہ کان پور جولائی ۱۹۳۴ء)

تمنّا... مولوی احمد حسین مرزا پوری

اس سلسلے میں دیکھیے مینا (مولانا احمد حسین مرزا پوری)۔
[مشاطۂ سخن (۱)، ص ۱۳۹۔]

تمنّا... مولوی محمّد حسین مراد آبادی

مراد آباد کے شرفا میں سے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شوق کرتے تھے۔ اُردو میں شیخ مہدی☆ علی زکی سے اصلاح لی اور فارسی میں غالب سے۔ تلاشِ معاش میں سرگرداں حیدرآباد دکن بھی گئے لیکن وہاں کامیابی نہ ہوئی اور بے نیلِ مرام واپس مراد آباد چلے آئے۔ نواب محمّد صدیق حسن خان (بھوپال) کے احباب میں سے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں دیوانِ اردو شائع کیا تھا۔ دیوانِ فارسی غالباً نہیں چھپا۔

تمنا پر تصوف کا غلبہ تھا۔ ایک پورا فارسی میں مجموعۂ نعت ''قصائدِ تمنا'' چھپا ہوا موجود ہے۔ اسی کے آخر میں تین قصیدے ان کے مرشد شاہ عبدالغنی مجددی (بن شاہ ابوسعید) کی مدح میں ہیں۔

شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی کی کتاب ''تقویتِ ایمان'' پر جو ہنگامہ بپا ہوا تھا اور

جو امکانِ نظیر وامتناعِ نظیر کے مناقشے کی بنا ثابت ہوا، تمنا نے بھی اس میں حصہ لیا تھا، یہ مولوی فضلِ حق خیر آبادی کے مؤید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے مخالف تھے۔

نوے برس کی عمر تھی، جب ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹۔ ۱۹۰۰ء) میں انتقال ہوا۔ امیر مینائی نے تاریخ کہی:

شوقِ دیدارِ الٰہی میں ہی بڑھتی رہی روح
آخر اِس دُھن میں سوئے خلد بریں جا نکلی
سالِ رحلت جو کہا ہاتفِ غیبی نے، امیر!
"جان کیا نکلی تمنا کی، تمنا نکلی"
(۱۳۱۷)

ذرہ ذرہ زجنوں، برسرِ کار است ایں جا
صد پری شیشہ بہر مشتِ غبار است ایں جا

☆

چو برقِ شوخیش، دیوانگاں را مجلس افرو زد
پری رقصاں، بگردِ شمع چوں پروانہ برخیزد

☆

چہ گوئی حالتِ زاہد کہ مدہو شا نہ می آید
پری ہم ازسر کوے کسے دیوانہ می آید
سویدائے دلِ عاشق، مگر باشد سپند اینجا
کہ دودِ خوں چکاں، از محفلِ جانا نہ می آید

☆

موجۂ غم ہر نفس طوفانِ فریادم کند
ماتمے دارم کہ مرگِ ناگہاں شادم کند

در جہاں بنود بدست ہیچ کس معموریم
خانۂ عشقم خرابیِ غم آبادم کند

☆

تعلّق از منِ دیوانہ خود یک قلم مکسل
وفا گر عیستت جاناں! بیا و بے وفائی کن

☆

اُردو کلام فارسی سے پست تر ہے۔ نمونہ یہ ہے۔

جوشِ الفت نے بڑے دھوکے میں رکھا عمر بھر
ہم یگانہ جانتے تھے جس کو، وہ بیگانہ تھا

☆

یہ مرض تھا عینِ صحت، جو طبیب یار ہوتا
مجھے غم ہی خورّمی تھا، جو وہ غمگسار ہوتا

☆

ہوے ہیں آپ جو بے گانہ آشنا ہو کر
بتایئے کہ بنے درد کیوں، دوا ہو کر؟

☆

گو سو طرح کے رنج و بلا میں پھنسا رہے
دل کا یہی مزا ہے، کہیں مبتلا رہے

(شمعِ انجمن ۱۰۰۔ ۱۰۱، خم خانۂ جاوید، ۲: ۱۳۳۔۱۳۴، غالب اور عصرِ غالب: ۱۴۰۔ ۱۴۶)

حواشی

☆۔ زکی شیخ مہدی علی مراد آبادی، شیخ کرامت علی کے صاحب زادے تھے۔ مدتوں جنت آرام گاہ نواب محمد سعید خان بہادر والی رامپور کی ملازمت میں رہے، بعد کو لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں واجد علی شاہ کی سرکار سے

خطاب "ملک الشعرا" عطا ہوا تھا۔ لیکن پھر واجد علی شاہ ان سے ناراض ہو گئے اور خطاب واپس لے لیا۔ جب انگریزوں نے سلطنت اودھ پر قبضہ کر لیا اور واجد علی شاہ کلکتہ چلے گئے تو یہ عہد فردوس مکان میں دوبارہ رام پور آ گئے۔ زکی آخری دور کے مشہور شعرا میں سے تھے۔ تاریخ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ علوم دینی میں بھی معقول دستگاہ تھی اور یہ انھوں نے علمائے فرنگی محل سے حاصل کیے تھے۔ انبالے گئے ہوئے تھے کہ مارچ ۱۸۶۷ء (ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ) میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت عمر ۷۲ برس کی تھی۔ دیوان مطبوعہ موجود ہے۔ دیوان کا ایک قلمی نسخہ دلی یونی ورسٹی کے کتاب خانے میں ایسا ہے، جس میں مطبوعہ دیوان سے کچھ زائد کلام بھی ہے۔ ایک رسالہ عروض میں بھی مسمّیٰ بہ یادگیر یادگار چھوڑا۔ کتاب خانہ رام پور میں ان کی نوشتہ پانچ داستانیں بھی ہیں (طلسم جام جم، طلسم حیرت کدۂ آصفی، طلسم حکیم قسطاس، سبع سیاح، بالا باختر) یہ آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ خان بہادر ظفر حسین خان (لکھنؤ) انھیں کے پوتے تھے، جنھیں ایک کتاب "مآل ومشیت" لکھنے پر ساہتیہ اکاڈمی کا انعام (پانچ ہزار روپیہ) ملا تھا (خم خانۂ جاوید، ۳: ۲۵۶۔ ۲۵۷، رسالہ آجکل نومبر ۱۹۵۲ء، انتخاب یادگار، ۱۴۰، صبح گلشن، ۱۹۰)

توفیق... شاہزادہ بشیر الدّین میسوری ثم کلکتوی

سلطان شہید ٹیپو سلطان (ف: ۱۷۹۹ء) والیِ میسور کے بارہ بیٹے تھے۔ اُن میں سے ساتویں شاہزادہ شکر اللہ سلطان (ف: ۱۸۳۷ء) تھے۔ یہی بشیر الدین کے والدِ ماجد تھے۔

ٹیپو سلطان کے خاندان سے متعلق اختلاف ہے۔ کوئی اُنھیں پنجابی الاصل کہتا ہے، کوئی افغان بتاتا ہے۔ ''نشانِ حیدری'' کے مصنف کا بیان ہے کہ ان کے آبا و اجداد قریشی نسل کے عرب تھے۔ اُس کے بیان کے مطابق اِس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام، جو سب سے پہلے ہندوستان وارد ہوئے، ولی محمدؔ تھا۔ وہ ایران اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دلّی پہنچے۔ ممکن ہے کہ وہ راستے میں بہت دن پنجاب میں ٹھیرے ہوں، جس سے بعد کے لوگوں نے خیال کیا کہ وہ پنجابی ہیں۔ چندے دلّی میں قیام کر کے وہ گلبرگہ (دکن) پہنچے۔ یہاں ولی محمدؔ کے صاحب زادے محمدؔ علی کی شادی حضرت شاہ بندہ نواز کی درگاہ کے متولّی کی صاحب زادی سے ہوگئی۔ تھوڑی مدّت بعد جب ولی محمدؔ کا انتقال ہوگیا، تو محمدؔ علی نے گلبرگہ سے نقل مکان کیا اور اپنی بیوی اور تین بیٹوں سمیت پہلے بیجاپور اور پھر کولار میں سکونت اختیار کرلی۔ پہلی بیوی کے بعد اُنھوں نے کولار ہی میں دوسری شادی کی۔ اِس سے اُن کا چوتھا لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام اُنھوں نے فتح محمدؔ رکھا۔ یہی فتح محمد، حیدر علی کے والد اور ٹیپو سلطان کے دادا تھے۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عروج وزوال کی داستان بھی تاریخ ہندوستان کا حصّہ ہے اور وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ مئی ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے نظام حیدرآباد کی

مدد سے ٹیپو سلطان کو شکست دی۔ خود سلطان میدانِ جنگ میں آخری دم تک لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور اُن کی سلطنت انگریزوں اور نظام اور میسور کے قدیم شاہی خاندان میں تقسیم کردی گئی۔ سلطان شہید کے بارہ صاحب زادوں اور ایک صاحب زادی کے لیے دو لاکھ چوبیس ہزار پگوڈ (تقریباً سات لاکھ روپیہ) سالانہ پنشن مقرر ہوئی اور اِن سب کو ویلور کے قلعے میں نظر بند کردیا گیا۔ ۱۸۰۷ء میں بعض لوگوں نے خروج کیا اور اِن شاہزادوں کو آزاد کر کے دوبارہ تخت نشین کرنا چاہا اور اس منصوبے کی تکمیل کے لیے شکر اللہ سلطان کو اپنا سردار اور سالار مقرر کیا۔ انگریزوں نے طاقت سے یہ مخالفت کی آگ تو دبا دی لیکن اسی کے ساتھ اُنھیں اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ اِس خاندان کا میسور کے اتنا نزدیک رہنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے سارے قافلے کو کلکتے بھیج دیا۔ یہاں یہ لوگ ٹالی گنج میں مقیم ہوئے۔ ان کی اولادِ امجاداب بھی یہیں رہتی ہے۔

شاہزادہ بشیر الدین توفیق کی عمر کا بیش تر زمانہ کلکتے ہی میں گزرا۔ اُنھیں بھی اپنے والدِ بزرگوار کی طرح علم و فضل سے بہرۂ وافر ملا تھا اور اس سے بھی اُنھوں نے اپنے خاندان کی شان دار روایات قائم رکھیں۔ اُن کے دیکھنے والے ان کے اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ برگزیدہ کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ اُردو، فارسی نظم و نثر میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ دیوان ہر بز☆ کی تقریظ و تاریخ اس پر گواہ ہیں ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴۔۱۸۸۵ء) میں وفات پائی۔ نسّاخ نے تاریخ کہی:

رفت شہزادہ بشیر الدّین توفیق از جہاں
سوے خلدو داغِ ہجر خویش در دلہا سپرد
زد رقم سالِ رحیلش، کلکِ نسّاخِ حزیں
''واے! حیف و آہ! شہزادہ بشیر الدین بمرد''
(۱۳۰۲)

دوسری تاریخ ہے ''رونقِ فردوس توفیق'' (۱۳۰۲ھ)۔

غالب کے خطوط (اردو اور فارسی) مطبوعہ اِن کے نام موجود ہیں۔
توفیق کی علاّتی بھائی شاہزادہ اعظم الدّین بھی شاعر تھے، سلطان تخلّص تھا۔
فارسی کے چند شعر ملے:

ولے آزادۂ داری، ازیں خوشترچہ می خواہی
درو نے سادۂ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی
تو، اے عاشق! زاشکِ سرخ در پیانۂ چشمت
مصفّا بادۂ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی

☆

چراروشن نگر دانی شبِ تاریکِ عاشق را
جبینے، ہمچو پرویں، عارضے ہمچو قمرداری
شدی توفیق گر بے چیز، باگردونِ دُوں مستیز
زفیضِ طبع گوہر ریز، گنجے از گہرداری
ندیدہ است کس از شاخِ خشک میوۂ تر
بجز قلم کہ دہد میوۂ تر و شیریں

(نگارستانِ سخن: ۱۸۔ ۱۹، ۴۰، خم خانۂ جاوید، ۲: ۱۵۲۔۱۵۳)

حواشی

☆۱۔ ہزبر تخلّص تھا، جرنیل فریدون قدر میرزا محمد ہزبر علی بہادر فرزند سلطان واجد علی شاہ کا۔ ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے (جوانِ اختر تاریخ ولادت ہے) مدّتوں مٹیا محل کلکتہ میں مقیم رہے۔ سلطان عالم ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ (بزمِ سخن: ۱۲۰۔ ۱۲۱)

ثاقب... میرزا شہاب الدّین احمد خان دہلوی

نواب ضیا الدّین احمد خان نیّر رخشاں کے بڑے صاحب زادے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت شروع سے اپنے والدِ عالی مقدار کی نگرانی میں پائی، جس سے بہت جلد اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث اقران و اماثل میں ممتاز ہوگئے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ اُن کی بیدار مغزی اور قابلیت کا اعتراف، حکومتِ انگریزی نے بھی کیا اور عین نوجوانی میں انھیں دلّی میں آنرری مجسٹریٹ مقرر کردیا۔

افسوس کہ بہت کم عمری میں انتقال کیا۔ صحت مدّت سے خراب رہتی تھی۔ غالب کی وفات کے دو مہینے کے اندر اندر دوشنبہ ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء (٦ محرم ۱۲۸٦ھ) کو عصر کے وقت وفات پائی۔ تپِ دق بہت دن سے لاحق تھا۔ ہر طرح کے علاج کیے، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا، بلکہ حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ موت سے چند دن پہلے اسہال کا حملہ ہوا۔ دن میں بیس بیس تیس تیس اجابتیں ہوئیں جس نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ وفات کے وقت صرف ۲۹ برس کی عمر تھی۔ قدم شریف میں اپنے چچا نواب شمس الدّین احمد خان والیِ فیروز پور جھرکہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ قربان علی بیگ خان سالک نے تاریخ کہی:

از صدمۂ مرگِ ثاقبِ والا جاہ
ہر سو است نالہ ہائے جانکاہ

تاریخِ وفاتِ اوچنیں سالک گفت
"روزِ ششم، مہِ محرّم، صد آہ"
(۱۲۸۶)

نسّاخ نے تاریخ کہی:

مر گئے آہ! شہاب الدّین خاں
غم میں ہیں سب مومن و کافر
سال لکھا خامے نے: "وائے
حیف! شہابِ ثاقبِ نیّر"
(۱۲۸۶)

نواب شمس الدّین احمد خان کی بیاہتا بیوی (جانی بیگم بنتِ مرزا مغل بیگ خان) سے دو لڑکیاں ہوئی تھیں، احمد النساء بیگم اور محمّد النساء بیگم۔ احمد النساء بیگم، نواب عبدالرحمٰن خان والی جھجر کے چچا زاد بھائی نواب سعادت علی خان کے نکاح میں آئیں۔ اُنھیں کی بڑی صاحب زادی سکندر جہان بیگم سے ثاقب کا نکاح ہوا تھا۔ غالب نے ان کی شادی پر سہرہ کہا تھا، جس کے یہ دو شعر محفوظ رہ گئے ہیں:

ہمنشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدّیں خاں
بزمِ شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا

ثاقب نے اپنے پیچھے چار صاحب زادے (شجاع الدّین احمد خان تاباں، بہاء الدّین احمد خان باطل وطلب، سراج الدّین احمد خان سائل اور ممتاز الدّین احمد خان مائل) اور ایک صاحب زادی (اختر سلطان بیگم) اپنی یادگار چھوڑی۔ صاحب زادی کا نکاح نواب سر امیر الدین احمد خان والیِ لوہارو سے ہوا۔ چاروں بیٹوں کو شاعری ورثے میں ملی۔ تاباں☆[1] اور سائل☆[2] نے تو اچھی خاصی شہرت حاصل کی۔

ثاقب تخلص غالب کا دیا ہوا تھا، جو شہاب کی مناسبت سے ہے۔ زبان کا کیا ذکر کہ وہ اُن کے گھر کی لونڈی ہے۔ کلام میں مضمون آفرینی کی کوشش کرتے ہیں۔ معاملہ خوب لکھتے ہیں۔ تصوّف اور اخلاق کی چاشنی بھی موجود ہے:

کیوں وعدہ کرو، بے خبر آجاؤ کسی وقت
ہوں وصل کا خواہاں، نہیں مشتاق خبر کا

☆

گھر بیاباں میں بنایا نہیں ہم نے لیکن
جس کو گھر سمجھے ہوئے تھے، وہ بیاباں نکلا

☆

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں
کچھ حال سنو، تو ہم سنائیں
آتے نہیں یاں اگر، نہ آئیں
اے کاش! مجھے وہاں بلائیں
ہم سینہ سپر کیے کھڑے ہیں
وہ شوق سے خنجر آزمائیں
جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس، وہ دل ربا ادائیں
اے بخت! کہاں تلک برائی
اے چرخ کہاں تلک جفائیں

ق

کل میں نے کہا کہ بندہ پرور!
چہرے سے نقاب آپ اٹھائیں

کہتے ہیں ادا شناس باہم
"اچھا ہو جو رخ" تو کیوں چھپائیں
بولے: "رُودادِ موسیٰ و طوُر
سن لی ہو، تو دیکھنے کو آئیں"
"بسم اللہ! ہم اٹھائیں پردہ
پر اُن سے کہو کہ تاب لائیں"

☆

نہیں عقل سے عشق خالی کہ اس میں
بڑے تجربے ہم کو حاصل ہوئے ہیں
غلط فہم ہیں، عاشقانِ مجازی
کہ محوِ تماشاے محمل ہوئے ہیں
رہیں گے گرفتارِ صورت پرستی
اگر حسنِ معنی سے غافل ہوئے ہیں
نہ لپٹیں، نہ ہوں قتل، انصاف یہ ہے
کہ ہم خود بد آموزِ قاتل ہوئے ہیں
ہمیں ذوقِ صحرا نوردی ہے ثاقب!
نہ سمجھو، کہ جویاے منزل ہوئے ہیں

☆

رنجش سے گر کہا ہو، تو ایماں نہ ہو نصیب
کافر بتوں کو کہتے ہیں عشاق پیار سے

☆

فکرِ وصال و ہجر کا صدمہ اُٹھایئے
اِس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھایئے

بیٹھے ہیں ہم تو اب دلِ بے آرزو لیے
وہ دن گئے کہ داغ تمنّا اٹھائیے
ثاقب! وہ ضبطِ اشک کو سمجھے ہیں بے غمی
یہ رویئے، کہ شورشِ دریا اٹھائیے

☆

اک بوند اثر تاک نہ اے چشمِ تر آئی
ہرگز نہ مری تجھ سے کچھ اُمید بر آئی
ہے بندرِ حجرہ، مگر یار کے گھر کا
جو زلف کی بو تجھ میں یہ بادِ سحر آئی
سینے کو مرے چاک کیا، پر ہوئے برہم
جب نوبتِ نظارۂ داغِ جگر آئی
چُپ بیٹھے ہیں، کچھ، کرتے نہیں بات کسی سے
ثاقب کے مگر مرنے کی ان کو خبر آئی

[اکمل الاخبار۴: ۱۲ (۲۶۔ اپریل ۱۸۶۹ء)، خم خانۂ جاوید، ۲:
۱۶۶۔ ۱۷۰، کشکول سید بہاء الدین بشر: ۱۸۴]

حواشی

☆۱۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ فارسی میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ پہلے حسین علی خان شاداں سے، پھر داغ سے مشورہ کیا۔ نہایت مشاق اور زودگو تھے۔ شطرنج کا بھی لپکا تھا۔ ان کا نکاح باقر علی خان کامل کی صاحب زادی محمد سلطان بیگم (عرف جندو بیگم) سے ہوا۔ تاباں نے ۱۶ اپریل ۱۹۲۸ء کو انتقال کیا۔ مہر دلی میں صندل خانۂ مرزا بابر میں مدفون ہیں۔

☆۲۔ ۲۰ شوال ۱۲۷۰ھ (۲۹ مارچ ۱۸۶۴ء) تاریخ پیدائش ہے "مرزا سراج دین احمد خان" سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ غالب نے قطعۂ تاریخ ولادت لکھا تھا (۵۸) لیکن وہاں نام غلط (سراج الدین احمد خان) چھپا

ملتا ہے۔ محو، ارشد، داغ تینوں سے استفادہ کیا۔ ان کی پہلی بیوی مولا بیگم، نواب ممتاز علی خان والی پاٹودی کی بیٹی تھیں۔ ان سے انقطاع کے بعد دوسرا نکاح داغ کی لے پالک بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوا۔ داغ ہی سے تلمذ تھا۔ استاد کے پاس بہت دن تک حیدرآباد میں مقیم رہے۔ اسی زمانے میں وہاں سے ایک رسالہ معیار الانشاء بھی نکالتے رہے تھے، جس میں بیش تر تلامذۂ داغ کا کلام چھپتا تھا۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق شاہ دلدار علی مذاق (شاگرد ذوق) سے بیعت بھی تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ۸۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا، اور نہ اب شائع ہونے کی کوئی امید ہے۔ فرماتے تھے اپنی عمر میں ایک لاکھ کے قریب شعر کہے ہوں گے۔ ایک ضخیم مثنوی ''نوراً علیٰ نور'' جس میں نور الدین جہانگیر اور نور جہان بیگم کی حیاتِ معاشقہ کا بیان ہے نا مکمل رہ گئی۔ اب بھی اس میں آٹھ دس ہزار شعر سے کم نہ ہوں گے۔ یہ بھی اپنی خاندانی ہڑواڑ صندل خانہ مرزا بابر میں دفن ہوئے۔ تاریخ ہوئی ''بہ جنت جانشینِ داغ آسود'' (تمنا)

جم... نواب سیّد محمد جمشید علی خان بہادر مراد آبادی

مراد آباد کے عمائد میں سے تھے۔ شاہی میں اُن کو مشیر الدّولہ سفیر الملک نصیر جنگ کا خطاب ملا تھا۔ سلسلۂ نسب آٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ مولانا محمد صالح جو بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے اتالیق تھے اور بعد کو فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفوں میں بھی شامل رہے، جم کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ اِن ہی خدمات کے انعام میں شاہجہان نے اُنھیں پرگنہ حسن پور (ضلع مراد آباد) میں محمد آباد اور سات آٹھ گاؤ دوامی جاگیر میں عطا کیے تھے۔ یہ جاگیر ۱۸۴۰ء تک اِسی خاندان میں رہی، پھر انگریزی حکومت نے اُسے ضبط کرلیا۔

جم کے دادا کا نام قاضی ظفریاب خان تھا۔ والد قاضی ولایت علی، درجۂ اول کی سند حاصل کر کے مراد آباد ہی میں وکالت کرتے رہے۔

جم اچھے صاحبِ علم تھے، اُردو فارسی دونوں زبانوں سے مزاولت تھی۔ تاریخ اور صحافت سے خاص شغف تھا، ایک زمانے تک اخبار ''جامِ جمشید'' اور ''روہیل کھنڈ پنچ'' نکالتے رہے۔ ایک اخبار ''بلند اختر'' کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ پھر ریاست جے پور میں عدالتِ فوجداری کے سررشتہ دار ہو کے چلے گئے۔ چندے ریاست کوٹہ میں حاکمِ اپیل بھی رہے۔ ریاست جے پور میں ان کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔

اُن کے بڑے صاحب زادے سیّد عبدالعلی صاحب بھی اپنے والد کے نقشِ قدم

پر تھے، شاعر بھی تھے اور اخبار نویس بھی۔ عابد تخلص تھا اور داغ کے مشہور شاگردوں میں سے تھے، بلکہ بقول لالہ سری رام استاد ہمیشہ انھیں "فخرِ داغ" کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ پہلے "جامِ جمشید" کے ایڈیٹر رہے، پھر اپنا ایک اخبار "مخبرِ عام" جاری کیا۔

اے مجمعِ بحرین دِلت عدل و کرم را
وے مطلعِ سعدین درت علم و علَم را
ازروے توشد صبحِ وطن، شامِ غریباں
وزکوے توشد داغ بدل، باغِ ارم را
ممنونِ تو ہر شیخ و برہمن بوَد، آرے
شمع ست گلِ باغِ کرم دیر و حرم را
از رشکِ دلِ روشنت، اے نورِ جوانی
بر زد برمن پیرِ فلک ساغرِ جم را
از فیضِ تو خوں خشک شدہ درتنِ حاتم
وزعدلِ تو دل ترشدہ کسرئِ عجم را

☆

شاہِ انجم چوشود رونقِ اورنگِ حمل
سازد از فیضِ نظر فرشِ زمیں را مخمل
شاہدِ گل شود از نازو ادا جلوہ فروش
بلبلانِ چمن از شوق بخوانند غزل
ساغرِ لالہ گرایں گونہ دہد ساقیِ شوخ
چہ عجب شوق گرفتن بکند پنجۂ شل
چشم از عکسِ چمن سرخ شود ہمچو شفق
طبع از گل بنماید ہمہ لبریز بغل

☆

تھا خفتہ میں شب مست مے جامِ الم کا
اک دولتِ بیدار کا رخ خواب میں چمکا
سرتابقدم غیرتِ خورشید تھی پیکر
تھا حسنِ حسینانِ جہاں عکس قدم کا
بکھرے ہوئے بالوں میں وہ عارض کے تھے جلوے
گویا کہ گھٹا سے تھا کوئی چاند سا چمکا
ابرو کا وہ عالم تھا، کہ تھی تیغ سیہ تاب
کشتہ تھا دلِ راست ہر اک جلوۂ خم کا

☆

آتی ہے مگر کوچۂ جاناں سے، یہ اے جم!
دامن ہے معطر جو نسیمِ سحری کا

☆

بوقتِ نزع عیادت کو رشکِ حور آیا
اجل سے ٹھن گئی لو، اور یہ فتور آیا
مچے گا شہرِ خموشاں میں غل قیامت کا
خرامِ ناز سے، گر وہ سوے قبور آیا
شہیدِ عشق کے سر پر ہوا نہ کب محشر
عدو کے ساتھ وہ کس دن نہ سوئے گور آیا
نہ جانے، ہم سے سکندر کو کیا کدورت تھی
مزاجِ یار میں آئینے سے غرور آیا
درست وصف، بجا خوبیاں، مگر زاہد!
نہ غیرِ نام، نظر بادۂ طہور آیا

بجا ہے، آپ کو مطلب عدو سے، اے توبہ!
کہیں سے نشہ میں، میں ہی تھا رات چور آیا
فریب غیر سے، جو آپ نے کیا آزاد
غلام سے کوئی طاعت میں کیا قصور آیا
شگفتہ غنچۂ دل اب بھی گر نہ ہو، تقدیر
پیام موسم گل، نغمۂ طیور آیا
جہاں میں حضرتِ غالب کے بعد، جم! افسوس
نظر نہ کوئی سخن سنج، دُور دور آیا

[قصائد مدحیۂ نظام: ۲۰۱۔ ۲۲۵، خم خانۂ جاوید، ۵: ۴۹۵۔ ۴۹۶، تاج التواریخ (حصہ اخبارات): ۶۔ ۷، گلدستۂ ریاضِ سخن (۲۰ فروری ۱۸۸۵ء): ۴۰]

جنون... خان بہادر قاضی عبدالجمیل بریلوی

خاندان کا سلسلہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان سے ملتا ہے۔ اِن کے آبا و اجداد شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں مصر سے ہندوستان آئے۔ حکومتِ وقت کی طرف سے اُن کی مناسب آوَ بھگت ہوئی اور وہ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے۔ آخر میں بریلی کی قضات اُن کے خاندان کے سپرد ہوئیّ۔ اُن کے اجداد میں سے قاضی ثناء اللہ اپنے علم و فضل اور تدبر اور فراست کے باعث نواب شجاع الدّولہ کے خاص معتمد علیہ رہے تھے، اور انھیں جاگیر اور معقول وظیفہ ملتا تھا۔ ان کے انتقال (۱۱۸۷ھ) کے بعد قاضی غلام نبی اُن کے جانشین ہوئے۔ دربارِ اودھ اور سرکارِ انگریزی دونوں جگہ اُن کی قدر د· تھی۔ اُن کا ۱۶ دسمبر ۱۸۱۲ء کو انتقال ہوا، اور ان کے بیٹے قاضی غلام احمد اُن کے ۔ م مقام ہوئے۔

قاضی غلام احمد صاحبِ علم ہونے کے باعث حکومتِ وقت کی طرف سے موردِ اعزاز و اکرام ہوئے۔ صدر الصدور اور جسٹس آف کورٹ کے عہدے ملے۔ متعدد مرتبہ خلعت عطا ہوئے۔ ۲۰ اگست ۱۸۳۸ء کو یہ راہیِ ملک جاودانی ہوئے، تو قاضی عبدالجلیل اُن کے بڑے بیٹے اس وقت صدر امین تھے۔ اس لیے اُنھوں نے عہدۂ قضات سے بطیب خاطر دست برداری دے دی اور اپنے چھوٹے بھائی قاضی غلام حمزہ کو مقرر کر دیا اور خود امین ہی رہے۔ انگریزی پنشن جو اب تک ذاتی چلی آتی تھی، قاضی غلام حمزہ ہی کے زمانے میں موروثی ہوئی۔ اُن کی وفات ۴ دسمبر ۱۸۷۰ء (۱۰ رمضان ۱۲۸۷ھ) کو ہوئی۔ یہی ہمارے صاحبِ ترجمہ جنون کے والدِ بزرگوار تھے۔

قاضی عبدالجلیل ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ـ ۱۸۳۶ء) میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ صدر الصدور مفتی عنایت احمد (مصنفِ تواریخ حبیبِ الٰہ) سے پڑھیں۔ علومِ ریاضیہ میں بھی دستگاہ کامل تھی۔ فارسی اور عربی میں منتہی کا درجہ حاصل کیا۔ اُن کے اسلاف کی طرح حکومت نے اُن کی بھی بہت آؤ بھگت کی اور اُنھیں عہدۂ قضا پر فائز کیا۔ ۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۲۰ مئی ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ اُردو کلام پر مرزا غالب سے اصلاح لی، جس کا سلسلہ صفر ۱۲۶۹ھ (نومبر/ دسمبر ۱۸۵۲ء) سے شروع ہوا۔ اُن کے ذاتی تعلقات اپنے استاد سے بہت عقیدت مندانہ تھے اور استاد بھی اُن سے بہت شفقت اور محبت کا سلوک کرتے تھے۔ غالب کی کتاب دستنبو کا دوسرا ایڈیشن انھی کی نگرانی میں ۱۸۶۵ء میں بریلی سے شائع ہوا تھا۔

اُن کے بڑے صاحب زادے قاضی محمد خلیل بھی شاعر تھے، حیران تخلص کرتے تھے۔ اُنھوں نے اولاً حسن رضا خان (تلمیذِ داغ) سے مشورہ کیا۔ پھر حافظ بھیتی سے اصلاح لی۔ ان کا ۱۹۳۹ء میں انتقال ہوا۔

افسوس جنون کا کلام ضائع ہو گیا۔ اُنھوں نے کبھی اس کی ترتیب کی طرف توجہ نہ کی، بلکہ آخری زمانے میں تو شعر و شاعری سے طبیعت کچھ اچاٹ سی ہو گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے خود اپنی زندگی ہی میں اپنا کلام تلف کر دیا تھا۔ اِدھر اُدھر سے جو کچھ ملا، وہی بطور نمونہ پیش ہے۔

کچھ آیا راہ پہ، شاید وہ بدگماں میرا
کہ رات ذکر بہت کچھ رہا وہاں میرا

یہ کیا، کہ غیر نے جو کچھ کہا، بجا ہے وہی
مری زبان سے سنتے، مگر بیاں میرا

جنوں نے جور کا شکوہ کیا، تو کہتے ہیں
کہاں کو چھوڑ کے جاؤ گے آستاں میرا

☆

جو حسیں ہم کو ملا، کافرو بے دیں ہی ملا
جس کو دیکھا اُسے غارت گرِ ایماں دیکھا
نہ ہوا خندۂ بے وجہ، گوارا گُل کا
ہم نہ کہتے تھے، نہ کر سیرِ گلستاں، دیکھا

☆

کہاں یہ تاب کہ آنکھیں ملا سکوں تجھ سے
کہ اک نگہ میں دگرگوں ہے حال محفل کا

☆

دیکھ کر اُس بُت کو، کیا کہیے کہ کیا یاد آگیا
ہم کو اس کی بے نیازی سے، خدا یاد آگیا
میں جو رخصت ہو کے اُن سے، پھر گیا تو یوں کہا
کیوں گئے، کیوں آئے، کیا بھولے تھے کیا یاد آگیا

☆

ہے سرِ شام ہی سے بھاری رات
ہائے کیسے کٹے گی ساری رات

☆

سرسری تھا گلۂ جور و جفا، اے جاناں!
تم پشیماں نہ کرو مجھ کو، پشیماں ہو کر

☆

سامنے سے یوں نکل جاتے ہیں وہ
ان سے گویا کچھ شناسائی نہیں

☆

نہ سہی لطف و عنایت، ستم و جور سہی
غم تو یہ ہے کہ نہیں حال کا پرساں کوئی

☆

غم تو یہ ہے کہ میں نے اُن سے بات
کیوں کہی دل کی بے قراری کی
ہجر میں کون تھا، مرا ہمدرد
کچھ ترے غم نے غمگساری کی
اے جنوں! مر کے اس ستم گر پر
قدر بھی کھوئی، جاں نثاری کی

☆

کچھ گئے گزرے نہ تھے ایسے، مگر کیا کیجے
ہم سے پیمانِ وفا باندھ کے توڑا نہ گیا
آپ حیران تھے مجبوریِ دل پر از بس
آئنہ دیکھ کے پھر ہوش میں آیا نہ گیا
گرچہ رنج و غمِ ہجراں کے گلے تھے دل میں
سامنے اس ستم ایجاد کے بولا نہ گیا
میرے نقصاں نہ ہوئے عشق میں کیا کیا ظالم
دل گیا، جان گئی، کیا کہوں کیا کیا نہ گیا
چل بسا گلشنِ ہستی سے جنونِ مرحوم
غمِ ہجرِ بتِ بیدرد اٹھایا نہ گیا

[ماہنامہ کمال (دہلی) جنوری ۱۹۱۲ء، خم خانۂ جاوید، ۲: ۲۷۶۔۲۷۷،
اکمل التاریخ، ۱: ۴۵۔ ۴۶، العلم (سہ ماہی، کراچی) غالب نمبر:
۱۹۶۹: ۱۴۰]

جوہر... منشی جواہر سنگھ دہلوی

غالب کے اُن کے والد رائے چھج مل سے بہت دوستانہ تعلقات تھے، چنانچہ جس زمانے میں وہ کلکتے گئے ہیں، رائے چھج مل ہی کو اپنے معاملات کی دیکھ بھال سونپ گئے تھے۔ رائے صاحب موصوف فارسی بہت اچھی جانتے تھے اور غالب کے بہت قدر دان تھے۔ غالب کے فارسی دیوان کا سب سے قدیم خطی نسخہ جو اب تک منظرِ عام پر آیا ہے اور کتاب خانہ بانکی پور (پٹنہ) میں موجود ہے، اِنھیں رائے چھج مل کا لکھا ہوا ہے، یہ ۱۲۵۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ اُن کا انتقال ۱۲۸۸ھ (۱۸۶۰۔ ۱۸۶۱ء) میں ہوا، تو غالب نے تاریخِ وفات کہی:

گویند، رائے چھج مل شیریں کلام مرد
دیرینہ دوست رفت، ازیں تنگنا دریغ
گفتم، کسے زسالِ وفاتش نشاں دہد
غالب شنید و گفت، چہ گویم: "بسا دریغ"

منشی جواہر سنگھ انگریزی عمل داری میں تحصیل دار تھے۔ یو پی اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں رہے۔ غالب نے ایک رباعی میں اُن کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

تامیکش و جوہر دو سخنور داریم
شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
درمیکدہ پیریم، کہ میکش ازماست
درمعرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

جوہر بیش تر فارسی کہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان چھپا تھا لیکن دیکھنے میں نہیں آیا۔ بروایتِ بشیر غالباً ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ ان کی ایک غزل اُردوے معلیٰ میں ہے، اسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بجیرتم کہ ز دوزخ، کسانِ دوزخ را
کجا برند، چو آہم شرارہ بار افتد
نہ گبرم و نہ مسلماں بجیرتم کہ مرا
سوائے دوزخ و مینو کجا گزار افتد
قرار در وطن، افسردہ می کند، دل را
خوشا غریب کہ دور از دیار یار افتد
ترا کہ شیوہ دگرگوں کنی، بہ زعمِ بتاں
خوش ست، گر ز جفا بروفا قرار افتد
چکد ز خامۂ جوہر، سخن چناں کہ گہر
بزورِ موج، دُر از بحر، برکنار افتد

اُردوے معلیٰ کی تاریخِ طبع کہی:

چو اُردوے معلیٰ گشت تالیف
ہمانا یک جہاں گروید طالب
پے سالِ مسیحائی طبعش
بگو جوہر: "خجے اُردوے غالب"
(۱۸۶۹ء)

قاطع برہان (غالب) کی تاریخ کہی:

ایں نسخہ کہ غالباً چو او دیگر نیست
تالیفِ حریفِ غالبِ دوران ہست

جوہر ایں گفت سال طبعش طبعم
''زیبا فرہنگ قاطعِ برہان ہست''
(۱۲۷۸ھ)

☆

تو و ز راہِ کرم برسرم گزار غلط
من و برہ نہ نشستن بہ انتظار غلط
برو، بزہد بدآموزیم مکن، زاہد!
من و ز شاہد وے تو بہ در بہار غلط
بعمد، درخورِ پرسش نیم مگر وقتے
شود بکلبۂ من راہِ آں نگار غلط
برآں سرم، کہ دگر با کسے نیامیزم
اُمیدِ لطف ز یارانِ روزگار غلط

[اُردوۓ معلیٰ: ۳۹۳-۳۹۴، سبدِ باغِ دو در، گلستانِ سخن: ۱۹۰،
قاطع برہان: ۹۷، اُردو (سہ ماہی کراچی) ۴۵: ۲: ۲۳۵]

جوہر... حکیم محمّد معشوق علی خان شاہجہانپوری

روہیل کھنڈ کے ایک معزز اور مشہور خاندان افاغنہ کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے جدِ اعلیٰ محمد عمر خاں عرف عمر بابا، ولایتِ کابل کے سرحدی قصبے چمکنی کے رہنے والے تھے۔ جسے غوریا خان کے پسرِ چہارم چمکنی خان نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ عمر بابا خود بھی اسی چمکنی خان کی نسل میں سے تھے۔ اُن کی ریاضت و عبادت اور زہد و ورع کی بنا پر اُن کے معاصران کا بہت اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ عمر بابا کا مزار نواح چمکنی میں اب تک مرجعِ انام ہے۔ سب سے پہلے انھی عمر بابا کے صاحب زادے محمد ابراہیم خان آغازِ شباب میں نواب بہادر خان کے ہم رکاب شاہجہان پور آئے اور یہیں بس گئے۔

محمد معشوق علی خان جوہر کے والد کا نام اصغر علی خان تھا۔ جوہر ۱۸۵۲ء میں شاہجہان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر دہلی اور لکھنؤ میں طب کی تکمیل کی۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۷ء تک ریاست دیرہ (ضلع سلطان پور) میں ملازم رہے۔ یہاں سے نکلے، تو ریاست بھوپال میں بزمرۂ وکلاء مختاری شامل ہوگئے۔ یہاں نہایت خوش حالی سے بسر اوقات ہوئی۔ حکمران خاندان سے بھی اچھے تعلقات تھے، جیسا کہ اُن کے متعدد قصائد سے ظاہر ہوتا ہے۔ چوں کہ وہ اکثر مشاعرے کرتے رہتے تھے، اس لیے بھوپال اور اُس کے اطراف میں اُن کے باعث اردو زبان کو بہت ترقی ہوئی۔

۱۹۰۸ء میں بھوپال سے مولوی محمد عزیز مرزا ہوم سیکریٹری کے ساتھ

حیدرآباد دکن آئے جو بھوپال میں اُن سے ذیابیطس کا علاج کرانے آئے اور صحت یاب ہوگئے تھے۔ غالباً بعد کو اُنھیں کے توسط سے ان کی قدر دانِ علم و فضل مہاراجا سرکشن پرشاد مدارالمہام تک رسائی ہوئی۔ جوہر نے بوقتِ ملاقات ایک قصیدۂ غرّا نذر گزرانا، جس کے صلے میں مہاراجا بہادر نے قدر افزائی کے علاوہ اُنھیں ریاست کی عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ) کی سندِ وکالت بھی عطا فرمائی اور اس طرح آپ یہیں کے ہو رہے۔ مدّتِ دراز کی غیر حاضری کے بعد ۱۹۲۵ء میں اپنے وطن شاہجہان پور واپس آئے۔ یہیں ایک ہفتے کی مختصر علالت کے بعد بمرضِ اسہال ۸ اگست ۱۹۲۸ء میں انتقال کیا۔ ہوش و حواس آخر تک قائم رہے، بلکہ اپنی تجہیز و تکفین کا انتظام خود بحالتِ مرض کیا۔ موت سے دو ماہ پہلے اپنی تاریخ وفات چار (۴) کے تعمیے سے کل نفسٍ ذائقۃ الموت نکالی تھی (۴ + ۱۹۲۴ء)۔ بعد رحلت اپنے آبائی قبرستان واقع محلّہ گاڑی پورہ میں متصل مزار حضرت اسحاق خاں سپرد خاک ہوئے۔

اولاد میں دو صاحب زادے جناب حامد علی خان حامد اور محمود علی خان بسلسلۂ ملازمت اورنگ آباد دکن میں موجود ہیں۔ خاندان کے باقی افراد شاہجہان پور میں ہیں۔

جوہر طبابت میں بھی بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، اگرچہ طبابت کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا۔ ان کے دو دیوان، اُردو اور فارسی مرتب شدہ اُن کے خاندان میں موجود ہیں، اُردو میں بلا مبالغہ سیکڑوں قصیدے اور قطعے ہیں۔ بہت قادر الکلام اور زود گو تھے۔ سو پچاس شعر کا قصیدہ ایک مختصر نشست میں کہہ لینا ان کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اردو اور فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ اگرچہ جدّت اور تازگی ان کے کلام کی خصوصیت نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ لطف سے خالی نہیں۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

غربت کی آفتوں کا گلہ کس لیے کریں
اے ہم نشین! پائی تھی راحت وطن میں کیا

پیرِ مغاں کا کس لیے ملتا نہیں دماغ
فصلِ بہار آ ہی گئی ہے چمن میں کیا

☆

دیکھی کبھی خزاں، کبھی موسم بہار کا
کیا اعتبار ہو چمنِ روزگار کا

☆

شیخ جی ہاتھ تو موقعے سے لگے تھے لیکن
کچھ سمجھ بوجھ کے رندوں نے مگر چھوڑ دیا

☆

گردن پہ وہ رکھ رکھ کے اٹھا لیتے ہیں خنجر
کچھ کچھ ہے محبت کی جھلک طرزِ جفا میں
بربادیِ گلشن پہ ہیں، گل چاک گریباں
پیدا اثرِ درد ہے، غنچوں کی صدا میں

☆

تکلیف نہیں کوئی بھی ہر چند قفس میں
لیکن ہے یہ کہنے کو کہ ہیں بند قفس میں

☆

دم گھٹتا ہے، گھبراتا ہے دل، ہوش ہیں اڑتے
دشمن کو بھی رکھے نہ خداوند قفس میں میں

☆

درد منت کشِ فریاد نہیں ہے جوہر
ورنہ اوروں کی طرح، ہم بھی زباں رکھتے ہیں

☆

تصور بھی دلِ ویراں میں اب آتا نہیں اس کا
کوئی اجڑا ہوا گھر بھی کہیں آباد ہوتا ہے!

☆

گزرے مجنوں کو مدتیں گزریں
دشتِ وحشت میں آج ہُو ہے وہی
پھر مرے چھیڑنے کی باتیں ہیں
پھر رقیبوں سے گفتگو ہے وہی
یوں زمانے میں ہیں حسیں لاکھوں
جس کو جی چاہے، خوبرو ہے وہی

☆

دل نہیں مانتا ہے، اے ناصح!
تو ہی بتلا کہ کیا کرے کوئی

☆

یہ ایک جام، اور اس میں بھی تھوڑا سا کچھ کم
نہ آئی دیتے ہوئے بھی تجھے حیا، ساقی!

اب فارسی کے چند شعر دیکھئے!

ہر قدم قیس کہ در دشتِ جنوں زا انداخت
بہرِ وحشت زدگاں جادہ بصحرا انداخت
قیس چوں رفت ازیں غمکدۂ کون و فساد
بارِ سودائے محبت، بہ سرِ ما انداخت

☆

روز یکہ دید مت، شدہ ام مبتلائے تو
گنجد بہ چشمِ من نہ کسے ماسوائے تو

بنگر وفاے من کہ چہا بر سرم گزشت
گاہے نہ حرفِ شکوہ زنم، از جفاے تو

☆

دردِ دل را، جز بہ لُطفت نیست ممکن راحتے
از ترحّم، ہرگدا اے خود نظر کن ساعتے
بندہ ام، لیکن ز نا فرمانیت شرمندہ ام
از خلوصِ دل گہے ہرگز نہ کردم طاعتے
ما گداے بے تو ایم، بوریا مارا بس است
بود تختِ سلطنت بہر سلیماں راحتے
از وفورِ رحم، نعمت ہا عطا کردی بمن
من اداے شکررا، ہرگز ندارم طاقتے

(آثار الشعراء: ۱۸۹۔ ۱۹۰، خم خانۂ جاوید، ۲: ۳۰۸۔ ۳۱۰، جوہر، مکتوباتِ دل شاہجہانپوری بنامِ مؤلف)

حالی... شمس العلما مولانا الطاف حسین انصاری پانی پتی

مولانا حالی ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں پانی پت کے ''محلّۂ انصار'' میں پیدا ہوئے۔ نجیب الطرفین تھے۔ مادری سلسلہ ۳۴ واسطوں سے حضرت رسول کریم ﷺ پر منتہی ہوتا ہے۔ پدری سلسلے میں ۲۹ واسطوں سے اُن کے جدِ اعلیٰ مشہور صحابی اور مدینہ میں حضرت رسول کریم صلعم کے اوّلین میزبان حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ اُن کے پدری سلسلے میں حضرت شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری پیرِ ہرات تھے۔ اس خاندان میں سب سے پہلے خواجہ ملک علی ہروی، خواجہ غیاث الدّین بلبن کے زمانے (۱۲۶۶۔ ۱۲۸۷ء) میں ہندوستان آئے۔ یہ اپنے وقت کے مشہور عالم تھے۔ یہاں پہنچنے پر حکومتِ وقت کی طرف سے پانی پت کے قاضی مقرّر ہوئے۔ اِس کے علاوہ منڈی میں اجناس کے نرخ مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوا۔ مگر خاندان کی یہ ظاہری شان وشوکت حالی سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی، بلکہ اُن کے والد خواجہ ایزد بخش نے بھی اس جاہ و مال سے کچھ نہ پایا اور ساری عمر عسیری الحالی میں بسر کردی۔ یہ نو برس کے تھے، جب ۱۸۴۵ء میں اُن کا بعمر ۴۰ برس انتقال ہوگیا۔ والدہ کو اس سے پہلے ہی کوئی دماغی عارضہ لاحق ہو چکا تھا، جس سے وہ بھی ان کی دیکھ بھال سے قاصر تھیں۔ چنانچہ اس کے بعد اُن کی تعلیم و تربیت بڑے بھائی خواجہ امداد حسین مظہر اور بڑی بہن کے سپرد ہوئی۔

زمانے کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پہلے قاری حافظ ممتاز علی کی نگرانی میں قرآن کریم حفظ کیا۔ پھر میر ممنون کے بھتیجے (اور داماد بھی) سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی کا درس لینا شروع کیا۔ ابھی تعلیم ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ گھر والوں نے اُن کی مرضی کے خلاف اُنھیں خانہ داری کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور اُن کی اُن کے ماموں میر باقر علی کی بیٹی اسلام النسا سے شادی کر دی۔ لیکن علم کی جو لگن اُن کے دل میں تھی، تاہل کی ذمہ داریوں نے اس میں کمی نہیں آنے دی۔ ۱۸۵۴ء میں جب کہ عمر ابھی ۱۷ برس سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، چپکے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور دلّی جا پہنچے۔ اس دور کی دلّی گویا علم و فضل کا گہوارہ تھی۔ دور نزدیک کے مشہور اور قابل علما نے یہاں حلقہ ہائے درس قائم کر رکھے تھے۔ یہ بھی مولوی نوازش علی☆[1] کے درس میں شریک ہوگئے اور سال بھر اُن کی خدمت میں رہ کے کچھ عربی حاصل کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے مولوی فیض الحسن سہارنپوری اور مولوی امیر احمد اور شمس العلما میاں نذیر حسین سے عربی پڑھی۔ اِس کے بعد اگلے ہی سال (۱۸۵۵) عزیزوں کے اصرار پر اُنھیں دلّی کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ واپس پانی پت چلے آئے، لیکن یہاں وطن میں بھی اُنھوں نے تحصیلِ علم اور مطالعے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ۱۸۵۶ء میں معمولی مشاہرے پر کلکٹر حصار کے دفتر میں ملازم ہوگئے، لیکن اس تعلق کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بپا ہو گیا اور وہ نوکری چھوڑ کر گھر آ گئے۔

''غدر'' کے بعد حسن اتفاق سے وہ واقعہ پیش آیا جس نے اُنھیں مولوی الطاف حسین سے حالی بنا دیا۔ ۱۸۶۳ء میں وہ نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ کے مصاحب اور اُن کے منجھلے صاحب زادے نقش بند خان مہجور کے اتالیق ہو کر جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر) چلے گئے۔ شیفتہ جہاں جید عالم تھے، وہیں اُردو اور فارسی کی نظم و نثر کا بھی بہت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور جہاں تک نقدِ سخن کا تعلق ہے، اپنے زمانے سے یقیناً بہت آگے تھے۔ حالی کو خوش قسمتی سے ایسے یگانۂ روزگار شخص کی مصاحبت میسر آ گئی۔

شیفتہ اُردو اور فارسی میں مومن اور غالب کے شاگرد تھے، اور اس عہد کے جملہ اصحابِ کمال اُن کے احباب میں سے تھے۔ چنانچہ حالی کو بھی اُن کی معیت میں مفتی صدر الدّین خاں آزردہ،[☆۲] میرزا اسد اللہ خان غالب، نواب ضیاء الدّین احمد خان نیّر رخشاں، حکیم احسن اللہ خان اور دوسرے اربابِ علم و فن سے ملنے کا موقع ملا۔ جوہرِ قابل تھا، شیفتہ جیسے سخن فہم اور سخن سنج کی صحبت اور سرپرستی نے اسے بیرونی آلائشوں سے پاک کردیا اور اِن نام آور اصحابِ کمال نے اسے جلا دی۔ وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ جب میں پہلی مرتبہ (۱۸۵۴۔ ۱۸۵۵ء) بغرضِ تعلیم دہلی آیا ہوں تو ان دنوں ''قلعۂ معلّٰی کے دیوانِ عام میں جو مشاعرہ ہوتا تھا، وہاں میں نے غالب کو فارسی اور اُردو غزل پڑھتے سنا۔ اس سے مجھے شاعری کا شوق ہوا'' چنانچہ ایک دن میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُنھیں اپنا کلام سنایا، تو اُنھوں نے فرمایا کہ ''اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے، کہ اگر تم شعر نہیں کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے''۔ ابتدائی مشق کے زمانے میں خستہ تخلّص کرتے رہے۔ چنانچہ اُن کی جو تضمین قدسی کی مشہور نعت پر مجموعہ ''حدیثِ قدسی'' میں شامل ہے، اس میں یہی تخلّص ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِن ایام میں اُنھوں نے کچھ زیادہ شعر نہیں کہے، نہ کلام پر باقاعدہ کسی سے اصلاح لی۔ لیکن جب وہ مستقلاً شیفتہ کے پاس جہانگیر آباد آگئے، تو یہاں آنے کے بعد غالباً شیفتہ ہی کے کہنے سے اُنھوں نے غالب کی شاگردی اختیار کرلی۔ اُنھوں نے ایک شعر میں اپنے اِستفادے کا ذکر کیا ہے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلّد ہوں میر کا

غالب کی شاگردی نے سونے میں سہاگے کا کام کیا اور حالی جلد ہی میرزا کے دوسرے شاگردوں اور اپنے ہم عصروں سے گوے سبقت لے گئے اور بالآخر خود استادی کا درجہ حاصل کیا۔

پس یہ علم و ادب کی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ وہ شیفتہ کے ساتھ جہانگیر آباد گئے، ورنہ خدا معلوم، اُنھیں وہ مواقع حاصل ہوتے یا نہیں، جو انھیں میسر آئے۔ وہ تقریباً سات برس تک شیفتہ کے ساتھ رہے اور اُن کی وفات کے بعد یہاں سے نکلے اور مختلف جگہ ہوتے ہوئے ۱۸۷۰ء میں لاہور پہنچے۔ یہاں اس زمانے میں اُردو خاص توجہ کا مرکز بن رہی تھی۔ سررشتۂ تعلیم کے انگریز ڈائریکٹر فلر تھے اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال دہلوی ایم، اے اُن کے مشیرِکار۔ ماسٹر صاحب موصوف نے دہلی سے دعوت دے دے کر ایسے اصحاب کو بلایا، جو محکمے کی ترقی میں کسی طرح معاون ہوسکتے تھے۔ حالی کو یہاں سرکاری بک ڈپو میں ان کتابوں کی زبان درست کرنے کی خدمت سپرد ہوئی جو سررشتہ تعلیم انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کروا رہا تھا۔ یہاں سے تقریباً چار برس کی ملازمت کے بعد وہ ۱۸۷۴ء کے اواخر یا ۱۸۷۵ء کے شروع میں دہلی آگئے اور اینگلو عربک اسکول میں بمشاہرہ ۶۰ روپے فارسی اور عربی کے مدرسِ اول مقرر ہوئے۔ سرسیّد احمد خان سے اُن کی ملاقات یہیں ہوئی جس کا ثمرہ ۱۸۷۹ء میں مدوجزرِ اسلام یعنی مسدسِ حالی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں نواب سر آسمان جاہ بہادر وزیراعظم حیدرآباد دکن ہندوستان کی سیر کے لیے تشریف لائے، تو سرسیّد نے حالی کو اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر نے ازرہِ علم پروری حضور نظام کی سرکار سے صیغۂ امداد مصنفین سے، اُن کی اینگلو عربک اسکول کی تنخواہ کے مساوی ۷۵ روپیہ (حالی) ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اس کے تین سال بعد ۱۸۹۱ء میں جب یہ کالج وفد کے ہمراہ دکن گئے، تو یہ ۷۵ روپے سے بڑھا کر ۱۰۰ روپے کردیا گیا۔ چوں کہ سو روپے ماہانہ ان کی بسر اوقات کے لیے کافی تھا، اس لیے یہ ملازمت سے مستعفی ہوکر پانی پت آگئے، اور بقیہ عمر علم و ادب کی خدمت میں بسر کردی۔ حکومتِ وقت نے اُن کی خدمات کا اعتراف یوں کیا کہ جون ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔

خواجہ حالی کا نکاح ان کے بچپن ہی میں ان کے ماموں سیّد باقر علی کی صاحب زادی اسلام النساء سے ہوگیا تھا۔ اس سے ان کی تین اولادیں زندہ رہیں:

اخلاق حسین اور سجاد حسین دو بیٹے اور عنایت فاطمہ ایک بیٹی۔ خواجہ اخلاق حسین کی صاحب زادی مشتاق فاطمہ کا نکاح آنریبل خواجہ غلام الثقلین سے ہوا تھا، جن کے صاحب زادے خواجہ غلام السیدین مرحوم سابق سیکریٹری وزارت تعلیم حکومت ہند تھے۔ صالحہ عابد حسین اُن کی بہن ہیں، اُن کا اصلی نام مصداق فاطمہ ہے۔ اُردو کے مشہور افسانہ نگار خواجہ احمد عباس کی والدہ مسرورۃ النسا، حالی کے چھوٹے صاحب زادے خواجہ سجاد حسین کی صاحب زادی تھیں، ان کا نکاح خواجہ غلام الثقلین کے بھائی خواجہ غلام السبطین سے ہوا تھا۔ اسلام النساء کا ۲۲ اگست ۱۹۰۰ء کو انتقال ہوا۔

۷۷ برس کی عمر میں یکم جنوری ۱۹۱۵ء (۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ) رات کے اوّلین وقت ڈھائی بجے پانی پت میں انتقال فرمایا اور حضرت شاہ شرف الدّین بو علی قلندر کی درگاہ کے صحن میں (بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی اُلٹے ہاتھ) دفن ہوئے۔ حالی کا کلام کسی تبصرے کا محتاج نہیں، وہ نظم و نثر دونوں کے مسلّمہ استاد ہیں۔ ان کی نثری کتابیں حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، اُردو زبان کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں تو اُن کا دیوان اور مسدس اور نظموں کے مجموعے اُنھیں صفِ اوّل کے شاعروں میں معزز جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ وہ بڑے جامع شخصیت کے مالک تھے۔ ''مقدمۂ شعر و شاعری'' اور ''یادگارِ غالب'' سے فنِ تنقید میں گہری نظر کا پتا چلتا ہے، تو مسدسِ حالی اور سوانح عمریوں سے ان کے تاریخ کے مطالعے اور روایت و درایت کی محققانہ چھان بین کا سراغ ملتا ہے۔ دیوان سے پرانے رنگِ سخن پر قدرت کا اظہار ہوتا ہے، تو مسدس اور متعدد نظموں سے جو اُنھوں نے انجمن پنجاب کے جلسوں میں پڑھیں، اُن کی طبیعت کی آزادہ روی اور ترقی پسندی کا میلان نمایاں ہے۔ انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کر کے ہماری فرسودہ شاعری کو نئی ڈگر پر ڈالنے میں جو خدمت سرانجام دی، وہ کسی طرح بھولنے کی چیز نہیں۔ اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی یکساں دستگاہ تھی، اِن زبانوں میں اُن کا دیوانِ مختصر بعنوان ''ضمیمۂ اُردو کلّیاتِ حالی مشتمل بر نظم و نثر فارسی و عربی'' ان کی وفات سے چند ماہ پیش تر ۱۹۱۴ء

میں شائع ہوا تھا۔ (تحفۂ ہند پریس، دہلی)

اُردو اور فارسی کلام کا مختصر انتخاب درج ذیل ہے:

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں، ہے حمد سرا تیرا

☆

رونا نہ ہوگا، حالیؔ! شاید یہ کم تمھارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے تر تمھارا

☆

اسی میں ہے خیر حضرتِ دل! کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد، اس کی بھول کر بھی، کبھی تمنا نہ کیجیے گا

☆

عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

☆

ہم روزِ وداع اُس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو، روتے بھی تو کیا ہوتا
گر صاحبِ دل ہوتے، سن کر مری بے تابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

☆

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
کچھ میری بے خودی سے تمھارا زیاں نہیں
تم جاننا، کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

☆

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا
عمر شاید کرے نہ آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

☆

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

☆

قلق اور دل کا سوا ہو گیا
دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہوگیا

☆

آج امتحاں ہے نالۂ بے اختیار کا
کل ظرف دیکھنا ہے ترے رازدار کا
اک خو سی ہوگئی ہے تحمل کی، ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
آؤ متا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار، زندگی مستعار کا

☆

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب
آنے لگا جب اس کی محبت میں کچھ مزہ
کہتے ہیں لوگ، جان کا اس میں زیاں ہے اب

☆

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

☆

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی، گلِ تر کی صورت

☆

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد
گو مے ہے تند و تلخ، پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ! بن پڑے گی نہ کچھ، ہاں کہے بغیر

☆

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

☆

دل سے خوشیاں ہوگئیں سب گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط

غنچہ چٹکا اور آپہنچی خزاں
فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

☆

خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں، یا رب کہاں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آگئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

☆

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو عیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں
یا رب! اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ربط ہم سے، مگر اس قدر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

☆

خوابِ راحت میں وہ لذّت تیرے اے پیری نہیں
جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

☆

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم، وہ بات نہیں
مجھ کو تم سے پر اعتمادِ وفا!
تم کو مجھ سے پر التفات نہیں
قیس ہو، کوہکن ہو، یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

☆

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازیِ شبِ ہجراں میں نہیں
آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں، کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

☆

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

☆

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے، کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

☆

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

☆

وفا اغیار کی، اغیار سے پوچھ
مری الفت در و دیوار سے پوچھ

☆

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

☆

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

☆

یاد آؤ گے بہت، لطف سمجھ کر کیجیے
اس بھلائی کا ہے انجام برا یاد رہے

☆

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت!
ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

☆

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

☆

یارانِ تیزگام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

☆

فارسی کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

من ز رویش حسنِ معنی دیدہ ام
آنچہ دل بُردست، آنے دیگر ست

☆

چوں منِ غمزدہ ناکام ہمے باید زیست
ہر کرا در شب راحت غمِ فردائے ہست

☆

بہ طبعم سازگار افتاد وردش
مرا پرہیز از درماں ضرورست

☆

گر بگیرد، ہمہ عیب است، چہ عیب وچہ ہنر
در پذیرد، ہمہ زیباست، چہ زیبا وچہ زشت

☆

عشق از خویش بُریدن می خواست
حالی! از خلق بُریدیم عبث

☆

روزِ محشر، کہ ز ہر شیخ و برہمن پُرسند
سر دہم قصۂ شوقِ تو، چو ازمن پُرسند
پارۂ بیخبری، نطق مرا درکار است
اے بیارندہ ز من نکتۂ ہر فن پُرسند

بندہ را نیست مجالِ سخن آنجا، حالی!
ورنہ افسانہ دراز است، گر از من پُرسند

☆

لطفِ طاعت چہ بود، نیست اگر ذوقِ نظر
نہ پرستم صنمے را کہ خود آرا نبود
مجلسِ وعظ ملامت گہ وما غمزدگاں
بکم نشینیم بہ بزمے، کہ مدارا نبود

☆

آتش زنِ صد خرمن و ویراں کنِ صدکشت
برقے ست کہ درنرگسِ شہلاے تو باشد
خرسندمی سازی و غمگیں نہ پسندی
ناکام کسے کش سرِ سوداے تو باشد

☆

جاں گدازند بلطف و بغضب شادکنند
ہرچہ خواہید ازیں عشوہ گراں، می آید
بعد ازیں راز بصد پردہ نہاں نتواں داشت
عشق می آید و باطبل و نشاں می آید
دوش چیزے زسخن ہاے محبت نگزاشت
بجز آں حرف، کہ ازدل بزباں می آید

☆

آں گوش کہ پُر ز حرف و صوتست
گنجائیِ رازِ ما ندارد

کارم بکسے فتادہ، کز ناز
پروائے نیاز ما ندارد

☆

شکوہ برلب نیاید، عاقبت کیں می شود
زخم براورماں نباشد چوں کہن خواہدشدن

☆

گر بازوے ہمت ہست،دستے بگریباں زن
ورپاے ارادت ہست، لختے بہ بیاباں شو
ساقی بہ قدح بخشی گو توبۂ ماشکن
مطرب بنوا سنجی گو رہزنِ ایماں شو
ہم بادہ دما دم خور، ہم بوسہ پیاپے دہ
بے پردہ تراز گل آے، چوں بوے گل ارزاں شو

☆

سر نہ بہ درے و خاکِ پاے ہمہ باش
دل دہ بہ یکے و دل رباے ہمہ باش
خواہی شوی آشناے بیگانہ نما
بیگانۂ آشنا نماے ہمہ باش

☆

از شعر و سخن گوشِ جہاں گر بادا
ویں مشغلۂ بیہدہ کمتر بادا
بزہر کہ دعاے بدکنم، می گویم
یا رب! کہ گراں مایہ سخنور بادا

[حالی (انگریزی)، مقالاتِ حالی (۱): (ترجمۂ حالی): ۲۶۱۔ ۲۷۰، تذکرۂ حالی، یادگارِ حالی، چند ہم عصر: ۱۳۲۔ ۱۵۱، اُردو (سہ ماہی) جلد۱۳ و۳۳]

حواشی

☆۱۔ مولوی نوازش علی اصل میں پونڈلی (بابا بڑی) ضلع کرنال کے رہنے والے تھے۔ دلی کے علما سے کتب درسی پڑھیں اور شاہ محمد اسحاق سے حدیث کا سبق لیا۔ دہلی میں کھجور کی مسجد کے قریب سکونت تھی۔ حسین بخش سوداگر کے قائم کردہ مدرسے اور مسجد میں جو جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے مقابل کٹرہ گونگل شاہ کے سامنے واقع تھی، ان کا درس ہوا کرتا تھا۔ اپنے زمانے کے مشہور واعظ اور بلند پایہ عالم تھے۔ سرسید بھی ان کے شاگرد تھے، انھوں نے درسی کتابیں انھیں سے پڑھی تھیں (تذکرۂ اہلِ دہلی: ۱۰۱، حیاتِ جاوید، ۱: ۳۶، ایضاً، ۳۰۸۔۳۵۱)

☆۲۔ مفتی صدر الدین خان کشمیری الاصل اور مولوی لطف اللہ کے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) دہلی میں پیدا ہوئے، ''چراغ'' تاریخِ ولادت ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی اور مولوی فضلِ امام (والد مولوی فضلِ حق خیر آبادی) سے تعلیم حاصل کی اور خود صاحبِ مسند و افتا ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان نے اس جامعیت کے بہت کم اشخاص پیدا کیے ہیں۔ شاہی میں بھی مسندِ افتا پر فائز تھے، انگریزی عہد میں بھی صدر الصدور رہے۔ ساری عمر درس و تدریس میں گزری۔ شاہجہانی مدرسہ دارالبقا پھر سے زندہ کیا تھا۔ طالب علموں کے تمام اخراجات کے خود کفیل ہوتے تھے۔ ان کے بیسیوں شاگرد مشہور عالم ہوئے۔ ان میں سرسید احمد خان، نواب صدیق حسن خان (بھوپالی)، نواب یوسف علی خان (رام پور) مولانا خیر الدین (والدِ مولانا ابوالکلام آزاد)، مولوی فیض الحسن خان قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو وفات پائی۔ ''چراغِ دو جہاں بود'' اور ''وائے چراغِ دین'' سے تاریخ نکلتی ہے۔ دہلی سے باہر قطب صاحب کے رستے میں ''درگاہِ روشن چراغ'' کے احاطے میں آسودۂ خواب ہیں۔

شروع میں چند غزلیں شاہ نصیر کو دکھائیں۔ پھر مجرم اکبر آبادی سے مشورہ کیا اور آخرکار میر نظام الدین ممنون سے اصلاح لی۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں پر یکساں قادر تھے۔ سارا مجموعۂ کلام غدر میں ضائع ہو گیا۔ ایک تذکرۂ شعرا بھی مرتب کیا۔ اس کے کچھ ابتدائی اجزا کا قلمی نسخہ کیمبرج میں موجود تھا۔ اسی کی نقل یہاں پروفیسر مختار الدین احمد نے ترتیب و تحشیہ کے بعد شائع کی (دلی، ۱۹۷۰ء)

(تذکرۂ علمائے ہند: ۹۳۔۹۴، خم خانۂ جاوید، ۱: ۵۳۔۶۱)

حباب... پنڈت امراؤ سنگھ

۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۰۔ ۲۵ برس تک رڑ کی کالج میں ریاضی کے معلم رہے۔ نظم و نثر دونوں سے مزاولت تھی۔ ایک اخبار بھی جاری کیا تھا جس میں زیادہ تر اُن ہی کے مضامین ہوا کرتے تھے۔

غالب نے مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں امراؤ سنگھ کا یوں ذکر کیا ہے:

> امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اون کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس ہے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اوس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں مصیبت میں پھنستا ہے!

اِس خط سے دو باتیں معلوم ہوتیں ہیں:

جس زمانے میں غالب نے یہ خط لکھا ہے، تفتہ اُن ایام میں سکندر آباد میں مقیم تھے۔ فحوائے عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ سنگھ بھی ان دنوں سکندر آباد ہی میں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امراؤ سنگھ کی دو بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہوئیں، اور دوسری بیوی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ مری تھیں۔

۶۵ برس کی عمر تھی، جب ۱۹۰۹ء میں لاہور میں انتقال کیا، جہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔

نمونۂ کلام درج ہے:

گلشن میں گدگدی سے نسیمِ سحر کی آج
گل ہنس دیا، تو غنچہ بھی کچھ مسکرا دیا
بہائے بحر جو ہے، گوہرِ خوش آب سے ہے
دُرِ سرِ اشک سے ہے، آنکھ بے بہا دریا

☆

نسیمِ صبحِ بہاراں سے نرم تھی مری نیند
خروشِ بلبلِ نالاں سے اڑ گئی مری نیند

☆

نگاہِ دیدۂ بے ہوش ہیں ہم
صدائے نالۂ خاموش ہیں ہم

☆

غل کرتا ہوا مژدۂ آزادی کا
زنداں سے رہا ہو کے اسیر آتا ہے
ہے ساتھ جو توشۂ توکل بخدا
آزادِ غمِ جہاں جو فقیر آتا ہے
بے تابی و اضطراب کا نقش مٹا
اے موج! حباب دست گیر آتا ہے

☆

جنوں تعلیم تھی کیا بزمِ شب! جو صبح ہوتے ہی
گریباں پھاڑتے گھر سے تمھارے ہم نشیں نکلے

(بہارِ سخن: ۱۳۶۔ ۱۳۷، خم خانۂ جاوید، ۲: ۳۸۰، خطوطِ غالب: ۶۰)

حزیں ... میر بہادر علی بریلوی

ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو کے مصاحب و مقرب، بڑے وضع دار اور سنجیدہ طبع بزرگ تھے۔ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر تجمف ہی تھا، جن کے دادا مستقیم الدولہ میر علی بخش مشہور خوش نویس تھے۔ عارف کی زندگی بھر ان سے اصلاح لی، اُن کی وفات کے بعد غالب سے استفادہ کیا۔ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ـ ۱۸۶۹ء) میں فوت ہوئے۔

سب ناز سہے میں نے بے جا و بجا ان کے
نبھتی نہ حزیں ان سے، گر میں بھی برا ہوتا

☆

کر دیا شوق نے خوبانِ جہاں کو اُس کے
تفتہ دل، سوختہ جاں، خستہ جگر اپنا سا

☆

میرا احوالِ زبوں اُن پہ کھلے گا کیوں کر
سامنے آئیں گے جب وہ، تو سنبھل جاؤں گا

☆

دنیا کی حسرتیں ترے گوشے میں آ گئیں
اللہ رے وسعتیں تری، اے تنگنائے دل!
دیکھا وہ اپنی آنکھ سے، جو کچھ سنا نہ تھا
اور دیکھیے حزیں! ابھی کیا کیا دکھائے دل

☆

یوں کہہ کے رخنہ ڈالیے ان کے حجاب میں
اچھے بُرے کا حال کھلے کیا نقاب میں

☆

سبو منھ سے لگائیں گے، اب اتنا صبر ہے کس کو
کہ بھریے خُم سے مے شیشے میں، اور شیشے سے ساغر میں

☆

اے سوزِ عشق! روز نیا داغ تا بکے
اِس سے تو تن میں آگ لگا ایک بار دے

☆

حزیں! کس سے توقع ہو وفا کی
نہ ہو امید، جب اپنی ہی جاں کی

☆

بے خودی کھو کے، لیے سر پہ ہزاروں جھگڑے
توبہ، مے سے ہوئے ہم تو پشیماں اُلٹے

☆

اثر جو آہ میں پایا، تو ہوگئی تسکیں
وہ بے قرار ہوئے، آگیا قرار مجھے

☆

بلا سے گر نگاہوں میں ہیں ہلکے
سبک ہو کر تو ہم اٹھے جہاں سے

(طبقات الشعرائے ہند: ۴۳۲: گلستانِ سخن: ۱۹۹۔ ۲۰۰، گلستانِ بے خزاں: ۷۵، شمیمِ سخن، ۱۱۴، بزمِ سخن: ۳۹: خم خانۂ جاوید، ۲: ۳۹۷۔ ۳۹۸)

حسین... بی خورشید جان دہلوی

دلّی کی رہنے والی ایک طوائف تھی۔☆ اُس نے بعد کو کلکتہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، چنانچہ تالیفِ یادگارِ ضیغم کے زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھی۔ گلدستہ ''نتیجۂ سخن'' میں اُس کی غزلوں پر عنوان ملتا ہے:

''بی خورشید جان طوائف متخلص حسین۔ خوشہ چینِ خرمنِ حضرتِ غالب'' ان کا دیوان بعنوانِ ''دیوانِ حسین'' ۱۳۰۳ھ میں کلکتہ میں چھپا تھا (رپن پریس) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید بعد کو حکیم شیخ بنو صاحب ہلال خوشہ چینِ خرمنِ حضرت شوخی (نادر شاہ) سے مشورہ کرنے لگی تھیں۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

سن کے آواز بلاتا تھا وہ دلبر پہلے
پہروں ہم سر نہ پٹکتے، سرِدر پر پہلے
حالِ دل کہنے کو آیا ہوں، کہوں گا، لیکن
دیکھ تو میری طرف، آنکھ اٹھا کر پہلے
صاف کہہ دیجیے، کیوں اپنی حسیں سے ہے غبار
اس طرح تھے نہ کبھی آپ مکدّر پہلے
(نتیجۂ سخن: مئی ۱۸۸۴ء)

☆

جھکتے ہیں شوقِ قتل پہ ہر ہر ادا کے ہاتھ
سچ مچ بنے نہ ہوں کہیں ان کے حیا کے ہاتھ

دل کی طرح سے جب ہوئی تاثیر بے قرار
بے چین ہو کے رہ گئے، یا رب! دعا کے ہاتھ
قربان کس طرح سے نہ ہو دل کی آرزو
نامِ خدا حسین! ہیں حسنِ حنا کے ہاتھ
(ایضاً: اپریل ۱۸۸۵ء)

☆

نالاں و بے قرار ہوں کوچے میں یار کے
لوٹے گئے ہیں قافلے صبر و قرار کے
نالے پہ عندلیب کے، روتے ہو، زاہدو!
کیا شیفتہ ہو تم بھی، کسی گُل عذار کے
دل سے خیال یار کا جاتا نہیں حسیں!
شیشے میں رکھ لیا ہے پری کو اُتار کے
(ایضاً: جنوری ۱۸۸۶ء)

☆

گرمیِ صحبت کا ہے اس رشکِ گل پر یہ اثر
ہے تصوّر سے بھی صورت اس کی کمھلائی ہوئی
اِن دنوں حد سے سوا ہے پردہ داری کا لحاظ
یاد بھی جب ان کو آتی ہے تو شرمائی ہوئی

☆

(یادگارِ ضیغم: ۱۲۱۔۱۲۲: خطوطِ ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس)

حواشی

☆۔ میں نے طبع اول میں ''یادگارِ ضیغم'' کی سند پر ان کا نام خورشید صاحب لکھا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا نام بی خورشید جان ہے۔

حسین علی بیگ، مرزا

ان کا تخلص معلوم نہیں ہوسکا۔ ''ارمغانِ گوکل پرشاد'' میں ہے:

عاقل : محمد علی دہلوی خلف مرزا حسین علی بیگ مرحوم شاگردِ غالب و ذوق دہلوی۔ بالفعل ہاتھرس کے اسکول انگریزی میں مدرّس ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ایک دیوان اور مثنوی ''سراپتِ عشق'' یادگار ہیں۔ حکمت سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ حکیم مشتاق علی کاکوروی کے شاگرد ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسین علی بیگ نے غالب اور ذوق دونوں سے مشورہ کیا تھا۔ ان کے بیٹے محمد علی عاقل کے حالات تو گوکل پرشاد کے مندرجۂ صدر اقتباس میں آہی گئے ہیں۔

(ارمغانِ گوکل پرشاد : ٦۴)

حقیر... خوب علی دہلوی عرف میر چھوٹے صاحب

دلّی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نصیر کے بعد غالب کا تلمذ اختیار کیا۔ الور میں راجا شیودھیان سنگھ کی سرکار میں ملازم تھے۔ شاہ بہاء الدّین دہلوی (معروف بہ عبداللہ شاہ) بشیر لکھتے ہیں کہ حقیر نے اُن کو بتایا کہ میرا دیوان الور میں چھپا ہے۔ لیکن میرے قیمت ادا کر دینے کے باوجود اُنھوں نے دیوان کا نسخہ نہیں بھیجا۔ اس کے بعد بشیر لکھتے ہیں: ''ان میں یہ بڑا سخت عیب ہے کہ اوروں کے کام کو اپنا بتاتے ہیں۔ یہ رباعی لکھا گئے ہیں، ۱۲۸۷ھ میں، مگر مجھ کو یقین نہیں کہ ان کی تصنیف ہے:''

''ع'' سے عین عبادت کا سر انجام ہوا
''ل'' وہ لام کہ جس لام سے اسلام ہوا
''ی'' بھی یاور ہوا بندے کی ہر اک مشکل میں
صدقے جاؤں میں کہ کیا خوب علی نام ہوا

[تذکرۂ بشیر بحوالۂ اُردو (سہ ماہی)، کراچی ''شمارۂ خصوصی بیادِ غالب''، ۴۵ : ۱ (جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء)]

حقیر... منشی نبی بخش اکبرآبادی

اگرچہ ان کا خاندان اصل میں پنجاب کا رہنے والا تھا، لیکن بعد کو یہ لوگ نقل مکان کر کے دہلی اور پھر آگرے چلے آئے۔ چنانچہ حقیر کے والد شیخ حسین بخش آگرے میں پیدا ہوئے۔ یہ بھی شاعر تھے۔ پہلے تخلّص بخشی تھا، بعد کو بدل کر عاصی کرلیا۔ نظیر کے شاگرد تھے۔ آگرے کے محلہ تاج گنج میں رہتے تھے۔ حقیر انگریزی عدالتِ فوجداری میں سررشتہ دار تھے۔ اور اس علاقے سے مدّتوں کول (علی گڑھ) میں مقیم رہے۔ غالب اِن کے پایۂ سخن سنجی کے بے حد معترف تھے اور اُنھوں نے اپنے خطوط میں اِن کی بہت تعریف کی ہے۔ حقیر نے پہلے میاں نظیر اکبر آبادی کے صاحب زادے خلیفہ گلزار علی☆[1] اسیر سے اصلاح لی، بعد کو غالب سے مشورہ کرنے لگے، اُردو، فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔

اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۰ء میں انتقال کیا۔ اولادِ جسمانی میں دو لڑکے عبداللطیف اور نصیر الدّین اور ایک لڑکی زکیہ بیگم یادگار چھوڑے۔

حقیر کی وفات پر غالب نے قطعۂ تاریخ کہا تھا:

شیخ نبی بخش، کہ باحسنِ خُلق
داشت مذاقِ سخن و فہمِ تیز
مرگِ ستم پیشہ، امانش نداد
کیست کہ بامرگ بسیجد ستیز
سالِ وفاتش، زپے یادگار
بادلِ زار و مژۂ دجلہ ریز

خواستم از غالبِ آشفتہ سر
گفت مدہ طول و بگو ''رستخیز''
(۱۲۷۷ھ)

بیش تر کلام ضائع ہو گیا۔ مختلف جگہ سے جو کچھ ملا، وہی ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ممکن ہے غالب نے جو کچھ اُن کی شعر فہمی سے متعلق کہا ہے، وہ درست ہو، لیکن جہاں تک شعر گوئی کا تعلق ہے، اُن کے کلام میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات دکھائی نہیں دیتی :

سایۂ قصر ترا یاد آیا
پھر ہمیں ظلِ ہما یاد آیا
زخم کے منھ میں بھر آیا پانی
جب کہ پیکاں کا مزا یاد آیا
پھر گریباں کے اڑیں گے ٹکڑے
پھر وہی چاکِ قبا یاد آیا
یدِ بیضا کا جو مذکور ہوا
اُن کا نقشِ کفِ پا یاد آیا
خط جو غیروں کو کیے اس نے رقم
ہم کو قسمت کا لکھا یاد آیا
بسکہ مصنوع ہے صانع کی صفت
بت کو دیکھا تو خدا یاد آیا
آج پھر اس بُتِ کافر نے حقیر!
وہ ادا کی، کہ خدا یاد آیا

☆

دیر میں ذکر اپنا، کعبے میں بیاں اپنا
ایک ہم ہیں اور چرچا ہے کہاں کہاں اپنا

☆

مجھ خفتہ بخت کا جو سُنا ذکر سو گئے
احوالِ غم میں خواب کا افسانہ بن گیا

☆

بڑھ گئی توقیر میری امتناعِ دخل سے
اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مجھ کو اس کے درباں دیکھ کر

☆

وہ نگاہیں، جن سے تھی مجھ کو تسلی کی امید
تشنۂ خوں، آفتِ دل، دشمنِ جاں ہوگئی

☆

شانے نے بل نکال دیے زلفِ یار کے
موذی کو اس نے زیر کیا مار مار کے☆[۲]
چلا اٹھا میں رات کو دھوکے میں یار کے
اب تک خجل ہوں ماہِ فلک کو پکار کے
کیا بے حجاب باتیں وہ مطرب پسر کرے
پردے میں باتیں کرتے ہیں پردے ستار کے
خط کا ابھار عارضِ گل رنگ پر ہوا
شکرِ خدا، قریب دن آئے بہار کے
لاغر ہے قیس، پر نہ حقیر! اس قدر کہ میں☆[۳]
ہے کاہ کوہ آگے مرے جسمِ زار کے☆[۴]

☆

پھر جنوں آکے ہوا دست و گریباں ہم سے
نہ گریباں ہی بچے اب کے، نہ داماں ہم سے
ہم تو چھوڑیں گے نہ اس کے رُخ و کاکل کا خیال
کوئی کافر کہے، یا کوئی مسلماں ہم سے

آتشِ دل نے تو سرتا بقدم پھونک دیا
دیکھیں، اب کرتے ہیں کیا دیدۂ گریاں ہم سے
کش مکش ہم سے شبِ ہجر کی مت پوچھ، حقیر!
ہجر سے تنگ ہیں ہم، تنگ ہے ہجراں ہم سے

فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زخوں فشانیِ چشمم، ترا بخوں گیرند
کہ ہم زتست مرا، آنچہ در دل افتادست

☆

در گلستاں گزرش زاں افتد
کہ گل از چشمِ گلستاں افتد
افتد آں سر کہ درو ساماں است
سرہماں بہ کہ زساماں افتد
خوں شد و کارِ دل افتاد بہ اشک
اشک را کار بداماں اُفتد

☆

خوں کردہ رواں بسکہ بہرسُومژۂ ما
خونریز تراست ازنگۂ او مژۂ ما
آخر چہ قدر خوں چکد از یک صفِ مژگاں
اے کاش کہ بودے سرِ ہر مُو مژۂ ما
بے روئے تو، اے غنچہ دہن! دیدۂ مارا
صدخار خلانید بہ پہلو مژۂ ما
آگاہ نبود آہ، کس از خوں شدنِ دل
ایں پردہ بر انداختہ از رُو مژۂ ما

ہر دم کند ابرام زدل درطلب خوں
درگریہ فتاد است چہ بدخو مژۂ ما
سنجد گہر و لعل زبس وقتِ گرستن
اندر نظرِ ماست ترازو مژۂ ما
جنبید و بہر کوچہ زخونِ سیل رواں کرد
ماناست بداں جنبشِ ابرو مژۂ ما
سرولبِ جو دید و ز خوں کرد رواں جوے
اندر غمِ آں قامتِ دلجو مژۂ ما
وقت است کہ طوفاں زپےِ داوری آید
یکسوست رگِ ابرو، دگر سوٗمژۂ ما
چوں غرق نباشیم حقیر! ایں ہمہ درخوں
برمانکند رحم سر موٗمژۂ ما

☆

تراست سہل و مراسخت مشکل اُفتاد است
بمن ترا و مرا کار با دل اُفتاد است
بمنزلے است، ثباتِ قدم، مرا کہ درآں
ہزار مرتبہ لیلیٰ ز محمل افتاد است
زخونفشانیِ چشمم ترا بخوں گیرند
کہ ہم زتست مرا آنچہ دردل افتاد است
عیاں کہ نور بگیتی کنوں چساں گنجد
رُخت بماہِ منوّر مقابل افتاد است
چگو نہ دل زسراپاے او تواں برداشت
کہ کار با بتِ شیریں شمائل افتاد است

نہ جاے شکر و نہ راے شکایت است مرا
بکین و مہر نگاہِ تو شامل اُفتاد است
خوش آں کہ خوں بدل و خار وہ بپایم بود
ازیں کہ پا بگل و خار دردل افتاد است
ہلاکِ طرزِ ستمہاے غمزۂ کہ بمن
چہانکردہ و از کردہ غافل اُفتاد است
حقیرا زود بروں آ ز قلزمِ غفلت
کنوں کہ کشتیِ عمرت بساحل افتاد است

[گلستانِ بے خزاں: ۳۶۔۷، ۶۶، اُردوے معلیٰ: ۸۳، شمیمِ سخن: ۱۱۸، خم خانۂ جاوید، ۲: ۹۰ہ، شاعر (آگرہ نمبر): ۷۲، اسعد الاخبار ۱۸۴۷ء تیز ۲۱ و ۳۱ جولائی ۱۹۴۸ء، تذکرۂ نادر: ۵۸]

حواشی

☆۱۔ خلیفہ گلزار علی اسیر ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱۔۱۸۰۲ء) میں پیدا ہوئے۔ علومِ رسمیہ کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور اس میں کوئی خاص دستگاہ بھی نہیں تھی۔ شروع میں مہاراجا بلونت سنگھ (بنارس) کے پاس ملازم رہے، بعد کو دھول پور چلے گئے، یہاں انھیں پانچ روپے یومیہ ملتا تھا۔ دورانِ قیام دھول پور میں ریاست کی تاریخ اُردو میں نظم کی۔ دیوانِ اُردو کے علاوہ ایک مثنوی سوزِ عشق بھی یادگار چھوڑی۔ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں انتقال کیا۔ ان کے ایک شاگرد غلام محمد خان رہا نے چھ کے تخرجے سے تاریخ نکالی: گفت: ''اسیرِ دامِ ہستی شدرہا'' یہی قبر پر کندہ ہے۔ آگرے کے اکثر شعرا ان سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے صاحب زادے نثار علی بھی شاعر تھے، پذیر تخلص کرتے تھے۔ (شاعر آگرہ نمبر. ۳۵۔۳۶ : خم خانۂ جاوید: ۱: ۲۹۸)

☆۲۔ سیدھا کیا ہے موذی کو کیا مار مار کے۔ (تذکرۂ نادر) غالباً اصلاح سے پہلے یہ صورت تھی۔

☆۳۔ ہم (ایضاً)

☆۴۔ تل ہے پہاڑ سامنے اس جسمِ زار کے (ایضاً)

حیدر... آغا حیدر علی بیگ دہلوی

بزرگوں کا وطن مشہد (ایران) تھا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ محمدؔ مرتضیٰ مشہدی، نادر شاہ کے حملۂ ہندوستان میں اُن کے ساتھ آئے (۱۷۳۹ء)، خاندان کے اور لوگ بھی اُن کے ہمراہ آئے تھے۔ نادر شاہ تو لوٹ مار کرنے کے بعد واپس چلا گیا، لیکن یہ لوگ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ جب امن و امان قائم ہو گیا، تو آغا محمدؔ مرتضیٰ کی محمدؔ شاہ کے دربار تک رسائی ہوگئی اور وہ شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے۔

محمدؔ مرتضیٰ کے پوتے آغا رجب علی بیگ (۱۱۶۷۔ ۱۲۴۴ھ) صاحبِ ترجمہ حیدر دہلوی کے دادا تھے۔ آغا رجب علی بیگ کے تین بیٹوں کے نام ہمیں معلوم ہیں: بڑے آغا نجف علی بیگ، منجھلے آغا بندہ علی بیگ اور چھوٹے آغا احمد علی بیگ۔ آغا نجف علی بیگ دلّی میں تھانے دار کے عہدے پر رہے۔ آغا بندہ علی بیگ کثیر الاولاد تھے، اُن کے پانچ بیٹے ہوئے (کربلائی آغا عبد علی بیگ، آغا حیدر علی بیگ (صاحبِ ترجمہ)، آغا میرزا علی بیگ، آغا ولایت علی بیگ، آغا اصغر علی بیگ) داغ کے نورتن، ہمارے مشہور شاعر آغا ظفر علی بیگ شاعر دہلوی (ف: ۱۹۴۰ء) انھیں کربلائی آغا عبد علی بیگ کے بیٹے تھے، گویا یہ حیدر کے حقیقی بھتیجے ہوئے۔

آغا عبد علی بیگ بھی شعر کہتے تھے، فدائی تخلّص تھا۔ تیسرے بیٹے آغا میرزا علی بیگ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے، شعر بھی کہتے تھے اور اس میں خاص طور پر حضرت امام حسین کے مصائب سے متعلق نوحے لکھنے پر توجہ تھی، پڑھتے بھی خوب تھے۔ سب سے چھوٹے آغا اصغر علی مدّتوں ایران میں برطانوی قونصل خانے میں ملازم

رہے، اُنھیں انگریزی حکومت کی طرف سے ''خان بہادر'' کا خطاب عطا ہوا تھا۔

حیدر کے والد بندہ علی بیگ انگریزی فوج میں ملازم تھے، لیکن کسی وجہ سے استعفیٰ دے کر دلّی میں خانہ نشین ہوگئے۔ بعد کو کرنیل رینی نے اُنھیں لاہور بلایا اور اپنے رسالے (۱۸ بنگار) میں تنخواہ تقسیم کرنے پر بعہدۂ دفع دار مقرر کردیا۔ اُنھوں نے اسی عہدے سے پنشن پائی۔ اُن کا ۱۸۷۸ء میں دلّی میں انتقال ہوا۔

آغا بندہ علی بیگ کا انگریزوں سے یہ ارتباط ان کے بیٹوں کے بہت کام آیا، اُن میں سے کئی اصحاب کو آسانی سے ملازمت مل گئی۔ انگریزوں نے اپنا قبضہ مستقل ہو جانے کے بعد آبپاشی کے انتظام کے لیے یہاں گنگا اور جمنا سے کئی نہریں نکالی تھیں۔ حیدر گنگا کی نہر میں سب اوورسیر مقرر ہوگئے تھے۔ اِس حیثیت سے وہ بہت دن تک اٹاوہ میں مقیم رہے۔ جب ملازمت سے سبک دوش ہوئے، تو دلّی واپس آگئے۔

حیدر خاموش طبع شخص تھے، اُنھیں نمود و نمائش سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ حالاں کہ اُن کے زمانے میں کئی گلدستے چھپنے لگے تھے، جن میں ہم عصر شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا، لیکن کہیں حیدر کی کوئی غزل نظر سے نہیں گزری۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ وہ جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے اور اُنھیں نظم و نثر دونوں سے دلچسپی تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اُن کی تصانیف ہیں۔ اُن کا ''دیوانِ نوحہ جاتِ حیدر'' (نول کشور، لکھنؤ: ۱۸۹۰ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید مرثیہ بھی کہتے ہوں۔ اس کے علاوہ اُن کی تصنیفات مختارنامہ (اُردو)، مثنوی عزیز دل، فغانِ حیدر (واسوخت)، رسالۂ قافیہ (منظوم)، افیون نامہ (منظوم) کارزار نامہ (فارسی) کے نام ملتے ہیں۔ افسوس کہ اُن کا دیوان تقسیمِ ملک (۱۹۴۷۔ ۱۹۴۸ء) کے فسادات کی نذر ہوگیا۔

اُن کی ایک اور مختصر کتاب ''ول کم (WELCOME) بھی ملتی ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ آغا سرخوش دہلوی (مقیم کراچی) کے پاس محفوظ ہے۔ دراصل یہ ۱۹۰۳ء☆ کے دلّی دربار کے کوائف کی منظوم داستان ہے۔

ملکۂ وکٹوریہ (۱۸۳۷۔ ۱۹۰۱ء) کے انتقال ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کے بعد اُن کے

فرزند اکبر ایڈورڈ ہفتم بن کر شاہ انگلستان ہوئے۔ یہ لارڈ کرزن کی وائسرائلٹی کا زمانہ تھا، جن سے بڑا کوئی شاہ پرست ہندوستان نہیں آیا۔ اُنھوں نے شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کی تقریب منانے کو لال قلعہ دلّی میں ایک شان دار دربار منعقد کیا۔ ولایت سے ایڈورڈ ہفتم کے برادرِ خُردڈیوک آف کناٹ خاص اس دربار کی رونق بڑھانے کو شاہی نمائندے کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اکبر الہٰ آبادی نے اسی موقعے پر صنعتِ مرتج میں مشہورنظم کہی تھی، جو اُن کے کُلّیات (حصّہ اوّل) میں ''جلوۂ دربار دہلی'' کے عنوان سے ملتی ہے۔ اپنے نادر قوافی کے باعث اس کے مندرجۂ ذیل بند ضرب المثل بن چکے ہیں:

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

☆

پُرتھا پہلوے مسجد جامع
روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع
سب کے سب تھے دید کے طامع

☆

سرخی سڑک پر کٹتی دیکھی
سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی
لطف کی دولت لٹتی دیکھی

☆

اوجِ بخت ملاقی اُن کا
چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل ان کی، ساقی اُن کا
آنکھیں میری، ساقی اُن کا

☆

وغیرہ

یہ کتابچہ مطبع قیومی، کان پور میں چھپا تھا۔ اس میں حیدر نے شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور ان کی مدح لکھی ہے۔ اس کے علاوہ سر سیّد تحریک اور دارالعلوم علی گڑھ سے متعلق کچھ نیم سیاسی نظمیں ہیں۔ آغا خان کے بارے میں لکھتے ہیں:

سیدؔ نے جو کہا، وہی آغا نے کردیا
سیدؔ نے سردیا، مگر آغا نے زر دیا
ہم تیرہ بخت شامِ غریباں سے تھے نڈھال
آغا نے تحفے میں ہمیں نورِ سحر دیا
چندہ ہو دو کروڑ کا، میری ہے یہ دعا
آغا نے بیس لاکھ ہی اب تک نذر دیا
بے خانہ بے دیار تھی یہ قوم جاں گداز
اب قیصری صلاح سے آغا نے گھر دیا

ایک روایت کے مطابق حیدر کا ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان کسی وقت انتقال ہوا۔ دیوانِ نوحہ جات سے قدسی کی مشہور نعت کے مطلعے کی چند تضمینیں ملاحظہ ہوں:

اہلِ دنیا کی جو آنکھوں پہ قدم تم نے رکھا
آنکھوں نے اپنا شرف جان کے سایے کو لیا(؟)

اس لیے سایہ نہیں اس قدِ رعنا میں ہوا
دیکھ اعجاز ترا، چشم نے ہر دل کی کہا
مرحبا، سید مکّی، مدنی العربی!
دل و جاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

ایک انگشت سے شق تم نے کیا جب کہ قمر
تیرے فرماں کے ہوے تابع وہیں اہلِ خبر
شق ہوا چاند، شہا! جوں ہی پڑی تیری نظر
کہتا تھا ہاتف: مبارک ہو شہِ جن و بشر
مرحبا، سید مکّی مدنی العربی!
دل و جاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

پردۂ غیب میں اللہ تھا، یادستِ خدا
ہے یقیں مجھ کو "ید اللہ" نہ بولا ہوگا
پاسِ آداب سے لب اس کے ہوئے ہوں گے نہ وا
اس لیے میں یہی کہتا ہوں کہ خالق نے کہا
مرحبا، سید مکّی، مدنی العربی!
دل و جاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

شافعِ روزِ جزا تم ہو، شہِ جن و بشر!
تم کو لولاک کہا خالقِ اکبر نے، مگر
لطف کر حیدرِ ناچیز پہ بہرِ حیدر
وِرد اُس کے یہی کلمہ ہے شہا، آٹھ پہر
مرحبا، سید مکّی، مدنی العربی!
دل و جاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

آخر میں غزل کے چند شعر دیکھیے:

ہوش و حواس دل کو ابھی آئے جاتے ہیں
صورت جو اپنی وہ مجھے دکھلائے جاتے ہیں

ہے دل میں، الجھے دامِ بلا میں کوئی شکار
زُلفوں کے بال اس لیے سلجھائے جاتے ہیں

حیدر نہ سونگھی بوئے وفا ہم نے آخرش
ہم گل رُخوں کے ہاتھ سے گُل کھائے جاتے ہیں

(یادگارِ ضیغم: ۱۱۶۔ ۱۱۷، خیابانِ غالب: ۲۵۳۔۲۶۳)

حواشی

☆۔ نادم سیتا پوری نے اسے ۱۹۱۱ء کا دربار قرار دیا ہے۔ (خیابانِ غالب: ۲۶) یہ غلط ہے۔

خاور... مرزا محمدؐ اکبر خان قزلباش

والد کا نام مرزا محمدؐ مہدی خان تھا اور قوم کے قزلباش تھے۔ یہ خاندان اصل میں سیستان کا رہنے والا تھا مگر خاور کے اسلاف ایک زمانے سے نقلِ مکان کر کے نواحِ کابل میں آرہے تھے۔ خاور یہیں ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹۔۱۸۴۰ء) میں پیدا ہوئے۔☆۱ اور عنفوانِ شباب میں سیر و سیاحت کی ہوا سر میں سمائی تو واردِ ہندوستان ہوئے، اور آخر دلّی پہنچے۔ موزوں طبع تھے، شعر کہنے لگے۔ مرزا محمدؐ حسین خراسانی سے مشورہ کرتے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کی خدمت میں بہ نظرِ اصلاح پیش کیا۔ دلّی سے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور ذہن کی برّاقی سے تھوڑی مدّت وہاں رہ کر اُردو حاصل کرلی اور مشق سے اتنا ملکہ بہم پہنچایا کہ اہلِ زبان کی طرح گفتگو کرتے اور شعر کہتے تھے۔ اُردو کلام پر میر وزیر علی صبا☆۲ سے اصلاح لی۔

افغانستان کی پہلی لڑائی (۱۸۳۹۔۱۸۴۲ء) کے دوران میں انگریزی فوج پر افغانستان میں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا ہے تو خاور کے بزرگوں نے بعض انگریزوں کو پناہ دی اور اُن کی جان بچائی تھی۔ انگریزوں نے اس خدمت اور ہمدردی کا یہ صلہ دیا کہ ایک خاص نشان مقرر کیا کہ اس خاندان کا جو فرد بھی یہ نشان دکھائے گا، ہر انگریز کا فرض ہوگا کہ اس کی حتی الامکان مدد کرے، چنانچہ خاور بھی موردِ عنایات رہے تھے۔ لکھنؤ میں ڈاکٹر لوگن ان اصحاب میں سے تھے جو خاور کے والد اور چچا کی مدد سے بچ کر ہندوستان واپس آئے تھے۔ اسی لیے وہ خاور پر بہت مہربان تھے اور ہر طرح اُن کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔

یہ لکھنؤ سے نکلے تو جموں جا کر مہاراجا کے متوسلین میں شامل ہو گئے۔ یہاں سے پٹیالہ پہنچے۔ ریاست کی طرف سے سو روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا اور یہیں انھیں خطاب سلطان الشعرا بھی ملا۔ لاہور سے ڈاکٹر لائٹز کی سرپرستی میں ایک عربی رسالہ ''النفع العظیم'' نکلا تھا۔ تھوڑے دن تک اس کے بھی ایڈیٹر رہے۔ علمی اور تاریخی معلومات بہت وسیع تھیں، اور اکثر فنون میں مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ اپنے زمانے کے اخبارات میں مضامین لکھتے رہتے تھے۔

جس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں جدید مشاعروں کی بنیاد ڈالی ہے، خاور بھی اُن دنوں لاہور ہی میں تھے۔ یہ بھی اُن مشاعروں میں حصہ لیتے رہے۔

۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰۔ ۱۸۸۱ء) میں وفات پائی۔☆[۳] نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں نے تاریخ کہی:

صد حیف کہ مُرد خاورِ دانشور
آں شاعرِ خوش بیان، معنی پرور
یک سالِ دگر، کاش بماندے زندہ
تا سال شدے کہ ''مُرد مرزا خاور''
(۱۲۹۸ = ۱۲۹۹)

فارسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

او در دلِ من ست و دلِ من بدستِ اُو
چوں آینہ بدستِ من و من در آینہ

☆

دم بادِ بہاری شد، چو روح القدس در گلشن
وزاں شد مریمِ گلبن بعیسیٔ گل آبستن

☆

نسیمِ باغ جاں پرور، شمیمِ بوستاں دلبر
صبارا عُود درمجمر، ہوا را مشک در دامن

☆

نبود سلسلہ جنبان کلام کہ بدہر
بستۂ بندِ وفایش، دلِ آزادِ من ست
غالبِ نامور، آں کشِ اسد اللہ خوانند
شاہِ ملکِ سخن و مرشد و استادِ من ست

☆

رُباعی

دی شب کہ بکوے میفروشم بروند
دادند پیالہ و زہوشم بُردند
ہر چند کہ گفتند حریفاں: "برخیز"
القصہ نرفتم و بدوشم بروند

خاور بفلک نزدِ ہنر می بازیم
بیہودہ بایں بو الہوسی می سازیم
نازد ہمہ کس بہ بخت و برطالعِ خویش
ماخود بنصیبِ دگراں می نازیم

اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

معمور ہے داغوں سے سراپا مرے دل کا
مثلِ شجرِ طُور ہے نقشا مرے دل کا
جیتا ہوں نہ مرتا ہوں، عجب دکھ میں پڑا ہوں
کیا پوچھتے ہو حال ہے کیسا مرے دل کا

کیا آپ کی مانوں میں بھلا، حضرتِ ناصح!
کچھ حال بھی معلوم ہے، قبلہ مرے دل کا

☆

نہ دیکھا ہو جس نے کبھی رقصِ بسمل
وہ آج آ کے دیکھے تماشا ہمارا
ہوے تم جو اس بے مروت کے خاور!
نہ ہے وہ کسی کا، نہ ہوگا ہمارا

☆

مرنے کا لطف، دیکھ رہا ہوں میں زیست میں
یہ بھی تو ایک موت ہے، مرتا نہیں ہوں میں
کچھ حالِ دل کے کہنے سے ڈرتا نہیں ہوں میں
اس میں بھی ایک بات ہے، کہتا نہیں ہوں میں

(سخنِ شعرا: ۱۴۷۔ ۱۴۸، نگارستانِ سخن: ۲۶۔ ۲۷، روزِ روشن: ۱۹۶، خمِ خانۂ جاوید، ۳: ۱۰۔ ۱۱، دو نایابِ زمانہ بیاضیں: ۱۰۷۔ ۱۰۸، تاریخِ پٹیالہ: ۲۲۲)

حواشی

☆۱۔ یہ نگارستانِ سخن کا بیان ہے۔ اس کے برعکس سخنِ شعرا (نساخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد ''مقیم اکبرآباد'' تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہجرت مرزا محمد مہدی خان نے کی اور جن ایام میں وہ اکبرآباد میں مقیم تھے، خاور یہاں پیدا ہوئے۔ یا شاید باپ بیٹا دونوں ایک ساتھ ہندوستان آئے اور مرزا محمد مہدی خان اکبرآباد میں بس گئے۔

☆۲۔ صبا لکھنوی، میر وزیر علی نام، بیٹے تھے میر بندہ علی کے۔ ان کے ماموں میر اشرف علی نے انھیں گود لے لیا تھا۔ آسودہ حال اور یار باش آدمی تھے۔ دو سو ماہانہ واجد علی شاہ کی سرکار سے اور تیس روپے نواب محسن

الدولہ بہادر (نبیرۂ غازی الدّین حیدر) کے ہاں سے ملتے تھے۔ کچھ اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ بھی تھی۔ غرض بڑے عیش سے بسر کی۔ صبح سے شام تک احباب کا جمگھٹا رہتا اور افیون کا دور جاری رہتا۔
شعر میں آتش کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے دیوان "غنچۂ آرزو" ان کی وفات کے ایک سال بعد شائع ہوا (۱۲۷۲ھ)۔ ان کی مثنوی "صیدیہ" بھی مشہور ہے۔ گھوڑے سے گرنے کے باعث بدھ ۲۷ رمضان ۱۲۷۱ھ (۱۳ جون ۱۸۵۵ء) کی رات کے پچھلے پہر انتقال ہوا۔ غلام حسنین قادر بلگرامی نے تاریخ کہی: اوفتادہ صبا از اسپ خود (۱۲۷۱) محلہ شاہ گنج، لکھنؤ کے قریب احاطہ تکی بیگ (حال میرلنگی) میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے تھے۔ مسجد موجود ہے، قبر کا نشان مٹ گیا۔
ان کے دیوان کا انتخاب (مرتبہ کاظم علی خان) اتر پردیش اُردو اکادمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے (۱۹۸۲ء)
[خم خانۂ جاوید، ۵: ۲۵۳۔ ۲۵۸، اردوے معلیٰ (ماہنامہ) (اگست ۱۹۰۷ء): ۱۔۸]

☆ ۳۔ تذکرہ اختر تاباں (ص ۱۲۹) میں لکھا ہے کہ وزیر النساء بیگم وزیر تخلص، خاور کی بیوی تھی۔ یہ غلط ہے جیسا کہ منشی دُرگا پرشاد نادر نے اپنے تذکرے گلشن ناز (ص ۴۲) میں صراحت کی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وزیر ان کی شاگرد ہو جیسا کہ صاحب گلشن (ص ۸۹۰) کا بھی خیال ہے۔

خستہ... محمد کریم الدّین

محمد حشمت علی خان موجد رامپوری (شاگردِ مومن) کے مطبوعہ دیوان (مطبع احمدی، کان پور۔ محرم ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء) میں قطعہ بعنوان ''محمد کریم الدّین صاحب متخلص بہ خستہ شاگردِ غالب'' میں ان کے دیوان چھپنے کی تاریخ ہے:

چھپا جب ہر طرح سے پا کے ترتیب
بہ امدادِ خدا دیوانِ خستہ
تو موجد! غیب سے ہاتھ آئی تاریخ
''سنا ہے چھپ چکا دیوانِ خستہ''

گویا (۱) تلمیذِ غالب تھے، (۲) صاحبِ دیوان تھے، اور (۳) دیوان ۱۲۹۲ میں چھپا۔

[اکادمی (دو ماہی) لکھنؤ۔۲: ۱۰: ۴۸]

خلیل وفوق... محمدّ ابراہیم آروی

اِن کے حالات معلوم نہیں ہوسکے، غالباً آرہ (ضلع شاہ آباد) کے رہنے والے تھے، اور یہاں محلہ چوک مسجد میں قیام تھا۔ پیشے کے لحاظ سے محررِ عدالت تھے۔ ان کا کُلّیاتِ نظم و نثر اردو فارسی مطبع نور الانوار، آرہ سے ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) میں شائع ہوا تھا۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں یہ غالب سے برابری کے دعوے دار تھے، جیسا کہ اُن کے ایک مقطعے سے ظاہر ہے:

خلیل ایں غزل گفتم از رُوے دعوا
جوابش دہد غالبِ نکتہ آرا

لیکن ۱۸۶۷ء میں یہ اصلاح کی درخواست لے کر غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ معلوم نہیں کہ غالب نے یہ درخواست قبول کی یا نہیں۔ غالب نے اُن کے خط کا جو جواب دیا تھا، وہ کُلّیاتِ فوق میں شامل ہے (ص ۱۴۵۔ ۱۴۶)۔ اِس سے یہ نہیں کھلتا کہ واقعی اُنھوں نے اصلاح دنیا منظور کیا یا نہیں۔ بہرحال فوق کا نام شاملِ تلامذہ کرلیا گیا ہے کیونکہ اس کا امکان ضرور ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

زنہار اے خلیل! بریں دہر دل مبند
یک گوشۂ قناعت ویک بوریا بس است

گویم من از تو چوں کہ زشوقت چہا گزشت
برجانِ ناتواں چہ قدر غمہا گزشت

☆

بے روئے تو گل بدیدہ خار است
بدتر زخزاں مرا بہار است

☆

گویم ہمہ عالم بمرادِ دلِ ما باشد
گر یار بکامِ منِ بیدل شدہ باشد

☆

بسانِ غنچہ دلِ من چمن چمن بشگفت
درآں زماں کہ نسیمے ازاں دیار آمد

☆

مفتونِ دل! مباش زنیرنگی جہاں
نرگس صفت بدہر سرا پا ے دیدہ باش

☆

حُسنِ تو کرد چناں محو کہ نتو انم گفت
کہ چسانیم بذکرِ تو سراپا مشغول
ہمرہاں پیش و پسِ قافلہ رفتند و من
رہ غلط کردم وماندم بتماشا مشغول

☆

کوئی کہتا ہے کعبہ رخ کو تیرے، کوئی بت خانہ
غرض جھگڑا رہا، اے یار! ہر شیخ و برہمن میں

☆

ہوتی فروتنی ہے تنک ظرف سے کہاں
ظاہر ہے دیکھ گردنِ مینا میں خم نہیں
شکوے کا کیا محل ہے، بہرحال شکر کر
دنیا میں، کون ہے، جسے اندوہ و غم نہیں

☆

اشک ہے سرخ، مرا رنگ ہے زرد
حالتِ دل کو بیاں کیا کیجیے
بخدا شکر کی جاہے ہر طور
شکوۂ جورِ بتاں کیا کیجیے

☆

صبا کی طرح پھرتے ہیں وہی سرگشتہ، جو اے دل!
زیادہ اس جہاں میں پاؤں پھیلاتے ہیں چادر سے

(کلیاتِ خلیل و فوق)

خضر ... میرزا خضر سلطان دہلوی

بہادر شاہ ظفر دہلوی کے بیٹے تھے۔ یہ وہی خضر سلطان ہیں، جن کی پیدائش پر غالب نے کہا تھا:

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر☆ سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد خاندانِ شاہی کے دوسرے افراد کے ساتھ یہ بھی ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو مقبرۂ ہمایوں میں گرفتار ہوئے اور اسی دن خونی دروازے کے باہر، اپنے بڑے بھائی میرزا ظہیر الدّین عرف مرزا مغل اور بھتیجے میرزا ابوبکر (خلف میرزا فخرو) کے ساتھ کپتان ہاڈسن کی گولی کا نشانہ بنے۔ دوسرے دن تینوں شاہزادوں کی لاشیں، چاندنی چوک میں کوتوالی کے چبوترے کے سامنے پھانسی پر لٹکا دی گئی تھیں۔ وفات کے وقت عمر ۲۶ سال سے متجاوز نہیں تھی۔ ایک لڑکا میرزا محمد عثمان اور ایک لڑکی یادگار چھوڑی۔ یہ صاحب زادی ان کے بھتیجے میرزا مجاہد الدّین شاہی (خلف میرزا مغل) سے منسوب تھیں۔ میرزا محمد عثمان بھی شعر کہتے تھے، افسر تخلّص تھا اور میرزا قادر بخش قادر سے اصلاح لیتے تھے۔ لگ بھگ ۴۰ برس کی عمر تھی، جب ۱۳۰۶ھ میں فوت ہوئے۔ میرزا خضر سلطان کے چند شعر ملے:

گالی سے کون خوش ہو، مگر حسنِ اتفاق
جو تیری خو تھی، وہ ہی مرا مدّعا ہوا

☆

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
غیروں پہ کرم ہو، یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

☆

جام جمشید کو، آئینہ سکندر کو ملا
خضر میں وہ ہوں، کہ حصے میں مرے دل آیا

☆

کہتے ہو! "وہ بھی ہوس پیشہ ہے، جیسا تو ہے"
مجھ سے اک چھیڑ ہوئی، شکوہ عدو کا نہ ہوا

☆

کہتے ہو کہ اک روز تجھے قتل کریں گے
پر یہ بھی تو اے شوخ ستم گر نہیں ہوتا

☆

نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی، نہ سن سکتے ہیں کچھ تیری
ہمیں اس وقت میں اے بے وفا! دیکھا، تو کیا دیکھا

(خم خانۂ جاوید، ۳: ۲۵۔ ۲۶، نیز ایضاً، ۱: ۳۴۳۔۳۴۴)

حواشی

☆۔ اشارہ ہے اکبر شاہ ثانی کی طرف جو خضر سلطان کے دادا اور ظفر کے والد تھے۔ یہ بھی شاعر تھے اور اپنے والدِ مکرم شاہ عالم ثانی کے تخلص آفتاب کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں مکندپور دیوان میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰۶ء میں تخت پر بیٹھے۔ ۳۱ برس کی حکمرانی کے بعد ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ ظفر انھی کے جانشین ہوئے تھے۔ ظفر نے تاریخِ وفات کہی: "عرش آرام گاہِ عالی قدر" آفتاب اور شعاع دونوں باپ بیٹے موتی مسجد (دلّی) کے پاس شاہ عالم بہادر شاہ اول (خلفِ عالمگیر) کے مجر میں مدفون ہیں۔ (خم خانۂ جاوید: ۴: ۵۵۲)

خورشید... خورشید احمد لکھنوی ثم دہلوی

شاہ شکور احمد شکور کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سرہندی کی پانچویں پشت میں تھے۔ ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹۔ ۱۸۲۰ء) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔☆[۱] بہت سیلانی آدمی تھے۔ ماور النہر اور خراسان تک کی سیر کی تھی۔

سلسلۂ نقشبندیہ میں اپنے عم زاد بھائی شاہ رؤف☆[۲] احمد رافت سے بیعت تھے اور ابتدا میں مشورہ سخن بھی اُنھیں سے کیا۔ اُن کے بعد شاہ سعد اللہ حیدرآبادی اور شاہ احمد سعید دہلوی سے بھی کسبِ فیض کیا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ مومن کی زندگی میں اُن سے مشورہ کرتے رہے، اُن کے بعد غالب سے اصلاح لی۔

جب دلّی پر زوال آیا، تو یہ ہجرت کر کے کابل چلے گئے، اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ ۱۲۹۱ھ میں مکۂ معظمہ میں رحلت کی۔ اولادِ جسمانی میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔

کہاں پہلو میں دل خورشید! جس کو ہم تسلی دیں
جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا

☆

پھاڑنے کو اور کیا باقی رہا! دستِ جنوں
چاک دامن ہو گیا، پرُزے گریباں ہو گیا

جاتا نہیں آنکھوں سے تصوّر کبھی خورشید!
موجود ہے ہر وقت، وہ گویا مرے آگے

☆

نویدِ وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے، خورشید!
کسی طرح کوئی تسکینِ اضطراب تو دے

☆

فارسی کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:

سوے چمن اے واے پریدن نتوانیم
در موسمِ گل ریخت فلک بال و پرِ ما

☆

دیدن بروے خوبِ تو، گیریم جرمِ ماست
برحالِ زار رحم نکردن، گناہِ کیست!

☆

عاشق و رندم و بیباک، بہ مسجد چہ کنم
اے برہمن! بُت و بت خانہ و زُنّار کجاست

☆

از رقیب آزار، اے دل، گر رسد ہرگز منال
ازبراے گل جفاے خار می باید کشید

☆

بے طلب آمد و من ہیچ نہ پرسم، خورشید!
نالہ من بدلش خوش اثرے پیدا کرد

☆

ازجاے رفتۂ ز بد آموزیِ رقیب
لطفے، عنایتے، کرمے داشتی چہ شد
آخر بگو، چگو نہ بہ حق مشتغل شدی
خورشید! مہ لقا صنمے داشتی چہ شد

☆

مالعلِ تو بالعلِ بدخشاں نفروشیم
جنس است گراں مایہ کہ ارزاں نفروشیم

☆

ساقی! بخیز و بادۂ گلگوں بجام کن
فارغ مرا ز وسوسۂ ننگ و نام کن

☆

اے صبا! نکہتِ آں رشکِ چمن باز رساں
مژدۂ دولتِ دیدار بمن باز رساں

☆

مہ و خورشید یک سو، چہرۂ آں سیم تن یکسو
عبیر و مشک یکسو، بوے زلفِ پُرشکن یکسو

(سخنِ شعرا: ۱۵۴۔ ۱۵۵، انتخابِ یادگار، ۲: ۱۲۶، خمخانۂ جاوید، ۳!
۶۷۔ ۶۸، ہدیۂ احمد یہ بحوالۂ ہماری زبان، ۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء: ۷)

حواشی

☆۱۔ طبع اوّل میں ولایت ۱۲۶۵ھ لکھی گئی تھی، جو مبنی تھی ''انتخابِ یادگار'' کے اندراج پر کہ وہاں عمر پچیس برس کی لکھی تھی۔ لیکن جناب کا کلب علی خاں فائق نے ٹھیک لکھا ہے کہ یہ سہوِ کتابت ہے، عمر پچپن سال ہوگی۔ اسی

لیے تبدیلی کردی گئی ہے (دیکھیے: ماہِ نو، کراچی: جنوری، فروری ۱۹۶۹ء)

☆۲۔ حضرت شاہ رؤف احمد رافت بھی حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد شاہ شعور احمد رامپوری تھے۔ رافت رام پور ہی میں ۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ (۶ نومبر ۱۷۸۶ء) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "رحمان بخش" ہے۔ (مولد لکھنؤ۔ طبقات الشعرائے ہند) جید عالم تھے۔ طریقت میں اوّل شیخ درگاہی سے استفادہ کیا، پھر دتی میں حضرت شاہ غلام علی کے حلقے میں شامل ہوگئے۔ ان کے بزرگ خلفا میں ان کا شمار ہے۔ بہت دن بھوپال میں مسندِ ارشاد و ہدایت کی زینت رہے۔ بھوپال کے سب حکمراں ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ۴۸ سال کی عمر تھی، جب ۵ اپریل ۱۸۳۴ء (۲۵۔ ذی قعدہ ۱۲۳۹ھ) کو عین سفرِ حج میں عرشۂ جہاز پر انتقال فرمایا۔ نساخ کی کہی ہوئی "قدوۂ جنت رافت" تاریخ وفات ہے۔ (انتخابِ یادگار، اور شمیم سخن دونوں جگہ عمر اور تاریخِ وفات غلط ہے)۔ شاعری میں جرأت کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شوق تھا۔ جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے عروض اور قوافی میں بھی بے نظیر مہارت تھی۔ اردو میں چھ اور فارسی میں ایک دیوان اپنے پیچھے چھوڑے ایک معراج نامہ اردو نثر میں اور اردو مثنوی یوسف زلیخا بھی ان سے یادگار ہے۔ اردو میں دو جلدوں میں تفسیرِ رؤفی لکھی۔ اپنے مرشد شاہ غلام علی کے ملفوظات درر المعارف کے عنوان سے جمع کیے بعض اور رسائل بھی جمع کیے تھے۔

رافت کے صاحب زادے جناب مولوی حسیب احمد بھی شاعر تھے۔ رویت تخلص تھا اور اپنے والد ماجد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کے استاد تھے۔ ۴۰ برس کی عمر میں (۲۲ مئی ۱۸۴۶ء ۲۵ جمادی الاوّل ۱۲۶۲ھ) کو بھوپال میں ہیضے سے انتقال کیا۔ (طبقات الشعرائے ہند: ۲۶۱۔۲۶۳، انتخاب یادگار، ۲: ۱۴۳۔۱۴۴، شمیم سخن: ۱۲۵۔ ۱۲۶، نگارستانِ سخن: ۳۰، تذکرۂ کاملانِ رام پور: ۱۴۳۔ ۱۴۷، تذکرۂ علمائے ہند: ۶۶۔ ۶۷، آثار الشعرا: ۱۱۷۔ ۱۱۸، فرح بخش: ۴۴)۔

درد... منشی ہیرا سنگھ دہلوی

رائے چھج مل کے بیٹے اور منشی جواہر سنگھ جوہر تحصیل دار کے چھوٹے بھائی تھے۔ دہلی میں مسجد فتح پوری اور سرائے احمد پائی کے درمیان گندی گلی میں رہا کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی سفارش پر کچھ دن روہتک میں ملازم رہے تھے۔ افسوس مزید حالات اور کلام دستیاب نہ ہوسکا۔

(اُردوئے معلیٰ: ۲۹۴)

ذکا و بے باک ... مولوی حبیب اللہ مدراسی ثم حیدرآبادی

یہ خاندان دراصل بیجاپور کا رہنے والا تھا۔ وہاں سے اُن کے اجداد میں سے کوئی صاحب کرناٹک چلے آئے اور یہاں مصطفےٰ علی خان جاگیردار کے ملازموں میں شامل ہوگئے۔ ذکا کے والد حافظ محمد میران نائطی تھے۔

اگرچہ حافظ محمدؐ میران کا سلسلۂ ملازمت اودگیر میں تھا، لیکن اُن کے تینوں بیٹے۔ بڑے محمدؐ رحمت اللہ (رسا) اور محمدؐ حبیب اللہ (ذکا) اپنی نانہیال نیلور (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ان سے چھوٹی دو بہنیں بھی تھیں۔

ذکا ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸۔ ۱۸۲۹ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ''خاش و خماش'' کے دیباچے میں خود ہی اپنی تاریخِ ولادت ''بے خودِ بدخوے'' سے نکالی ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی محمدؐ رحمت اللہ رسا سے حاصل کی۔ پھر علومِ متداولہ دوسرے اساتذۂ وقت سے پڑھے۔ چنانچہ فارسی پر پوری قدرت حاصل کی اور عربی بھی بقدرِ ضرورت جانتے تھے۔ فارسی میں نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔

شاعری کا شوق بہت کم عمری میں ہوا۔ شروع میں میر مہدی ثاقب سے اصلاح لیتے رہے۔ اُن کے بعد سیّد میر مرتضٰی بینش☆[1] سے مشورہ کیا۔ شعر و سخن سے قدرتی لگاؤ تھا ہی، اِن صاحبِ کمال استادوں کی تربیت سے بہت جلد ترقی کر گئے اور کرناٹک میں ان کے کلام کی دھوم مچ گئی۔ حاسدوں کی کمی نہیں تھی۔ اُنھوں نے زک

دینے کے لیے جوڑ توڑ کرنا شروع کیے۔ انھی ایّام میں وہاں نواب کرناٹک کی شادی کی تقریب کے سلسلے میں ایک مشاعرۂ اعظم بڑے اہتمام سے منعقد ہوا، جس کے کرتا دھرتا نواب کرناٹک کے مصاحبِ خاص شیخ محمّد حسین راقم المخاطب بہ شیریں سخن خان بہادر تھے۔ خود نواب صاحب نے بھی اس مشاعرے میں بہت دلچسپی لی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس شاعر کا کلام حاصلِ مشاعرہ ثابت ہو، اسے انعام اور خلعت سے نوازا جائے۔ میرِ مشاعرہ شیخ محمّد حسین راقم، ذکا کے مخالفوں میں تھے۔ چوں کہ ہر ایک شخص کا خیال تھا کہ میدان ذکا کے ہاتھ رہے گا، اس لیے راقم نے اُنھیں انعام سے محروم کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ مشاعرے سے ایک دن پہلے اعلان کرا دیا، کہ ہر ایک شاعر اپنا کلام خود سنائے گا۔ ذکا کی زبان میں لکنت تھی اور وہ مجمعے میں اپنا کلام خود نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس اعلان کا صاف مطلب یہ تھا کہ اُنھیں پڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ اس سے سخت بد دل ہوئے، اور ۱۲۷۲ھ میں کرناٹک کا قیام ترک کر کے حیدرآباد چلے آئے۔ اس وقت عمر ۲۸ سال کی تھی۔

یہاں وہ سیّد محمّد عباس (والد نواب مہدی نواز جنگ) اور عبدالوہاب صاحب کے ذریعے سے نواب مختار الملک کی سرکار تک پہنچے اور اُن کے کاتبِ خصوصی مقرّر ہوگئے۔ اُن دنوں حیدرآباد میں حافظ میر شمس الدّین فیض☆[۲] کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ بھی اُن کے دامن سے وابستہ ہوگئے۔ لیکن جب ۱۸۶۲ء میں غالب کا شہرہ سُنا تو ان سے اصلاح لینے لگے۔ ایک شعر میں اُن کا ذکر یوں کرتے ہیں:

آں کہ در حضرتِ اُو خامہ بعرضِ ادب است
شاہِ مردانِ سخن غالب عالی نسب است

دوسرے شعر میں کہتے ہیں:

قائل ہوں میں غالب کے ذکا، طرزِ سخن کا
ایسا کوئی دلّی میں سخن ور نہ ہوا تھا

مدّتوں نواب مختار الملک کے میر منشی رہنے کے بعد تعلّقدار درجہ سوم مقرّر

ہوے۔ لیکن نواب صاحب نے اُن کا حیدرآباد سے جانا گوارا نہ کیا اور اُن سے کام اپنی پیشی ہی کا لیتے رہے، بعد کو اُن کی جاگیر کی دیکھ بھال کے لیے علاقے پر چلے گئے۔ وفات سے پہلے ناگر کرنول میں تعلقدار تھے۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴۔ ۱۸۷۵ء) میں بعارضۂ فالج انتقال کیا۔ ۴۷ برس کی عمر پائی۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر نواب حفیظ الدّین خان پاس نے تاریخ کہی:

"مات فی عشق رب حبیب اللّٰہ"

غالباً حیدرآباد کے جنوبی محلۂ چنچل گوڑہ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔☆۴

ذکا نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے ان کے ایک بیٹا محمّد میران سہا ہوئے اور دوسری سے ایک بیٹا محمّد اسد اللہ۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر حبیب اللہ وفا موخر الذکر ہی کے بیٹے تھے۔ ذکا کا دیوان "خاش و خماش" محمّد میران سہا ہی نے مرتب کر کے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں طبع کرایا تھا۔ اس پر جو مختصر تقریظ غالب نے لکھی تھی، وہ اس کے شروع میں چھپی ہے، اور اُردوئے معلیٰ میں بھی شامل ہے۔ غالب کی اصل تحریر "خاش و خماش" کے خطی نسخے کے ساتھ جامعۂ نظامیہ، حیدرآباد کے کتاب خانہ میں محفوظ ہے۔ اُردو کلام بھی اُنھوں نے جمع کیا تھا۔ لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ اُن کی ایک اُردو مثنوی بھی "جواہر الانسان" یعنی "پندنامۂ ذکا" کے نام سے ۱۲۹۳ھ میں حیدرآباد (دارالطبع سرکار عالی) سے شائع ہوئی تھی۔ یہ نواب مختار الملک کے لیے لکھی گئی، اس میں ۳۲ صفاتِ کاملہ کا ذکر ہے۔

اپنے استاد کی تاریخِ وفات کہی تھی:

میرے استادِ معنوی غالب
جن کا ہر لفظ معنیِ اعجاز
وحدہٗ لا شریک لہ کی قسم
تھے وہ فنِّ سخن میں بے انباز
ایسی قسمت کہاں جو میں کرتا
پردۂ چشم صرفِ پا انداز

ہاں سُنا ہے کہ ان کے تھے کردار
جیسے گفتارِ حافظِ شیراز
کیا عجب ہے، جو حرمتِ مے سے
بخش بھی دے کریمِ نکتہ نواز
ہند کا انوری و سعدی تھا
متفق اس پہ ہیں سخن پرداز
خود ہی فرما گیا ہے یہ مقطع
پیش بینی کا دیکھنا انداز
"اسد اللہ خاں تمام ہوا"
وا دریغا، وہ رندِ شاہد "باز"
(۱۰+۱۲۷۵)
پہلے مصرعے سے تا بآخرِ شعر
سال تاریخ کا ہے جلوہ طراز
غیب دانی صفت خدا کی ہے
اک عدد کی کمی میں تھا یہ راز

غالب نے اپنی تنخواہ کے ماہ بماہ کرنے کے لیے بہادر شاہ ظفر سے درخواست کی تھی، جس کا پہلا شعر ہے:

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاں دارِ آفتاب آثار

ذکا نے ایک موقعے پر ایسی ہی درخواست نواب مختار الملک سالار جنگ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ دیکھیے:

اے خداوندگارِ بندہ نواز
فی المثل، تو طبیب میں بیمار

ہے جگہ رحم کی، ترے آگے
گر میں چلاؤں، روؤں زار نزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف
ہوں میں چودہ برس کا کارگزار
اتنی مدّت ہوئی، مگر نہ ہوا
کسی صورت سے ملزمِ سرکار
یہ سنا تھا، مرید نعمت کا
حسنِ خدمت پہ ہے جہاں میں مدار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت
جس میں درماہ ہووے بیش قرار
ہے مری ذات میں وہ استعداد
کہ نہیں میرا شیوہ استعذار
کون سا کام جو نہ دوں انجام
کون سا گھاٹ جو نہ اتروں پار!
وعدے ہوتے رہے نوازش کے
مگر ایفا کے کچھ نہیں آثار
نخلِ ماتم نہیں ہوں میں واللہ
کہ نہ ہو میرے لیکھے فصلِ بہار
شیرِ قالیں نہیں ہوں میں باللہ
کہ نہ ہو میرے حصے ذوقِ شکار
لیک ناکام اپنی قسمت سے
سربزانو ہوں، پشت بردیوار
سیکڑوں کامیاب ہوتے ہیں
کیسے کیسے اجانب و اغیار

فی الحقیقت مقامِ حیرت ہے
کہ میں سنگِ نشاں، وہ راہ سپار
یعنی سب پہنچ جائیں منزل کو
میرے آگے سے، اور کروں میں شمار
دردِ دل تو بہت سے ہیں لیکن
مجھ میں تھوڑی ہے طاقتِ اظہار
تس پہ بھی گر ذرا تغافل ہو
موت آساں ہے زیست ہے دشوار
مرتے مرتے بھی یہ دعا دوں گا
خضر کی عمر تجھ کو دے دادار
تیرے ہوتے، بلا سے مر جائیں
مجھ سے امیدوار ساٹھ ہزار
بس ذکا! دیکھی تیری گستاخی
با ادب ہے یہ آصفی دربار

اس درخواست پر نواب مختار الملک نے انھیں تعلقدار درجہ سوم مقرر کردیا تھا، لیکن اس کی صرف تنخواہ ملتی رہی، کام اس کے بعد بھی اُن کی پیشی میں کرتے رہے کیوں کہ اُنھیں ان کی علیحدگی منظور نہیں تھی۔

بہت پختہ اور زود گو شاعر تھے۔ ہجو پر بھی پوری قدرت حاصل تھی اور اس میں بے باک تخلص کرتے تھے۔ یہ کلام بیش تر بہت عریاں بلکہ فحش تھا۔ اسی لیے یہ چھپنے سے رہ گیا اور اب اس کے شائع ہونے کی کوئی اُمید بھی نہیں۔

مختصر انتخاب ملاحظہ فرمایئے:

باغِ ہستی میں بہت میں کم رہا
تو بھی روتا صورتِ شبنم رہا

☆

طوفِ کعبہ سے غرض ہم کو بتوں کی دید ہے
اے جنوں! رہنے دے پردہ جامۂ احرام کا

☆

اے گل! دماغِ خندۂ بے جا نہیں مجھے
آئی بہار، تو میں چمن سے نکل گیا

☆

وہ مرے خون کا مشتاق، میں نظارے کا
میں ادھر ہوں، تو اُدھر ہے مرا قاتل بے تاب

☆

آئے ہیں بے بلائے، مرے گھر کو وہ ذکا!
بدلا ہے کچھ تو چرخِ ستم گار کا مزاج

☆

بھری ہے سر میں مرے اس قدر ہوائے قدح
کہ اپنے نام پہ لکھتا ہوں "خاکِ پائے قدح"
پلا دے ایسی ہی ساقی! شرابِ مرد افگن
کہ کوئی چل نہ سکے بزم میں سوائے قدح

☆

قسمت کی بات ہے کہ ملیں زاہدوں کو حور
ہم پر حرام ہو رہے بنت العنب تلک

☆

اتنا جنوں کو جوش ہے فصلِ بہار میں
دل اپنا ہاتھ میں ہے، نہ ہاتھ اختیار میں

☆

جس قدر چاہو، ہوا خواہوں پہ بیداد کرو
پر تغافل کے سوا طرز اک ایجاد کرو

☆

عشق میں اور بھی بہت ہیں کام
کیا کروں عمرِ تنگ فرصت کو
شیخ صاحب! مری بھی ہے اک عرض
آپ کرنا معاف جرأت کو
گر ذکا کو لگا ہے عشق کا روگ
کیا اذیّت ہے، کہیے حضرت کو!

☆

چھوڑدوں نالہ، کچھ بھی بات ہے یہ
ناصحو! میرے دم کے سات ہے یہ
عشق کا کب ہو زیست میں انجام!
وہ بڑا سانگ، چھوٹی رات ہے یہ

☆

مایوس نہ کر ڈالے کہیں رنجشِ بے جا
ہم وصل کے وعدے پہ تقاضا نہ کریں گے

☆

دل نشینی تمھارے قامت کی
مصرعِ انتخاب کیا جانے!
چشمِ بد دُور! تیری خوش نگہی
نرگسِ نیم خواب کیا جانے!

☆

اُس رخ پہ خطِ سبز نکلنے کے دن آئے
کچھ رنگ زمانے کا بدلنے کے دن آئے

☆

میں نے بازی میں عشق کی، اے زیست!
جیتے رہنے سے شرط ہاری ہے

اب فارسی کے چند شعر دیکھیے:

شادم کہ آخر از گلِ من جام ساختند
صدشکر آبِ رفتہ درآمد بجو مرا
شرمِ گناہ نیز بطاعت برابر است
باشد ذکا! زتر شدن آخر وضو مرا

☆

ز کوے اُو دہمت قاصدا نشانے چند
ہمی تپند، بہر گوشہ، نیم جانے چند
نشستہ اند، بکویت، بلاکشانے چند
کہ می کشند بجاے نفس، فغانے چند

☆

ہجران تو طاقت و تواں بُرد
فریاد کہ مایۂ فغاں بُرد
دستِ تو، زہر کہ خواست، جاں برد
ازدستِ تو جاں نمی تواں بُرد
صبر و دل و دیں، کہ جمع کردیم
عشقت آمد، یگاں یگاں بُرد

☆

برخاستن بہ حشر ہم، آساں نبودہ است
با ایں فتادنی، کہ ذکا من فتادہ ام

☆

خدانکردہ، خداگر شوی، چہ خواہی کرد
تو آں بتی کہ ز قہرت حذرتواں کردن

☆

گریار بسویم نظرے داشتہ باشد
درفکر جفائے دگرے داشتہ باشد

☆

پرسید حالِ زار و جوابے نگفتمش
درفکرِ آں کہ یارچنیں مہرباں نبود
بدکردہ ام بخود کہ تراماہ خواندہ ام
زیں پیشتر دماغ تو بر آسماں نبود

☆

خلقے ہجوم کرد زہر سُو بدیدنم
صبحِ بہار بود گریباں دریدنم
رفت آں شب وصال و زیادم نمی رود
برجستہ رفتنِ تو و دامن کشیدنم

[گلزار اعظم: ۱۹۷-۱۹۹، تزکِ محبوبیہ، (۲) دفترِ ہفتم: ۶۳-۶۴، محبوب الزمن، ۱: ۴۴۳-۴۴۶، متعلقاتِ غالب: ۱۱۹، تحریر (۱۳): ۷۸-۷۹، سب رس (غالب نمبر: ۱۹۶۹: ۵۴]

حواشی

☆۔ سیّد مرتضیٰ بینش۔ ان کے والد میر صادق علی حسینی سیّد تھے۔ خاندان کے جدّ اعلیٰ مشہد سے گلبرگہ آئے۔ شاہ ابراہیم مصطفیٰ ان کے بزرگوں میں تھے۔ جو حضرت خواجہ محمد بندہ نواز گیسو دراز کے ماموں تھے۔ بینش ۱۲۶۲

میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ مادۂ تاریخ ولادت ''آفتابِ سپہر سیادت'' ہے۔ عربی فارسی اور دیگر علومِ دینیہ علمائے مدارس سے حاصل کیے۔ شاعری کا شوق ہوا تو پہلے اپنے والد اور بھائی سے اور پھر مولوی میراں محی الدین واقف سے اصلاح لی۔ اس کے بعد حیدرآباد آئے تو یہاں بھی بہت نام پیدا کیا۔ نواب والا جاہ محمد غوث خان بہادر کے دربار سے بزمرۂ شعرا وابستہ تھے۔ ۱۲۶۵ھ میں اہل و عیال کے ساتھ عتباتِ عالیہ کی زیارت کے لیے کربلا اور نجفِ اشرف چلے گئے۔ کربلائے معلیٰ ہی میں واصل بحق ہوئے۔ روضۂ مبارکہ کے صحن میں آسودۂ خواب ہیں۔ میر مہدی ثاقب، بینش کے بھائی عمر میں ان سے تین برس بڑے تھے، انھوں نے واقف کے علاوہ میر مبارک اللہ خان راغب سے بھی مشورہ کیا۔ (صبحِ وطن: ۳۸۔ ۳۹، ۴۹، گلزارِ اعظم: ۱۲۱۔ ۱۲۲، محبوب الزمن، ۱: ۳۰۴۔ ۳۰۵)

☆۲۔ میر شمس الدین فیض یہ خاندان اصل میں دہلوی تھا۔ سب سے پہلے ان کے دادا، محمد رحمت اللہ خان آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدرآباد آئے۔ فیض کے والد میر امیر الدین تھے۔ فیض ۱۲۱۵ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت ''وجودِ مظہرِ کل'' ہے۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ عربی فارسی میں بہت اچھی دسترس تھی۔ ناخن سے نقش و نگار بنانے اور لکھنے کے فن میں اچھی مہارت تھی۔ کلام پر اصلاح حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی (شاگرد خواجہ میر درد) سے لی۔ روحانی فیض حضرت ابراہیم علی شاہ سے حاصل کیا، انھی کے خلیفہ بھی ہوئے۔ ۶۸ برس کی عمر میں ۱۳ رجب ۱۲۸۳ھ (۲۱ نومبر ۱۸۶۶ء) کو انتقال فرمایا۔ حیدرآباد میں لال دروازے کے باہر مزار ہے۔ یہاں ہر سال ۱۴ رجب کو عرس ہوتا ہے۔ ان کے شاگرد حکیم محمد مظفر الدین خان حراج نے تاریخِ وفات کہی: شد سالِ وصالِ اوبوحدت۔ ''باللہ وجودِ مظہرِ کل''۔ اُردو فارسی کا مشترکہ دیوان موجود ہے۔ کچھ نثری رسالے بھی لکھے تھے، جن میں سے کچھ چھپے، باقی قلمی رہ گئے۔ دو صاحب زادے تھے، مولوی میر ضیاء الدین احمد اور مولوی میر عماد الدین احمد متخلص بہ وصف۔
(محبوب الزمن، ۲، ۹۱۳۔ ۹۱۸، مرقعِ سخن، ۱: ۱۳۵۔ ۱۳۶)

☆۳۔ میں نے عبدالرزاق بسمل کی سند پر طبعِ اول میں مشرقی محلے کے قبرستان میں تدفین کا ذکر کیا تھا۔ لیکن بعد کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ مشرقی محلے کے قبرستان میں صرف مہدوی مسلک کے لوگ دفن ہو سکتے ہیں، اس لیے وہاں ذکا کی تدفین کا سوال ہی نہیں، کیوں کہ وہ مہدوی نہیں تھے۔

رابطہ ... میرزا حسن رضا خان صاحب دہلوی

(تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم: ۳۱، تذکرۂ سخنوران چشمِ دیدہ: ۱۸]

راضی ... دیوان جانی بہاری لال جی

اِن کے ناگر برہمن بزرگ گجرات سے نقل مکان کر کے بھرت پور میں آبسے تھے۔ راضی کے والد کا نام تھنی رام تھا۔ قیاس ہے کہ جانی بہاری لال ۱۸۰۷ء اور ۱۸۱۴ء کے درمیان کسی سال بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آگرہ اور اعظم گڑھ میں ہوئی جس کی تکمیل بنارس میں کی۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ یہ کہاں تک اور کس نوعیت کی تھی، البتہ اُن کی تصانیف سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی میں بہت معقول استعداد کے مالک تھے۔

کسبِ معاش کے لیے مدرّسی کا پیشہ اختیار کیا اور نو برس تک فوجیوں کو پڑھاتے رہے، اِس سلسلے میں کئی چھاؤنیوں میں قیام رہا۔ محکمے نے سفارش کی اور یہ بھرت پور دربار کی طرف ایجنٹ گورنر جنرل کے وہاں نائب وکیل مقرر ہوگئے۔ پانچ برس بعد یہاں سے نکلے، تو راجپوتانہ ایجنسی میں منشی کا عہدہ مل گیا۔ چار برس یہاں قیام رہا۔ پھر تین برس تک والیِ کچھ مہاراج ادھیراج مرزا مہا راؤ سری دیشل جی کے دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ اُسی زمانے میں دربار بھرت پور نے بلا کر گورنر جنرل کے دربار میں وکیل بنا دیا۔ چند مہینے کے لیے مہاراجا سجن سنگھ والیِ میواڑ کے اتالیق کی

حیثیت سے کام کیا تھا کہ مہاراجا بھرت پور نے اپنے ہاں واپس بلا لیا۔ بہت کبرسنی میں یہیں سے ۱۸۹۴ء میں پنشن پر سبک دوش ہوئے اور پنچ سرداروں میں شامل ہو گئے۔

۳۰ اپریل ۱۸۹۷ء تک پنشن پائی، گویا یہی تاریخِ وفات ہے۔ عمر بھر مجرّد رہے۔ اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جاداد (آگرہ، بھرت پور، ناگر پاڑہ جے پور) اپنے دو بھتیجوں جانی لکھمی لال (پسر چھگن لال) اور جانی موتی لال (پسر چھتو لال) کے نام منتقل کردی تھی، وہی وارث ہوئے۔

دیوان ربیع الثانی ۱۲۷۷ھ (اکتوبر ۱۸۶۰ء) میں مطبع دربار بھاؤنگر سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مندرجۂ ذیل تصنیفات کی نشان دہی کی گئی ہے:

۱۔ یادگارِ راضی (۱۲۴۷ھ) نام تاریخی ہے اور غالباً یہی اُن کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ یہ نہایت مبسوط کتاب ہے، جس میں عربی زبان کے قواعد بیان کیے ہیں۔ یہ مطبع مفیدِ عام، آگرہ سے ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں شائع ہوئی (صفحات: ۲۱۶)

۲۔ تصریفِ زبان فارسی و انگریزی (۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء) مثنوی میں دونوں زبانوں کے قواعد بیان کیے ہیں۔ یہ (۱۸۵۹ء/ ۱۲۷۶ھ) میں مطبع اعجاز محمدی، آگرہ میں چھپی تھی۔ (صفحات: ۲۳۰)

۳۔ نگارِ راضی (۱۲۸۵ھ) گلستانِ سعدی کا منظوم ترجمہ بشکلِ مثنوی، مطبع مفیدِ عام، آگرہ میں غالباً ۱۸۶۹ء میں چھپی تھی۔ (صفحات: ۱۴۲)

۴۔ دلارامِ راضی (۱۲۸۷ھ) بوستانِ سعدی کا اُردو مثنوی میں ترجمہ۔ یہ بھی مطبع مفیدِ عام، آگرہ میں غالباً ۱۸۷۳ء میں طبع ہوئی۔ (صفحات: ۱۳۰)

۵۔ اژرنگِ راضی (۱۲۸۹ھ) انوارِ سہیلی (کلیلہ ودمنہ) کا منظوم ترجمہ بشکلِ مثنوی۔ مطبع مفید عام، آگرہ میں ۱۲۸۹ھ میں چھپی (صفحات: ۴۷۸)

۶۔ گلِ مقصودِ راضی (۱۳۰۱ھ) مسٹر ج، پ۔ الٹرنین سابق پولیٹیکل ایجنٹ میواڑ کی انگریزی تاریخ چتوڑ کا اردو نثر میں ترجمہ۔ یہ کتاب اعجاز محمدی پریس، آگرہ میں چھپی ۔(صفحات: ۱۰۲)

اِن کے علاوہ بعض اور کتابوں کے نام لیے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، اور بسیار نویس و زُود نویس تھے۔ کچھ مدّت راجپوتانہ گزٹ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اپنی سوانح ''حسبِ حال'' کے عنوان سے لکھی تھی، لیکن یہ کہیں نظر سے نہیں گزری سنسکرت صرف ونحو سے متعلق چارلس ولکنسن اور میکس مولر اور مونیر ولیمز کی انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے۔ اخلاقی مضامین سے زیادہ شغف تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

کروں شکوہ میں کیا اس شوخ کی نامہربانی کا
دمِ رخصت دیا مجھ کو نہ اک چھلا نشانی کا

☆

نہ دوا فائدہ کرتی ہے کسی کی، نہ دعا
چشمِ بیمار نے، کیسا مجھے بیمار کیا

☆

دل بھی دشمن ہوا، اُس دشمنِ جاں کی خاطر
ہم جسے سمجھے تھے اپنا، وہ بھی اپنا نہ ہوا

☆

چھپاتی ہے بدی سیرت کی، صورت
مکاں سے عیب چھپتا ہے، مکیں کا

☆

تو چاہ، نہ چاہ مجھ کو، میں تو
جی جان سے تجھ کو چاہتا ہوں

☆

پست ہمّت روتے رہتے ہیں صدا تقدیر کو
صاحبِ ہمّت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو

☆

مفت رُسوا ہیں چاہ میں تیری
کچھ نہ ٹھہرے، نگاہ میں تیری
کوئی چڑھتا نہیں ہے آنکھوں میں
ہے جو صورت نگاہ میں تیری
کھینچ لیتا ہے دل کو آنکھوں میں
ہے وہ جذبہ، نگاہ میں تیری

☆

برائی سے احمقوں کو ہوتی ہے نفرت
تو اچھا ہے، پھر کیوں ترا دل بُرا ہے!

☆

بے وفاؤں سے دوستی کر کے
کیوں، دِلا! مفت خوار ہوتا ہے؟

☆

مشکل ہے زندگی ترے بیمارِ عشق کی
چاہے کوئی دعا کرے، چاہے دوا کرے

☆

آرام سے جاہل کی گزرتی ہے ہمیشہ
عاشق کو یہاں ایک دم آرام نہیں ہے

☆

شیخ جی، آپ کی نصیحت سے
عشق اور اُستوار ہوتا ہے
حسن تسخیر سے نہیں خالی
عشق بے اختیار ہوتا ہے

بھول جاتا ہے آپ کو، کم اصل
کچھ بھی گر اقتدار ہوتا ہے

[تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود: ۶۳۔۶۴، بہارِ سخن: ۱۶۶، خم خانۂ جاوید، ۳: ۳۴۲۔ ۳۴۶، مضامینِ دیرندر پرشاد سکسینہ (ہماری زبان: ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء) قاضی معراج دھول پوری (ہماری زبان: ۸ نومبر ۱۹۶۱ء)، زمانہ کان پور: ستمبر ۱۹۳۷ء: ۱۵۳۔ ۱۵۹]

راقم... خواجہ میرزا قمرالدّین خان دہلوی

اِن کے بزرگ، غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ خان کے ساتھ وسطِ ایشیا سے ہندوستان آئے تھے، بلکہ اگر مرزا فرحت اللہ بیگ کا بیان تسلیم کیا جائے تو راقم کے پر دادا اور غالب کے دادا آپس میں بھائی بھائی تھے۔ اگرچہ یہ دعویٰ غلط ہے، تاہم اس میں شک نہیں کہ راقم اور غالب کے بزرگوں کے باہم تعلقات تھے۔

غالب کی سوانح عمری میں خواجہ حاجی کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ یہی خواجہ حاجی، راقم کے دادا تھے۔ خواجہ حاجی کے دو بیٹے تھے، بڑے خواجہ شمس الدّین خان عرف خواجہ جان (متوفی ۱۸۷۲ء) اور چھوٹے خواجہ بدر الدّین خان عرف خواجہ امان (متوفی ۱۸۷۹ء) خواجہ امان کا نام اُردو ادب میں بوستانِ خیال کے مترجم کی حیثیت سے بہت مشہور ہے، اس کی ایک جلد حدائقِ انظار یا معزنامہ پر غالب نے جو دیباچہ لکھا تھا، وہ اردوئے معلیٰ میں بھی شامل ہے۔

خواجہ قمرالدّین خان ۱۸۳۲ء میں دلّی میں پیدا ہوئے اور تعلیم ختم کرنے کے بعد سولہ برس کی عمر میں لال قلعہ میں ملازم ہوگئے۔ اُسی زمانے میں بہادر شاہ ظفر سے تیر اندازی سیکھی۔ چندے مرزا فخرو ولی عہدِ ظفر کے دامن سے بھی وابستہ رہے۔ جب ۱۸۵۶ء میں اُن کا انتقال ہوا تو یہ اپنے والد خواجہ امان کے پاس الور چلے گئے، جو اُن دنوں وہاں مہاراجا شیو دھیان سنگھ کے اتالیق تھے۔ ۱۸۵۸ء کے مقامی ہنگامے میں جب تمام دلّی والے الور سے نکالے گئے، تو راقم بھی اُن کے ساتھ نکلے۔ یہاں سے پہلے جے پور گئے اور وہاں سے دلّی چلے آئے۔ یہاں آ کے اپنے والد کا بوستانِ خیال

کے ترجمے میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ جب ۱۸۷۹ء میں امان کا انتقال ہو گیا، تو اُنھوں نے اس کی ساتویں جلد کی اشاعت کا انتظام کیا، جو خواجہ امان چھوڑ مرے تھے اور اس کے بعد خود دو مزید جلدوں کا ترجمہ کر کے اُنھیں بھی شائع کیا۔

راقم کے دادا خواجہ حاجی انگریزی حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ یہ یوں کہ حکومت کی طرف سے جو پانچ ہزار سالانہ پنشن میرزا غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خان کے پس ماندگان کے لیے مقرر ہوئی تھی، اُس کی ادائی نواب احمد بخش خان والیِ فیروز پور جھرکہ کے سپرد کی گئی تھی۔ اُنھوں نے خواجہ حاجی کو بھی اِس میں شامل کر کے دو ہزار سالانہ ان کے نام کر دیے۔ چنانچہ اُنھیں زندگی بھر باقاعدہ یہ پنشن ریاست لوہارو کے خزانے سے ملتی رہی۔ لیکن جب ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدّین احمد خان کو ولیم فریزر کے قتل کے سلسلے میں پھانسی ہوئی تو ریاست سے متعلق تمام ایسے وظیفے دلّی کلکٹری سے ملنے لگے۔ خواجہ حاجی ۱۸۲۴ء/ ۱۸۲۵ء میں فوت ہوئے۔ اُن کے بعد یہ پنشن اُن کے دونوں بیٹوں کے نام منتقل ہو گئی اور اُن کے بعد اُن کی اولاد کو ملتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ راقم بھی اس پنشن میں حصّہ دار بن گئے۔ اس کے علاوہ اُنھیں سوائی مہاراجا رام سنگھ والیِ جے پور کی سرکار سے بھی معقول وظیفہ ملتا رہا۔ چنانچہ اِسی تعلّق کے باعث یہ دلّی چھوڑ کر مستقل طور پر جے پور جا بسے تھے اور اپنی عمر کے آخری ۳۱ برس وہیں مقیم رہے۔ اُن کی اولاد اب بھی وہاں ہے۔

خواجہ قمر الدّین خان کی شادی میرزا غالب کے بھانجے میرزا عاشور بیگ کی صاحب زادی سگّی بیگم سے ہوئی تھی۔ اس بیوی سے انھوں نے اپنی یادگارِ جسمانی تین اولادیں چھوڑیں۔ دو لڑکیاں، احمد النساء بیگم اور شمس النسا بیگم اور ایک لڑکا خواجہ امیر الدّین خاں۔ یہ شعر بھی کہتے تھے، آثم تخلّص تھا۔ ان کا انتقال ۱۴ اگست ۱۹۲۱ء (۱۹ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ) کو ہوا۔ اولاد میں صرف پانچ لڑکیاں تھیں، فرزندِ نرینہ کوئی نہیں تھا۔

راقم نے جے پور ہی میں مارچ ۱۹۱۰ء میں اٹھتر (۷۸) برس کی عمر میں

وفات پائی۔ مدفن بھی یہیں سانگا نیر دروازے کے باہر، رام نواس باغ کے قریب ''قدمِ رسول'' کے احاطے میں حکیم محمد سلیم خاں خستہ کے (جن کی کتاب تکثیف پر غالب نے قطعۂ تاریخ لکھا ہے) مزار کے جوار میں ہے۔ قبر پر کتبہ نہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی میں بھی دونوں دوستوں کے مکان دیوار بہ دیوار رہے اور مرنے کے بعد قبریں بھی پاس پاس ہی ہیں۔

۱۹۰۱ء میں کُلّیات ''تتمۂ اُردو'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ (افضل المطابع، دہلی) ایک مختصر مجموعہ ''مرقعِ نعت'' کے نام سے بھی شائع ہوا تھا۔ ایک اور کتاب ''سبعہ سیارہ'' لکھی تھی جس میں سیاروں وغیرہ کے حالات ہیں۔ یہ بھی چھپ چکی ہے۔ ''عقدِ ثریا'' کے نام سے عورتوں کی زبان میں ایک قصہ لکھا تھا، اس کا صرف پہلا حصہ چھپا۔ دیوانِ غالب کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ یہ نہیں چھپ سکی، بلکہ غالباً اس کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔ اگرچہ پختگی اور زبان پر قدرت لفظ لفظ سے ظاہر ہے، لیکن کلام میں کوئی ندرت نہیں۔ اپنے زمانے کے رسمی مضامین کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بیش تر کلام بے مزہ ہے۔

مختصر انتخابِ کلام درج کرتا ہوں:

اللہ! میں ہوں اور یہ غم وصلِ یار کا
تو جانتا ہے درد، دلِ بے قرار کا
آجاؤ پھرتے چلتے کبھی غم کدے میں تم
آنکھوں سے ہم بھی دیکھ لیں آنا بہار کا

☆

ہم نے اِس ناز سے دیکھا ہے کسی کو آتے
آج راقم بھی اگر دیکھتا، حیراں ہوتا

☆

مجھ کو وہ یاد کرے، ہوش کی ہَوا قاصد!
جس کے لب پر نہ کبھی نام خدا کا آیا

☆

پہلے ہی چشمِ مست تھی اس کی نظر فریب
میری نظر نے اور فسوں گر بنا دیا

☆

اے ہجومِ نا اُمیدی! صبر کر
اب زمانہ ہوچکا اقرار کا

☆

طعنِ احباب سہے، سرزنشِ غیر سہی
عشق میں تنگ نہیں چاک گریباں ہوتا

☆

یاں بھروسا ہی نہیں سانس کا، آیا آیا
واں ملاقات کا وعدہ پسِ فردا ٹھہرا

☆

کوئی ہوگا تمھاری خلوت میں
خوش گیا اور شادمان اُٹھا

☆

کیسا جنونِ عشق نے خود بیں کیا مجھے
انجام کا خیال نہ آغاز دیکھنا

☆

جاں نذر میں نہ کر سکا، میری خطا سہی
خنجر گلے پہ روکنا کس کا قصور تھا☆[۱]

☆

دیکھ کر حضرتِ واعظ کو، خدا کی سوگند
کفر اچھا ہے ہمیں، ہم نے تو ایماں چھوڑا

☆

ناصح! تمھاری بات تو میں مان لوں، مگر
سمجھا کے دل کو لاؤ، وہ نادان تو گیا

☆

آئے تھے اگر ملنے، دم بھر تو ٹکے ہوتے
کچھ میری سنی ہوتی، کچھ آپ کہا ہوتا

☆

قیس و فرہاد کی شہرت ہو، خدا کی قدرت
حوصلہ عشق کا کس کس نے کیا میرے بعد

☆

کہتے ہو، کسی غیر سے اب ربط نہیں ہے
اچھا، تمھیں سچے سہی، میں نے ہی سنا اور
مانا کہ وفادار نہیں ہم، تمھیں سچے
تم سا بھی وفا شیوہ نہیں، نامِ خدا اور

☆

اس کے وعدے کی انتہا ہے نہ حد
عمر اپنی وفا کرے کب تک ☆۲

☆

جس بزم میں گئے ہیں، ہنسا کر اٹھے ہیں ہم
جب تم سے بات کی ہے، رُلا کر رہے ہو تم

☆

جینے کا لطف، مرنے کی لذّت کسے نصیب
جو دیکھتے ہیں غم کی فراوانیوں میں ہم

☆

کیوں ہم کو کوئی پوچھے، تعلق نہیں جسے
اچھے ہیں یا بُرے ہیں، کسی کی بلا سے ہم

☆

کل کون جیے، کون مرے، کس کو بھروسا
مل جاؤ بس اب وعدۂ فردا نہ کرو تم

☆

جفا کرلو، ستالو، دیکھنا محشر کے میداں میں
کہ دامن ہاتھ میں کس کے ہے، کس کا منھ گریباں میں

☆

زاہد! نجات کے لیے طاعت نہیں ضرور
کچھ بندگی، ذریعۂ عفوِ خطا نہیں

☆

کوچۂ یار ابھی دُور ہے، دل بیٹھ گیا
دشت میں دیکھنے کو سایۂ دیوار نہیں
جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم، راقم!
یہ تو مسجد ہے، چلو خانۂ خمّار نہیں

☆

کیا مستیاں ہیں اُن کو غرورِ شباب میں
ڈوبے ہوئے ہیں حسن کی گویا شراب میں

☆

تیرِ نظر میں اس کے دونوں چھدے پڑے ہیں
دیوانہ رہ گزر میں، فرزانہ انجمن میں

☆

جان پیاری ہے، تو الفت کے کبھی پاس نہ جائے
غیر ہو، کوئی ہو، ہم عام صدا دیتے ہیں ☆۳
سنتے ہیں نالوں سے تسکین ہوا کرتی ہے
یاں تو کم بخت سوا آگ لگا دیتے ہیں

☆

واں کل کا وعدہ وہ کہ وفا کا گماں نہیں
یاں غم کی رات یہ کہ سحر کا نشاں نہیں

☆

منزل کی ہے تلاش، پتا کس سے پوچھیے
رہرو نہیں، غبارِ پسِ کارواں نہیں

☆

وہ کام نہیں یاں، کہ بنے چارہ گروں سے
وہ درد نہیں یاں، کہ مسیحا سے دوا ہو

☆

ہے اگر فرقت یہی اور ہجر کا آزار بھی
جان سے ہم بھی گئے، ہم سے دلِ بیمار بھی

☆

یادگاروں میں اسد کے ہے یہ بندہ راقم
کیا ہوا بزمِ سخن میں نہیں شہرت میری

☆

بلا سے اُس کی، کسی جان کا زیاں ہو جائے
درازِ دستیِ قاتل کا امتحاں ہو جائے
بلا سے، ہم سے نہیں، غیر سے کرو الفت
کسی کا دل تو کبھی [تم سے] شادماں ہو جائے

☆

حسنِ زیبا لاکھ نظروں سے چھپاتے جایئے
اور کھلتا جائے گا، جتنا چھپاتے جایئے

☆

رات سے مضطرب ہے، دل راقمؔ!
دیکھ آیا یہ بے قرار کسے!

☆

ہونے کو ہے شاید کوئی سامان خداساز
جو شام سے ہے اور ہی رونق مرے گھر کی

☆

دیر ہو، کعبہ ہو، عشرت کدہ ہو، کوئی ہو
ہم تو مشتاق نہ ہوں گے، ترے گھر کے ہوتے
ہم بھی سنتے ہی رہے، آپ بھی کہتے ہی رہے
روز وعدے ہی رہے شام و سحر کے ہوتے
ہائے راقمؔ نہ رہے حضرتِ غالبؔ سر پر
قدر فرزند کی ہوتی ہے، پدر کے ہوتے

☆

ایک دو دن کا تماشا ہے گلستانِ جہاں
کون رہتا ہے یہاں اور وطن کس کا ہے!

☆

درد کا ضبط نہ کرنا تو ہے میری تقصیر
خامشی شیوہ یہ ہنگامِ سخن کس کا ہے[☆۴]
تم ہی سمجھو، کہ وفاخو ہے طبیعت کس کی
تم ہی جانو، کہ دلِ عہد شکن کس کا ہے

☆

عشق کی ابتدا میں، اے ناصح!
سوجھتا ہے مآلِ کار کسے

☆

وہ بات ہی گئی، تمھیں تھی جس کی احتیاط
مدّت ہوئی کہ عشق کی تشہیر ہو چکی

☆

گردشِ بخت تو تھی ساتھ ازل سے راقم!
یہ بُری ساتھ لگی گردشِ دوراں تیرے

☆

تم کہو، دشمن کہیں، ناصح کہے اور ہم سنیں
جو خدا سنوائے ہم کو، بس وہ سننا چاہیے
ہم سے تم کو لاکھ ہوں گے، تم سا ہم کو ہے کہاں
تم اگر مل جاؤ ہم کو، پھر ہمیں کیا چاہیے

(مضامینِ فرحت:۵: ۱۹۵_۲۸۵، ذکرِ غالب: ۳۱_۳۲، ۵۲_۵۴،
احوالِ غالب: ۲۹۰_۲۹۴، خم خانۂ جاوید، ۳: ۳۵۵_۳۶۱)

حواشی

☆۱۔ گیرم کہ وقتِ قتل تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست
(غالب)

☆۲۔ تیرے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی
(مومن)

☆۳۔ آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے!
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں
(حالی)

☆۴۔ یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
(غالب)

رُسوا... شیخ محمد عبدالمجید☆ غازی پوری

شیخ امداد علی کے بیٹے تھے۔ تقریباً ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹۔۱۸۵۰ء) میں غازی پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے اکثر اعزّہ و اہلِ خاندان سرکارِ انگریزی میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن تھے۔ شروع میں اُن کا ارادہ وکیل بننے کا تھا۔ چنانچہ امتحانِ وکالت کی تیاری کے لیے آگرے آئے اور شاہ اسد علی وکیل ہائی کورٹ کی پیشی میں کام سیکھنے لگے۔ بعد کو سفرِ دلّی کا اتفاق ہوا اور یہاں غالب کی خدمت میں رہ کر نظم و نثر فارسی کی مہارت پیدا کی۔ دو سال بعد غالب کی وفات ہوگئی تو یہ واپس آگرے آگئے۔ اُن دنوں آگرہ / بھرتپور سڑک زیرِ تعمیر تھی، اس میں یہ بطورِ محرر کام کرنے لگے۔ بعد کو دل برداشتہ ہو کر اس سے استعفیٰ دے دیا۔

اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ اُردو میں مرزا حاتم علی مہر سے اور فارسی میں غالب سے اصلاح لی۔ بہت پُر گو تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اُردو:

کہا میں نے ذرا ٹھہرو، تو دل اے دل ربا، ٹھہرے
کہا اس گیسوؤں والے نے، اب کس کی بلا ٹھہرے
نہیں کچھ فصلِ گل بھی دُور، گر ہے زندگی باقی
خزاں کی یہ مصیبت جھیل لے بلبل، ذرا ٹھہرے
قدم پڑتا نہیں ہے، جب کہیں پر فرطِ مستی میں
تو پھر رُوئے زمیں پر کیا برابر نقشِ پا ٹھہرے

نہیں ملتی رہِ ملکِ عدم اب کس طرف جائیں
نہ سنگِ رہ یہاں، نے کارواں کہ نقشِ پا ٹھہرے
مسلماں ہو کے بُت پوجے ہمیشہ تم نے، اے رسوا!
قریبِ مرگ ہو، اب دیکھیے، انجام کیا ٹھہرے

فارسی:

محوشدآں کافرِ ترسا بترسائے دگر
واجب آمد بہرِ ہر فرعون موسائے دگر
یا گہرمی جو شد، از لعلِ تبسّم ریزِ تو
یا بہ چرخِ حسنِ تاباں، شد ثریائے دگر
طاعتِ محرابِ ابروے و طوافِ کوے تو
غیر ازیں وردل نمی دارم تمنائے دگر
کردہ ام بسیار عصیاں، یا شفیع المذنبیں!
جُز جنابِ تو ندارم، ہیچ ملجائے دگر
در جہاں تا آمدم، از خود نمی دارم خبر
ساقیِ ما ریخت در جامم چہ صہبائے دگر
فاش میگویم، میانِ عاشقاں، گربشنوی
ہمچومن اے جاں! نخواہی یافت رسوائے دگر
(شعر وسخن: ۴۵۔۴۸)

حواشی

☆۔خم خانۂ جاوید (۴۰۳:۳) میں نام محمد عبدالمجید لکھا ہے، لیکن تذکرۂ شعر وسخن میں جو حالات ان کے خود نوشت شائع ہوئے ہیں، وہاں نام محمد عبدالمجید ملتا ہے، شعر وسخن زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔

رشکی... نواب محمدؔ علی خان بہادر جہانگیر آبادی

نواب محمدؔ مصطفیٰ خان شیفتہ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ عالی مقدار کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ مفتی صدر الدّین خان آزردہ سے عربی پڑھی۔ بعد کو انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے، اور اِس میں بھی کافی دستگاہ پیدا کرلی تھی۔ جس زمانے میں حالی جہانگیر آباد میں تھے۔ یہ بھی اُن کی اتالیقی میں رہے۔ اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد جاگیر کے وارث ہوے۔ اپنی سادہ مزاجی اور اولو العزمی اور قومی ہمدردی کی وجہ سے رعایا اور سرکار دونوں میں نہایت ہر دل عزیز اور نیک نام تھے' چنانچہ ضلع بلند شہر میں اُنھیں مجسٹریٹی کے اختیارات حاصل تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبہ جاتِ متحدہ کی طرف سے وائسرائے لارڈ لینسڈاؤن کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ پانچ سال بعد ۱۸۹۵ء میں خان بہادری اور نوابی کے خطاب ملے۔ نواب سر حامد علی خان والیِ رام پور کے زمانۂ نابالغی میں اُنھیں انتظامِ ریاست میں مدد دینے کے لیے کونسل مقرر ہوئی تھی، جس میں محکمۂ مال (ریونیو) کے ممبر خان بہادر سیّد علی حسن تھے۔ اُنھوں نے بعارضۂ تپ دق اپریل ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا، تو ان کی جگہ نواب صاحب موصوف نے سرکارِ انگریزی کی منظوری سے نواب محمدؔ علی خان رشکی کو اپنی کونسل کا ممبر مقرر کردیا۔ اِس عہدے کی تنخواہ بارہ سو روپے ماہوار تھی۔ یہ ۴ مئی ۱۸۹۵ء کو اِس عہدے پر متمکن ہوئے۔ یکم جون ۱۸۹۶ء کو یہ کونسل ٹوٹ گئی اور نواب صاحب کو اختیاراتِ کاملہ حاصل ہوئے۔ چنانچہ رشکی بھی اِس عہدے سے سبک دوش ہوگئے۔ اس کے بعد ان کے چھوٹے سوتیلے بھائی نواب محمدؔ اسحاق خان

ریاست میں مدارالمہام بن کر تشریف لے گئے۔

رشکی ۹ محرم ۱۳۱۷ھ (۲۰ مئی ۱۸۹۹ء) کو دلّی میں لاولد فوت ہوئے۔ ہاتھ پر کاربنکل نکلا تھا، وہی موت کا بہانہ بن گیا۔ اپنے والدِ گرامی کے پہلو میں سلطان جی میں مدفون ہیں۔ میر مہدی مجروح نے قطعۂ تاریخ لکھا:

زہے امیر محمد علی بخاں مشہور
کہ بد عقیل و فہیم و ذکی و خوش تقریر
زفیضِ بذل و عطا بود در زمانہ شُہر
بہ نظم و نثرِ سخن بود بے عدیل و نظیر
ہزار حیف کہ آں قدر دانِ اہلِ ہنر
بسوے ملکِ بقا شد ازیں سرا راہگیر
پے سنینِ وفاتش خرد بمن فرمود
بگوے ”رفت زدنیاے امیر ابنِ امیر“
(۱۳۱۷ھ)

مولانا حالی کی کہی ہوئی تاریخِ وفات میں مادّہ ”بخشش زحق“ (۱۳۱۷ھ) ہے ان کا قطعہ حسبِ ذیل ہے:

محمد علی خاں رئیسِ سترگ
کہ در مردمی بُرد از اقراں سبق
بناگاہ بربست رختِ سفر
جگرہا ازیں غصہ گردید شق
چو بر بخشش حق لبے تکیہ داشت
شدش سال تو دیع: ”بخشش زحق“
(۱۳۱۷)

اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو کے چند شعر ملاحظہ کیجئے:

بے وفا تجھ سے کیا نہیں ہوتا
ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا

قیس کی دھوم مچ رہی ہے، مگر
عشق اس سے سوا نہیں ہوتا

شائبہ جور کا نہ ہو جب تک
لطف میں کچھ مزا نہیں ہوتا

چھیڑ دیتے ہیں اُن کو ہم بھی کبھی
گرچہ کچھ مدّعا نہیں ہوتا

ایک، رشکی! ہمیں نہیں ہوتے
ورنہ واں اور کیا نہیں ہوتا

☆

کیا کیا بنا کے ہم نے سُنایا رقیب کو
مضمون تیرے نامۂ اُلفت طراز کا

☆

رنجش کا گرچہ کوئی سبب درمیاں نہ تھا
لیکن وہ آپ صلح کریں یہ گماں نہ تھا
مانگی جو اس نے جان، تو غیروں پہ آبنی
حالاں کہ اک ہنسی تھی فقط امتحاں نہ تھا

☆

چارہ گر! فکرِ علاجِ دلِ وحشی ہے غلط
کوچۂ یار ہی چھوٹا، تو گلستاں کس کا

☆

شکوے ہمارے سارے غلط ہی سہی مگر
لو، تم ہی اب بتاؤ، کہ کس کا قصور تھا

☆

کیا نیا ظلم کوئی یاد آیا
ہم پہ کیوں آج مہربان ہیں آپ!
لائقِ قتل، میں ہی ٹھہرا ہوں
سچ تو یہ ہے، کہ قدر دان ہیں آپ

☆

بے قراری ہے کم ہماری آج
کیا نظر پھر گئی تمھاری آج
وہ منانے کو آئے ہیں، رشکی!
نبھ نہیں سکتی وضع داری آج

☆

ہے دگرگوں ابتدائے عشق میں رشکی کا حال
رحم آتا ہے مجھے، اس کی جوانی دیکھ کر

☆

فرصت نہیں ہے اپنے ہی عالم کی سیر سے
فرصت بھی ہو تو رخصتِ سیرِ چمن کہاں
یہ منصبِ بلند، ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

☆

آئے تو اپنا حال، کچھ اُن سے نہ کہہ سکا
کیا جانے، ہو گیا مجھے کیا اضطراب میں

☆

پیش تر وقت سے مرنا، سو وہ امکاں میں نہیں
اور جینا بھی کچھ آساں شبِ ہجراں میں نہیں
اہلِ دل سے نہ کبھی آپ سنیں گے نالہ
چاک دل میں ہے، مگر چاک گریباں میں نہیں

☆

محبت ہے بہت مجھ کو کسی سے
خوش آئے آپ کو بھی گر بیاں ہو
کریں کچھ چھیڑ ان سے آج، رشکی!
اگر تم بھی ہمارے ہم زباں ہو

☆

تم سے گلہ نہیں ہے، ہمارا قصور ہے
اوپر اٹھائیے نگہِ شرمسار کو

☆

مزا الفت کا، جانِ زار سے پوچھ
یہ نکتہ واقفِ اسرار سے پوچھ
بھلا رشکی کو، قدرِ فصلِ گل، کیا!
یہ کیفیت، کسی بے خوار سے پوچھ

☆

وہ باتیں، جو کہ اُن سے تھیں چھپاتی
غضب ہے، کر رہا ہوں میں اُنھیں سے
ہزاروں مہر و الفت کی ادائیں
سمجھ لیتے ہیں ہم تیری "نہیں" سے

نہیں ہیں سب سے یہ برتاؤ اُس کے
مگر کچھ لاگ ہے، رشکی تمھیں سے

☆

ہر چند دل سے اس کو بھلاتا رہا مگر
یاد آگیا، کسی نہ کسی بات پر مجھے
ایسی کہانیاں کہیں رشکی نے دردخیز
کم بخت نے نہ سونے دیا رات بھر مجھے

۱۲۶۴ھ کے ایک طرحی مشاعرے میں اُنھوں نے مندرجہ ذیل غزل پڑھی تھی۔ طرح تھی: یہ مدّعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا۔

بے چنگ و نے یہ قصہ سنایا نہ جائے گا
بے بادہ شوقِ وصل جتایا نہ جائے گا
پردہ اٹھا دیا ہے، تو کچھ سوجھتا نہیں
یہ پردہ زینہار اُٹھایا نہ جائے گا
جانِ التیامِ دشمن و دل انقطاعِ دوست
رُوٹھو نہ تم، کہ ہم سے منایا نہ جائے گا
آنکھیں ملانے میں ہے عبث تم کو احتراز
آنکھیں ہیں، دل نہیں کہ ملایا نہ جائے گا
نبضیں چھٹی ہیں، آنکھوں میں دم ہے، لبوں پہ نام
آؤ کہ کوئی دم میں بلایا نہ جائے گا
کچھ دیر خلوت اور جو رہتی تو خوب تھا
جلوت میں حرفِ شوق سُنایا نہ جائے گا
جاتے ہیں راہ بھول کے وہ مدعی کے گھر
کیا ہم سے اُن کو راہ پہ، لایا نہ جائے گا

آتش فشاں ہے عشق، پھر اب کوئی کچھ کہے
شعلۂ شوق ہم سے بجھایا نہ جائے گا (کذا)
افسوں ہوں گر ہزار، یہ وحشت نہ ہوگی کم
جب تک فسانہ اُن کا سنایا نہ جائے گا
گر ایک بار رُخ سے نقاب اُن کے اٹھ گیا
پھر رازِ دل کسی سے چھپایا نہ جائے گا
رشکی بھی آج بیٹھ گیا بزمِ دوست میں
دشمن تو یہ نہیں کہ اٹھایا نہ جائے گا

[اخبار الصنادید ۲: ۳۶۱ و ۳۶۷، خم خانۂ جاوید، ۳: ۴۲۲۔۴۳۲، ادیب (فیروز آباد، ضلع آگرہ) ۱: ۵۔۶، ماہِ نو (ماہنامہ، کراچی) جنوری۔فروری ۱۹۶۹: ۶۸]

رضوان... میرزا شمشاد علی بیگ خان دہلوی

نواب میرزا عالم بیگ کے صاحب زادے اور مرزا قربان علی بیگ خان سالک کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷۔ ۱۸۳۸ء) میں پیدا ہوئے۔ غالب سے فارسی پڑھی اور اُنھیں سے کلام پر اصلاح لی۔ الور میں ملازم تھے۔ پہلے وکیل، پھر ڈپٹی مجسٹریٹ رہے۔ شطرنج کا بہت شوق تھا اور کھیلتے بھی خوب تھے۔ نواب علاء الدّین احمد خان علائی نے ریورنڈو ہیٹلی صاحب کے ایما پر ایک سوسائٹی ''جلسۂ شطرنج دہلی'' کے نام سے قائم کی تھی، جس کا مفصّل ذکر علائی کے ترجمے میں دیا گیا ہے۔ رضوان بھی اس کے رُکن تھے۔ اِس سوسائٹی سے متعلّق اُنھوں نے ایک مختصر رسالہ ''بساطِ فرنگ'' کے نام سے لکھا تھا، جو ۱۸۶۷ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ اور بھی چند رسالے نثر میں لکھے۔ بہت صالح اور طاعت گزار جوان تھے۔ چالیس برس کی عمر تھی، جب ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں دلّی میں انتقال ہوا۔ بڑے بھائی سالک نے تاریخ کہی:

روزے کہ برادر از جہاں رفت
گفتیم کہ وائے، وائے رضواں
از ''عالم بے مدار'' بگزشت
گردید بہ ''خُلد'' جائے ''رضواں''
(۱۲۹۳=۳۹۸-۱۰۵۷+۶۳۴)

سالک کا مرثیہ بھی موجود ہے۔ لاولد فوت ہوئے۔

طبیعت بہت دقّت پسند اور مضمون آفرین پائی تھی۔ معمولی بات کو بھی پیچ

سے کہنے کا شوق تھا۔ چند شعر دیکھیے:

گُم کردگانِ راہ کو ہو نقشِ پا دلیل
مل جائے گر نشان ترے پائمال کا

آئینہ دارِ ذات ہے، آئینۂ صفات
ہے ذرّہ ذرّہ آئینہ اُس کے جمال کا

دیتے ہیں بے طلب بےِ مقصد، بقدرِ ظرف
شرمندہ اے کلیم، ہوا کیوں سوال کا

شیریں ہے کیا جواب ترا، گو خلاف ہے
منھ بند کردیا ہے مکرّر سوال کا

صحرا ہے اور میں ہوں، مرا سر ہے اور کوہ
کیا پوچھتے ہو حال، مجھ آشفتہ حال کا

رضواں! خدا کو مان، یہ ظاہر پرستیاں
کم بخت! کچھ بھی خوف ہے تجھ کو مآل کا

☆

کیا لطفِ زندگی دلِ غم مبتلا کے ساتھ
سیرِ جہاں کو آئے بھی تو کس بلا کے ساتھ

گر جاؤ گے نظر سے، جو ٹوٹی وفا کی آس
جانے بھی دو کہ ضد نہیں اچھی وفا کے ساتھ

شرمِ ستم گری سے بن آتا نہیں اُنھیں
انداز لطف کا، دلِ غم آشنا کے ساتھ

بے تابیاں نہ کیوں کہ ہوں، آئینہ دارِ راز
شوخی غضب ہے اس کی نگاہِ حیا کے ساتھ

ہم پاسِ وضع سے رہے، ناکام بیش تر
نازک دماغیاں بھی ہیں یاں التجا کے ساتھ
ہم مر گئے خوشی میں، وہ یاں آئے اس طرح
یہ ظلم کس سے کہیے کہ مارا وفا کے ساتھ

☆

کہہ چکے آپ، سن چکے ہم، پھر
کہتے ہو، کہیے، ماجرا کیا ہے
خود تماشا ہے، خود تماشائی
کون جانے وہ خود نما کیا ہے
میں تو موسیٰ نہیں، کہ ہوں محروم
جلوہ پردے میں، اے خدا کیا ہے
دل لگا ایسے بھولے سے، رضواں!
جو سمجھتا نہیں، ادا کیا ہے

☆

میری فریاد سے ظاہر ہے بیانِ دہلی
دلِ خوں گشتہ پہ ہے داغ زبانِ دہلی
ہم کو معلوم تصوّر سے ہوا ہے اتنا
عرش سے بڑھ کے ہے کچھ رفعتِ شانِ دہلی
کحلِ مازاغ لگاؤ تو کھلے راز کہ ہے
چیدۂ عالمِ ارواح جہانِ دہلی
شہرِ دہلی کو اگر ہند کا دل کیجیے فرض
حضرتِ قلعہ کو ٹھہرایئے جانِ دہلی

ہم نے پائے نہ ہنر مند کہیں دلّی سے
ہم نے دیکھا نہ کوئی شہر بسانِ دہلی

چھوڑ دے زہد کو، زنار پہن لے، زاہد
یک نظر دیکھے جو اندازِ بتانِ دہلی

گر نہ ہوں ہم، تو ہو بازار میں گرمی کیوں کر
ہم ہی تھے جنسِ گراں ارزِ دکانِ دہلی

ہے عدم کی تجھے منظور، خدایا رونق
کہ اٹھایا اُنھیں جو لوگ تھے جانِ دہلی

کیا بتاؤں کہ ہوں کس صدمے سے رضواں خاموش
دلِ خوں گشتہ پہ ہے داغِ زبانِ دہلی

(خم خانۂ جاوید:۳: ۴۵۱۔ ۴۵۴، فغانِ دہلی:۵۵۔ مکتوب سیّد ابو الاعلیٰ مودودی بنام مؤلف)

رضوان... نواب محمدؐ رضوان علی خان بہادر عرف محمود اختر مراد آبادی

مراد آباد کے رؤسا میں سے تھے۔ عضد الدولہ نواب محمدؐ عظمت اللہ خان بہادر ناظمِ روہیل کھنڈ اِن کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ علومِ متداولہ میں اچھی خاصی دستگاہ تھی۔

جس زمانے میں غالب رام پور گئے ہیں، یہ اُن کے شاگرد ہوئے۔ غزل کی طرف کم توجہ تھی، نعت سے زیادہ شغف تھا۔ جب حج کے لیے گئے تو مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر اپنی مشہور نعت پڑھی، جس کا مطلع ہے:

اِترائیں نگاہیں، جو پڑیں سُوے محمدؐ
دلؔ لوٹ گیا، دیکھتے ہی رُوے محمدؐ

اس پر حاکمِ مدینہ خالد پاشا نے حسّانِ الہند کا خطاب دیا۔ یہ نعت بہت مقبول ہوئی اور مدّت تک طرح ہوتی رہی۔ امیر مینائی نے اسے تضمین کیا ہے۔ مولوی فرید احمد وفا مراد آبادی نے بھی اسے تضمین کیا۔ خود رضوان نے اسے مختلف ڈھنگ سے تضمین کیا۔ یعنی مثلّث، مخمّس، معشّر وغیرہ اور اِن تمام تضمینوں کو ''طغرائے کمال'' کے تاریخی نام سے ۱۳۱۱ھ میں شائع کیا۔

اس نعت کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ مشہور مسیحی شاعر برج پیش شور☆ نے ردیف میں محمدؐ کی جگہ مسیحا لکھ کر اسے تضمین کیا۔ اس سے جناب رام بابو سکسینہ کو

دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے اپنی کتاب ''یورپین اور انڈویورپین شعراے اُردو و فارسی'' (انتخابات: ۴۷۶) میں لکھ دیا ہے کہ اس کا مصنف رضوان مراد آبادی کوئی عیسائی شاعر تھا۔ حالاں کہ اصلیت یہ ہے کہ شور نے اپنے جوشِ عقیدت میں اصلی نعت کی ردیف بدل کر اسے حضرتِ مسیح علیہ السلام سے منسوب کر دیا ہے۔

رضوان نے ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ علیم الدین علیم سُہنوی نے تاریخ کہی:

از جہاں رفت چوں رضوان علی خاں رضواں
درغمش اہلِ سخن زود برفتند ز ہوش
بعلیم از پےِ تاریخِ وفاتش دمِ فکر
''جائے رضواں بہ اِرم باد ابدا'' گفت سروش
(۱۳۲۹ء)

اُن کے ذریعے سے اُردو کو بہت فروغ حاصل ہوا، شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ اُن کا کلیات ''تصویرِ خوبی'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء) پہلے اسی نعت کے چند اشعار سن لیجیے:

اِترائیں نگاہیں جو پڑیں سُوئے محمدؐ
دل لوٹ گیا، دیکھتے ہی رُوئے محمدؐ
ہر ماہ گھٹا، بڑھ کے فلک پر مہِ انور
ابروے محمدؐ ہے، کبھی رُوئے محمدؐ
موسیٰ کی طرح، برقِ تجلی کو غش آئے
بے پردہ اگر ہو رخِ نیکوے محمدؐ
پژمردہ ہوں، یارب! نہ گلِ باغِ محبت
ان پھولوں سے آتی ہے مجھے بُوئے محمدؐ

بہت مشاق اور بسیار گو شاعر تھے، لیکن کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

ہو کوئی بات، تو کچھ اس کا تدارک کیجیے
خود بخود وہ تو عبث چیں بہ جبیں رہتے ہیں

☆

وہ معنی ہوں، کہ مضمونِ فنا ہے زندگی میری
وہ مطلب ہوں کہ ہستی سے ہے بہتر نیستی میری
ابھی فرشِ زمیں پر تھا، ابھی عرشِ بریں پر ہوں
کہاں سے لے اُڑی مجھ کو، کہاں تک بے خودی میری

☆

تکلیف روا رکھ نہ پرِکاہ کسی کی
ہاں تنکے نہ چنوائے کہیں آہ کسی کی
عشاق کو اتنا نہ ستا، اے بتِ ظالم!
فریاد نہ سن لے کہیں اللہ کسی کی

(خم خانۂ جاوید، ۳: ۴۵۶ـ ۴۵۸، یادگارِ ضیغم: ۳۹۵ـ ۳۹۶)

حواشی

☆۔ جارج پیش شور نے اوائل میں مرزا رحیم بیگ میرٹھی سے مشورہ کیا۔ پھر قطب الدّین مشیر دہلوی اور ان کے صاحب زادے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لی اور خود استادی کا درجہ حاصل کیا۔ بہت قادر الکلام شخص تھے۔ اردو میں ایک مثنوی (خود نوشت سوانح عمری) اور چھ دیوان موجود ہیں۔ ’’(گلشنِ فرنگ)‘‘ فارسی کا دیوان اس کے علاوہ ہے۔ عربی اور ہندی بھی خوب جانتے تھے، بلکہ ہندی میں تو ان کی ٹھمریاں اور ہولیاں آج تک مشہور ہیں۔ عربی کی تعلیم میرٹھ کے ایک مشہور عالم رئیس قاضی رشید الدّین سے پائی تھی۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر تھی، جب ۲۳ فروری ۱۸۹۴ء کو میرٹھ میں اِنتقال کیا۔ داغ نے جو قطعۂ تاریخ وفات لکھا تھا، اس کا آخری شعر ہے:

سالِ رحلت عیسوی بنوشت داغ
’’اہلِ عالم کرد ماتم شور، شور‘‘
(۱۸۹۴ء)

(خم خانۂ جاوید، ۵: ۷۱ـ۷۳)

رفعت و سرور... مولانا ابوالفضل محمدؐ عباس شروانی

اُن کا خاندان ولایتی تھا۔ مذہباً شیعی تھے۔ اُن کے جدِ امجد جابر ابنِ عبداللہ انصاری تھے۔ آبائے کرام مدینۂ منورہ سے بغداد چلے آئے اور یہاں بہت عزت اور احترام سے رہے۔ پھر آب و دانہ کی کشش سے ہمدان (ایران) میں جابسے۔ اُن کے جدِ اعلیٰ مرزا محمدؐ ابراہیم خان ہمدانی، نادر شاہ درّانی کے وزیر بھی رہے۔ اُنھوں نے شاہِ مذکور کے ظلم و ستم سے دل برداشتہ ہوکر نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور نجف اشرف میں روضۂ مبارکہ کے مجاور بن گئے۔ لیکن اُن کے فرزندِ رشید مستوفی الملک مرزا محمدؐ علی خان کے ماتھے گئی، وہ قہرِ نادری کا شکار ہوگئے۔ نادر شاہ نے خود اُنھیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کا گھر بار تاراج کر ڈالا۔ اُن کی اولاد اور دوسرے رشتہ دار ڈر کے مارے اِدھر اُدھر آوارہ اور منتشر ہوگئے۔ اُن کے بھائی مرزا محمد حسن خان، ترکِ وطن کر کے ہندوستان پہنچے اور بنارس میں مقیم ہوگئے۔ مستوفی الملک کے بیٹے مرزا محمدؐ تقی روپوش ہوکر شیخ محمدؐ کے نام سے شروان میں رہنے لگے۔ چندے بعد نجف اشرف پہنچے اور یہاں سیّد مہدی طباطبائی مجتہد العصر کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور ان سے فقہ و حدیث و تفسیر میں دستگاہ حاصل کی۔ شدہ شدہ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ ان کے چچا مرزا محمدؐ حسن خان بنارس میں مقیم ہیں تو وہ بھی یہاں آگئے لیکن اُن کے آنے کے جلد بعد چچا کا انتقال ہوگیا اور چوں کہ شیخ محمدؐ شروانی کی اُن کے ورثا سے بن نہ آئی، اس لیے یہ

بنارس سے لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں اُن دنوں نواب آصف الدولہ کی حکومت تھی۔ اُنھوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور یوں اُن کی آرام و آسائش سے بسر ہونے لگی۔ کچھ مدّت بعد انھوں نے یمن کی راہ لی، اور حدیدہ میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ایک تاجر سیّد محمّد حیدر بغدادی کی دخترِ نیک اختر سے نکاح کیا، جن کے بطن سے شیخ احمد شروانی پیدا ہوئے۔ یہی شیخ احمد صاحب ترجمہ رفعت کے والدِ بزرگوار تھے۔

شیخ احمد کمالاتِ علمی و عملی کی تحصیل کے بعد عنفوانِ شباب میں یمن سے ہندوستان آئے اور کلکتہ میں وارد ہوئے۔ یہاں حکّامِ فرنگ کی قدر شناسی سے اُنھیں مدرسۂ عالیہ میں عربی زبان و علوم پڑھانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ اِس ملازمت کے دوران میں اُنھوں نے بعض بہت قیمتی کتابیں تالیف کیں، جو اسی زمانے میں شائع ہوگئی تھیں۔ اُن میں سے زیادہ اہم یہ تھیں: حدیقۃ الافراح، (۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء)، منہاج البیان، الشافی فی علم العروض و القوافی (۱۸۳۴ء/ نیز ۱۸۴۶ء)، العجب العجاب (۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء)، نفحۃ الیمن (۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء)۔ اُسی زمانے میں اُنھوں نے الف لیلیٰ بھی مرتب کی، اس کی اصل غالبًا کوئی مصری نسخہ تھی۔ یہ پوری کتاب نہیں، اُنھوں نے صرف پہلی دو سو راتوں کو درست کیا اور اُنھیں دو جلدوں میں (۱۸۱۴۔ ۱۸۱۸ء) میں شائع کردیا۔ یہ پہلا کلکتہ ایڈیشن ہے۔ بعد کو سر رچرڈ برٹن نے جب پوری الف لیلیٰ کا انگریزی میں ترجمہ کیا، تو اپنے ترجمے میں اس نسخے سے بہت مدد لی تھی۔

تھوڑے دن بعد اُنھوں نے نوکری کو خیرباد کہا اور یہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ غازی الدّین حیدر شاہ کا زمانہ تھا۔ اِن کے خاندان کے تعلّقات دربارِ اودھ سے پہلے سے تھے ہی، چنانچہ اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اُنھوں نے اپنی کتاب مناقب حیدریہ قیامِ لکھنؤ کے زمانے ہی میں لکھی تھی۔ یہاں لکھنؤ میں رکن الدّولہ سیّد محمّد اسمٰعیل خان رضوی مرشد آبادی نے اپنی صاحب زادی ان کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ شیخ محمّد عباس رفعت اسی ازدواج کا نتیجہ تھے۔ غازی الدّین حیدر کی وفات کے بعد شیخ احمد شروانی کا دل لکھنؤ سے اچاٹ ہوگیا۔ وہ کان پور، بنارس، حیدرآباد، بھوپال،

بمبئی وغیرہ کی سیر و سیاحت کرتے پونا پہنچے اور وہیں ۲۱ مئی۔ ۱۸۴۰ء (۱۹ ربیع الاوّل ۱۲۵۶ھ) کو رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے، تکیہ رضا شاہ میں مدفن ہے۔

شیخ احمد بڑے صاحبِ کمال شخص، تھے۔ اپنے وقت کے متنبّی اور حریر تسلیم کیے گئے۔ تمام تذکرہ نویسوں نے اُن کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ مندرجۂ صدر تصانیف کے علاوہ تاج الاقبال فی تاریخِ مُلکِ بھوپال بھی اُن سے یادگار ہے۔

رفعت ۲۲ شوال ۱۲۴۱ (۳۰ مئی ۱۸۲۶ء) کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ عربی اپنے والدِ ماجد اور فارسی شیخ علی حزیں کے شاگرد میر خیرات علی خان مشتاق فیض آبادی سے حاصل کی۔ چودہ برس کے تھے جب والد کا انتقال ہو گیا۔ چوں کہ ان کی اپنے چچا سے نہ بنی اور اُنھوں نے انھیں جاداد پدری سے محروم کردیا، اس لیے یہ بھی ایک زمانے تک ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کرتے رہے۔ طبیعت سپاہ گری کی طرف مائل تھی۔ شہ سواری اور نیزہ بازی اور تفنگ اندازی کی مشق کی، اور فی الجملہ اِن فنون میں معقول مہارت بہم پہنچائی۔ قسمت آزمائی کے لیے دکن گئے۔ لیکن قسمت میں ابھی اور گردش لکھی تھی۔ یہ دلّی آئے اور یہاں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہوئی۔ ''مرزائی'' اور ''خانی'' اور ''ابو الفضلِ دوراں'' کے خطاب عطا ہوئے۔ اِن ہی ایّام میں غالب سے ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے اپنے فارسی کلام اور قصائد پر بالخصوص ان سے اصلاح لی۔ اس زمانے کا دہلی دربار کسی صاحبِ کمال کی صحیح قدردانی نہیں کر سکتا تھا۔ اُنھیں بھی یہاں کوئی خاص منفعتِ مالی حاصل نہ ہوئی۔ اب کے نکلے تو بھوپال پہنچے اور نواب جہانگیر محمدؐ خان بہادر شمشیر جنگ (نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کے والدِ ماجد) کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ اُن کی وفات کے بعد کچھ مدّت کے لیے نواب قدسیہ بیگم کے متوسلین میں شامل رہے، پھر ملازمت چھوڑ کر تجارت کا پیشہ اختیار کیا جب نواب والا جاہ سیّد محمدؐ صدّیق حسن خان بہادر کا نکاح نواب شاہجہان بیگم سے ہوا تو اُنھوں نے ازراہِ قدردانی اِنھیں اپنے پاس بلا لیا اور یہ ریاست کے ملازموں میں شامل ہوگئے۔ محکمۂ تنظیماتِ شاہجہانی (یعنی قانون اور تاریخ نویسی) اِن کے سپرد ہوا۔

سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس کے بعد بقیہ عمر یہیں بھوپال میں بسر کردی۔

رواداری کا زمانہ تھا۔ اختلافاتِ مسلک کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ نواب محمد صدیق حسن خان غالی سنّی، بلکہ ہندوستان میں ''وہابیت'' کے اوّلین علم برداروں میں گنے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس رفعت شیعی جن کے نام کا سجع تھا۔ شیعۂ آلِ محمدؐ عباس☆ لیکن دونوں کی ایسی خوش اسلوبی سے نبھی کہ رفعت نے مرتے دم تک بھوپال سے قدم باہر رکھنے کا خیال تک نہ کیا۔ دراصل معیار ذاتی استعداد اور قابلیت اور کارگزاری تھا۔

عربی اور فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی، ادب، علمِ کلام اور تاریخ میں وحیدِ عصر تھے۔ فارسی نظم و نثر پر بھی کماحقہ، قادر تھے۔ چھوٹی بڑی چونسٹھ کتابیں تصنیف کیں۔ معلوم نہیں کس بات پر دل برداشتہ ہو کے اپنی بیاض بھوپال کے تالاب میں ڈال دی۔ اور شعر گوئی سے توبہ کرلی۔ اگرچہ دو ایک شعر اُردو کے بھی ملتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے، یہ محض بطورِ تفنّن کہے گئے تھے، دراصل فارسی ہی میں کہتے تھے۔ جو کلام منتشر حالت میں ملتا ہے، اسی سے یہ انتخاب درج ہے۔ اُن کے بہت سے قصیدے نواب محمد صدیق حسن خان بہادر اور نواب شاہجہاں بیگم والیۂ بھوپال کی مدح میں موجود ہیں۔

۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷۔ ۱۸۹۸ء) میں بھوپال ہی میں انتقال کیا۔ میرزا محمد تقی کمال الدّین سنجر طہرانی نے تاریخ کہی، مصرعِ تاریخ ہے: آہ از مرگ ابو الفضل کمال۔ دوسری تاریخ بھی اُنھیں کی ہے: گفت: صد وائے بو الفضایل مرد (۱۳۱۵ھ)۔ بھوپال میں احمد آباد روڈ پر ''کربلا'' میں سپردِ خاک ہوئے۔

ان کی بیوی حسینا بیگم بھی شاعرہ تھیں، حسینہ تخلّص تھا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتی تھیں، اردو میں زیادہ، فارسی میں کم۔

بیگم حسینہ کا انتقال رفعت کی زندگی یعنی ۱۲۸۵ھ میں ہوا۔ بھوپال کی فصیل کے باہر مغرب کی طرف احمد علی شاہ کے تکیے میں مدفون ہیں۔ لوحِ مزار پر اُن کے

شوہر (رفعت) کی کہی ہوئی یہ تاریخ کندہ ہے:

چوں حسینا بیگمِ عفت سرشت
دفعتۂ دنیائے فانی را بہشت
جست عباسِ حزیں تاریخِ او
با "ادب" فرمود رضوانِ بہشت
برسرِ لوحِ مزارِ پاک آں
"فادخلی فی جنتی" باید نوشت

(۱۲۷۸+۷ =۱۲۸۵)

اولاد میں دو صاحب زادے یادگار چھوڑے۔ ابوالقاسم محتشم اور ابوالحسن محترم۔ دونوں علم و فضل میں اپنے اسلاف کے جانشین تھے۔ مدّت العمر ریاستِ بھوپال کی ملازمت میں بسر کردی۔

تا چشمِ تو آموخت، فنِ فتنہ گری را
در فتنہ گری، داد سبق چشمِ پری را

☆

دردِ سرِ من بہ خُدَنی نیست مسیحا
بیہودہ بخود راہ مدہ درد سری را
مہر و مہ و انجم، ہمہ ہا گرمِ گزاف اند
وقت ست، کہ آغاز کنی جلوہ گری را

☆

امشب از شمعِ رخِ جانانہ بزمم روشن است
بر بساطم از پرِ پروانہ خرمن خرمن است
سوزِ من، از گریہ، ہرگز کم نگردد، مثلِ شمع
آبِ اشکم، برسرِ آتش، مثالِ روغن است

یافت بازارِ محبت رونقے، از داغِ من
دُودمانِ عشق، از نورِ چراغم روشن است

☆

تُرکِ خونخوار، بکف تیغ، سرافشاں برخاست
خوب شد، بارِ سر از دوشِ عزیزاں برخاست
تا کجا، راز ز اغیار، توانم پوشید
یادِ یار آمد و آہ از دلِ نالاں برخاست
دید چوں جوہرِ خوں نابۂ چشمِ رفعت
موجِ خوں، از جگرِ لعلِ بدخشاں برخاست

☆

حالِ من آشفتہ، بجاناں کہ کند عرض
دردِ منِ رنجور، بدرماں کہ کند عرض

☆

بے نیازم کرد از کون و مکاں تاثیرِ عشق
سیم شد از زرِ من، تا یافتم اکسیرِ عشق
من چگویم، حالِ من چونست از مہرِ بتاں
درد منداں نیک می دانند، دار وگیرِ عشق
رادقِ شیراز دماءالورد میباید کشید
ایں مرکّب در اوانِ بَرد میباید کشید
با بُتِ گلفامِ نورس، غنچہ لب، پستہ دہن
جامِ بادہ در ہوائے سرد میباید کشید
در فراقِ دلبرِ شیریں دہن، رُخ نارون
آہِ سرد از سینۂ پُر درد میباید کشید

الحذر از صحبتِ بد گوہرانِ تیرہ دل
مے بیادِ روے جاناں فرد میباید کشید
مقطعِ صائب خوش است اے سرورِ والا گہر
برسرِ لوحِ طلاے زرد میباید کشید
ہر چہ میخواہی طلب کن صائب از شاہِ نجف
منّتِ گر میکشی از مرد میباید کشید

☆

دُور از بندِ کمندِ سبحہ و زُنّار باش.
مست "یاقدوس" گویاں بردرِ خمّار باش
مشربِ رنداں خوش است وعیشِ اینان بے گزند
نغمۂ یاہو چو قمری خوان و در گلزار باش
بزمِ رندانست، پاسِ عزّت اینجا لازم است
جاے خفتن نیست ایں دارِ فنا، بیدار باش
می نمایم رہ ترا ای راہ جُو ازراہِ صدق
سالکِ راہِ قویمِ حیدرِ کرّار باش

☆

اپنے اُستاد کا قطعۂ تاریخِ وفات کہا تھا:

جانِ اربابِ سخن غالبِ عالی ہمّت
ناظمِ سحر بیاں، ناثرِ والا فطرت
رشکِ فردوسی و خاقانی و عالی و کمال
ثانیِ خسرو وسعدی و حزیں و شوکت
ابرِ مدرارِ کمالات و قراتِ دانش
ماہرِ علمِ معانی و بیان و حکمت

از جہاں کردہ سفر سوئے ریاضِ رضواں
گفت عباس کہ "شایانِ سریرِ جنت"
(۱۲۸۵)

اُردو کے صرف یہ دو شعر شوکت نے اپنے تذکرے "فرح بخش" میں دیے ہیں:

پہرا ہے رقیبوں کا چھپر کھٹ کے برابر
دس بیس یقیں ہوں گے یہاں کٹ کے برابر
نغمۂ چنگ و رباب و دف و نے
دن ترے مرثیہ خوانی سمجھا

[تاریخِ دلچسپ (قلمی): ۵۷-۵۹، جلوۂ خضر ۲: ۱۹۷-۱۹۸، صبحِ گلشن: ۱۸۰-۱۸۲، شمعِ انجمن: ۱۸۲-۱۸۳، آثار الشعراء: ۱۱۱-۱۱۶، راہِ روح (قلمی): ۴۷-۴۸، فرح بخش: ۲۳-۲۸، غالبیات، چند عنوانات: ۸۷، تذکرۃ النساء نادری: ۵۷، اخترِ تاباں: ۱۴-۱۵، اُردو کی نثری داستانیں، ۸۲-۸۴، مکتوب جناب نادم سیتاپوری بنام مؤلف، جامعہ (ماہنامہ۔ دلّی) غالب نمبر (فروری و مارچ ۱۹۶۹ء): ۱۰۶-۱۱۳]

حواشی

☆۔ یہی سجع انھوں نے بعد کو شعر میں لکھ دیا اور مہر تیار کرائی (۱۲۹۸ھ):
خوش بود سجع نگینم رفعت شیعۂ آلِ محمدؐ عباس

رمز... میرزا فتح الملک بہادر
غلام فخر الدّین عرف مرزا فخرو دہلوی

خاندانِ تیمور کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر کے سولہ بیٹے تھے۔ مرزا فخرو اُن میں سے چوتھے تھے۔ ان سے تین بھائی بڑے، مرزا محمّد دارابخت میران شاہ عرف مرزا شبو اور مرزا شاہ رُخ اور مرزا کیو مرث تھے۔ مرزا فخرو (۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۲ء) میں پیدا ہوئے۔ سورۂ فتح کی آیت ''اِنّا فتحنا لک فتحاً مبینا'' سے بطرزِ تجع تاریخ ولادت (۱۲۳۳ھ) برآمد ہوتی ہے۔ جب ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو مرزا دارابخت ولیِ عہد کا انتقال ہوا۔[☆1] تو لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل نے یہ مسئلہ اٹھایا کہ اب کسے ولیِ عہد تسلیم کیا جائے۔ آخر معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی اور بڑی ردّوکد کے بعد مرزا فخرو ولیِ عہد منظور کیے گئے۔ لیکن شرط یہ ٹھہری کہ یہ برائے نام بادشاہ ہوں گے اور قلعۂ معلّٰے سے اُٹھ کر مہر ولی جا رہیں گے۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء میں اس معاملے پر دستخط ہوگئے اور مرزا فخرو کی ولی عہدی کا اعلان ہوگیا۔ بہادر شاہ کی چہیتی بیگم ملکہ زینت محل اس انتظام سے خوش نہیں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میرا اکلوتا بیٹا، جوان بخت، ظفر کا جانشین تسلیم کیا جائے۔ اُنھوں نے بہادر شاہ کو ہموار کرلیا تھا اور اُن کی طرف سے ایک لمبی چوڑی عرضی ملکہ وکٹوریہ کے نام لکھوائی تھی کہ وہ جوان بخت کی ولی عہدی کا اعلان کردیں۔ لیکن انگریزی سیاست کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور یہ مُنھ دیکھتی رہ گئیں۔ جتنے مُنھ اتنی باتیں، بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بیگم نے انگریز

ریذیڈنٹ سر ٹامس مٹکاف کو زہر دلوا دیا تھا کیوں کہ وہ ان کے رستے میں حائل تھے، چنانچہ صاحب موصوف ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو جان بحق ہوگئے۔ اس کے بعد مرزا فخرو کا کانٹا تھا، یہ بھی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کی شام کو ہیضے سے فوت ہو کے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے، اگرچہ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ انھیں بھی زینت محل نے زہر دلوا دیا ہے۔ مرزا فخرو درگاہِ قطب صاحب میں شاہ عالم بہادر شاہ اوّل (خلفِ اورنگ زیب عالمگیر) کے حجرے میں دفن ہیں۔

مرزا فخرو نے اپنی عمر میں تین نکاح کیے۔ پہلا مرزا جہانگیر (اکبر شاہ ثانی کے دوسرے بیٹے اور ظفر کے چھوٹے بھائی) کی اکلوتی صاحب زادی سے ہوا۔ مرزا ابوبکر اسی بیوی کے بطن سے تھے، جو ۱۸۵۷ء میں اپنے دونوں چچاؤں مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کے ساتھ کپتان ہاڈسن کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس بیوی کی وفات کے بعد دوسرا نکاح مرزا الٰہی بخش☆[۲] کی صاحب زادی حاتم زمانی بیگم سے ہوا۔ اور تیسرا وزیر☆[۳] بیگم عرف چھوٹی بیگم سے۔ شوکت محل اُن کا خطاب تھا۔ اُن کے بطن سے خورشید عالم خورشید پیدا ہوئے۔ ہمارے مشہور شاعر نواب مرزا خان داغ بھی اسی چھوٹی بیگم کے بیٹے تھے، اور وہ اسی واسطے سے قلعۂ معلیٰ میں پہنچے۔ اس لحاظ سے داغ مرزا فخرو کے گیلڑ بیٹے تھے۔ داغ نے مرزا فخرو کی تاریخِ وفات کہی ہے:

غمِ فتحِ ملکِ سلطاں، چہ بلائے جان و دل شد
دہدش مقامِ جنت، ز کرم، کریمِ غفار
چو ز داغ سالِ رحلت، دلِ درد مند پرسید
بکشید "آہ" حسرت "دو صد دوازدہ بار"
(۲۱۲×۶=۱۲۷۲ھ)

مرزا فخرو بھی ذوق کی زندگی تک اُنھیں سے اصلاح لیتے رہے، لیکن جب نومبر ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہوگیا، تو ظفر کی طرح یہ بھی غالب سے مشورہ کرنے لگے۔ غالب سے ان کے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ غالب نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے

ان کا چار سو روپیہ سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرزا زین العابدین خان عارف کے دونوں کم سن بچوں، باقر علی خان اور حسین علی خان کے لیے بھی دس روپیہ ماہانہ پھلوں کے لیے دیتے تھے۔ غالب کے فارسی کلام میں مرزا فخرو کی مدح میں تین قصیدے موجود ہیں۔ غالب کی اردو مثنوی ''درصفتِ انبہ'' بھی مرزا فخرو ہی کے آموں کے تحفے کے شکریے میں لکھی گئی تھی۔

رمز کو شعر گوئی کے علاوہ موسیقی اور رقص کا بھی بہت شوق تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ شوق خاندانِ تیموریہ کی گھٹی میں پڑا تھا۔

مرزا فخرو کا دیوان ۱۸۵۷ء کی افتاد میں ضائع ہو گیا۔ جو کچھ بچ گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت پختہ کلام ہے۔ زبان کی تعریف تحصیلِ حاصل کہ یہ واقعی اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ معاملہ خوب لکھتے ہیں۔ مختلف تذکروں میں سے مختصر انتخاب درجِ ذیل ہے:

آنکھیں تو اس کو دیکھ کے ہوتی ہیں بے قرار
بن دیکھے دل تڑپنے لگا، اِس کو کیا ہوا

☆

سب کچھ آساں ہے تجھے، گردشِ دوراں کرنا
ایک مشکل، مری مشکل کا ہے آساں کرنا

☆

مانا، کہ نہ دل لے کے تو مجھ سے وفا کرتا
پر دل کی تسلی کو، وعدہ تو کیا ہوتا

☆

وہ لے گئے ہیں خدا جانے، کس طرح دل کو
دیا ہے میں نے اُنھیں، اپنے اختیار سے کیا!

☆

غم وہ کیا ہے، جو جاں گزا نہ ہوا
درد وہ کیا، جو لادوا نہ ہوا

درد کیا، جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا، جس میں کچھ مزا نہ ہوا

وہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف!
تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا

تم رہو اور مجمعِ اغیار
میرا کیا ہے، ہوا، ہوا، نہ ہوا

پھر تمھارے ستم اُٹھانے کو
رمز اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

☆

ڈھونڈو گے جان کو بھی، محبت کی راہ میں
پھرتے ہو رمز! دل کی ابھی جستجو میں کیا

☆

دلِ بے تاب ہو کیا تجھ سے رفاقت کی اُمید
کون ہوتا ہے بُرے وقت میں جو تو ہوگا

☆

میں جو رُسوائے زمانہ ہو گیا
اس کی شہرت کا بہانہ ہو گیا

جا پڑے ہم، کوچۂ جاناں میں رمز!
بارے اپنا بھی ٹھکانہ ہو گیا

☆

حال سن سن کے عشق میں تیرا
رحم کرتے ہیں خاص و عام افسوس

☆

دردِ فراق، فکرِ عدو، طعنِ دوستاں
اِس ایک جان پر مری کیا کیا بلا نہیں

☆

نہ حرم میں جگہ، نہ دیر میں جاے
ہم کنے جائیں، اے خدا! کس میں

☆

اے دلِ بے تاب! اتنا اضطراب
صبر تجھ پر، اور تو میں کیا کہوں

☆

یاں یہ حالت کہ دم لبوں پر ہے
واں یہ غفلت، کہ کچھ خیال نہیں

☆

تم نہ تھے، غیر کے گھر میں شب کو
بس چلو، یوں ہی سہی، جانے دو
منھ دکھانا ہے خدا کو، اک دن
اے بتو! اتنی خودی جانے دو
شکر و شکوہ سے تعلق نہ رکھو
نبھ سکے جیسے، نبھی جانے دو
رحمِ الفت میں جو چاہو آرام
تو یہ راحت طلبی، جانے دو

☆

تم آؤ یا غمِ فرقت میں یہ کم بخت دم نکلے
تمنا کوئی تو دل کی ہمارے اے صنم نکلے
اگر سیدھی کہوں ان سے، تو یہ الٹی سمجھتے ہیں
مگر یہ حضرتِ ناصح بھی کوئی اک رقم نکلے

☆

ہم نے تو غمِ یار میں، یوں عمر بسر کی
مرمر کے جو کی شام، تو رو رو کے سحر کی

[ریذیڈنٹ دہلی کا روزنامچہ: ۱۲ د ۲۵، طبقات الشعرائے ہند: ۴۱۶، گلستانِ سخن، ۲۴۷۔۲۵۰، اردوئے معلیٰ: ۱۰۵، نادراتِ غالب: ۸۵، خم خانۂ جاوید: ۳: ۴۹۷۔۵۰۲]

حواشی

☆۔ وفات کے وقت عمر ۵۷ برس تھی۔ ظفر نے تاریخ کہی:

آں ولی عہدے کہ دارابخت بود
کردچوں رحلت ازیں دنیاے دوں
شد درونِ خلق داغ از سوزِ غم
گشت سالِ رحلتش "داغِ دروں"
(۱۲۶۵ھ)

درگاہ چراغ دہلی میں دفن ہوئے تھے۔

☆۔ یہ وہی مرزا الٰہی بخش ہیں، جن سے متعلق مشہور ہے کہ وہ انگریزوں کے یارِ غار اور ان کے جاسوس تھے۔ بہادر شاہ کے مقدمے میں یہ بھی گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے۔ ان کا اصلی نام مرزا ہدایت افزا تھا اور یہ شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کی چھٹی پشت میں تھے۔ انگریزوں اور مرزا فخرو سے جو معاہدہ ہوا تھا، وہ بہت حد تک انھی کا کیا دھرا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے انھیں خاندانِ شاہی کا سرپرست تسلیم کرلیا اور جاگیر عطا کی۔ ۲۱ مارچ ۱۸۷۸ء کو وفات پائی۔ مرزا جہانگیر کے مجرّ میں دفن ہیں۔

☆۔خدا کی شان کہ اس عورت سے جتنی اولاد ہوئی، سب شعر کہنے والی۔ یہ محمد یوسف سادہ کار کشمیری کی بیٹی تھی (بڑی بیگم اور عمدہ خانم اس سے دو بڑی بہنیں تھیں) سب سے پہلے یہ ایک انگریز کے گھر میں رہی جس کے نام میں اختلاف ہے۔ کوئی اسے بلیک (Black) لکھتا ہے (ماہِ درخشاں: ۲۱) اور کوئی مارٹن

(کارنامۂ سروری: ۶۵) ہمیں ممکن ہے کہ نام مرتب بلیک مارٹن یا مارٹن بلیک ہو۔ اس سے چھوٹی بیگم کے ایک لڑکا امیر مرزا اور ایک لڑکی ہوئی، اس کا نام مسیح جان عرف پادشاہ بیگم اور تخلص خفی تھا۔ اس کے بعد یہ نواب شمس الدّین احمد خان والیِ فیروز پور جھرکہ کے پاس پہنچی۔ یہاں داغ پیدا ہوئے۔ نواب کے پھانسی پا جانے (۱۸۳۵ء) کے بعد یہ آغا مولوی تراب علی کے یہاں گئی۔ اُن سے شاہ محمد آغا پیدا ہوئے، جو پہلے شائق (فغان دہلی: ۱۷۲) اور بعد کو شاغل تخلص کرتے رہے (خم خانۂ جاوید، ۴: ۴۱۹)۔ اس کے بعد یہ چندے نیز رخشاں کے پاس بھی رہی ہے، جن کا ان دنوں عنفوانِ شباب تھا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ۱۸۴۴ء میں یہ قلعے میں آئی۔ یہاں مرزا فخرو سے شاہزادہ خورشید عالم خورشید ہوئے۔ مولانا آزاد نے دیوانِ ذوق (ص ۴۱۔۴۲) میں جو لطیفہ چھوٹی بیگم کا لکھا وہ اسی سے متعلقہ ہے۔ اس کا انتقال اگست ۱۸۷۹ء میں ہوا۔

(اُردو ادب، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۱ حاشیہ ۳)

رنج وطبیب ... حکیم محمدؒ فصیح الدّین میرٹھی

میرٹھ کے سربرآوردہ اور باوجاہت خاندان کے فرد اور قوم کے بنی اسرائیل تھے۔ یہ خاندان اصل میں سکندر آباد (ضلع بلند شہر) کا رہنے والا تھا۔ جہاں سے رنج کے آباو اجداد نقلِ مکان کر کے میرٹھ چلے آئے تھے۔ میرٹھ کا محلہ بنی سرائے (مخففِ بنی اسرائیل) اسی خاندان کا آباد کردہ ہے اور آج بھی باقیاتِ صالحات یہیں مقیم ہیں۔

بنی اسرائیل صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی نسل سے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ پہلے یہودی تھے اور بعد کو اسلام لے آئے تھے، ان کی اولادِ امجاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔

رنج کے مورثِ اعلیٰ الحاج محمدؒ ادریس نجندی شاہ طہماسپ کے ایما پر ہمایوں کے ساتھ ۱۵۵۵ء میں ایران سے ہندوستان آئے۔ اکبر نے ان کے پوتے محمدؒ برخوردار خان کو خانی کا خطاب اور میرٹھ میں ۲۷ ہزار گز کا قطعۂ زمین اپنی محل سرا تعمیر کرنے کو عطا کیا۔ یہاں اُنھوں نے اپنے خاندان' کے لیے مکانات بنوائے اور اس محلے کا نام اپنی قوم کے نام پر محلۂ بنی اسرائیل رکھا، جو کثرتِ استعمال سے بگڑ کر اب ''بنی سرائے'' کہلاتا ہے۔ عہدِ مغلیہ میں اس خاندان کے اکثر افراد عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے۔

رنج کے والد حکیم مولوی قمر الدّین کے پھوپھا مولوی صدر الدّین دربارِ گوالیار میں وکیل تھے۔ چوں کہ اُن کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، اُنھوں نے قمر الدّین کو گود لے لیا تھا۔ قمر الدّین نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ اپنے فن میں ماہر تھے اور اسی سلسلے

میں مہاراجا سیندھیا کے دربار سے منسلک ہوگئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ رخصت پر وطن چلے آئے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو مہاراجا بہادر نے اُنھیں طلب فرمایا۔ لیکن خدا معلوم کیوں، یہ پاؤ توڑ کے یہیں کے ہو رہے اور واپس نہ گئے۔ اس کے بعد کہیں ملازمت نہیں کی۔ مہوّسی کا بھی شوق تھا۔ ۱۸۸۳ء میں انتقال فرمایا۔ رنج نے تاریخ کہی:

بود حیف از خسوف قمر الدّین (۱۲۹۹ھ)

رنج نے عربی اور فاسی اور طب کی تعلیم اپنے حقیقی ماموں (اور خسر) مولوی نصیر اللہ سے پائی، جو ریاستِ دتیا کی ملازمت ترک کر کے اپنے مکان پر مقیم ہوگئے تھے۔اس کے علاوہ طب میں حکیم سعادت علی خان میرٹھی (ف ۱۲۸۰ھ) سے بھی استفادہ کیا۔ ماموں کی زندگی بھر رنج اُنھیں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اُن کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنا الگ مطب شروع کیا۔ کامل اور حاذق طبیب تھے، خصوصاً اپنے ماموں مرحوم کی طرح نسائی امراض کے علاج میں بہت شہرت حاصل کی۔ افسوس کہ عین جوانی یعنی ۴۹ برس کی عمر میں استقائے لحمی کے مرض سے آٹھ مہینے بیمار رہ کر ۳۰ مارچ ۱۸۸۵ء شب کے دو بجے وفات پائی۔ میرٹھ کے قبرستان شاہ سلطان میں دفن ہوئے۔

ان کے صاحبزادے حکیم محمد فخر الدّین فخرو شاد نے ازلب بکا (یعنی دو) کے تعمیہ سے ''آہ رنج در گزشت'' سے عیسوی میں تاریخ (۱۸۸۵ء) نکالی۔ ہجری تاریخ اُن کے دوست جارج پیش شور نے کہی۔

خوشی شور کی لے گئے اپنے ساتھ
نصیب اس کو ہے ''اب غم رنج آہ''
(۱۳۰۲)

اُن کی بیوی کا انتقال اُن سے چند برس پہلے ۱۰ ستمبر ۱۸۶۷ء کو ہو چکا تھا۔
شاعری میں رنج کے علاوہ اپنے پیشے کی مناسبت سے کبھی کبھی طبیب تخلص بھی کرتے تھے۔ نعت سے بھی شغف تھا چنانچہ ایک مجموعہ ''گلشنِ نعت'' کے عنوان سے

موجود ہے۔ دیوان بھی زندگی میں مرتّب نہیں ہوا۔ یہ اُن کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے حکیم محمد فخر الدّین نے ''مخزن الفصاحت'' کے تاریخی نام سے ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) میں مطبع ہاشمی، میرٹھ میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس کے علاوہ اُن کی تالیف شاعرات کا ایک تذکرہ ''بہارستانِ ناز'' بھی یادگار ہے۔

حکیم محمد فخر الدّین کی وفات بعمر ۵۵ برس 1915ء (۲۹ نومبر) میں ہوئی۔ ان کا نکاح اپنی سگی پھوپھی کی بڑی بیٹی تبارک النساء سے ہوا تھا۔ اُن کے صاحب زادے حکیم محمد محمود الحق بھی طبابت پیشہ تھے، ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۵۰ء کو ہوا۔ دونوں باپ بیٹے قبرستان سلطان شاہ (میرٹھ) میں آسودۂ خواب ہیں۔ اب اِس خاندان کے نام لیوا حکیم محمود الحق کے خلف الصدق حکیم سیف الدّین احمد سلمہٗ، (میونسپل کمشنر) میرٹھ میں مطب کرتے ہیں۔

انتخاب ملاحظہ ہو:

دیکھتا تھا میں نگاہوں سے ہر اک جا تجھ کو
اور اُنھیں میں تو نہاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

☆

عجب وہ لوگ ہیں جو اپنے دل کو تھام لیتے ہیں
ہمیں تو تھامنا مشکل ہے، آنسو چشمِ گریاں کا

☆

اغیار اور خلوت، ایسا نہ جانتے تھے
دربارِ خاص اُن کا، دربارِ عام نکلا

☆

پرتو فگن جو ساقیِ گلفام ہو گیا
گل رنگ شیشۂ دلِ ناکام ہو گیا

یارب! مرے گناہ کی تعزیر اور کیوں
بس ہے یہی، کہ لطف نہ پایا گناہ کا

☆

آج اُن سے صلح ہوتے ہوتے پھر کل پر رہی
سہل ہو کر کام مجھ ناکام کا مشکل ہوا

☆

مرے خط میں لکھا عدو کو سلام
آگے آیا لکھا مقدّر کا

☆

عشق میں ہم نے کیا اپنوں کو غیر
تم نے کیوں کر، غیر کو اپنا کیا!

☆

بت خانے سے گھبرائے تو کعبے سے بندھا دھیان
بت ظلم جو کرتے ہیں تو آتا ہے خدا یاد

☆

ناچار دل سے، تنگ بتوں کی جفا سے ہم
فریاد ایک ہو، تو کریں بھی خدا سے ہم

☆

لاکھوں بناؤ ایک تغافل میں آپ کے
لاکھوں بگاڑ، ایک مرے اضطراب میں

☆

معلوم نہیں کچھ کہ میں آیا ہوں کہاں سے
جاؤں گا کہاں، آیا تھا کیوں، کون ہوں کیا ہوں!

☆

بہار آئی ہے پھر وحشت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
بڑھیں کیوں ہاتھ، خود ٹکڑے گریباں ہوتے جاتے ہیں

☆

دن کاٹنے کو خوب تو ہے دل لگی کی راہ
اچھا ہے، جی لگا جو کسی سے، بُرا نہیں

☆

تمنا جس کی خود محتاج ہو، یارب، وہ دل دے دے
نہ دے ایسا مجھے دل تو کہ محتاجِ تمنا ہو

☆

کب کیا کرتے تھے اس طرح سے پامال مجھے
کب چلا کرتے تھے تم، ایسی ادا سے پہلے

☆

قاصد گیا، ہر طرح سے تسکین ہوئی، لیکن
اب دل کو یہ دھڑکا ہے کہ کیسی خبر آئے

[خم خانۂ جاوید، ۳: ۵۰۷: دیباچہ و خاتمہ مخزنِ فصاحت، مکاتیب غالب (حواشی: ۲۰۰، عبرت، ماہنامہ بمبئی، ستمبر ۱۹۵۰ء: ۳۵۔ ۳۶ (مضمون ''حکیم محمود الحق مرحوم'' از شاہ بدر الدّین انور چشتی)]

رند ... جانی بانکے لال

غالب کے اپنے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دربارِ بھرت پور میں وکیل تھے، اور ان ہی کے واسطے سے منشی ہرگوپال تفتہ کو بھی وہاں کسی طرح کی ملازمت مل گئی تھی، یا کوئی اور سلسلۂ روزگار ہو گیا تھا۔

۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵۔ ۱۸۵۶ء) میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک طویل مرثیہ تفتہ کے دیوان دوم (۱۸۵۷ء۔ کوہِ نور پریس، لاہور) میں موجود ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ رند اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور پچاس برس کی عمر میں لاولد فوت ہوئے۔

(اُردوئے معلیٰ: ۴۴، ۵۶)

زکی... حکیم محمدؒ اشفاق حُسین مارہروی

مارہرہ (ضلع ایٹہ۔ یو پی) کے خاندان کنبوہ کے چشم و چراغ تھے۔ اِن کے والد مولوی الطاف حسین کا اپنے عہد کے ذی علم حضرات میں شمار ہوتا تھا۔ زکی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے پائی۔ بعد ازاں فارسی اور طب کی تعلیم اور تکمیل مارہرہ کے دوسرے اساتذہ سے کی۔ عربی بھی بقدرِ ضرورت جانتے تھے۔

شاعری کا شوق بہت کم عمری میں پیدا ہوا۔ اس کے آغاز کا قصہ بیان کرتے تھے کہ میرا ابھی مشکل سے چودہ برس کا سن ہوگا کہ میں وطن میں ایک مشاعرے میں گیا۔ وہاں جو کلام سنا اور سامعین نے جس طرح سے داد دی، اس سے طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ گھر پہنچ کر مشاعرے کی طرح پر سات شعر لکھے اور اُنھیں لے جا کر والد صاحب قبلہ کو دکھایا۔ توقع تھی، کہ میری طرح وہ بھی خوش ہوں گے اور داد دیں گے، اُلٹا انھوں نے ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ شغل ترک کردو، پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس پر میں بہت مغموم ہوا۔ لیکن مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے چند شعر نعتِ رسول میں لکھے اور اُنھیں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بھلا اب وہ کیسے اعتراض کر سکتے تھے! میری چالاکی کو بھانپ گئے اور فرمایا: اچھا، تم اگر شعر گوئی سے باز نہیں رہ سکتے، تو میں منع نہیں کرتا، لیکن اپنی تعلیم کی طرف سے غافل نہ ہونا اور اسے بہرحال مقدّم سمجھنا۔ اس کے بعد میں کبھی کبھی شعر کہتا رہا اور مارہرہ اور قرب و جوار کے مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔

سرکاری ملازمت ذریعۂ معاش تھی۔ ملازمت کا پورا زمانہ محکمۂ بندوبست میں

بسر ہوا۔ ابتدائی ایام ایٹہ میں گزرے۔ پھر اتر پردیش کے دوسرے اضلاع مثلاً مظفر نگر، بنارس، حیسبر، بدایوں وغیرہ میں قیام رہا۔ انگریزی ملازمت کے اختتام کے بعد چندے گوالیار میں بھی رہے۔ ۱۹۰۷ء میں بھوپال پہنچے اور یہاں بھی پہلے محکمۂ بندوبست اور پھر جمع بندی (Land Records) کے دفتر سے وابستہ رہے۔ ۱۹۱۵ء میں محکمے کے افسرِ اعلیٰ کے رویّے سے ناراض ہو کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور خانہ نشین ہو گئے۔

طب کی تعلیم مکمل تھی اور اس فن میں پوری دستگاہ تھی، لیکن کبھی اُسے ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ البتہ جہاں کہیں رہے، ادویہ کا ذخیرہ ساتھ رہا، اسے ضرورت مندوں میں مفت تقسیم کرتے۔ جب بھی اپنے وطن مارہرہ جانے کا اتفاق ہوتا، وہاں اپنے ہم درس دوست حکیم آلِ حسن کے مطب میں چلے جاتے، مریضوں کو دیکھتے اور اُنھیں مشورہ دیتے۔

مذہب سے بہت شغف تھا۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ اور صاحبِ دل بزرگ تھے۔ مارہرہ کے سلسلۂ قادریہ برکاتیہ سے منسلک اور حضرت سیّد ابو الحسین احمد شاہ نوری سے بیعت تھے۔ اپنے سلسلے کے تمام اوراد و وظائف پوری پابندی سے ادا کرتے تھے۔

زکی کی شادی اپنے خاندان ہی میں ۲۵ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی زینب فاطمہ رشتے میں ان کے چچا کی بیٹی تھیں۔ یکے بعد دیگرے چھ لڑکے پیدا ہوئے، لیکن ان میں سے کوئی زندہ نہ رہا اور سب اُنھیں صغر سنی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ بفضلہٖ آخری تین بچے زندہ رہے۔ ان میں سب سے بڑی صاحب زادی میمونہ خاتون تھیں۔ محمدؐ ملیح زبیری (جن سے یہ حالات ملے) اُنھیں کے صاحب زادے ہیں۔ صاحب زادی کا زکی کی زندگی ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان سے چھوٹے محمدؐ اخلاق حسین تھے۔ یہ بھوپال کے کسٹم ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور پنشن پانے کے بعد بھی وہیں رہے۔ اِن کا ۱۹۵۵ء میں بعارضۂ فالج کراچی میں انتقال ہوا۔ سب سے چھوٹی صاحب زادی عرفان فاطمہ حیات ہیں اور آج کل (۱۹۵۷ء) اپنے اہل و عیال کے

ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔

زکی کی بیوی کا ۱۹۲۸ء میں انتقال ہوگیا۔ چوں کہ اہلی زندگی بہت خوش گوار گزری تھی، اس لیے بڑھاپے میں رفیقۂ حیات کی جدائی سے بالعموم مغموم اور اُداس رہنے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں ملیریا کا سخت حملہ ہوا، اور بہت دن صاحب فراش رہے۔ اگرچہ اِس سے نجات مل گئی لیکن پھر نہ طبیعت پورے طور پر بحال ہوئی، نہ کم زوری کا ازالہ ہوا۔ یہ حالت تھی، جب ۱۹۳۰ء میں دوبارہ ملیریا کا حملہ ہوا۔ چوں کہ بخار بہت تیز تھا، اُسے روکنے اور کم کرنے کے لیے دوائیں دی گئیں۔ اُن سے حرارت تو کم ہوگئی، لیکن پسینہ اتنا آیا کہ اس سے نقاہت المضاعف ہوگئی۔ اِسی حالت میں ۹۳ برس کی عمر میں ۱۴/ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء کی درمیانی شب میں انتقال کیا۔ صبح کو تجہیز و تکفین ہوئی اور بھوپال کے تکیے جھولا شاہ میں سپردِ خاک کیے گئے۔ تکیے کی مسجد کے احاطے کی مغربی دیوار سے ملحق قبر ہے، جو مرحوم کی وصیت اور خاندانی روایات کے مطابق کچی رکھی گئی۔ اُن کے نواسے جناب ملیح زبیری نے تاریخِ وفات کہی:

چوشد سازِ انفاسِ پاکش خموش
زکی را نہادند اندر مغاک
چو ایں حادثہ سخت آمد، ملیح!
زفرطِ الم می تپیدم بخاک
مکن غم، ندائے شنودم زغیب
کہ ایں بندۂ ماست: ''مغفور پاک''
(۱۳۴۹ھ)

نمونۂ کلام میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

دم الجھنے لگا ہے، بے الجھے
زُلف اُلجھی اگر، تو کیا ہوگا

رہ گزارِ بلا پہ بیٹھے ہیں
نہ ملا راہبر، تو کیا ہوگا

☆

زہے قسمت! پسندِ خاطرِ مشکل پسند آیا
ازل سے چھانٹ کر لائے تھے ہم جو دل، پسند آیا
نکل کر آنکھ سے آنسو رُکے ہیں نوکِ مژگاں پر
کہ لڑکوں کو تماشائے لبِ ساحل پسند آیا
ہوئی ہے تیغ کند اُس کی بقولِ حضرتِ غالب
"تماشائے بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا"

☆

صیاد دُور، موسمِ گل، سامنے چمن
کنجِ قفس میں روؤں نہ کیوں بال و پر کو میں
زار انتظارِ خط نے کیا اِس قدر مجھے
انجان سوچتا ہوں مگر نامہ بر کو میں
قدرِ سخن زمانے میں باقی نہیں، زکی!
کس کو دکھاؤں آج متاعِ ہنر کو میں

☆

سِفلوں سے پوچھتا ہوں غربت میں
کہیے، کیسا مزاجِ عالی ہے؟

☆

وابستہ رہ چکے ہیں جو دل زلفِ یار کے
پابند ہیں وہ آج غمِ روزگار کے

جو اپنے عزِ نفس کو پہچانتے نہیں
رہتے ہیں فکر میں وہی جھوٹے وقار کے
بلبل کو آشنائے جنوں کردیا، زکی!
صدقے گلوں کے پیرہنِ تار تار کے

☆

جو اس سے دوری میں عمر گزرے، اسے نہ کر زندگی مین شامل
قریب رہ کر جو وقت گزرے، وہ زندگی میں شمار کرلے

☆

نعت و مستزاد میں یہ رنگ ہے:

اک برقِ تجلّی۔ مری ہستی پہ گرا کر، مدہوش بنا کر
سینے کو بنا دو مرے تم وادیِ سینا، یا شاہِ مدینہ!
مے خانہ بدوش آج مرے سامنے آجا، متوالا بنا جا
حصّے میں مرے آئے تری آنکھوں سے پینا، یا شاہِ مدینہ!
بگڑی ہوئی قسمت مری للہ بنادو، ہر غم سے چھڑا دو
جب دِل کو نہ ہو چین تو کس کام کا جینا، یا شاہِ مدینہ!

(مکتوب جناب محمد ملیح زبیری، کراچی)

زکی... نواب سیّد محمدؐ زکریا خان رضوی دہلوی

دلّی کے ایک معزّز خاندانِ سادات کے چشم و چراغ تھے۔ خان دراصل نام کا جزو نہیں تھا، بلکہ اُن کے بزرگوں کو شاہی میں ''خانی'' کا خطاب ملا تھا، جو خاندان کے بعض اصحاب کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا رہا۔ اصل میں یہ خاندان کشمیری تھا۔ اُن کے بزرگ نواب مختار الدّولہ ابو القاسم خان بہادر، شاہ عالمِ ثانی کے وزیر مجد الدّولہ عبد مد خان کے قریبی عزیز تھے۔ زکی نے وجاہتِ دنیوی کے علاوہ شاعری بھی گویا وراثت میں پائی۔ ان کے والدِ ماجد سیّد محمود خان بھی شعر کہتے تھے اور محمود تخلّص کرتے تھے۔ اُردو شعرا کے مشہور تذکرے ''عمدۂ منتخبہ'' کے مؤلف اعظم الدولہ نواب میر محمدؐ خان معظم جنگ سرور (شاگردِ محمدؐ جان بیگ سامی) ان کے نانا اور دادا کے بھائی تھے، بزرگوں کا مسکن دلّی کا مشہور محلّہ زینت باڑی تھا۔ لیکن یہ خاندانی جاہ و جلال زکی کی قسمت میں نہیں تھا۔ سب جاداد کچھ اُن سے پہلے اور باقی ۱۸۵۷ء کے بعد خالصے لگ گئی۔ خاندان کے بہت سے افراد بھی (بقول سیّد ابو القاسم رضوی ۹۰ عدد) اسی ہنگامے میں انگریز کی گولی کا نشانہ بنے۔

زکی ۱۸۳۹ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی، منطق، ریاضی کی تعلیم غالب، صہبائی اور پنڈت رام کشن بسمل سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ طب میں بھی واقفیت بہم پہنچائی۔ قرآن بھی حفظ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ بھی دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ آخر کار محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے اور بتدریج ترقی کر کے صوبۂ یو پی کے مدارس کی ڈپٹی انسپکٹری کے عہدے تک پہنچے۔ اس تعلق سے مدّتوں میرٹھ، گورکھ پور،

بریلی، الہ آباد اور بدایوں میں رہے۔ جب ۱۹۰۱ء میں ملازمت کی میعاد ختم ہوئی ہے، تو وہ بدایوں ہی میں تعینات تھے۔ اس کے بعد بھی وہ مستقلاً بدایوں ہی میں رہے، یہیں ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳-۱۹۰۴ء) میں اللہ کو پیارے ہوئے، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے والد ماجد سیّد احمد کی درگاہ (ساگرتال، نوادہ) کے احاطے کی جنوبی دیوار کے باہر جانبِ شرق آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔

بڑے قادر الکلام شخص تھے۔ مولوی حشمت اللہ حشمت، پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی، تولاؔ بدایونی، سیّد احمد دہلوی (مؤلف فرہنگِ آصفیہ) وغیرہ ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے دیوانِ غزلیات (دیوانِ زکی) پر غالب نے چند سطریں بطورِ سند لکھ دی تھیں۔ وہ اس کے ساتھ موجود ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت مشاق اور نازک خیال شاعر تھے۔ استاد کے کلام کی بعض خصوصیات مثلاً مضمون آفرینی، دقت پسندی، فارسی تراکیب وغیرہ کو اُنھوں نے نباہنے کی کوشش کی ہے اور اِس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ بہت کچھ کلام غیر مطبوعہ رہ گیا، جو اُن کے خاندان میں موجود ہے۔

زکی کی بیوی کا نام مریم بیگم تھا۔ مریم بیگم نے ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء میں رحلت کی۔ اولاد میں پانچ بیٹے: (۱) سیّد ذوالفقار علی رضوی (۲) سیّد ابو القاسم رضوی (۳) سیّد حامد حسن رضوی (۴) سیّد عنایت حسین رضوی، (۵) سیّد ولایت حسین رضوی اور ایک بیٹی ہے۔ ان میں سے (۱) اور (۳) اور (۴) نے شادی نہیں کی (۲) یعنی ابو القاسم کا پہلا نکاح ۱۹۰۹ء میں نواب صدیق حسن خان (بھوپال) کی پوتی (یعنی نواب سیّد نورالحسن کی بیٹی) سے لکھنؤ میں ہوا، جس کے بعد وہ بھی ''نواب'' کہلانے لگے۔ اُن کے بیٹے سیّد زبیر حسن رضوی اپنے خاندان کے ساتھ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ اِن بیگم کے انتقال (۱۹۲۲ء) کے بعد سیّد ابو القاسم نے دوسرا نکاح کیا۔ اِس بیگم کی بھی اولاد موجود ہے۔ ابو القاسم رضوی کا ۱۹۳۸ء میں دلّی میں انتقال ہوا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، بسملؔ تخلص تھا۔

نمبر (۶) سیّد ولایت حسین رضوی کا پہلا نکاح اپنے چچا سیّد محمد یحییٰ خان (زکی کے بڑے بھائی) کے بیٹے سیّد محمود حسن ثاقب☆ رضوی کی صاحب زادی سے ہوا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح بھی کیا تھا۔

زکی کے ایک چچا زاد بھائی سیّد میر حسن رضوی تھے۔ سیّد مسعود حسن شہاب دہلوی ایڈیٹر الزبیر، بھاول پور (پاکستان) اِنھیں سیّد میر حسن رضوی کے پوتے ہیں۔ میر حسن رضوی اخبار خیرخواہ عالم اور مطبع رضوی کے مالک تھے۔ زکی کا دیوان پہلی مرتبہ اسی مطبع میں اُن کے اہتمام سے ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ مطابق جون ۱۸۹۵ء میں چھپا تھا۔

مختصر انتخابِ کلام ملاحظہ ہو:

وضعِ بالیدگیِ شوق جو رہبر ہوتی
اے زکی! قطرۂ ناچیز بھی دریا ہوتا

☆

تمکینِ وضع و طرزِ تبسّم میں دیکھیے
انداز اس کی شوخیِ طبعِ سلیم کا

☆

حیف، صد حیف، زکی، زندگیِ تلخ اپنی
بے کسی کا اگر انجام یہ ہو، مر جانا!

☆

کس نے حیا سے نیچی نظر کی، کہ ہو گیا
آساں نہ دیکھنا مجھے، دشوار دیکھنا
وہ دیکھتے ہیں بزم میں یہ، دیکھتا ہے کون
بارے، ہوا مجھے بھی سزاوار دیکھنا

☆

بیداد میں لطف کیوں نہاں تھا!
کیا یہ بھی عدو کا امتحاں تھا
جب عشق مرا سُنا، تو ہنس کر
کہنے لگے: "ہم کو بھی گماں تھا"

☆

عجب کیا ہے، وہاں رحمت سے زاہد کی ہو آمرزش
عذاب اس پر، یہاں کچھ کم نہ تھا زہدِ ریائی کا

☆

تری راہ کس نے بتائی نہ پوچھ
دلِ مضطرب، راہبر ہو گیا

☆

آج کیا جانیں، کہا کیا، وہ بھی سُن کر رو دیے
ورنہ اظہارِ تمنا بیش تر کرتے ہیں ہم
بے تکلف عشق ہے غارتگرِ ایماں، مگر
حضرتِ ناصح کو کیا، یہ بھی اگر کرتے ہیں ہم

☆

بھرنے میں زخم کے وہ گُل افشانیاں کہاں
جی میں ہے دل کو چھیڑ دیں پھر نیشتر سے ہم

☆

رُسوا کنِ جہاں، نگہِ ناز ہی نہیں
پنہاں رہے، یہ عشق کا انداز ہی نہیں
دشمن کا وصل دوست سے یوں سازگار ہے
گویا وہ چرخ تفرقہ پرداز ہی نہیں

وحشت میں تھک کے بیٹھ رہے مثلِ نقشِ پا
وہ جوش ہی نہیں، وہ تگ و تاز ہی نہیں

☆

یہ شرمگیں نگہ، یہ تبسم نقاب میں
کیا بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

☆

اس تکلّف میں وہ لطفِ مےِ گلفام کہاں
میرا انکار کہاں، آپ کا ابرام کہاں

☆

وہ بھلا کیا جانیں، کیا ہوتا ہے جان و دل کا حال
اُن کی شرمِ صلح جو میں، غمزۂ بے باک میں

☆

وہی سبزہ، وہی وحشت وہی ویرانی ہے
اور کیا دشت میں ہوگا، جو مرے گھر میں نہیں

☆

کچھ ایسے تنگ ہیں، غمِ دل سے کہ جی میں ہم
کہتے ہیں، دل کو دے کے غمِ روزگار لیں
ناصح! قمارِ عشق کو ہم چھوڑ دیں گے آپ
باقی ہے ایک جان، ذرا اس کو ہار لیں

☆

روبرو جلوہ فزا ہے چمنستانِ شہود
نگہِ شوق کبھی، دید میں معذور نہیں

کردیا خوے خموشی کو، وفا میں داخل
بے وفائی میں بھی فریاد کا مقدور نہیں

☆

بدگمانی یار کے حق میں، دلِ مہجور حیف!
وہ خدا ناکردہ کیوں، اغیار کی محفل میں ہو

☆

کبھی نہ چھوڑیں گے، اس وضعِ التفات کو ہم
تمھاری طرزِ تغافل سے گو ملال بھی ہو
زکی! شباب گیا، اب کہاں، کہ خاطر میں
اُمنگ بھی ہو، عناصر میں اعتدال بھی ہو

☆

جانستاں ہے، حرفِ مطلب کا جوابِ ناتمام
ہائے اُس کا شرم سے کہنا کہ "اچھا دیکھیے"

☆

نفس نفس ہے نسیمِ وفا، محرکِ شوق
یہ وہ مزہ ہے جسے ذوقِ جاوداں کہیے
وہاں یہ فکر، کہ رازِ دل آشکار نہ ہو!
یہاں یہ شوق، کہ کچھ حسرتِ نہاں کہیے
وہ سادگی سے، تغافل کو ناز کہتے ہیں
مگر سکھاتی ہے شوخی کہ امتحاں کہیے

☆

ترا وہ ظلم، کہ ہو جائیں دوست بیگانے
میرا یہ حال، کہ دشمن بھی مہرباں ہو جائے

نہ پوچھو، مجمعِ اعدا میں کون ہے جانباز
تمھیں نہ کھینچ لو خنجر کہ امتحاں ہو جائے
تمھارا ذکر نہ ہو، روندادِ شوق نہ ہو
تو یہ ہی کیوں نہ کہو، کوئی بے زبان ہو جائے

☆

دشمن سے ارتباط ہے، اس کا جواب کیا
یہ خو سہی تمھاری کہ میری خبر نہ لی

☆

عدو کے پاس سے کہتے ہو امتحاں نہ سہی
تمھیں کو شوق نہیں ہے، تو مہرباں! نہ سہی
وہ میرا غم ہی سنیں، پوری داستاں نہ سہی
حکایتِ دلِ بے تاب درمیاں نہ سہی
اگر نہیں ستمِ دہر جاوداں، نہ سہی
جفا پسند وہ کیا کم ہیں، آسماں نہ سہی
نہیں ہے عشق کی سرگشتگی میں ساتھ ضرور
ہمیں تو خاک اڑاتی ہے کارواں نہ سہی
زکی! مقامِ سعادت سمجھ کے، بیٹھ رہو
حریمِ کعبہ نہیں ہے درِ مغاں، نہ سہی

☆

خموشی میری ہمدم ہے، کہا کس نے! سنا کس نے
ترا رازِ محبت، بدگماں! میری زباں تک ہے

☆

چاک داماں کیجیے، ٹکڑے گریباں کیجیے
کچھ تو آخر چارۂ طبعِ پریشاں کیجیے

[خم خانۂ جاوید، ۳: ۶۲۵۔ ۶۳۷، ادیب (الٰہ آباد) فروری و مارچ ۱۹۱۳ء، انتخابِ زرّیں: ۱۴۸۔ ۱۵۰، خطوطِ زبیر حسن رضوی، کراچی]

حواشی

رام صاحبۃ

☆۔ ضمناً یہی محمود حسن ثاقب تھے، جنھوں نے زکی کا غیر مطبوعہ کلام لالہ سری رام صاحب خم خانۂ جاوید کو مہیا کیا تھا۔ یہ شعر کہتے اور زکی ہی کے شاگرد تھے۔ (خم خانۂ جاوید ۲۰: ۱۷۹۔ ۱۸۰)

سالک (قربان)... میرزا قربان علی بیگ خان حیدرآبادی ثم دہلوی

یہ قوم کے اوزبک ترک تھے۔ اِن کے بزرگ عہدِ عالمگیری میں ماوراء النہر سے وارِدِ ہندوستان ہوئے اور شاہی ملازمت میں داخل ہوگئے۔ جب شاہِ عالم کے زمانے میں سلطنت کے کاروبار میں اختلال پیدا ہوا، تو اِس خاندان کے افراد بھی منتشر ہوگئے۔ سالک کے والد نواب عالم بیگ خان خلف عاشور بیگ خان غالب جنگ تھے۔ اسی زمانے میں وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی نواب نیاز حیدر بیگ کے پیچھے دلّی سے تلاشِ روزگار کے لیے نکلے اور حیدرآباد (دکن) پہنچے۔ یہاں عالم بیگ خان کی شادی قلعہ دارِ گولکنڈہ کے خاندان میں عبدالرحیم خان کی صاحب زادی سے ہوئی۔ سالک کی پیدائش یہیں حیدرآباد میں ہوئی۔ وہ چھٹے برس میں تھے، جب اُن کے والد ملازمت کے اختتام پر اپنے وطنِ مالوف دلّی واپس آئے۔

تذکرہ ''روزِ روشن'' میں سالک کا ترجمہ باب 'ق' میں ''قربان علی'' کے تحت درج ہے۔ مصنّف (مولوی محمد مظفر حسین صبا) لکھتے ہیں:

> اینک در شہرِ حیدرآباد بملازمتِ رئیس آں جا سربلندی دارد و در مرحلۂ پنجاہ و ہفتم از عمر قدم می گزارد۔ ہر چند نظر بتخلّصش جاے ترجمہ وار اجیز وے باب سینِ مہملہ می بایست، لکن حال وقالش بنامہ نگار بواسطۂ منشی سیّد جمیل احمد جمیل سہوائی وقتے رسید کہ

کتاب تا بابِ شینِ معجمہ حلۂ طبع در برکشید، ناچار دریں موقع مندرج گردید۔ (ص ۵۵۴)

یہ تذکرہ ۱۲۹۶ھ میں تالیف (تاریخ: بوستانِ فرحت افزا) اور ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوا (تاریخ: روزِ روشن جلوۂ رُوے سحر)۔ گویا ۱۲۹۷ھ میں جب سالک کے حالات مؤلف کو موصول ہوئے ہیں، سالک کی عمر ۵۷ برس کی تھی، اِس سے ثابت ہوا کہ اُن کی ولادت ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴۔ ۱۸۲۵ء) میں ہوئی، اور وہ عمر کے چھٹے برس (۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء) میں پہلی مرتبہ دلّی آئے۔

اُن کی والدہ کا انتقال اُن کے ''ایامِ طفولیت'' میں ہو گیا۔

سالک کی نشوونما اور تعلیم و تربیت دلّی میں ہوئی اور وہ مدّتوں اِسی دیار میں رہے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور تاریخی ہنگامے کے بعد انگریزی استبداد سے بچنے کی خاطر وہ بھی الور چلے گئے تھے۔

لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ الور میں بہت پریشان رہے۔ دلّی کی محفلیں اور یہاں کے احباب یاد آتے ہوں گے۔ واپس دلّی آنا چاہتے تھے، لیکن انگریزی سیاست سے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں یہاں پہنچنے پر کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے دریافتِ حال کے لیے الور سے اپنے ایک عزیز دوست اور خواجہ تاش محمد تفضّل حسین خان کوکب کو مندرجۂ ذیل منظوم خط لکھا:

کوکب دوست نواز اور ملاذِ سالک
تم سے کرنا ہے یہ اظہارِ تمنّا مجھ کو
کیا کہوں حالتِ بے تابیِ شوقِ دیدار
بیٹھے بیٹھے جو خیال آپ کا آیا مجھ کو
دلِ بے تاب نے بستر پہ لٹایا کیا کیا
دیدۂ تر نے بٹھایا لبِ دریا مجھ کو
دستِ وحشت نے مراجیب و گریباں تاکا
دشت گردی کا کیا پاؤں نے ایما مجھ کو

دن کو وہ فتنے ہیں مجھ پر کہ جو محشر میں نہ ہوں
شب وہ آفت ہے کہ ہے روز ہی اچھا مجھ کو
قافلہ قافلہ ہیں رنج و الم میرے ساتھ
اور پھر اہلِ جہاں کہتے ہیں تنہا مجھ کو
پاؤں میں غور سے دیکھا تو نہیں ہے زنجیر
اور اس پر نہیں رفتار کا یارا مجھ کو
طوق کا بوجھ بھی گردن میں نہیں ہے لیکن
سر اٹھانے میں ہے اندیشہ فلک کا مجھ کو
نہیں دیکھا تھا سو تقدیر سے یوں پیش آیا
گھر میں بیٹھے ہوئے زنداں کا تماشا مجھ کو
غرض اس سب سے ہے یہ بات کہ بلواؤ مجھے
اور جو بلوانے میں نقصان ہو پیدا مجھ کو
بھیجیے لکھ کے جو احوال ہوا ہو معلوم
کچھ تو تسکیں کا مری کیجیے ایما مجھ کو
جانتے ہو کہ میں آوارہ و بازاری ہوں
مرتبہ حضرتِ یوسف کا نہ دینا مجھ کو

دیوان میں اس قطعہ نما خط کا عنوان بڑا معنی خیز ہے، بہ عالمِ گوشہ نشینی از بیم مخبراں بہ محمد تفضّل حسین خان کوکب درالور نوشتہ شد۔ اگرچہ "گوشہ نشینی" کے الفاظ بھی غیر معمولی ہیں، لیکن دراصل سوال پیدا ہوتا ہے کہ "بیم مخبران" کی بنیاد کیا تھی؟ مقطعے سے پہلے کا شعر بھی غور طلب ہے:

بھیجیے لکھ کے جو احوال ہوا ہو معلوم
کچھ تو تسکیں کا مری کیجیے ایما مجھ کو

یہاں سالک کن ''احوال'' کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟ اور وہ کوکب سے کس اطلاع کے ذریعے تسکین کے متمنی ہیں؟

میرا گمان ہے کہ سالک ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں کسی نہ کسی عنوان انگریز مخالف سرگرمیوں میں ضرور ملوّث تھے، اور نئے حاکموں کی نظر میں ان کی حالت مشتبہ تھی۔ اسی لیے وہ داروگیر سے بچنے کی خاطر رُوپوش ہوگئے اور الور میں ''گوشہ نشینی اختیار کرلی کہ جب حالات معمول پر آگئے اور اُن کے خلاف شبہات رفع ہوگئے، وہ دلّی واپس آجائیں گے۔ اب وہ کوکب سے پوچھ رہے ہیں کہ دلّی میں '' احوال کیا ہے؟'' یعنی اُن کے خلاف کارروائی کس رُخ پر جارہی ہے، تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرسکیں۔

بہرحال آج سواسو سال بعد یہ فیصلہ کرنا محال ہے کہ صحیح حالات کیا تھے! واللہ اعلم ۱۸۵۸ء کے آخر میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی طرف سے ''غدر'' کے تمام مجرمین کی عام معافی کا اعلان ہوگیا تھا۔ غالبًا اسی کے بعد سالک بھی دلّی واپس آگئے۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ ''مانا دلّی میں رہے، کھائیں گے کیا!'' غالب نے بہت کوشش کی تھی کہ اُن بے کاری کے ایّام میں سالک (اور ان کے برادرِ خُرد رضوان) کا لوہارو میں ٹھکانا ہو جائے؟ اس سلسلے میں ان کے علائی کے نام کے خطوط ''اُردوئے معلّٰی'' میں موجود ہیں۔ لیکن علائی کے والد نواب امین الدّین احمد خان والیِ لوہارو اس پر تو تیار تھے کہ رضوان کو ملازم رکھ لیں، لیکن وہ سالک کو لینے پر آمادہ نہیں تھے۔[☆1] بہرحال کچھ نہیں کُھلتا کہ سالک نے یہ زمانہ کیوں کر بسر کیا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ سالک کو الور میں ملازمت مل گئی تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ غالب کے والد عبداللہ بیگ خان ریاستِ الور میں ملازم رہے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا تھا۔ یہ مہاراجا بختاور سنگھ کی حکمرانی کا زمانہ تھا۔ بختاور سنگھ کی وفات (۱۸۱۵ء) کے بعد ان کا بھتیجا بنے سنگھ گدّی پر بیٹھا۔ کیوں کہ

بختاور سنگھ کے اپنے کوئی اولاد نہیں تھی۔ بنے سنگھ کی وفات (اگست ۱۸۵۷ء) پر اُس کا نابالغ بیٹا شیودان سنگھ جائز وارث تسلیم کرلیا گیا، جس کی عمر اس وقت صرف ۱۲ برس کی تھی۔ بنے سنگھ مقامی آبادی کی سرکشی اور شورہ پشتی سے بہت نالاں تھا، لہٰذا اُس نے ریاست کے انتظام کے لیے دلّی سے بعض مسلمان امرا کو طلب کیا، اور اُنھوں نے الور پہنچ کر حالات ٹھیک کر دیئے۔

شیودان سنگھ کی اسی ماحول میں پرورش ہوئی تھی۔ وہ اسلامی تمدّن اور طرزِ زندگی کا بہت دل رادہ تھا، اسے اُردو فارسی سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اُس کے دربار میں اُردو کے متعدّد شعرا ملازم تھے۔ مثلاً سالک، مجروح، امراؤ مرزا انور، ظہیر دہلوی، غلام احمد تصویر، خدا بخش تنویر وغیرہ۔ قیاس ہے کہ سالک ۱۸۶۳ء میں الور پہنچے، اسی سال ایجنسی موقوف ہوئی اور شیودان سنگھ کو پورے اختیارات ملے۔ سالک کے کُلّیات میں شیودان سنگھ کی مدح میں ایک بڑا معرکے کا قصیدہ موجود ہے۔

سالک مہاراجا کے وکیل مقرر ہوئے تھے۔ دو برس بعد (۱۸۶۵ء) اُن کے چھوٹے بھائی شمشاد علی بیگ رضوان بھی الور آگئے اور یہاں ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے (یہ عہدہ سالک کے عہدے سے بڑا تھا)۔

لیکن الور کے حالات روز بروز خراب ہو رہے تھے۔ اخراجات اتنے بڑھ گئے تھے کہ ملازموں کی تنخواہ تک وقت پر ادا نہ ہوسکی۔ انگریز کو خدا ایسا سنہرا موقع دے۔ انھوں نے مداخلت کی، مہاراجا کو پندرہ ہزار ماہانہ وظیفہ دے کر ۱۸۷۳ء میں نظم و نسق ریاست سے الگ کردیا اور انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مہاراجا کے آوردہ تمام لوگ برطرف کردیے گئے، اُنھیں میں سالک اور رضوان بھی تھے۔ یہ دونوں بھائی دلّی آگئے۔

قرائن ایسے ہیں کہ سالک ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲۔۱۸۷۳ء) ہی میں دلّی سے حیدرآباد روانہ ہوگئے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا ۱۲۹۳ھ میں دلّی میں انتقال ہوا تھا۔

سالک اس زمانے میں حیدرآباد میں تھے۔ انھوں نے بھائی کے مرنے کی تاریخ کہی:

از ''عالمِ بے مدار'' بگذشت
گردید بہ ''خلد'' جاے ''رضواں''

(۱۰۵۷+۶۳۴=۱۶۹۱-۳۹۸=۱۲۹۳)

اُنھوں نے اسی موقعے پر ایک رباعی بھی کہی تھی:

دُوری کے الم چار برس تک کھینچے
امید تھی دل کو کہ کبھی مل لیں گے
رضواں کو اجل آئی تو بولا یہ فلک
اب خاطرِ نومید کو تسکین رہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رضوان کی وفات سے چار برس قبل دلّی سے حیدرآباد چلے گئے تھے۔

حیدرآباد میں ان کے عم بزرگوار رن بہادر خان موجود تھے وہ نواب بہادر تاڑ بن کے یہاں ملازم تھے اور بعد کو انھیں کی دخترِ بلند اختر سے شادی کر کے خانہ داماد ہو گئے تھے۔ سالک اُنھیں چچا کے ساتھ رہنے لگے۔

حیدرآباد میں وہ صیغۂ تعلیمات میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں نواب عماد الملک بہادر سیّد حسین بلگرامی اس محکمے کے ناظم تھے۔ ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ میں انھوں نے ایک رسالہ ''مخزن الفوائد'' جاری کیا تھا۔ سالک اس کی تربیت و تدوین میں اُن کے برابر کے شریک رہے۔ یہ رسالہ مدّتوں اردو علم و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ اس رسالے میں اُن کے متعدد نثری مضمون شائع ہوئے۔ (اگر انھیں جمع کر کے شائع کردیا جائے تو یہ بھی ادب کی خدمت ہوگی)۔

جیسا کہ ''روزِ روشن'' میں ہے، سالک کو ۱۵ سال کی عمر یعنی تقریباً ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹۔ ۱۸۴۰ء) کے لگ بھگ شعر گوئی کا شوق ہوا۔ قربان تخلص اختیار کیا اور حکیم مومن خان مومن کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ لیکن معلوم نہیں، کیوں جلد ہی

اُنھیں چھوڑ کر غالب سے مشورہ کرنے لگے اور پھر ساری عمر اُن کے حلقہ بگوش رہے۔

بعض اصحاب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ مومن کی زندگی بھر اُنھیں کے شاگرد رہے اور اُن کی وفات کے بعد غالب سے منسلک ہوئے۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

اوّل تو کسی تذکرہ نگار نے یہ نہیں لکھا کہ سالک اور مومن کا یہ تعلق موخر الذکر کی وفات تک قائم رہا۔ پھر اِس کی خود سالک کے بیان سے بھی تصدیق نہیں ہوتی۔ سالک اپنے دیوان ''ہنجارِ سالک'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> کوچہ گردِ دیارِ ہیچ مدانی، جادہ نوردِ دشتِ ہرزہ بیانی، راہرو مسالکِ تلاش و تفحص، قربان علی بیگ سالک تخلّص، عرض پرداز است کہ ''اقلِ روزگارے'' بہ استفادۂ والا خدمتِ بابرکت، سحبانِ فصاحت، حسّانِ بلاغت... جنان ساکن حکیم محمدؐ مومن خان مومن، مستفید و ''بیشتر زمانے'' بہ استفاضۂ تربیت جناب افادت مآب نظیری نظیر، ظہوری ظہور،... غیرتِ عرفی و فخرِ طالب میرزا اسد اللہ خان بہادر غالب غفراللہ ذنوبہما مستفیض بودہ بہ افاضۂ تلقین و رہنمایی آں قطبین اوجِ سخنوری و سخن پروری... چندے خودرا از زُمرۂ قافیہ پیمایان... شمردہ۔

مومن نے ۱۲ مئی ۱۸۵۲ء کو رحلت کی۔ سالک کا ۱۸۳۹۔ ۱۸۴۰ء سے لے کر بارہ تیرہ برس تک ان سے استفادہ کرنا کسی عنوان ''اقلِ روزگارے'' سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے مقابلے میں غالب کے تلمذ کا زمانہ بھی صرف ۱۷ برس بلکہ اس سے کم ہے، جو اس صورت میں کسی طرح ''بیشتر زمانہ'' کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا کیوں کہ دونوں سے زمانۂ استفاضہ میں بہت کم فرق ہے۔ یوں بھی سالک بہت آسانی سے لکھ سکتے تھے کہ میں نے مومن کی وفات کے بعد غالب سے رجوع کیا۔ اسی لیے میرا قیاس ہے کہ مومن کے تلمذ کا زمانہ طویل نہیں تھا۔

سالک نے ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹۔۱۸۸۰ء) میں حیدرآباد میں وفات پائی۔ ان کے خواجہ تاش غلام حسنین قدر بلگرامی نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا:

اے قدر! خواجہ تاشِ ما نوّاب قربانِ علی
سالک تخلّص دہلوی، معجز نگار افسوس مُرد
مصراعِ تاریخِ وصال اندر رجز آمدنال
"نوّابِ قربانِ علی سالک ہزار افسوس مرد"
(۱۲۹۷)

خم خانۂ جاوید (۴:۳۹) کا یہ کہنا کہ "آخر ۱۸۷۹ء میں... اِس جہانِ فانی سے رحلت کی" درست نہیں ہو سکتا۔ ۱۲۹۷ھ میں یکم محرم ۱۵ دسمبر ۱۸۷۹ء کو تھی، گویا اِس سال صرف ۱۷ دن ۱۸۷۹ء میں پڑے۔ سالک کا دیوان اُن دنوں چھپ رہا تھا جیسا کہ اس کے ساتھ شامل قطعاتِ تاریخ سے ثابت ہے، یہ سب ان سترہ دنوں سے متعلق نہیں ہو سکتے۔ اُن کے دیوان کے سات آٹھ قطعات سے بھی تاریخ (۱۲۹۷) برآمد ہوتی ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا سالِ وفات ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) ہے۔ حیدرآباد میں مدفن نصیب ہوا، لیکن کہاں، اِس کا سراغ نہیں ملتا۔

اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ اُردو میں دو دیوان تھے "ہنجارِ سالک" اور "مے خانۂ سالک"۔ دوسرا میری نظر سے نہیں گزرا۔ "ہنجارِ سالک" اُن کی زندگی میں مطبع بدر الدّجیٰ، دلّی میں چھپا تھا (نومبر ۱۸۷۱ء)۔ اس کے شروع میں سالک کے فارسی دیباچے کے علاوہ مولانا حالی کی فارسی تقریظ بھی ہے۔

اُنھوں نے رائے دولت رام حیدرآباد کی فرمایش پر ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں اپنا جملہ کلام "کُلّیاتِ سالک" کے عنوان سے جمع کیا تھا۔ یہ راجا گنیش پرشاد بہادر شاد کی مالی اعانت سے اکمل المطابع، دلّی میں زیرِ طباعت تھا کہ اِسی دوران میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اب مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور نے "کُلّیاتِ سالک" مطبع عالیہ، لاہور سے چھپوا کر نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا ہے۔ اسے کلب علی خان فائق نے مرتّب کیا ہے۔

شروع میں ۵۸ صفحات کا مبسوط اور مفید مقدّمہ ہے اور پوری کتاب قیمتی حواشی سے مزیّن ہے۔ فارسی کلام افسوس کہ ضائع ہو گیا (کم از کم اب تک منظرِ عام پر نہیں آیا) جو چند شعر تذکرۂ ''روزِ روشن'' میں شامل ہیں، ان کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔

نہایت قادر الکلام اور نغز گو شاعر تھے۔ طبیعت بہت مضمون آفرین پائی تھی۔ اس پر استاد دونوں ایسے ملے، جو اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر تھے۔ مومن اگر حُسن و عشق کی واردات کے بیان میں اپنا جواب نہیں رکھتے، تو غالب کلام کی گہرائی اور معمولی بات کو بھی ایک خاص انوٹ سے کہنے میں مشہور ہیں۔ سالک کے کلام میں دونوں کے رنگ کی کامیاب مثالیں ملتی ہیں۔

سالک کو یہ مزید فخر حاصل ہے کہ غالب کی وفات کے بعد ان کے بیش تر مبتدی اور کم مشق شاگردوں نے اُن سے اصلاح لی۔

سالک شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ یہ بھی اس ''جلسۂ شطرنج'' دلّی کے رکن تھے۔ دنواب علاء الدّین احمد خان نے ۱۸۶۶ء میں قائم کیا تھا۔

ایک روایت کے مطابق اُن کی شادی حیدرآباد کے خاندان تاڑبن میں ہوئی تھی۔ دو بیٹے اور چار بیٹیاں (امراؤ بیگم، انوری بیگم، اکبری بیگم، رقیہ بیگم) اپنی یادگار چھوڑیں۔ دونوں بیٹے شاعر تھے۔ بڑے محمّد مرزا خان[☆۲] کا تخلّص عابد تھا۔ وہ مدتوں حیدرآباد میں ''دفتر ہوم سکریٹری میں محافظِ دفتر'' رہے۔ وہاں سے پنشن پانے کے بعد دلّی چلے آئے تھے۔ ''مے خانۂ سالک'' اُنھیں نے مرتب کیا تھا۔

دوسرے بیٹے حیدر مرزا تھے۔ یہ پہلے حیدر تخلّص کرتے رہے، بعد کو اسے ترک کر کے قلندر کرلیا۔ نوجوانی میں حجاز چلے گئے تھے۔ وہیں غالباً مدینہ منوّرہ میں انتقال ہوا۔

سب سے چھوٹی بیٹی رقیہ بیگم کی شادی اورنگ آباد (ریاست حیدرآباد دکن) کے ایک وکیل سیّد احمد حسن مودودی سے ہوئی، جن کی پہلی بیگم (امتہ الحبیب) تین کم سن بچے (ایک بیٹی اور دو بیٹے) چھوڑ کر فوت ہوگئی تھیں۔ خدا نے انھیں متعدد بچے

ارزانی فرمائے، ان میں سے دو بیٹوں ابو الخیر مودودی اور ابوالاعلیٰ مودودی☆[۳] نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ سب سے بڑی بیٹی امراؤ بیگم کی نواسی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی اہلیہ ہوئیں۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

تم غیر کے ہوئے، تو رہا کیا جہان میں
گویا ہمارے واسطے، کچھ بھی بنا نہ تھا

☆

میرا ہو آشیانہ، اور آدھا جلا ہوا
بجھ بھی گئی تھی آگ، تو بجلی کو کیا ہوا

☆

کہلاتے ہو کیوں وعدہ فراموش، جہاں میں
آجاؤ کہ میں آپ میں اکثر نہیں ہوتا

☆

نہیں اِک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں
پہلے سو بار، ترا نام لیا کرتا تھا

☆

سالک! صنم کدے سے نکالے گئے کہیں!
حضرت ارادہ رکھتے ہو، کیوں خانقاہ کا!

☆

سالک! جو کوئی عشق میں، مجھ کو بُرا کہے
تکتا ہوں منھ کو اور یہ کہتا ہوں: ''ہاں درست''

کیوں چلا آتا ہے، ہر بات پہ رونا، سالک!
آج اُس کوچے سے آتا ہے، مگر تو ہو کر

☆

کس کو دل دیتے ہو، کیا کرتے ہو، دیکھو سالک!
ہائے نادان بنے جاتے ہو، دانا ہو کر

☆

اب تک بھی میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہوئے
سالک کا حال رات کو ایسا سُنا کہ بس

☆

تم بھی وہی کہو، تو کہیں سب بجا، درست
میں بھی وہی کہوں، تو کہے اک جہاں، غلط

☆

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج، آسماں سے ہم
تم آگئے تو ہوش کہاں، میزباں ہو کون
آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم
چپ چپ پڑے ہوئے تھے، ابھی خانقاہ میں
کچھ کچھ کھلے ہیں، بیعتِ پیرِ مغاں سے ہم

☆

مایوس و نا امید ہیں، کیا مدّعا سے ہم
کہتے ہیں، اور کہتے ہیں کس التجا سے ہم
کاش! اے سپہر! تجھ سے ہی رکھتے تو سہل تھیں
وہ خواہشیں کہ رکھتے ہیں اس بے وفا سے ہم

☆

کہنے کا غیر کے، تو کسی کو یقیں نہیں
پر تیری آنکھ، راز کی تیرے، امیں نہیں

☆

کب دیکھیے قفس سے رہائی نصیب ہو
کیا آمدِ بہار کی، ہم آرزو کریں

☆

پھرتے ہیں دادخواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں

☆

خدا کرے کہ سمجھ جائیں یہ کنایہ وہ
ابھی تو چرخِ بریں کا گلہ کیے جاؤں

☆

نقاب چہرے سے اُلٹو [بھی اب] کہ میں کب تک
شکایتِ نگہِ نارسا کیے جاؤں

☆

وہ دشمن دوست ہو یا آسماں ہو
اجل بن کر ہی کوئی مہرباں ہو

☆

شکر کیجیے کہ نہیں تابِ تکلم مجھ کو
ورنہ اس طرح بھی، جو چاہو، کہو تم مجھ کو
غصہ قاتل کا بڑھایا ہے یہ طعنہ دے کر
زندہ گویا کہ نہیں چھوڑنے کے تم مجھ کو

☆

رگ رگ میں نیشِ عشق ہے، اے چارہ گر مرے
یہ درد وہ نہیں، کہ کہیں ہو کہیں نہ ہو

☆

گرچہ ہے آمدِ جاناں کی خبر بازاری
ہے مگر سالکِ مضطر کے سنا دینے کی

☆

زباں کٹ جائے، گر لب سے تمھارا کچھ گلہ نکلے
مگر یہ تو کہوں گا، تم کو کیا سمجھا تھا، کیا نکلے

☆

اُس کے آنسو ٹپک پڑے، سالک!
حال اِس درد سے کہا تو نے

☆

جو پاس ہیں میرے، وہ خدا جانے کہاں ہیں
تم دُور ہو، پر بیٹھے ہو گویا مرے آگے

☆

ہم سے بھی، مل کر گیا، روتا ہوا سالک ابھی
کیا ارادہ ہے، خدا جانے، کدھر جانے کو ہے

☆

جان ہی دے کے عشق میں ہوئی خیر
آگیا کچھ لیا دیا آگے

فارسی کا رنگ یہ ہے:

افروختم ز آتشِ دل شمعِ آہ را
درسینہ سوختم، نفسِ صبح گاہ را

☆

زاہد! زاہلِ میکدہ پرہیز واجب است
ازما کنارہ گیر کہ آلودہ ایم ما

☆

ازماپرس، بہرِ خدا، داستانِ ما
دریاب ازیں کہ تاب ندارد زبانِ ما

☆

تانظر کردم برویت، ازنگاہم خوں چکید
تاسخن گفتم زخویت، ازلبم تبخالہ ریخت

☆

جہاں زتیغِ جفاے تو سربسر خون ست
بہرکجا کہ نہم پاے، تا کمر خون ست

☆

پنہاں زہمہ، او نظرے جانبِ ماداشت
رفیتم گر از جاے، تخندید کہ جاداشت

☆

سوے عاشق، نگہِ مہر فزا، نتواں کرد
می کنی ہرچہ بہ اغیار، بمانتواں کرد

☆

گرزندہ ام بہ ہجرِ تو، اے بے وفا! مرنج
مُردن بہ اختیارِ منِ سخت جاں نبود

☆

در بہ بندم بشبِ وصل و چناں رقص کنم
راہ نایافتہ مردم سرِ دیوار آیند

☆

جادہ پیمایاں کہ عزمِ کعبۂ دل کردہ اند
رفتہ اند از خویش و ہم درخویش منزل کردہ اند

☆

شبِ وصال بہ غفلت گزشت، سالک حیف
مثالِ عمر کہ در عالمِ شباب رود

☆

ناز بر روشنیِ نیرِ اقبال مکن
تادمِ صبح بود انجمن آرائیِ شمع

☆

نشیند آتشِ دلہا دمی کز جوش بنشینم
بر اُفتد رسمِ نالیدن، اگر خاموش بنشینم

☆

درگفتگوے عشق، لبِ راز بستہ ایم
ازدل گرہ کشودہ، بر آوازبستہ ایم

☆

روزِ وصلِ غیر و من اندر دعا
تاشود اِمروزِ اُو، فرد اے من

☆

اے بے خبر زرنجِ فراق و نشاطِ وصل
دیر آمدی بسوے من و زود می روی

[روزِ روشن: ۵۵۴، ۵۵۵، خم خانۂ جاوید، ۴: ۳۷۔ ۴۹، محبوب الزمن، ا: ۵۱۰۔ ۵۱۲، تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم: ۷۹۔

۸۰۔ کُلّیاتِ سالک مرتبہ کلب علی خاں فائق (دیباچہ)، ایک شخص ایک کارواں: ۱۹۔ ۴۵، مکتوبِ مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم بنام مؤلّف]

حواشی

☆۱۔ ممکن ہے اس میں بھی ''غدر'' کے ایّام میں سالک کی ''کارگزاریوں'' کا کچھ دخل ہو۔

☆۲۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عرف یا گھر کا نام ''اکبر'' تھا۔ سالک نے اپنے چھوٹے بھائی رضوان کا جو مرثیہ کہا ہے، اس میں ایک شعر ہے:

آتے نہیں ہیں اکبر و حیدر بھی یاد کیا
دنیا سے رنگرا ہوئے کیوں، تم نے کیا کیا!

☆۳۔ سیّد ابو اعلیٰ مودودی ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام خاندان کے مورثِ اعلیٰ خواجہ ابو الاعلیٰ مودودی چشتی کے نام پر رکھا گیا تھا، جو سکندر لودھی کے عہد (۱۴۸۹۔ ۱۵۱۷ء) میں چشت (خراسان) سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔

ابتدائی نجی تعلیم کے بعد مدرسۂ فوقانیہ، اورنگ آباد سے ۱۹۱۴ء میں دسویں کی سند لی۔ لیکن والد سیّد احمد حسن کی بعارضۂ فالج علالت اور بعد کو اسی سے ۱۹۲۰ء میں، وفات کے باعث اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔

انھوں نے ابتدا صحافت سے کی، مختلف اوقات میں، کبھی بڑے بھائی ابو الخیر مودودی کے ساتھ اور کبھی اکیلے، ہفتہ وار ''مدینہ'' (بجنور)، ہفتہ وار اور روزنامہ ''تاج'' (جبل پور)، ہفتہ وار ''مسلم'' (دلّی) اور روزنامہ ''الجمعیۃ'' (دلّی) کے مدیر رہے۔ پھر انھوں نے مولوی ابو مصلح حیدرآباد سے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' خرید لیا اور اس کے ذریعے سے اپنے مخصوص دینی اور سیاسی افکار کی تبلیغ کرنے لگے۔

پٹھان کوٹ (ضلع گور داس پور۔ پنجاب) کے ایک صاحب چودھری نیاز علی نے محکمۂ انہار کی ملازمت سے پنشن پانے کے بعد منصوبہ بنایا کہ ایک اسلامی مرکز قائم کیا جائے، جہاں علما اسلام اور اسلامی علوم سے متعلق تحقیق کریں، تاکہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دینی اور اخلاقی انحطاط کا مداوا کیا جاسکے۔ اس کام کے لیے انھوں نے اپنی ۶۰۔ ۷۰ ایکڑ اراضی وقف کردی اور علامہ اقبال (ف: ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) کے مشورے سے مولانا مودودی کو اس ادارے کی ذمہ داری قبول کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۸ء میں مولانا مودودی اس مرکز میں پہنچ گئے۔ اس بستی کا نام پہلے جمال پور تھا، اب یہ دارالاسلام کے نام سے موسوم ہوئی۔ مولانا مودودی یہاں زیادہ دن نہ رہ سکے، چودھری نیاز علی سے انھیں کچھ سیاسی نظریات اور طریقۂ کار کے بارے میں اختلاف پیدا ہوگئے۔ اس پر وہ لاہور منتقل ہوگئے، جہاں انھوں نے ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو اسلامیہ پارک (چوبرجی) میں جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی، وہی خود اس کے صدر منتخب ہوئے۔

اب چودھری نیاز علی لاہور آئے اور اصرار کر کے جون ۱۹۴۲ء میں انھیں دارالاسلام واپس لے گئے۔ ملک کی آزادی اور تقسیمِ ملک تک وہ یہیں رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ذیلدار پارک، (اچھرہ) لاہور میں اپنا مرکز

قائم کرلیا اور تصنیف و تالیف کے کام کے ساتھ جماعتِ اسلامی کے استحکام اور ترقی میں معروف ہوگئے۔ اُن کی صحت خراب رہنے لگی تھی خصوصاً گھٹنے میں درد کے باعث وہ بیٹھنے سے معذور ہو گئے تھے۔ معدے میں بھی مستقل شکایت رہتی تھی۔ ان کے دوسرے بیٹے ڈاکٹر احمد فاروق امریکا کے شہر بفیلو میں مطب کرتے ہیں، مئی ۱۹۷۹ء میں، وہ باصرار انھیں علاج کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں عملِ جراحی ہوا اور بظاہر وہ مُرد بصحت تھے کہ یک لخت حالت بگڑ گئی اور وہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو وہیں بفیلو میں جاں بحق ہوگئے۔ لاش پاکستان آئی اور انھیں ۲۵ ستمبر کو ان کے مسکن (ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور) میں سپردِ خاک کردیا گیا۔ شروع میں شاعری بھی کی، طالب تخلص تھا۔ چند غزلیں ملتی ہیں [ایک شخص ایک کارواں (از مجیب الرحمٰن شامی): ۱۹۔۴۵]

سالم ... میر احمد حسین

اٹھائے کوئی نہ فتنہ نیا قیامت میں
ٹٹولتا ہوں دلِ مبتلا کو تربت میں

(از خط منشی مہیش پرشاد مرحوم بنام مؤلف)

سجّاد... سیّد معین الدّین حیدر عرف سجّاد میرزا دہلوی

بہت نامی گرامی خاندان کے نام لیوا تھے۔ اودھ کے شاہی خاندان اور اُن کے اجداد ایک ہی تھے۔ پدری سلسلہ برہان الملک سعادت خان، میر محمدؐ امین نیشاپوری، نواب وزیر اودھ کے واسطے سے حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے اور مادری بخشی الملک نواب مرزا نجف خان بہادر سے۔ یہ خاندان دلّی، لکھنؤ اور فیض آباد میں مقیم رہا۔ سب سے اوّل سجّاد مرزا کے دادا نواب مبارز الدولہ، ممتاز الملک حسام الدّین حیدر خان بہادر حسام جنگ لکھنؤ سے دہلی آئے۔ یہ بیٹے تھے نواب سراج الدّولہ غیاث محمدؐ خان نیشاپوری کے جو فارسی میں شعر کہتے تھے اور قیامت تخلّص کرتے تھے (ف: ۱۲۲۸ھ۔ در زمیں پنہاں شدی اے آفتاب) نواب حسام الدّین حیدر خان بہادر خود بھی شاعر تھے، نامی تخلّص تھا۔ اُنھوں نے میر مستحسن خلیق (والدِ میر انیس) اور میر تقی میر دونوں سے مشورۂ سخن کیا۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے غالب کی شاعری کے آغاز میں اُن کا کلام لکھنؤ میں اپنے استاد میر کو دکھایا تھا، جس پر انھوں نے وہ مشہور فقرہ کہا کہ ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا تو بے نظیر شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔'' اُن کے بیٹے ناظر حسین مرزا نے اُن کا اُردو کلام جمع کر کے شائع کیا تھا اس دیوان پر غالب نے ایک دیباچہ فارسی زبان میں لکھا تھا جو اُن کے کُلّیاتِ نثر میں بھی موجود ہے۔ نامی نے ۲۲ شوال ۱۲۶۲ھ (۱۳ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو

بعارضۂ فالج وفات پائی۔ مدفن علی گنج (دہلی) میں درگاہِ قدم مبارک کے بیرونی چبوترے پر تھا۔ اُردو کے مشہور شاعر نواب سیّد محمدؔ خان رند لکھنوی حضرت نامی کے علاتی بھائی تھے۔

نامی کی تین اولادیں تھیں: مظفر الدوّلہ ناصر الملک مرزا سیف الدّین حیدر خان بہادر سیف جنگ، یہ ۱۸۵۷ء میں انگریز کی گولی کا شکار ہوئے۔ اُن سے چھوٹی ایک لڑکی تھی، قدسیہ بیگم (عرف حسینی صاحبہ) یوسف مرزا جن کے نام غالب کے خط ہیں، اُنھیں کے بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹے ذوالفقار الدّین حیدر (عرف ناظر حسین مرزا) تھے۔ ناظر حسین مرزا اپنے بھائی سے ۱۴ سال اور بہن سے چار سال چھوٹے تھے۔ یہی سجّاد کے والد تھے۔ ناظر حسین مرزا کی ۲۷ برس کی عمر میں جہان آرا بیگم بنت نواب حیدر خان بہادر سے شادی ہوئی، جو لال قلعہ میں ملازم تھے۔ ناظر حسین مرزا اپنے خسر ہی کی جگہ تعینات ہوئے تھے، وہ بعد کو ترقی کر کے خواصی ہوگئے، حال آنکہ یہ عہدہ شاہزادوں کے لیے مخصوص تھا۔ اُن کی چھ اولادیں ہوئیں: تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ بڑے بیٹے یہی سیّد معین الدّین حیدر سجّاد میرزا تھے۔ ان سے چھوٹے سیّد زین العابدین حیدر عرف اکبر میرزا تھے، یہ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۸/۱۸۴۹ء) میں پیدا ہوئے اور ۲۶ مارچ ۱۹۱۸ء کو فوت ہوگئے۔ ان سے چھوٹے سیّد غیاث الدّین حیدر تھے۔ یہ ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے، ان کا سالِ وفات ۱۲۹۲ھ ہے۔ بڑی بیٹی کبریٰ بیگم ۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ شاعرہ بھی تھیں، ذکی اور مخفی دو تخلّص تھے۔ ان کا نکاح سیّد محمدؔ میر سے ہوا تھا۔ چھوٹی کا نام صغریٰ بیگم تھا، ان کا میر تفضّل حسین وکیل شاہی کے پوتے (اور میر نواب کے صاحب زادے) سیّد افضل حسین سے نکاح ہوا، انھیں کی بیٹی ذکیہ بیگم مولانا محمد حسین آزاد کے بیٹے آغا محمدؔ ابراہیم سے منسوب تھیں (آغا محمدؔ باقر، آغا محمدؔ طاہر (ف: دلّی، ۱۹۵۷ء)، آغا محمدؔ اشرف (ف: لندن، ۱۹۶۱ء)، تینوں نبیرگانِ آزاد اِنھیں آغا محمدؔ ابراہیم کے بیٹے تھے)۔ تیسری بیٹی رقیہ بیگم تھیں۔ اُن کی اولاد ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸۔ ۱۸۵۹ء) میں ہوئی۔ تاریخِ وفات ۳۰ جنوری ۱۹۲۴ء ہے۔

سجّاد کی ولادت (۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء) کے بعد حسبِ دستور ناظر حسین میرزا بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ نومولود کے لیے نام عطا فرمایا جائے۔ بہادر شاہ ظفر نے دریافت کیا کہ آپ نے خود کیا نام تجویز کیا ہے، تاکہ اگر وہی مناسب ہو، تو اسے قائم رکھا جائے۔ حسین میرزا نے عرض کیا کہ خادم کے ذہن میں تفاولاً زین العابدین حیدر عرف سیّد سجّاد میرزا نام آیا تھا، لیکن جو رائے عالی ہو، وہی نام رکھا جائے گا۔ اس پر بہادر شاہ نے فرمایا: اس لڑکے کا نام معین الدین حیدر عرف سجاد میرزا رکھو، خداوندِ کریم تم کو اور لڑکا دے گا، اس کا نام زین العابدین حیدر رکھنا۔ حسین میرزا نے عرض کیا: بسروچشم۔

سجّاد ابھی پانچ چھ مہینے کے ہوں گے کہ ان کی نانی (بیگم نواب حیدر خان) نے جن کے اپنی اولادِ نرینہ نہیں تھی، انھیں گود لے لیا۔ چنانچہ ان کی پرورش نانی اماں کی نگرانی میں ہوئی۔ سنِ شعور کو پہنچے تو حسین میرزا نے خود اُن کی اُردو، فارسی، عربی کی تعلیم کا انتظام کیا۔ عربی شرح ملاّ تک پڑھی۔ فارسی نثر کے مسودے غالب کی خدمت میں بھی پیش کرتے رہے۔ غرض تعلیم کا سلسلہ ۱۵۔ ۱۶ برس کی عمر تک جاری رہا۔ اس کے بعد کچھ انگریزی پڑھنے کا بھی موقع ملا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ناظر حسین میرزا اور اُن کے خاندان پر جو افتاد پڑی، اس کی تفصیل غالب کے خطوط (مشمولۂ اُردوئے معلیٰ) میں ملتی ہے۔ حسین مرزا کو دلّی چھوڑ کر اپنی جان کی خاطر ہرزہ گردی پر مجبور ہونا پڑا۔ اُنھوں نے لکھنؤ، رام پور، بھرت پور، گوالیار، بیکانیر، الور... غرض کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی، جموں تک کا سفر کیا۔ ان دنوں بیکانیر میں نواب ولایت حسین خان وزیرِ ریاست تھے۔ اُن کی بدولت چندے تحصیل داری کی اسامی پر تعینات ہوگئے۔ یہاں شاید دو برس سے کچھ اوپر رہے تھے۔ لیکن یہاں سے بھی دانہ پانی اٹھا، تو پھر دلّی آ گئے۔ حیدرآباد جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ فالج میں مبتلا ہوگئے اور زیادہ نقل و حرکت سے معذور ہوگئے۔ جان تو بچ گئی، لیکن کہیں جانے آنے کے لائق نہ رہے۔ قابلِ ذکر بات یہ

ہے کہ اُس زمانے میں نواب ضیاء الدین نیر رخشاں نے حسین میرزا کی بہت مدد کی۔ اُن کی وفات تک ماہانہ اُن کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔

الور کے سفر کے دوران میں حسین مرزا کی میر بندہ علی عرف میرزا امیر سے ملاقات ہوئی۔ میر بندہ علی وہاں کے عمائد میں سے تھے اور حسین میرزا کی خاندانی عظمت اور دنیوی مرتبت سے خوب واقف تھے۔ اُنھوں نے مناسب آؤ بھگت کی اور حتی الوسع راج کی طرف سے کچھ عارضی انتظام بھی کروا دیا۔ اُسی زمانے میں معین الدّین حیدر سجّاد میرزا کا نکاح میر بندہ علی کی صاحب زادی گوہر سلطان بیگم سے اور خود حسین میرزا کی بڑی بیٹی کبریٰ بیگم کا ان کے بیٹے سیّد محمد میر سے ہوا۔ اس وقت سجّاد میرزا کی عمر بمشکل ۱۴۔ ۱۵برس کی ہوگی۔

الور سے دلّی واپس آنے کے بعد سجّاد میرزا کا یہاں مشن ہائی اسکول میں داخلہ ہوگیا۔ صرف انگریزی کی کسر تھی، باقی سب مضامین تو وہ گھر پر پڑھ ہی چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد جلد ترقی کے مراحل طے کرتے چلے گئے اور تین سال بعد میٹرک کا امتحان درجۂ اول میں پاس کرلیا۔ اس زمانے میں پنجاب یونی ورسٹی کا ایک امتحان ''جنرل ایگزیمی نیشن'' کے نام سے ہوا کرتا تھا۔ سجّاد میرزا اس میں بھی شامل ہوئے اور پنجاب بھر میں اوّل رہے۔

میٹرک کے بعد اُنھوں نے سان اسٹیفنس کالج میں داخلہ لے لیا، حالاں کہ اس وقت تک یہ دو بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے۔ لیکن مزید تعلیم اُن کے مقدّر میں نہیں تھی۔ مشن اسکول کے پرنسپل پادری ر۔ ر۔ ونٹر صاحب تھے۔ تعلیم کے زمانے میں سجّاد اپنے انگریزی کے مضامین اور مسودے خاص طور پر بنظرِ اصلاح اُن کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ اُس کے بعد ان کے امتحان کے نتائج بھی بہت تسلی بخش رہے۔ انھیں باتوں سے ونٹر صاحب ان سے بہت خوش اور اُن کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ سجّاد ابھی کالج میں داخل ہوئے ہی تھے کہ مشن اسکول میں مشرقی زبانوں (اردو، فارسی) کے مدرّس کی جگہ خالی ہوئی۔ اُنھوں نے اس کی سجّاد کو پیش کش کی۔ یہاں مشاہرہ

۳۰/۴۰ روپے تھا اور کالج میں صرف ۱۲ روپے ماہانہ وظیفہ ملتا۔ اُن کے گھر کے حالات جیسے کچھ تھے، اُن سے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ تعلیم جاری رکھنے کی خواہش کے باوجود وہ یہ ملازمت قبول کر لینے کی طرف مائل تھے۔ دشواری یہ تھی کہ کالج کے پرنسپل صاحب سے اجازت کیوں کر حاصل کی جائے، جو اُن پر بے حد مہربان تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا تو کہا کہ میں تمھارے لیے وظیفہ بارہ کی جگہ پندرہ روپے ماہانہ کردوں گا۔ تم پڑھنے لکھنے میں بہت اچھے ہو، اپنی تعلیم جاری رکھو، پڑھائی کے بعد ترقی کا بہت میدان ہے۔ سجّاد نے پوری رُوداد ونٹر صاحب کے گوش گزار کردی۔ ونٹر ان کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے پرنسپل سے خود بات کی، جس پر اُنھوں نے اجازت دے دی اور سجّاد کالج سے اپنا نام کٹا کر مشن اسکول میں ملازم ہوگئے۔

ونٹر لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں کا بھی ایک اسکول چلاتے تھے۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس زنانہ مدرسے کے ہیڈ ماسٹر ہدایت اللہ صاحب کو حیدرآباد میں ملازمت مل گئی۔ جانے سے پہلے انھوں نے ونٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ میرے بعد سجّاد میرزا صاحب کو اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کردیں، اُن سے بہتر آدمی اس جگہ کے لیے آپ کو نہیں ملنے کا۔ مسٹر ونٹر اُن کی عالی خاندانی اور ذاتی کارکردگی کا مدّاح تو تھا ہی، اس نے ماسٹر ہدایت اللہ کا مشورہ بے عذر قبول کرلیا اور سجّاد کو ہیڈ ماسٹر بنا دیا۔ اس عہدے کی تنخواہ ۷۰ روپے ماہانہ تھی۔

ونٹر صاحب کی بیوی دلّی کے زنانہ اسکول کی پرنسپل تھیں۔ سجّاد کی اُن سے بھی واقفیت پیدا ہوئی۔ جس گھر کے وہ نام لیوا تھے، وہ کسی سے مخفی نہیں تھا۔ اس پر ونٹر اور ان کی بیوی کی سرپرستی مستزاد۔ بہت جلد سجّاد مرزا مقامی انگریزی حلقوں میں متعارف ہوگئے اور سب اُن سے مہربانی اور لطف کا سلوک کرنے لگے۔ دلّی کے چیف کمشنر کرنیل ڈیوس خاص طور پر شریف دوست اور امیرانہ مزاج کے آدمی تھے، اُنھوں نے سجّاد میرزا کا نام نائب تحصیل داری کے لیے منظور کرا دیا۔ لیکن اگر قسمت میں ''تہی دستی'' لکھی ہو، تو ''رہبرِ کامل'' کی کوشش کیوں کر کامیاب ہو سکتی ہے! جب

حکومت کی طرف سے نائب تحصیل داری کے لیے بلاوا آیا ہے، تو ان کی بیوی بسترِ مرگ پر موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا پڑی تھیں، اُنھوں نے اپنی مجبوری لکھ کر معذرت کر دی۔

اس وقت تک ان کے پانچ بچے ہو چکے تھے۔ ایک بچہ عالمِ طفلی میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا، چار بفضلہٖ زندہ تھے اور سب کم سن۔ اسی زمانے میں ان کی بیوی گوہر سلطان بیگم عارضۂ تپ دق میں مبتلا ہوگئیں اور عین عالمِ شباب میں صبح ۹ شعبان ۱۲۹۲ھ (۱۰ دسمبر ۱۸۷۵ء) کو جنّت سدھاریں۔ قدم شریف (دلّی) میں مدفن نصیب ہوا۔

ناظر حسین میرزا نے بہو کی تاریخِ وفات کہی:

سردار دلھن، سیدۂ نیک سرشت
درعینِ شباب مُرد زار و ناشاد
تاریخِ وفاتِ وے چو ازما جستند
گفتیم کہ: "خلد خواب گاہِ وے باد"
(۱۲۹۲)

اب دیکھیے تقدیر کا کرشمہ!

سیّد سجّاد میرزا اپنی والدہ کی گود میں ابھی دودھ پیتے بچے تھے کہ اُن کی خالہ یعنی (نواب حیدر خان کی چھوٹی صاحب زادی) امید سے ہوئیں۔ دونوں بہنوں کے دل میں خیال ہوا کہ اگر ان کے لڑکی پیدا ہو، تو اس کی سجّاد میرزا سے نسبت کردی جائے، تاکہ رشتہ جاری رہے بلکہ اور استوار ہو جائے۔ اس زمانے میں (بلکہ اب بھی کہیں کہیں) بہنوں اور پکّی سہیلیوں میں اس طرح سے رشتے کر دیے جاتے تھے۔ خدا کی شان، لڑکی پیدا ہوئی۔ جب دونوں بچے ذرا بڑے ہوئے، تو ناظر حسین میرزا نے اپنی بیوی (جہاں آرا بیگم) کے ایما پر پیغام دیا۔ اس پر ان کے ہم زلف سیّد سردار میرزا نے نہ حسین میرزا کی بزرگی کا خیال کیا، نہ اُن کے مرتبے کا، اور بڑی تمکنت

سے جواب دیا: ''میرے جدی خاندان میں کوئی لڑکا دستیاب نہ ہوا، تو میں سجّاد میرزا سے نسبت کردوں گا''۔ اس جواب سے ناظر حسین میرزا کو رنج تو ضرور ہوا ہوگا، لیکن اُس کے بعد انھوں نے سردار میرزا سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

خدا کی شان! سجّاد میرزا کا گوہر سلطان بیگم سے نکاح ہوا اور وہ چار چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر جاں بحق ہوگئیں۔ اُدھر سردار میرزا کا انتقال ہو چکا تھا، وہ اپنے خاندان کے کسی موزوں پیغام کی حسرت دل ہی میں لیے رخصت ہوگئے، اور سجّاد میرزا کی خالہ کی بیٹی ہنوز بن بیاہی بیٹھی تھیں۔ گوہر سلطان بیگم کے انتقال کے بعد خالہ نے سلسلہ جنبانی کی۔ سیّد سجّاد میرزا کو نکاح کی خواہش تو نہ تھی، لیکن وہ اپنے کم سن بچوں کی طرف سے بہت متفکر تھے۔ سیّد حسین میرزا کے اصرار پر وہ نکاحِ ثانی پر رضامند ہوگئے۔ لیکن بیوگی کا داغ بھی اس بے چاری کی قسمت میں لکھا تھا۔

اس دوران میں سیّد سجّاد میرزا زنانہ اسکول کی ملازمت چھوڑ چکے تھے۔ ونٹر صاحب کو اپنے ہاں خرچ کی تخفیف منظور تھی، اُنھوں نے سجّاد میرزا سے کہا کہ جلدی کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کوئی اور مناسب ملازمت مل سکے، تو وہاں جا سکتے ہو۔ حسنِ اتفاق سے اُسی زمانے میں دلّی عربک اسکول میں سیکنڈ ماسٹر کی اسامی خالی ہوگئی اور اس پر سیّد سجّاد میرزا کا تقرر ہوگیا۔ جس وقت اُن کی یہ دوسری شادی ہوئی ہے، وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔ شادی کے کوئی تین مہینے بعد عربک اسکول میں تقسیمِ انعامات کا جلسہ تھا۔ کمشنر صاحب بہادر کو صدارت کے لیے آنا تھا۔ اسکول کی طرف سے یہ فرض سجّاد میرزا کے ذمّے ہوا کہ یہ جائیں اور کمشنر بہادر کو ان کی کوٹھی (بیرونِ کشمیری دروازہ) سے ساتھ لوا لے آئیں۔ یہ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی کوٹھی پر حاضر ہوئے۔ صاحب بہادر بگھی پر سوار تھے اور سجاد گھوڑے پر اُن کے ساتھ ساتھ۔ بدقسمتی سے پاؤں رکاب سے نکل گیا۔ سواری جانتے نہیں تھے، تو ازن بگڑ گیا اور یہ دھڑام سے سر کے بل زمین پر آرہے۔ دماغ پر سخت چوٹ آئی۔ علاج معالجے میں کمی نہیں ہوئی۔ لیکن بے سود! وقت آن لگا تھا، جاں بر نہ ہو سکے، اگلے ہی دن راہیِ ملکِ بقا ہوگئے۔ درگاہِ

شاہ مرداں (علی گنج) میں مجلس خانے کے دالان کے باہر دفن کیے گئے تھے۔ میرزا عبدالغنی ارشد گورگانی نے تاریخ کہی: بیٹھ کر ''رنج وغم'' سے کھینچوں ''آہ'' [رنج وغم'' کے اعداد (۱۲۹۹) سے ''آہ'' کے (۶) کا تخرجہ ہے جس سے (۱۲۹۳) برآمد ہوتے ہیں]

دوسری تاریخ میر شاہجہان کامل نے کہی:

ہے ہے زپشتِ اسپ افتادہ (۱۲۹۳)

ناظر حسین میرزا کے دوست آغا علی حسن ندیم لکھنوی کے قطعۂ تاریخ میں حادثے کی پوری تفصیل ہے:

دادو بیداداست از جوروجفاے چرخ پیر
نوجواناں را بغلطاند بخوں ایں کینہ خواہ
لائق و فائق، سعید و ہم مطیع والدش
نورِ چشمِ اقربا، بہرِ پدر نورِ نگاہ
صاحبِ فہم و فراست، مالکِ علم و کتاب
پاک طینت، نیک سیرت، خوبصورت ہمچو ماہ
حیف، آں سجاد مرزا بست و پنجم از رجب
یومِ اثنین اوفتاد از اسپ در اثنائے راہ
چوں فرس بگریخت پائش در رکاب آویختہ
بر زمیں برخوردہ، سر بشکست و شد قالب تباہ
آہ از ضربِ دماغ از حلق و ہم بینی و گوش
ہفت شش سیر خون آمد بیروں تا صبحگاہ (کذا)
ڈاکٹر ہا و طبیباں روز و شب کردند سعی
برنمی گردد اجل، چوں آید از امرِ الاہ
یازدہ ساعت، سہ شنبہ، الغرض کرد انتقال
شد بچشمِ والدِ ماجد ہمہ عالم سیاہ

بہرِ تاریخِ وفاتش زد رقم کلکِ ندیم
"نوجوانے مرد آہ، از راہوار افتادہ، آہ"
(۱۲۹۳)

گویا ۲۵ رجب ۱۲۹۳ھ کو حادثہ پیش آیا اور اگلے دن سہ شنبہ ۲۶ رجب دن کے گیارہ بجے انتقال ہوگیا (۱۵ اگست ۱۸۷۶ء)

نواب ضیا الدین نیر رخشاں نے ۲۰ شعر کا قطعہ لکھا، جو نوحہ بھی ہے اور تاریخ بھی:

رفتی بہ جوانی، اے دریغا سجّاد!
از گرم روانی، اے دریغا سجّاد!
رہِ خلد بسر تاختی، افتادی از اسپ
بس تیز عنانی، اے دریغا سجّاد!
تو گوہرِ نایابی، کہ از چشمِ پدر
چوں اشک روانی، اے دریغا سجّاد!
وے گرم سخن کہ بود، باما کامروز
گویا تو نہ آنی، اے دریغا سجّاد!
درکنجِ مزار غافل از دردِ پدر
آسودہ چسانی، اے دریغا سجّاد!
کوآں نمطِ کلامِ لطف آمیزت
در عرضِ معانی، اے دریغا سجّاد!
دلجوئیِ کو دکانِ غم دیدہ کجا
بانرم زبانی، اے دریغا سجّاد!
فارغ دلی ازما و مگر، رنجِ پدر
دانم کہ ندانی، اے دریغا سجّاد!

دارد شب و روز چشم و دل در یادت
خونابہ فشانی، اے دریغا سجّاد!
از بالشِ خشت برنمی داری سر
درخوابِ گرانی، اے دریغا سجّاد!
از پیشروی تو شرمساری زپدر
خاموش از آنی، اے دریغا سجّاد!
از گریۂ خونیں ہمہ تن مردم را
درخون بنشانی، اے دریغا سجّاد!
از اشک بکامِ خشک فریاد کناں
شورابہ چکانی، اے دریغا سجّاد!
چوں گنجِ مروّت و محبّت بودی
درخاک نہانی، اے دریغا سجّاد!
کوآں روشِ بیانِ درد انگیزت
درمرثیہ خوانی، اے دریغا سجّاد!
کو پرسشِ جمعِ دوستانِ ہمسال
باشستہ زبانی، اے دریغا سجّاد!
یک حرف زدن بطفلگاں نتوانی
با آں ہمہ دانی، اے دریغا سجّاد!
ماغمزدگاں بہ رنجِ ہجرِ تو و تو
شاداں بجنانی، اے دریغا سجّاد!
باماسخنے نزنی و سوئے عدم
تیزاسپ برانی، اے دریغا سجّاد!

تیر سنۂ فوت ہم بطرزِ نوحہ
باید کہ بخوانی: "اے دریغا سجّاد!"
(۱۲۹۳)

یہی مادۂ تاریخ ان کے کتبے میں لکھا گیا تھا[☆1] اگرچہ اس میں ایک زائد ہے۔

نواب ناظر حسین میرزا بڑے باحوصلہ اور مستقل مزاج بزرگ تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اور اُس کے بعد اُن پر جو بیتی، اور برسوں اُنھیں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے میں جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اُن حالات میں دل و دماغ کو ماؤف ہونے سے محفوظ رکھنا کچھ اُنھیں کا کام تھا۔ لیکن اس میں بھی شبہہ نہیں کہ خاندان کی تباہی نے اُنھیں پکا پھوڑا بنا دیا تھا۔ وہ اپنی قوتِ برداشت کی آخری حد تک پہنچ چکے تھے۔ یکے بعد دیگرے عزیزوں کی اموات نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ بڑے بھائی نواب مظفر الدولہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے۔ ابھی وہ ان صدمات سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ سب سے چھوٹے بیٹے سیّد غیاث الدّین حیدر عرف اصغر میرزا عین شباب کے عالم میں بعمر ۲۰ برس ۱۲۹۲ھ میں داغِ مفارقت دے گئے۔ اس نے بالکل حواس باختہ کردیا، اور واقعی اُن کے دماغ میں اختلال کے آثار پیدا ہوگئے۔ اس پر بمشکل سال بھر گزرا تھا کہ ۱۲۹۳ھ میں یہ سجّاد میرزا کا حادثہ پیش آیا، جس نے اُنھیں گویا زندہ درگور کر دیا۔ یکشنبہ ۶ رمضان ۱۳۰۶ھ (۶ مئی ۱۸۸۹ء) ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علی گنج ہی میں مجلس خانے کی چار دیواری کے اندر پہلے دالان میں قبر تھی، اور لوح پر یہ تاریخ کندہ تھی۔

حسین میرزا مُرد درشش رمضان
ازاں کہ بود زنسلِ امیر خیبرگیر
پے شمارۂ سالِ وفات رضواں گفت
"بیا بکاخِ جناں اے امیر ابنِ امیر!"
(۱۳۰۶)

سیّد سجّاد میرزا کی جسمانی یادگار چار بچے تھے: تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ ان کے نام حسبِ ترتیب یوں تھے: سیّد محمد میرزا، سیّد حیدر مرزا، سیّد صاحب میرزا، لڑکی کا نام سجّادی بیگم تھا، جو اپنے تینوں بھائیوں سے بڑی تھیں۔ سجّادی بیگم کے تین بچے ہوئے: سب سے بڑی لڑکی کنیز فاطمہ اور ان سے چھوٹے دو لڑکے: سیّد محمدؐ حیدر اور سیّد محمدؐ سلطان۔ کنیز فاطمہ کا نکاح سیّد حیدر میرزا حیدر دہلوی سے ہوا تھا۔

ان کے بیٹے سیّد مصطفےٰ میرزا شریر دہلوی آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔[☆۲]

افسوس کہ سجّاد میرزا کا بیش تر کلام ضائع ہو گیا۔ تقسیمِ ملک کے وقت جب خاندان پاکستان گیا ہے، تو دوسرے قلمی مسودات کے ساتھ ان کا دیوان بھی ایک صندوق میں مقفّل بحفاظت یہاں چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن سالہا سال تک کسی نے صندوق نہ کھولا، جس سے کاغذات کو دیمک چاٹ گئی۔ جو کلام بچ گیا، شریر دہلوی کے بیاں کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے: ایک قصیدہ حضرت صاحب العصر علیہ السلام کی شان میں (۲۰ اشعار)، ۱۴ غزلیات، ایک مثنوی (۱۳۷ شعر) چار سلام اور نوحہ۔ ان کی ایک نثری تصنیف ''مجالسِ مولود'' کے عنوان سے بھی محفوظ رہ گئی ہے۔ اس میں ائمۂ اطہار میں سے (۱) امیر المومنین حضرت علیؑ (۲) بنتِ رسول، حضرت فاطمۃ الزہراؑ (۳) حضرت امام حسنؑ (۴) حضرت امام حسینؑ (۵) حضرت امام محمدؐ باقرؑ (۶) حضرت امام محمدؐ تقیؑ (۷) حضرت امام حسن عسکریؑ اور (۸) صاحب العصر کے سوانح حیات ہیں۔ ۶۹۵ صفحات کے اس مسودے کے ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف نے اسے دوم شعبان ۱۲۸۰ھ کو ختم کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔

سجّاد میرزا کو شاعری گویا ورثے میں ملی تھی۔ ان کے دادا نواب حسام الدّین حیدر شعر کہتے اور نامی تخلّص کرتے تھے۔ والد سیّد ناظر حسین میرزا نے باقاعدہ شاعری نہیں کی، لیکن اس کوچے سے بالکل نابلد بھی نہیں رہے۔ چند شعر اُن سے یادگار ہیں۔ اُنھوں نے طالب علمی کے زمانے میں فارسی غالب سے پڑھی تھی۔ غالب کا اردو کلام اُنھیں کے ہاں جمع ہو رہا تھا، جو ۱۸۵۷ء کے فساد میں برباد ہو گیا۔

سجاد میرزا نے بہت کم عمری میں شعر گوئی شروع کردی تھی۔ مشورہ شروع میں غالب سے رہا۔ ایک سلام کا مطلع ہے:

حلقۂ زنجیر آہن اور پا سجاد کا
کیوں نہ دستِ نحس یا رب! شل ہوا حداد کا

اس کے مقطعے میں کہتے ہیں:

کیوں نہ ہو باغِ سخن سجاد کا رشکِ بہار
خوشہ چیں ہے غالبِ مرحوم سے استاد کا

غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) کے بعد کلام پر قربان علی بیگ سالک سے اصلاح لی۔ اُن کے چھوٹے بھائی سیّد اکبر میرزا بھی شاعر تھے، اکبر تخلص تھا۔ پہلے مجروح و سالک سے اصلاح لی، بعد کو حالی سے مشورہ کرتے رہے۔

سجاد کے جملہ بقیۃ السیف کلام میں سے غزلوں کا انتخاب درج ذیل ہے:

آئنہ خانے میں ہے محو خود آرائی کا
واہ، کیا خوب ہے، دعویٰ اُسے یکتائی کا
غیر کا کوچہ ہے اور گرد ہے لڑکوں کا ہجوم
ہے محبت میں یہ ساماں ترے سودائی[٭۳] کا
آپ کے پندو نصائح ہیں بجا سب، واعظ!
عقل اس وقت میں، اک نام ہے بن آئی کا
انگلیاں شہر میں اٹھتی ہیں جدھر جاتا ہوں
اور ابھی دُور ہے عالم مری رُسوائی کا
کچھ بھی غیرت ہے تو در سے ترے پھر جائے گا غیر
دیکھ کر نقش مری ناصیہ فرسائی کا
اب تصوّر میں بھی مجھ کو نظر آتے نہیں تم
ماجرا پوچھتے کیا ہو، شب تنہائی کا

غیر کو ڈھونڈنے اُس در پہ چلے جاتے ہیں
ہم نے اک رنگ تو ڈالا ہے شناسائی کا

یہ جو دیوانہ سا پھرتا ہے، وہی ہے سجّاد
شہر میں شور تھا جس شخص کی دانائی کا

☆

ممکن ہی جب نہیں کہ نظر آئے روئے دوست
اچھا کیا، جو ہم نے نہ کی جستجوئے دوست

سو بار ہم تو راہ میں مل لیں، پہ کیا کریں
اتنا خیال ہے کہ رہے آبروئے دوست

وہ دن خدا دکھائے، کہ دل کو قرار ہو
وہ مجھ کو ڈھونڈیں غیر کو ہو جستجوئے دوست

یہ تھی غیر ہے کہ نہیں مجھ کو رشکِ غیر
یوں محوِ دوست ہوں کہ نہیں آرزوئے دوست

باتوں میں اس نے مجھ کو ملایا رقیب سے
حیران ہوں، یہ سحر ہے، یا گفتگوئے دوست

آبِ بقا پلایا سکندر کو آپ نے
اے خضر! مجھ کو کیوں نہ بتاؤ گے کوئے دوست

ناصح! جو پھر کہو گے تو میں چھوڑ دوں گا عشق
ہاں، ایک بار تم کو دکھا لاؤں رُوئے دوست

سجّاد کے مزار سے حسرت ٹپکتی ہے
اللہ، کس قدر تھی اُسے آرزوئے دوست

☆

جس میں کچھ شکل و شمائل مری ملتے دیکھی
اس کو دھوکے سے مرے قتل کیا میرے بعد

☆

میرے سیاہ حال کی تقریر ہے وہ زلف
روزِ سیاہ نالۂ شب گیر ہے وہ زلف

☆

خدا کی قدرت کا ہے تماشا، نہ کہیے اس کو دیارِ دہلی
خدا کی رحمت کا ہے احاطہ، نہ کہیے اس کو حصارِ دہلی
سُنیں جو دہلی کے گل رخوں سے، جناں میں حوریں بہارِ دہلی
تو بے تامّل زباں سے نکلے، نثارِ دہلی، نثارِ دہلی
وہ مست و دل کش یہ سرزمیں ہے کہ اس کا ثانی کہیں نہیں ہے
فرشتے بے ہوش ہوں فلک پر جو جائے اُڑ کر غبارِ دہلی
جو پہلی دہلی کو دیکھتے تم، تو کہتے: خلدِ بریں یہی ہے
اِرم سے کم تو نہیں ہے اب بھی، خزاں ہے گرچہ بہارِ دہلی
ذرا سے ویران باغیچے پر تمھیں ہے کیا کیا غرور، واعظ!
ہمیں بھی اس کی کھلے حقیقت جو اس کو کیجے دوچارِ دہلی
سفر میں غربت کے دل تمھارا، کہو تو سجّاد! پہلے کیوں کر
نہ سیر کرنے کو سیرِ دہلی، نہ بات کرنے کو یارِ دہلی

☆

ہیں تیغ بکف اور ارادہ ہے ادھر کا
کیوں کر نہ کروں شکر محبت کے اثر کا
کہتے ہیں جسے مہر، یہ کیا چیز ہے یارب!
کیا عکس پڑا ہے یہ مرے داغِ جگر کا

ڈھونڈ آئے عدم تک بھی کئی بار ولیکن
ہم کو تو نہ مضمون ملا اس کی کمر کا

گل پھولے گا گر ہے یہی خونابہ فشانی
کچھ رنگ تو پلٹا ہے مرے دیدۂ تر کا

یہ زلفِ سیہ، یہ رُخِ روشن، قدِموزوں
ان سب کے سوا دیکھنا انداز نظر کا

زاہد کو تو راضی کیا مے خواری پہ ہم نے
رستہ بھی بتا دے کوئی خمار کے گھر کا

اک جنبشِ لب میں ابھی ہو جاؤں گا زندہ
کشتہ ہوں فقط آپ کے اک تیرِ نظر کا

سجّاد! نہ لو نام محبت کا کسی کی
گر دل میں خیال آپ کے ہے نفع وضرر کا

☆

خزاں میں یاد آتا ہے سماں فصلِ بہاری کا
وہ کوکو قمریوں کی، شور مرغِ شاخساری کا

شبِ مہتاب ہو، اور باغ ہو اور یار پہلو میں
مرے دل سے مزا پوچھے کوئی پھر بادہ خواری کا

ترے عاشق کی پہروں اب تو آنکھیں بند رہتی ہیں
وہ اتنا شغل بھی جاتا رہا اختر شماری کا

وہ ملکِ جم کو مشتِ خاک سے کم تر سمجھتا ہے
اٹھایا جس نے تھوڑا سا مزہ بھی خاکساری کا

ترے بہکانے سے میں بادہ خواری چھوڑدوں ناصح!
معاذ اللہ! تقاضا کب ہے میری وضع داری کا

کہیں ایسا نہ ہو بہ جاؤ تم بھی جوشِ طوفاں میں
تماشا دیکھنا اچھا نہیں ہے اشکباری کا
تصور میں بنایا باغ اور اُس کی خوشی، واعظ!
جزاک اللہ، میں قائل ہوں تیری ہوشیاری کا
نگاہِ مست سے اس نے جو دیکھا صحنِ گلشن میں
گماں لوگوں کو گزرا آمدِ فصلِ بہاری کا
یقیں ہے انتظامِ دین و دنیا سلب ہو جائے
یہی عالم رہا کچھ دن جو دل کی بے قراری کا

☆

معتقد ہو کس طرح وہ سبحہ و زنار کا
جس کو ہووے عشق تیرے مصحفِ رخسار کا
جذبۂ شوقِ شہادت جسم میں پاتا ہوں میں
نام میں لیتا ہوں قاتل، جب تری تلوار کا
پھول جھڑتے ہیں زباں سے گفتگو میں آپ کی
معجزہ ہے، سحر ہے، یا ڈھنگ ہے گفتار کا
رنگ فق ہے، آنکھ میں آنسو ہیں دل میں درد ہے
کیا سناؤں حال یارو، عشق کے آزار کا
پھر وہی کنجِ قفس اور خانۂ صیاد ہے
دیکھ لے بلبل تماشا، چار دن گلزار کا
میں نے حالِ دل کہا اُن سے تو ہنس کر بولے وہ
"آپ کو کس روز سے عہدہ ہوا اخبار کا"
پاؤں کے کانٹوں کا تو سجاد کو شکوہ نہیں
ہاں مگر آفت ہے یارو دل میں چبھنا خار کا

☆

گھر میں مرے رہا جو وہ دل بر تمام رات
کیا کیا جلے رقیبِ بداختر تمام رات

وہ چاندنی میں سوئے تو ہم رشک سے جلے
دیکھا کیا انھیں مہِ انور تمام رات

یارب! اگر وہ غیر کے مہماں نہ تھے، تو کیوں
اک جوشِ غم رہا مرے دل پر تمام رات

مدّت کے بعد وصل کی ٹھیری ہے ساقیا!
ہو دورِ جام آج برابر تمام رات

اس وصل کو بھی ہجر میں شامل کریں گے ہم
باتوں میں کھوئی تو نے ستم گر تمام رات

وعدے کی شب بناؤ میں ان کی گزر گئی
شانہ تھا اور زلفِ معنبر تمام رات

سویا جو میں تصوّرِ مژگاں میں رات کو
دیکھا ہے میں نے خواب میں خنجر تمام رات

سجّاد، وہ جو کعبہ نہ جائے، خدا کی شان
بیٹھا رہے صنم، تیرے در پر تمام رات

☆

اُٹھا دو شرم تمھیں اپنی ہی حیا کی قسم
تمھیں ہے ناز بہت جس پہ اُس ادا کی قسم

بس ایک ہاتھ لگا اور، تجھ پہ میں قرباں
ستم شعار تجھے اپنی ہی جفا کی قسم

اگر ہے ایسی ہی وحشت تو اب کوئی دن میں
چلیں گے نجد کو، مجنوں کے نقشِ پا کی قسم

جو تم نہ کہتے تو ہم عشق چھوڑ ہی دیتے
پر اب نہ چھوڑیں گے ناصح! ہمیں خدا کی قسم

کہا جو میں نے کہ صاحب حجاب اب چھوڑو
کہا ''نہ چھوڑیں گے ہرگز، ہمیں حیا کی قسم''

ترے فراق میں جینا محال ہے ہم کو
دلِ حزیں کی قسم، جانِ مبتلا کی قسم

ہماری کوئی دُعا تو قبول ہو، یارب!
جو بے اثر رہی اب تک اسی دُعا کی قسم

مری وفا کا وہ عالم کہ عشق بازی میں
جہاں میں کھاتے ہیں عاشق مری وفا کی قسم

یہ سِن اور اُس پہ یہ تقویٰ، تمھیں سے ہو سجّاد!
ولی تم اپنے زمانے کے ہو، خدا کی قسم

☆

راضی ہوں کہ وہ مجھے ستائیں
پر بے خبری سے باز آئیں

گردش سے ذرا جو چین پائیں
پھر چرخ کو ہم مزا چکھائیں

صاحب، جو خفا نہ ہو تو دم بھر
ہم قصۂ دل تمھیں سُنائیں

واعظ! تری حُور میں بھی ہیں کیا
یہ ناز، یہ عشوہ، یہ ادائیں

جتنی مانگوں شراب کم ہے
یہ سبزہ، یہ باغ، یہ گھٹائیں

کیا کیا شبِ وصل میں مزے تھے
بے باکی اِدھر، اُدھر حیائیں
حسرت ہے کہ جیتے جی پھر اک بار
لے لوں تری زلف کی بلائیں
اس سوز و تپش کی تاب کس کو
ہم داغِ جگر کسے دکھائیں
سجاد! ترا ہی حوصلہ ہے
کس سے یہ غم اُٹھائے جائیں

☆

مجھے موقع ملا جانے کا اچھا بزمِ جاناں میں
مری قسمت سے جھگڑا ہو رہا تھا غیر و درباں میں
عجب بے تابیِ دل ہے اُنھیں رہبر بناتا ہوں
اگر اغیار مل جاتے ہیں مجھ کو راہِ جاناں میں
انا الحق کہنے سے منصور کو کیوں دار پر کھینچا
وہ قطرہ بحر سے کب کم ہے، جو مل جائے عماں میں
بتاؤ تم کہ اک صورت کو لے کر کیا کریں، واعظ!
تمھاری حُور میں کب ہیں یہ باتیں جو ہیں انساں میں
یہ کس کی یاد ہے دل کو کہ اک عالم کو بھولا ہوں
ہوا ہے مجھ کو لطفِ وصل حاصل کس کے ہجراں میں
ارادہ ہے ذرا دشتِ عدم کو دیکھیے چل کر
بہت تنگی سے گھبرایا ہے دل کوہ و بیاباں میں
وہی سجاد، جو کل مسجدِ جامع میں واعظ تھا
اسے دیکھا ہے ہم نے آج بیٹھا بزمِ رنداں میں

☆

کپڑے ہیں گو سپید، مگر کس پھبن کے ساتھ
سو رنگ کا بناؤ ہے اس سادہ پن کے ساتھ

عاشق ہوں میری راہ جُداگانہ چاہیے
کیوں شیخ کے شریک ہوں، کیوں برہمن کے ساتھ

جب ہو قفس نصیب تو کیوں کر نہ چُپ رہوں
وہ چہچہے چمن کے گئے سب چمن کے ساتھ

ہرگز گئی نہ وحشتِ دل بعدِ مرگ بھی
دستِ جنوں کو چھیڑ ہے جیبِ کفن کے ساتھ

کچھ کچھ شباہتِ قدِ جاناں جو اس میں ہے
اک انس ہو گیا مجھے سروِ چمن کے ساتھ

سجّاد کو بہشت میں، دہلی کی یاد ہے
اللہ کس قدر ہے محبت وطن کے ساتھ

☆

جو اُس بُت کی سیدھی نظر ہوگئی
تو پھر عمر اچھی بسر ہوگئی

جلایا ہے جس نے فلک بارہا
وہی آہ، اب بے اثر ہوگئی

مرے دل کی حسرت تو نکلی نہیں
الٰہی، ابھی کیوں سحر ہوگئی

کیا ایک عالم کو مقتولِ ناز
جدھر تیری ترچھی نظر ہوگئی

ہوئی جب سے غیروں سے اُلفت تمھیں
مرے دل کی کچھ تو خبر ہوگئی

ارادہ ہے جائیں گے دشت و جبل
جو وحشت کی دھن راہبر ہوگئی

تصوّر میں میرے جو گزرا وصال
تو شب کس قدر مختصر ہوگئی

نہ ہوگا فلک اور نہ ہوگی زمیں
جو میری ذرا چشم تر ہوگئی

شہادت مبارک دلِ دردمند!
وہاں تیغ زیبِ کمر ہوگئی

بس اب اٹھو سجّاد! سوئے بہت
جوانی کی شب کی سحر ہوگئی

☆

جب غیر سے وہ گرمیِ صحبت نہیں رہی
پھر شکوہ کیا کہ مجھ سے محبّت نہیں رہی

اب کیوں نہ ہو رقیب سے رنجش، مرے لیے
وہ سِن نہیں رہا، وہ نزاکت نہیں رہی

گم گشتہ اس قدر ہوں تصور میں یار کے
دیدار کی بھی اب مجھے حسرت نہیں رہی

جوشِ جنوں میں گھر مرا ویراں ہوا تو ہو
صد شکر قیس سے تو خجالت نہیں رہی

کس دن خیالِ قامتِ دل کش نہیں رہا
کس وقت مجھ کو فکرِ قیامت نہیں رہی

کب جوش میں جنوں کے گریباں کیا نہ چاک
کب خضرِ راہ، دشت میں وحشت نہیں رہی

رنجش تو غیر سے ہے، نہ ہو مجھ سے گو ملاپ
اب آہِ نارسا کی شکایت نہیں رہی
کب مجھ کو پوچھا، ہائے، فراموش کار نے
جب مجھ میں عرضِ حال کی طاقت نہیں رہی
سجاد! کس کے عشق کی اب آرزو کریں
وہ دل نہیں رہا، وہ طبیعت نہیں رہی

☆

شیخ کے ساتھ عبادت ہی سہی
زر نہیں پاس تو طاعت ہی سہی
تجھ کو مسجد ہو مبارک، زاہد!
ہم کو مے خانے سے الفت ہی سہی
ہم نہ چھوڑیں گے طریقِ الفت
آپ کو ہم سے عداوت ہی سہی
لے چلے کچھ تو گلی سے تیری
تیرے دیدار کی حسرت ہی سہی
مجھ کو بازار میں تم قتل کرو
مجھ سے گم نام کی شہرت ہی سہی
قتل پر اپنے رضامند ہوں میں
تیرے صدقے میں شہادت ہی سہی
آج سرکار سے کچھ تو مل جائے
عرضِ احوال کی جرأت ہی سہی
نوکری گر نہیں قسمت میں ابھی
پاس رہنے کی اجازت ہی سہی

عشق، اور خواہشِ عزت سجاد!
سب نے، اس کام میں ذلت ہی سہی

☆

غزل (ناتمام)

بھروسا تیری الفت پر ہمیں کیا کیا ہوا ظالم
سبب یہ تھا کہ میں سمجھا تھا تجھ کو باوفا ظالم
فقط صورت کے دیکھے سے نہ دیتا دل کبھی ہرگز
محبت کی نگاہوں نے مگر مفتوں کیا ظالم
وہ ہر دم مے پلانا اور پہلو میں بٹھا لینا
وہ بوسے مجھ کو دینا اور وہ ناز و ادا ظالم
مجھے افسردہ گر پانا تو رونا اشکِ خونیں سے
وہ میرا روٹھ جانا اور تیری التجا ظالم
عجب حیراں ہوں غیروں نے ترے کیا کان میں پھونکا
کہ مجھ سے ہو گیا دم بھر میں تو نا آشنا ظالم
حماقت کی بہت میں نے کہ تجھ کو باوفا سمجھا
تجھے تو جاننا تھا بانیِ جور و جفا ظالم
مرا دل لے کے کی مجھ سے دغا، اچھا کیا تو نے
مگر لِلّٰہ اوروں سے نہ کیجیو اب دغا ظالم

[خاندانی حالات (قلمی) : خم خانۂ جاوید، ۴: ۸۲۔۸۴، ایضاً ۴: ۳۱۰۔ ۳۱۱، خطوطِ غالب (۲) ۸۶۔ ۹۰، واقعات دارالحکومتِ دہلی، ۳ : ۶۷۔۷۲، خطوطِ سیّد مصطفےٰ میرزا شریر دہلوی]

حواشی

☆۱۔ اب شاہِ مرداں میں نہ کوئی قبر ملتی ہے، نہ کتبہ۔ سب کچھ تقسیمِ ملک کے ہنگامے اور اس کے بعد کے فسادات میں نذرِ تاراج ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆۲۔ یہاں سجاد میرزا کے حالات میں ان کے خاندان کی بیش تر تفاصیل اور تاریخیں جناب سیّد مصطفیٰ میرزا شریر دہلوی ہی کی مہیا کردہ معلومات پر مبنی ہیں، جو انھوں نے مسودہ خاندانی حالات مرتبہ سیّد اکبر میرزا سے اخذ کی ہیں۔

☆۳۔ شیدائی

سخن... خواجہ میر فخر الدّین حسین خان دہلوی

اِن کے والد خواجہ جلال الدّین حسین عرف حضرت صاحب بیٹے تھے، ابو القاسم نظام الدّین احمد رضوی المعروف بہ خواجہ فقیر چشتی مودودی کے، جن کا سلسلۂ نصب حضرت شاہ خواجہ حسین مودودی کھاری چشتی سے ملتا ہے۔

سخن بدھ ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۵۵ھ (۱۰ جولائی ۱۸۳۹ء) دلّی میں پیدا ہوئے اور سنِ شعور تک یہیں مقیم رہے۔ اُن کی والدہ کا اُن کی کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی نانی امّاں کا قلعۂ معلیٰ سے کچھ تعلق تھا، چنانچہ والدہ کے انتقال کے بعد یہ اُنھیں کے پاس رہے۔ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) میں نانی فو... گئیں۔ اسی دوران میں اُن کے والد نے لکھنؤ میں دوسرا نکاح کرلیا تھا، جس سے خاندان کے بیش تر افراد بھی لکھنؤ منتقل ہوگئے تھے۔ شاہی میں یہ لوگ وہاں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ نانی امّاں کی وفات کے بعد سخن بھی نقلِ مکان کر کے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں اپنے چچا خواجہ محمدّ بشیر کے ساتھ رہنے لگے، جو عہدِ واجد شاہی میں ممالکِ محروسہ کی فوج داری کے مہتمم تھے۔ یہ عہدہ واجد علی شاہ کی جلاوطنی (۱۸۵۶ء) تک اُن کے پاس رہا، اس کے بعد وہ اس سے برطرف ہوگئے۔ اب سخن کے حقیقی پھوپھا مرزا محمدّ ابراہیم خلف الصدّق مرزا محمدّ صدّیق صاحب بہادر صدر امین سارن (ضلع شاہ آباد۔ بہار) اُنھیں اپنے وطن آرہ لے آئے، اور یہاں اپنی بڑی بیٹی تحفہ بیگم ان کے حبالۂ عقد میں دے دی (۲۷ رمضان ۱۲۷۳ھ/ ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء)۔

سخن نے ۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء کو وکالت درجۂ اوّل کی سند حاصل کرلی۔ اس کے

بعد وہ مدّتوں آرہ میں وکالت کرتے رہے۔ لیکن اِس میں اُنھیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس پر وہ حکام کی سفارش سے سرکاری ملازمت میں شامل ہوگئے۔ ۱۸۷۰ء میں وہ منصف درجۂ سوم مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۸ء ہزاری باغ میں منصف درجۂ اوّل رہے۔ یہیں ۱۸۸۸ء میں ان کی بیوی تحفہ بیگم کی وفات ہوئی۔ ہزاری باغ کے قیام کے دوران میں اُنھوں نے انگریزی سیکھ لی تھی۔ بالآخر ۱۸۹۲ء میں صدرِ اعلیٰ (سب جج) مقرر ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں اُنھیں منصف درجۂ اوّل کے اختیارات حاصل ہوگئے۔ قاعدے کے مطابق اُنھیں جولائی ۱۸۹۶ء میں ملازمت سے سبک دوش ہونا چاہیے تھا، لیکن ڈسٹرکٹ جج مسٹر پام وُڈ کی سفارش پر اُنھیں ایک سال کی توسیع دے دی گئی اور بالآخر یکم اگست ۱۸۹۷ء کو ملازمت سے الگ ہوئے۔ اس کے بعد اُن کا مستقل قیام پٹنہ میں رہا۔

شروع میں ان کی زندگی بڑی آزادانہ اور لا ابالیا نہ رہی۔ آرہ کے قیام کے زمانے میں باقر علی باقر (شاگردِ غالب) سے ملاقات ہوئی، اُن کے زیرِ اثر زندگی کا رُخ بدل گیا، اور اُنھوں نے حضرت شاہ قیام اصدق چشتی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

بچپن میں اُردو فارسی غالب سے پڑھی تھی۔ بعد کو جب شاعری کا شوق پیدا ہوا تو انھیں سے اصلاح بھی لینے لگے۔ غالبًا اُن کی غالب سے کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ یہ انھیں اپنا ''جدِ فاسد'' یعنی نانا لکھتے ہیں، لیکن صحیح رشتہ متعین نہیں ہوسکا۔ وہ غالب کے صفِ اوّل کے شاگردوں میں سے تھے۔ اگرچہ سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی نے اُنھیں بھی اپنا شاگرد لکھا ہے، لیکن یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے مشہورِ زمانہ ''فسانۂ عجائب'' میں دلّی کی زبان پر تعریض کی تھی۔ سخن نے ''سروشِ سخن'' کے تاریخی نام سے ایک افسانہ اس کے جواب میں لکھا اور حُبّ الوطنی کا حق ادا کردیا۔ یہ کتاب ۱۲۸۱ھ میں مطبع نول کشور میں چھپی (گلِ گلستانِ بے خزاں : ۱۲۸۱ھ)

اسی طرح جب قاطع برہان کے قضیے میں مختلف اطراف[1] سے غالب پر نظم و

نثر میں بوچھار ہوئی، تو یہ بھی اپنے استاد کی طرف سے سینہ سپر ہو کر میدان میں نکل آئے۔ ہنگامۂ دل آشوب میں ان کے تین قطعے شامل ہیں۔ ۱۹۰۰ء (۱۳۱۸ھ) میں کلکتے میں انتقال کیا مولوی محمّد وزیر، مالکِ مطبع گوہر آصفی کلکتہ نے تاریخ کہی :

سالِ رحلت، آں وزیرِ دل حزیں
گفت : ''دردا، آہ فخر الدّیں حسین''
(۱۳۱۸)

دوسری تاریخ شہرت عظیم آبادی نے لکھی :

سالِ وفات اون کا لکھ دو اے شہرت!
شاعر و عاقل و شفیقِ دلی''
(۱۳۱۸)

اُن کا مدفن پٹنے میں موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کلکتہ سے یہاں لائی گئی تھی۔ سخن نے فسانۂ سروشِ سخن کے علاوہ ایک اور نثری کتاب ''تہذیب النفوس'' بھی اپنے صاحب زادے خواجہ سیّد محمّد محی الدّین حسین کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی تھی۔ اس کے تین حصے چھپے (نول کشور : ۱۸۷۲ء : ۱۸۷۴ء اور ۱۸۹۸ء) یہ مدّتوں مدارس کے نصاب میں شامل رہی۔ اُردو دیوان ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا۔ اس کے شروع میں غالب کی لکھی ہوئی ایک نثری تقریظ بھی شامل ہے۔ فارسی کلام غالباً غیر مطبوعہ رہ گیا۔ پہلی بیوی تحفہ بیگم کے انتقال کے بعد اُنھوں نے ۱۸۹۰ء میں دوسری شادی کر لی تھی، یہ بیگم نجف علی صاحب وکیل کی بیٹی تھیں۔ دونوں بیگمات سے یہ اولاد ہوئی : پہلی بیوی سے دو بیٹے، خواجہ محمّد محی الدّین حسین (ولادت :۱۸۶۴ء) اور خواجہ محمّد سراج الدّین حسین☆ (ولادت : ۱۸۷۵، وفات: ۱۹۲۴ء) اور تین بیٹیاں : بڑی بیٹی مرزا محمّد سعید آروی کے عقدِ نکاح میں آئی تھیں، محمودہ بیگم (ف : ۱۹۳۲ء) شاہ محمّد محمّدی کے نکاح میں تھیں۔ اور سردار بیگم (ف: ۱۹۰۵ء) یہ محمّد رضا کی بیوی تھیں۔ دوسری بیگم سے چار بیٹے ہوئے (معین الدّین،

رضی الدّین، حمید الدّین، حفیظ الدّین اور دو بیٹیاں) عمدہ بیگم جن کا نکاح محمدؐ یعقوب مونگیری سے ہوا تھا، ایک بیٹی کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ بڑے قادر الکلام اور صاحبِ فن شاعر تھے۔ زبان اور محاورے کے مالک تھے۔ معاملہ خوب لکھتے تھے۔ اُن کا دیوان سادگی اور رنگینی کا اچھا خوش نما مرقع ہے۔ اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے :

جلوہ فرما ہے تو ہر رنگ میں، اے جانِ جہاں!
تو نے جس جامے کو پہنا، ہوا زیبا کیسا!
مجھ کو دیوانہ بنایا ہے تری الفت نے
لوگ سمجھاتے ہیں آکر مجھے، کیسا کیسا!

☆

نہ منھ کھلواؤ سب کے سامنے، جانے دو، کیا حاصل!
سبب تم جانتے ہو، میری رنجش ہائے پنہاں کا

☆

اُس کے آنے کی مسرّت ہے، مگر فکر یہ ہے
کیا کہوں گا، جو مرے حال کا پُرساں ہوگا

☆

خوش و ناخوش بسر ہو جائے گی یہ زندگی لیکن
جسے آرام کہتے ہیں، نہ یاں ہوگا، نہ واں ہوگا

☆

اب آپ جا کے کسی اور کو یہ دم دیجے
یہاں تو آپ کے وعدوں کو بس سلام کیا

☆

ہے دوستی عدو سے، تو اس کی طرف نہ دیکھ
چڑھ جائے اس کو زہر نہ تیری نگاہ کا

☆

وہ ناز ہیں کہ اٹھانے ہر اک کو مشکل ہیں
وہ جور ہیں، کہ نہیں جن کی آسماں کو خبر
کسی کو کیا نظر آئے، نگاہِ ناز تری
یہ تیر وہ ہے کہ جس کی نہیں کماں کو خبر

☆

دم بھر میں ایک تیری ''نہیں'' نے مٹا دیے
کیا کیا خیال تھے دلِ امیدوار میں

☆

دیکھا مجھے تو غیر سے آنکھیں چُرا گئے
کیا اس نگاہِ لطف میں پنہاں ستم نہیں؟

☆

مہر و الفت ہی سہی، بغض و عداوت ہی سہی
پھر مجھے دیکھتے تم کیوں ہو، اگر کچھ بھی نہیں
اک یقیں میرا کہ کچھ بھی نہیں، اور سب کچھ ہے
اک ترا وعدہ کہ سب کچھ ہے، مگر کچھ بھی نہیں

☆

یوں ناز تو ہر ایک ترا قہر ہے، لیکن
اک بات نئی ہے ترے بے ساختہ پن میں

☆

پھر اپنے گھر وہ بلا گئے ہیں، غضب کا مژدہ سنا گئے ہیں
پھر ان کے دم میں ہم آگئے ہیں، کہ جن سے دھوکا اٹھا چکے ہیں

☆

چاہتا ہوں، نہ بولوں اس سے مگر
دل تو کم بخت مانتا ہی نہیں

☆

تری طرح، کوئی پیماں شکن جہاں میں نہیں
کہ جس کے قول میں انکار، جس کی ہاں میں نہیں

☆

ستم جو کچھ ہیں، مجھ پر ہیں، فقط تیرے تغافل سے
اگر تو دوست ہے میرا، تو دشمن آسماں کیوں ہو

☆

وعدۂ حشر پہ تسکین ہو کیوں کر، دیکھو
تم وہاں بھی تو یہ کہہ دو گے "نہیں یاد مجھے"

[خم خانۂ جاوید، ۴ : ۱۳۹۔ ۱۴۴، نوائے ادب (سہ ماہی بمبئی)، جولائی ۱۹۵۰ء، سروشِ سخن (خاتمہ)، نگار (اپریل ۱۹۵۳ء) : ۴۳۔ ۴۴، معاصر (۲) : ۸۱۔ ۸۲، مضمون خواجہ فخر الدّین حسین سخن دہلوی۔ از سمیع الحق مشمولۂ آج کل (نئی دلی) فروری ۱۹۷۱ء : ۱۴۔ ۱۷، ذکرِ غالب : ۱۸۰۔۱۸۲]

حواشی :

☆۔ اولاد کی تفصیل اور اُن کے ناموں کی تعیین خواجہ محمد سراج الدّین حسین کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سیّد منہاج الدّین حسین (ولادت ۰ یکم اپریل ۱۹۱۲ء) سے ہوئی۔

سرور... دیبی پرشاد دہلوی

ان کا ایک قطعۂ تاریخ نواب محمدؐ احمد خان بہادر رونق ٹونکی کے دیوان (رونقِ سخن) کے آخر میں نظر سے گزرا:

چوشد دیوانِ رونق طبع امسال
کہ ازروئے بقائے نام گردد
سرور امشب بفکرِ سالِ اُویود
کہ ازغیم چہا الہام گردد
بگفتا، ہاتفِ غیب از سرِداد
کہ تاکارِ منِ ناکام گردد
زہے دیوانِ رونق طبع گردید
''الٰہی دل پذیرِ عام گردد''
(۴+۱۳۳۱=۱۳۳۵ھ)
(رونقِ سخن)

سرور ... چودھری عبدالغفور مارہروی

ضلع ایٹہ (یو پی) کے تاریخی قصبے مارہرہ میں تین خاندان اپنی گوناگوں حیثیتوں کے باعث ممتاز رہے: اوّل، شیوخ کمبوہاں، عہدۂ قانون گوئی اور منصب چودھر اُن کے لیے مخصوص تھا۔ دوم، شیوخ انصاری، قضات اُن کے پاس تھی اور سوم، ساداتِ واسطیہ: یہ حضرات دینی رُشد و ہدایت کا منبع تھے۔

چودھری عبدالغفور گروہ اوّل شیوخ کمبوہاں کے چشم و چراغ تھے۔ مراجعت کی سہولت کے لیے یہاں ان کا شجرہ دیا جارہا ہے:
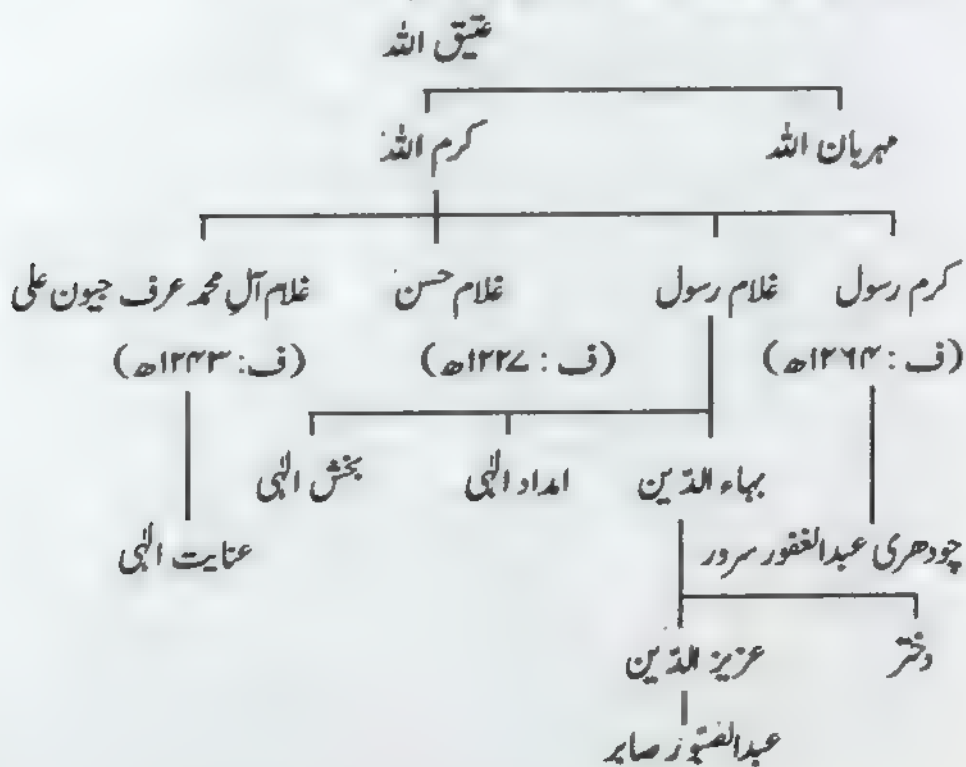
چودھری کرم اللہ اور چودھری غلام رسول وقار و اقتدار کے لحاظ سے اپنے اقران و اماثل میں بہت بلند حیثیت کے مالک تھے۔ دونوں حینِ حیات موروثی عہدۂ چودھر و قانون گوئی پر متمکن رہے۔ چودھری غلام رسول نے پیر کے دن ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ (۱۳ مارچ ۱۸۷۱ء) رحلت کی۔ سیّد آلِ محمد مارہروی نے تاریخِ وفات کہی (دیوان تواریخ : ۱۷)

شد ازیں عالم رئیسِ محترم
ہر کہ فوتِ اُو شنیدہ، ہاے گفت
بندۂ آلِ محمدؐ سالِ اُو
"بستمِ ذی الحجہ" "بایوائے" گفت
(۱۲۵۹+ ۲۸=۱۲۸۷)

دوسری تاریخ ان کے بھانجے کرم حسن نے کہی :

فخرِ دو جہاں، قبلۂ دل، کعبۂ جاں، ہاے (۱۲۸۷)

عبدالغفور سرور اِنھیں چودھری غلام رسول کے بھتیجے تھے۔ اُن کے والد چودھری کرم رسول بھی اپنے والد کے عہدۂ قانون گوئی اور چودھر پر فائز رہے۔ سرور نے تعلیم اپنے چچا سے حاصل کی اور بعد کو ان کی شادی بھی اپنے چچا کی پوتی (یعنی ان کے صاحب زادے بہاء الدّین مؤلف اخبار المارہرہ کی دخترِ نیک اختر) سے ہوئی۔ افسوس کہ وہ لاولد رہے۔ اس پر انھوں نے اپنے سالے عزیز الدّین کے بیٹے عبدالصبّور کو متبنّیٰ بنالیا تھا۔ عبدالصبّور کو بھی شعر گوئی سے دلچسپی تھی، صابر تخلّص تھا اور دلیر مارہروی (ف ۱۹۵۸ء) کے شاگرد تھے۔

علم و فن اور شعر و سخن کے علاوہ سرور کو دینی اعمال سے بھی شغف تھا۔ رمضان کے مہینے میں ان کے ہاں صلائے عام تھی۔ افطار کا انتظام وسیع پیمانے پر کرتے، اعزہ و احباب میں سے جو چاہے، اس میں شریک ہو جائے۔

غالب کے اُردو خطوط کا پہلا مجموعہ ”عودِ ہندی“ اُنھیں نے مرتب کیا تھا۔
منشی ممتاز علی خان میرٹھی نے اُن سے غالب کے خطوط طلب کیے۔ سرور نے نہ صرف اپنے بلکہ صاحب عالم مارہروی اور اُن کے صاحب زادے شاہ عالم کے نام کے خطوط بھی جمع کیے۔ ان کا نام مہر غالب رکھا اور ان پر ایک دیباچہ لکھا۔ لیکن بعد کو خان بہادر ذوالقدر منشی غلام غوث بے خبر نے اِدھر اُدھر کے دوسرے اصحاب سے خطوط وغیرہ لے کر اُن میں اضافہ کیا اور یہی مجموعہ عودِ ہندی کے نام سے پہلی بار، غالب کی وفات سے چار ماہ پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔

سرور نے اپنے نوشتہ دیباچے کے آخر میں یہ قطعۂ تاریخ لکھا تھا:

انشا، مملو بصد مطالب لکھی
یعنی پےِ عاشقانِ طالب لکھی
موسوم کیا جو ”مہرِ غالب“ سے سرور
تاریخ بھی اس کی ”مہر غالب“ لکھی
(۱۲۷۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنا کلام ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں ختم کرلیا تھا اور بقیہ خطوط اور نثروں وغیرہ کے جمع کرنے میں مزید چھ برس صرف ہوئے۔

سرور کی تاریخِ وفات معلوم نہیں ہوسکی۔ اُن کی وفات سے متعلق مندرجۂ ذیل قطعہ ان کے متبنّیٰ بیٹے عبدالصبور صابر کے دیوان میں ملتا ہے:

تاریخِ انتقال سراپا حسرت و ملال
قبلۂ کونین، ولیِ نعمتِ دارین، جناب چودھری محمد عبدالغفور
مرحوم و مغفور رئیسِ اعظم قصبہ مارہرہ

☆

از زمیں تا بہ آسماں ہیہات
یک جہاں راست ہر زماں ہیہات

می رسد از چہار سُو در گوش
نالہ و زاری و فغاں ہیہات
بشرے ہست، کو نمی گرید
ہر دم افسوس، ہر زماں ہیہات
ہمنشیں! آں کہ رفت ذاتے کیست
کہ بود بہرِ او چناں ہیہات
یعنی آں نامور، رئیسِ زماں
در زمیں رفت ناگہاں ہیہات
دائما پنج گانہ در مسجد
باجماعت نماز خواں ہیہات
شور از فرش تا بعرش بلند
ہمہ گفتند قدسیاں، ہیہات
اُو کہ تاریخِ او، زنامِ اُو
بعدم رفت زیں جہاں ہیہات
فکرِ تاریخِ اُو اگر داری
لفظ عبدالغفور خواں ہیہات
رنج و آلامِ صابرِ ناکام
بے حساب است بیکراں ہیہات

☆

(میں نے بیسیوں جوڑ توڑ کیے کہ اس قطعے سے کوئی معقول تاریخ نکل آئے، لیکن بے سود۔ قطعہ اس لیے درج کر رہا ہوں کہ شاید کوئی صاحب رہنمائی کر سکیں)

ظاہرا ان کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ کچھ متفرق نثر اور چند قطعات محفوظ رہ گئے

ہیں۔ سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی تقریب پر لکھتے ہیں:

مرے فرزند احمد کا وہ فرزند
دعا گو جس کا ہر فردِ بشر ہے
الٰہی، اس کو تو رکھیو سلامت
کہ نخلِ زندگانی کا ثمر ہے
نویدِ فرحتِ میلادِ مولود
سرورِ سینہ و نورِ نظر ہے
سُرورِ خوش دلِ شاداں نے تاریخ
لکھی فی الفور یہ "لختِ جگر ہے"

☆

صد شکر خدائے پاک، فرزند
دادہ بہ شفیق قدر دانم
زیں مژدۂ دل فزائے جاں بخش
شاداں شد روح و ہم روانم
ہر صبح دعائے عمر و جاہش
بر ذروۂ عرش می رسانم
تاریخش یافتم مسیحی
"نورِ نظر و نشاطِ عالم"
(۱۸۶۶ء)

حکیم امداد حسین مارہروی نے ۱۲۸۲ھ میں رحلت کی۔ سال بھر کے اندر ان کے بیٹے علی حسین بھی ۱۲۸۲ھ میں رہگرائے عالمِ بقا ہوئے۔ سرور نے ایک قطعے میں دونوں کا ذکر کیا:

وادریغا، وادریغا، وادریغا، وادریغ
ہائے ہا و ہائے ہا و ہائے ہا و ہائے ہا

در ہزار و دو صد دہشاد و دو ماہِ صیام
جانبِ فردوس شد فخرِ اطبا رہگرا
پنج پور نامور از وے بگیتی یادگار
صاحبانِ عقل و علم و دانش و فہم و ذکا
سال نگزشتہ ز فوتِ والدِ والاے شاں
پورِ چارم را ربود اے وائے از عالم قضا
بود نامِ اُو مرکّب از علی و از حسین
وہ چہ نام است ایں کہ بروے باد جان و دل فدا
از وقوعِ ایں چنیں بس سخت و سنگیں واقعہ
رستخیزے گشت پیدا محشرے شد رونما!
از یگانہ تا بہ بیگانہ، دریں رنجِ عظیم
ہر یکے راہست برلب نعرۂ واحسرتا
دل بدرد آورد و تاریخِ وفاتش نظم کرد
ہر کہ در مارہرہ با شعر و سخن بود آشنا
ہم سُرورِ خستۂ ناشاد، ازروے اُمید
گفت: "حشرش با حسین و با علی روزِ جزا"
(۱۲۸۳=۱۲۸۲)

مرزا حاتم علی مہر کے بیٹے مرزا سخاوت علی بیگ ضیا کی شادی پر سہرا کہا تھا:

محوِ نظارۂ نوشہ نہ ہو کیوں کر سہرا
گلِ نرگس سے بنایا ہے سراسر سہرا
کچھ تو یہ بے ادبی سمجھا ہے سر پر سہرا
قصدِ پابوس جو رکھتا ہے سراسر سہرا!

سوزنِ فکر سے گلہاے معانی کو پرو
کشتیِ عرض میں لایا ہوں لگا کر سہرا
ایک پھولوں کا تھا، اور کثرتِ نظارہ سے
دیکھ لو اور بندھا سہرے کے اُوپر سہرا
ہیں تتبع میں یہ غالب کے سب اشعار سرُور!
"دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا"

[غالب اور عصرِ غالب : ۱۰۱۔ ۱۰۵، عودِ ہندی (دیباچہ): آج کل:
فروری ۱۹۵۵ء، خطوط ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس ہندو یونی ورسٹی]

سرور... آغا غلام حسین خان تبریزی

غالب ایک خط میں سیف الحق منشی میاں داد خان سیاح کو لکھتے ہیں :

آغا غلام حسین خان صاحب کا قطعہ پہنچا۔ اس میں کچھ تو شعر اصلاح طلب بھی تھے، اب اصلاح دے کون! میں تو اپنی مصیبت میں گرفتار۔ بارے ایک میرا شاگردِ رشید منشی ہرگوپال تفتہ بہ سواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا۔ اس کو موقع و محل بتا دیا، جو میں کہتا گیا، اسی طرح وہ بناتا گیا! وہ قطعہ کا کاغذ بعد اصلاح کے اکمل المطابع میں بھیج دیا، ہفتۂ آئندہ میں تم بھی دیکھ لو گے۔

(۱۱ جون ۱۸۶۷ء)

یہاں اشارہ اِنھیں سرور کی طرف ہے۔ سرور کی فارسی اور اُردو کی اچھی استعداد تھی۔ خوش نویسی بھی جانتے تھے اور سورت کے نواب میر افضل الدّین☆ قمرالدّولہ حشمت جنگ بہادر کی سرکار میں میر منشی تھے۔

تاریخ کہنے میں خاص مہارت تھی۔ بعض کتابوں پر اُن کے تاریخی قطعات ملتے ہیں۔ غالب کے محولۂ فوق خط میں بھی بظاہر کسی ایسے قطعے ہی کا ذکر ہے، جو اُنھوں نے اصلاح کے بعد اکمل المطابع سے چھپنے والے ہفتہ وار ''اکمل الاخبار'' میں اشاعت کے لیے بھیج دیا تھا۔ ''تاریخ گجرات'' کا قطعہ ملاحظہ ہو :

ہم دراں بزمِ خوشی رقاصہ ہائے دلربا

بردند از (نازو) ادا صبر و قرار بزمیاں

الغرض در بزمِ شادی بد بحدّے انبساط
ازغناے خوشنواے دلربا رامشگراں
سائرین از دوستاں اوصافِ اورامی کنند
ازنباتِ وصفِ اُوہستند ہمہ شیریں زباں
شیخ فاضل شادیِ ابنِ برادر زادہ است
مرترا بادا مبارک، اے شفیق و مہرباں!
ایں ہمہ آرائش و زیبائشِ محفل تمام
آمداز عقلت نمایاں، اے زہے عقلت جواں
لازم آمد برخودم، تامن نگارم تہنیت
زاں براے اُونمودم، تہنیت رامن بیاں
ایں نویدِ شادمانی چوں بگوشِ من رسید
غوطہ ورگشتم بہ بحرِ فکرِ سالش در زماں
عقل آمد رہبرم گفتا کہ سرور گوش کن
"جشن فرخندہ" زرُوے جشن، گو تاریخِ آں
(۱۲۹۲ + ۳ = ۱۲۹۵ھ)

نوٹ ۱: اس قطعے کے بعض اشعار ٹھیک سے نہیں پڑھے گئے۔

۲۔ فحواے کلام سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے خود نہیں، بلکہ سیّاح نے سرور کا قطعۂ تاریخ غالب کی خدمت میں بھیجا تھا، یہ غالبًا میر غلام بابا خان کے مقدمہ جیتنے کے بارے میں تھا۔ سیاح اور سرور دونوں کا مقصد اور مصلحت ظاہر ہے۔ سیاح چاہتے تھے کہ قطعۂ تاریخ "اکمل الاخبار" میں شائع کرا دیا جائے۔ اسی لیے غالب سیاح کو اطلاعاً لکھتے ہیں: "آغا غلام حسین خان صاحب کا قطعہ پہنچا مشکل یہ تھی کہ قطعے میں "کچھ شعر اصلاح طلب بھی تھے" اس لیے غالب کو اسے جوں کا توں اخبار کو بھیجنے میں تامّل تھا۔ لیکن اب اصلاح دے کون! وہ اسی حیص بیص میں تھے کہ تفتہ

آگئے اور غالب نے اُنھیں ''موقع و محل'' بتا کر اصلاح دے دی اور اسے اکمل الاخبار میں چھپنے کو بھیج دیا۔ سرور کو غالب کی اصلاح کا علم بھی قطعے کے چھپنے کے بعد ہوا ہوگا۔

اس سے میرا یقین ہے کہ سرور، غالب کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے، اُن کا صرف یہی ایک قطعہ غالب کی اصلاح سے مزیّن ہوا۔ بہرحال وہ لہو لگا کر شہیدوں میں تو شامل ہوگئے۔ اسی لیے میں نے ان کا نام یہاں درج کرلیا ہے)

(اُردوئے معلّٰی: ۲۵ : سخن ورانِ گجرات : ۱۶۵۔ ۱۸۹۰۔ ۱۹۰)

حواشی :

☆۔ رستم علی خان سورت میں متصدّی تھے۔ وہ مرہٹوں کے خلاف جنگ کے لیے سورت سے چلے گئے، تو ان کی جگہ اُن کے بیٹے سہراب خان متصدّی ہوگئے۔ قلع دار بیلگر خان (مرزا گدا بیگ) نے انگریزوں کی شہ پا کر اُنھیں بے دخل کردیا اور اپنے چھوٹے بھائی تیغ بیگ خان (عرف میرزا گل) کو متصدّی بنادیا۔ دلّی کی مرکزی حکومت کم زور اور بے عمل تو تھی ہی، اب تیغ بیگ خان نے اپنے نواب سورت ہونے کا اعلان کردیا۔ تیغ بیگ خان کے بعد انگریزوں کی سازباز سے ان کے داماد میر معین الدّین (عرف سیّد اچھن) نواب بنے اور ۱۱۷۸ھ /۱۷۶۴۔ ۱۷۶۵ء میں اُن کے انتقال پر اچھن کے بیٹے سیّد حفیظ الدّین احمد خان ان کے وارث ہوئے اور ان کے بعد اُن کے بیٹے سیّد نظام الدّین۔ چوں کہ سیّد نظام الدّین کے کوئی بیٹا نہیں تھا، اس لیے ان کی وفات پر انگریزوں نے اُن کے بھائی سیّد نصیر الدّین کو نواب تسلیم کرلیا۔ یہ افضل الدّین خان اِنھیں نصیر الدّین کے بیٹے تھے، اُن کا ۱۲۵۸/ ۱۸۴۲ء میں انتقال ہوا۔

ضمناً یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ افضل الدّین خان کی چھوٹی بیٹی بختیار النسا کی شادی میر سرفراز علی سہوانی کے بیٹے میر جعفر علی سے ہوئی تھی۔ اس بیگم کی وفات کے بعد میر جعفر علی نے اور دو نکاح کیے۔ تیسری بیوی سے چھوٹی صاحب زادی رحیم النسا کا نکاح غالب کے مکتوب الیہ میر بابا خان سے ہوا تھا۔ غالب کا میر غلام بابا خان کے نام پہلا خط اُن کے خسر میر جعفر علی کی وفات ہی پر لکھا گیا تھا۔ اُنھوں نے ۱۲۸۰ / ۱۸۶۳ء میں رحلت کی (سخنورانِ گجرات : ۲۶۹۔ ۲۸۰، اردوے معلّٰی : ۵۔ ۶)

سرور... شیخ محمدؐ امیر اللہ اکبر آبادی

یہ بیٹے تھے شیخ عبداللہ کے۔ ۱۲۴۳ھ میں دہلی میں تھے۔ غالب کے علاوہ شیخ رحمت اللہ مجرم اکبر آبادی سے بھی اصلاح لی۔

[شاعر آگرہ نمبر]

سروش... صاحب زادہ عبدالوہّاب خان بہادر رامپوری

رام پور کے حکمران خاندان سے تھے۔ ان کے والد صاحب زادہ عبدالرحمٰن خان بہادر تھے اور دادا نواب غلام محمدؐ خان بہادر غفران مآب، جو نواب یوسف علی خان بہادر فردوس مکان کے بھی دادا ہوتے تھے (خاندان کا مفصّل حال نواب یوسف علی خان بہادر ناظم کے ترجمے میں لکھا گیا ہے)۔

سروش ۱۲۳۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں مومن سے مشورہ کرتے رہے، پھر غالب سے اصلاح لی اور اُن کی وفات کے بعد خوش وقت علی خان خورشید سے استفادہ کیا۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

تھامتا دل کو، کہ آنکھوں کو نہ رونے دیتا
ایک میں، جھگڑے ہزاروں، کہو کیا کیا کرتا

☆

قتل عالم کو کیا، ایک نظر میں تو نے
کون باقی ہے ستم گار جو پرساں ہوگا

☆

سچ تو یہ ہے، لاکھ سر مارا کرو، ماتھا گھسو
کچھ کرو، لکھا نہیں مٹتا کبھی تقدیر کا

[انتخابِ یادگار، ۲: ۱۷۲ـ۱۷۳، خمخانۂ جاوید ۴: ۱۸۹ـ۱۹۰]

سلطان... مولوی محمدّ سلطان حسن خان بریلوی

بریلی کے مشہور خاندانِ مفتیان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے والد مفتی احمد حسن خان اضلاع ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ (حال یو پی) میں صدر الصد ور رہے۔ اُن کا شعبان ۱۲۷۳ھ (مارچ / اپریل ۱۸۵۷ء) میں انتقال ہوا۔

غالب کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ جب وہ رام پور کے دوسرے سفر سے دسمبر ۱۸۶۵ء میں بعہدِ نواب کلب علی خان دلّی واپس آرہے تھے تو راستے میں مراد آباد کے نزدیک رام گنگا پار کرتے ہوئے انھیں ایک افسوس ناک حادثہ پیش آیا تھا، جس پر انھیں کپڑوں کی قلت کے ساتھ مقامی سرائے میں رات بسر کرنا پڑی تھی اور اگلی صبح مولوی محمدّ حسن خان صدر الصدّور انھیں سرائے سے اٹھا کر اپنے ہاں لے گئے تھے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے، ذکرِ غالب : ۱۲۶۔ ۱۲۸) یہ مولوی محمدّ حسن خان اِنھیں احمد حسن خان کے برادرِ خرد (اور محمد سلطان حسن خان کے سگے چچا) تھے۔ محمدّ حسن خان عالم آدمی تھے، ان سے متعدّد کتابیں یادگار ہیں۔ اُردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، اسیر تخلص تھا۔ اُنھوں نے غالب کی وفات پر یہ قطعۂ تاریخ کہا تھا:

غالب کہ بود پیرِ مغانِ سخنوری
زیں دہر چوں بدارِ سلامت گرفت راہ
ساغر شکست و میکدۂ شعر شُد خراب
مینا گریست زار کہ ''غالب بمرد آہ''
(۱۲۸۵)

محمدّ سلطان حسن خان ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴۔ ۱۸۲۵ء) میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے علومِ دینیہ مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے حاصل کیے اور اُن میں خود اُستادانہ دستگاہ پیدا کی۔

سلطان انگریزی عہد میں محکمۂ عدلیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ترقی کر کے صدر الصدور بن گئے تھے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں آگرے میں منصف تھے۔ یہاں بیمار پڑ گئے تو بریلی کے لیے روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ کو خواب میں دیکھا کہ دتی آنے کے لیے فرما رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بریلی کے بجائے دتی کا رُخ کیا۔ یہیں انتقال ہو گیا (۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۱۔ ۱۸۸۲ء)، باون برس کی عمر پائی۔ درگاہِ حضرت باقی باللہؒ ہی میں دفن ہوئے۔ غلام رسول ویران (تلمیذِ ذوق) نے تاریخ کہی:

مولوی سلطان حسن خان، عالمِ نیکو عمل
چوں سفر کردند از دنیا سوے دارالنعیم
بہرِ سالِ رحلتِ ایشاں بگوشِ دل رسید
ایں ندا از عالمِ بالا: "ولھم اجر عظیم"
(۱۲۹۹)

شعر گوئی کے علاوہ نجی طور پر طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے۔ من جملہ اور طلبہ کے غلام بسم اللہ بسمل بریلوی (تلمیذِ غالب) بھی اُن کے شاگرد تھے۔ غالباً انھیں شاگردوں کی سہولت کے لیے عربی کے دو مشہور قصیدوں، بانت سعاد اور بردہ کی شرح لکھی تھی۔

مفتی محمدّ سعد اللہ مراد آبادی نے ان کے استاد مولانا فضلِ حق خیر آبادی کی کتاب "ہدیۂ سعیدیہ" پر کچھ اعتراض کیے تھے۔ سلطان نے اُن کے جواب میں ایک رسالہ قلم بند کیا، جو مطبع "شعلۂ طور" کان پور میں محرّم ۱۲۸۸ھ میں چھپا تھا۔

اولاد میں پانچ بیٹے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹی قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (تلمیذِ غالب) کے صاحب زادے قاضی محمد خلیل حیران کے حبالۂ عقد

میں تھیں۔ ان کے دو بیٹے مفتی حبیب الحسن احسن اور حکیم مفتی عماد الحسن محو بھی شعر کہتے تھے، اُنھوں نے خاصا نام پیدا کیا۔ یہ محو ہی تھے، جنھوں نے غلام بسم اللہ کے حالات نواب صدر یار جنگ مرحوم کی فرمایش پر لکھے تھے۔ سلطان کے اخلاف آج کل پاکستان میں مقیم ہیں۔

غالب ایک خط میں غلام بسم اللہ کو لکھتے ہیں :

''آپ کے منصف صاحب کی بھی غزل میں اصلاح کم ہوئی ہے'' (عودِ ہندی : ۱۷۹)

یہاں منصف صاحب سے یہی سلطان مراد ہیں۔

افسوس کہ سلطان کا کلام ضائع ہو گیا۔ ایک نعتیہ قصیدہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری (اُردو کالج، کراچی) کے پاس محفوظ ہے۔ اُنھوں نے اس کی نقل عنایت فرمائی ہے، جو ہدیۂ ناظرین ہے:☆

خدا کے بعد رتبہ ہے تمھارا، یارسول اللہ
ہوا تم سا نہ کوئی، اور نہ ہوگا یارسول اللہ
تمھارے دامنِ دولت سے وابستہ ہے کل عالم
تمھارے دم کا ہے سارا کرشمہ یارسول اللہ
تمھارے واسطے حق نے بنایا دونوں عالم کو
تمھیں دونوں جہاں کے ہو وسیلہ یارسول اللہ
صفاتِ ظاہری و باطنی سب تم میں یک جا ہیں
جو قدرت کے خزانے میں تھا، بخشا یارسول اللہ
تمھیں ہو باعثِ ایجادِ کُل اور ہو تمھیں سب کے
نجاتِ آخرت کا بھی ذریعہ، یارسول اللہ
کہاں سے سایہ ہوتا، آپ کو، اس ذاتِ واحد نے
بنایا نور کا اپنے نمونہ، یارسول اللہ

پہنچ کر طور پر موسیٰ نے کی دیدار کی خواہش
جوابِ لن ترانی اُن کو آیا، یارسول اللہ
سواری لے کے بھیجا حق نے خود اپنے مقرب کو
تمھیں گھر بیٹھے خلوت میں بلایا، یارسول اللہ
نیاز و ناز کی باتیں ہوئیں کیا کیا نہ خلوت میں
دوئی کا درمیاں میں تھا نہ پردہ، یارسول اللہ
تقرب کے جہاں تک تھے مدارج، وہ ملے تم کو
بچشمِ سر خدا کو تم نے دیکھا، یارسول اللہ
فلک کو بھی شرف حاصل ہوا، پائے مبارک سے
نہ تنہا کچھ زمیں نے فخر پایا، یارسول اللہ
قسم کھائی خدا نے آپ کی عمر اور مسکن کی
سبحان اللہ، یہ رتبہ ہے تمھارا، یارسول اللہ
اگر پاؤں اجازت تو کروں کچھ عرضِ حال اپنا
کہ اک [مدت] سے رکھتا ہوں ارادہ، یارسول اللہ
تمنا ہے، مدینے کو برہنہ سر برہنہ پا
چلا جاؤں میں آزادانہ کہتا، یارسول اللہ
کبھی میں شوق میں دوڑوں، کبھی میں وجد میں آؤں
تصور ہو بندھا مجھ کو تمھارا، یارسول اللہ
کیا ہو پارہ پارہ میں نے اپنے جیب و داماں کو
بہاتا ہوں میں اِن چشموں سے دریا، یارسول اللہ
میں پہنچوں کعبۂ مقصود تک، اللہ اکبر جب
کھڑا ہوں سر جھکا کے دست بستہ، یارسول اللہ
یکایک محو ہو جاؤں، کبھی جو ہوش میں آؤں
کروں میں عرض جو کچھ ہو تمنا، یارسول اللہ

در و دیوار سے لپٹوں، دل اپنا کھول کر رووٗں
پھروں میں گردِ روضے کے تڑپتا، یارسول اللہ
تڑپ کر پھر کسی ڈھب سے میں پہنچوں قبرِ اقدس تک
نکالوں دل کے میں ارمان کیا کیا، یارسول اللہ
تمنا جس کو ہو چومے وہ جاکر سنگِ اسود کو
ملے مجھ کو ترے مرقد کا بوسہ، یارسول اللہ
یہی ہے آرزو میری، مروں جاکر مدینے میں
ملے مجھ کو وہاں اک قبر کی جا، یارسول اللہ
بوقتِ نزع دم بھرتا ہوں میں ذاتِ مقدس کا
زباں پر ہو مری کلمہ تمھارا، یارسول اللہ
جو مجھ کو قبر میں رکھیں، اکیلا چھوڑ کر لوٹیں
وہاں دیکھوں رُخِ انور کا جلوا، یارسول اللہ
نہ پھر وحشت رہے مجھ کو، نہ دہشت ہو نہ تاریکی
یہ خلوت دے رہی ہو لطفِ تازہ، یارسول اللہ
فرشتے قبر میں آکر اگر کچھ پوچھنا چاہیں
انھیں کچھ آپ فرما دیں اشارہ یارسول اللہ
بدولت آپ کی مجھ کو نہ کچھ ہولِ قیامت ہو
بہ آسانی گزر ہو پُل سے میرا یارسول اللہ
نہ کھلنے پائیں محشر میں مرے دفتر گناہوں کے
یہ فرما دیجیے : ''ہے یہ ہمارا'' یارسول اللہ
رہوں خوش حال، فارغ بال، جب تک میں رہوں زندہ
نہ پہنچے میرے دل کو کوئی صدمہ یارسول اللہ
رہے آباد میرا گھر، جو ہیں میرے جگر گوشے
رہیں وہ پھولتے پھلتے ہمیشہ یارسول اللہ

میں اچھا یا برا، جیسا ہوں، امت میں تمھاری ہوں
مری دونوں جہاں میں شرم رکھنا، یارسول اللہ
نوازش پر تمھاری، کر رہا ہوں نازشیں، ورنہ
کہاں میں اور کہاں میری تمنا، یارسول اللہ
نہ کچھ فضل و ہنر مجھ میں، نہ کچھ حسنِ عمل میرا
تمھارے فضل کا اک ہے سہارا، یارسول اللہ
تمھارے فضل کا سب سے مجھے اک حق زائد ہے
نہیں امت میں بدکردار مجھ سا، یارسول اللہ
تمھیں دارین کے ملجا، تمھیں کونین کے ماوئی
کہوں میں اور کس سے درد اپنا، یارسول اللہ
چھڑا کر کش مکش سے، اب بلالو تم مدینے میں
دکھادو اب تو تم مجھ کو مدینہ، یارسول اللہ
مدینہ کی گدائی ہو کہیں سلطان کو حاصل
ملے بہرِ حسن اُس کو یہ رتبہ، یارسول اللہ
ادب سے کہہ نہیں سکتا ہوں، جو کچھ اور کہنا ہے
مگر مالک ہو تم، ہوں میں تمھارا، یارسول اللہ

(غالب اور عصرِ غالب: ۱۳۵۔ ۱۴۰، خطوط ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی)

حواشی

☆۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ منشی مہیش پرشاد مرحوم نے مجھے بتایا کہ مفتی سلطان حسن خان کا تخلص احسن تھا، اس لیے میں نے اسی نام کے تحت ان کا کتاب کی طبع اوّل میں ذکر کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ ان کا تخلص احسن نہیں، بلکہ سلطان تھا۔ لہٰذا یہ تبدیلی کی گئی ہے۔

سوزاں... حسیب الدّین احمد انصاری سہارنپوری

اُن کے والد کا نام خواجہ معین الدّین انصاری تھا۔ سلسلۂ نصب مشہور صحابی رسول حضرت ابو ایوّب انصاریؓ تک پہنچتا ہے۔ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم بہت معقول تھی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد سہارن پور سے دلّی آ گئے۔ عاشق تن آدمی تھے، یہاں دلّی میں کوٹھوں کی سیر کرنے لگے۔ شاعری کا شوق پہلے سے تھا، اس رندمشی نے گویا سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ غالب کی اصلاح نے رہی سہی کسر پوریِ کردی۔ نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔ چنانچہ قیامِ دلّی کے دوران میں ''اخبار الاخیار'' کے ایڈیٹر بھی ہوگئے تھے۔ کئی کتابیں نثر میں یادگار چھوڑیں۔ جن میں سے تاریخِ عجیب در حالاتِ حکمائے یونان، تریاقِ مسموم، تاثیر القلوب، گنجِ شائگاں (قافیہ میں) قابلِ ذکر ہیں۔

اُستاد کے عاشق تھے جب تک غالب زندہ رہے، اُنھوں نے دلّی چھوڑ کر کہیں جانے کا نام نہیں لیا۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد یہاں سے دل اُچاٹ ہو گیا اور واپس سہارنپور چلے گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

غالب سے کام تھا، سو وہ سوزاں، گزر گئے
دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا!

اگرچہ معاش کا کوئی خاص ذریعہ نہیں تھا اور تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی، لیکن عجیب قانع طبیعت پائی تھی، کبھی ماتھے پر بل نہیں لائے، ہنستے کھیلتے زندگی کے دن گزار دیے۔ ۶۵ برس کی عمر تھی، جب ۱۸۸۹ء میں جاں بحق ہوئے۔

ایک مختصر دیوان اُن کی زندگی میں شائع ہوا تھا (مطبع انصاری، دہلی: ۱۳۰۰ھ باہتمام عبدالرزّاق بیگ)۔ کلام کا بہت بڑا حصّہ غیر مطبوعہ رہ گیا، جس کے اُن کی تنگ دستی کے باعث چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ کلام سے بھی زندہ دلی اور شوخی ٹپکتی ہے:

اللہ میں ہوں اور یہ غمِ وصلِ یار کا
تو جانتا ہے درد، دلِ بے قرار کا

☆

تیری نگاہِ مست، اثر دل میں کر گئی
ساقی! یہ جام لے کہ مرا کام ہو گیا

☆

افسوس، کہ دل خوش نہ ہوا، مل کے کسی سے
ماتم کدۂ دہر میں، جو تھا، سو حزیں تھا

☆

دھو سکے تو اپنے دل کا داغ دھو
شیخ! منھ کو ہر گھڑی دھوتا ہے کیا

☆

توبہ کا ارادہ تو ہمارا بھی ہے، اے شیخ!
لیکن ذرا آجائے بڑھاپا، ابھی کچھ اور

☆

لطف کم کیجیے کہ اس بندے کے حق میں آپ کا
اب ستم اچھا ہے اور لطف و کرم اچھا نہیں
حق تعالےٰ غم کسی کو دے، تو سوزاں عشق کا
ورنہ دنیا کا ہو یا دیں کا ہو، غم اچھا نہیں

☆

جاتے ہیں پر افسوس، یہ ہم کو نہیں معلوم
جائیں گے کہاں اور ہم آئے ہیں کدھر سے
آتی ہے تجھے دیکھ کے، کیا کیا مرے دل میں
پر کہہ نہیں سکتا ہوں میں ظالم ترے ڈر سے

☆

بس اب عشقِ بتاں کر ترک، سوزاں!
خدا کا خوف کر، بندے خدا کے

☆

جانے کس وقت وظائف سے ہوں فارغ سوزاں
جامِ مے، ساقیِ گلفام! لگا رہنے دے

(خم خانۂ جاوید، ۴ : ۲۸۸۔ ۲۸۹، یادگارِ ضیغم، ۱۷۵، ۱۷۶، مکتوب ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس)

سوزاں و مدّاح... شیخ محمد صادق علی گڑھ مکتیسری

اگرچہ گڑھ مکتیسر وطن تھا، لیکن سکندرہ راو (ضلع علی گڑھ) میں رہتے تھے۔ سرکاری ملازم اور پرمٹ کے محکمے میں درجۂ اوّل کے انسپکٹر تھے اور کھاتے پیتے خوش حال اور عالم آدمی تھے۔ سوزاں اور مدّاح دو تخلص کرتے تھے، نعت کہنے کا بھی شوق تھا غالباً التزام یہ تھا کہ عاشقانہ کلام میں سوزاں تخلص تھا اور نعتِ رسول اللہ ﷺ میں مدّاح۔ چنانچہ نعتیہ دیوان میں جو ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸۔ ۱۸۶۹ء) میں چھپا تھا، تخلص شروع سے آخر تک مدّاح ہی استعمال کیا ہے۔ ایک تذکرہ بھی لکھا تھا، جو اب نہیں ملتا۔

اُن کے صاحب زادے نثار علی شہرت کسی زمانے میں ہاشمی پریس میرٹھ میں ملازم تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اُس کو بُلوایا تو ہے، لطف تب اے دل، آئے
ساتھ تلوار بھی لائے، جو وہ قاتل آئے

☆

ایسا نہ ہو کہ ظلم سے بھی ہاتھ اُٹھائے یار
کیوں کہیے ناز اٹھانے کی طاقت نہیں رہی

☆

ایک نعت کے دو شعر ہیں:

نگینِ دل ہمارا ہے مزیّن
نقوشِ نامِ ختمِ مرسلیں سے

صلہ مدحت کا لو، مدّاح چل کر
حضورِ خسروِ دنیا و دیں سے

(سخنِ شعرا : ۳۲۶، یادگارِ ضیغم : ۳۸۷، اُردو ادب، اکتوبر/ دسمبر، ۱۹۵۴ء : ۱۱۴-۱۱۳)

سیّاح (عُشّاق)... منشی میاں داد خان اورنگ آبادی

اِن کے والد منشی عبداللہ خان کا اورنگ آباد کے امیر لوگوں میں شمار تھا۔ اس لیے سیاح کا بچپن نہایت عیش و عشرت اور آرام و آسایش میں بسر ہوا۔ لیکن جب یہ سن رشد کو پہنچے، تو سب جا داد ٹھکانے لگ چکی تھی۔ یار باش اور زندہ دل آدمی تھے۔ مزاج میں بہت نفاست تھی۔ خوش لباس ایسے کہ کپڑے دلّی میں سلواتے۔ عطر کا شوق اس درجہ کہ جس گلی کوچے سے نکل جاتے، وہ مہک اُٹھتا اور لوگ محض فضا کی خوش بو سے کہہ دیتے کہ سیاح اِس طرف سے گزرے ہیں۔

فارسی زبان بے تکان بولتے تھے۔ طبیعت میں تیزی اور بذلہ سنجی اور ظرافت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جہاں جاتے لوگوں سے بے تکلف دوستی پیدا کر لیتے۔ اپنے اہتمام سے مشاعرے کرتے، پڑھنے کا انداز بھی بہت دل کش تھا۔ اِنھیں باتوں سے لوگوں کو اِن پر انگریزوں کا جاسوس ہونے کا شبہہ ہوا۔ آخر یہی روشنی طبع بلائے جان ثابت ہوئی۔ ۱۸۷۸ء میں ان پر جعلی سکّے بنانے کا مقدّمہ قائم ہوا، اور یہ ماخوذ ہو کر قید کر دیے گئے۔

واقعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ اچّھے خطّاط اور فنِ مصوّری میں ماہر تھے، اس لیے اُنھیں قلب سازی سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ تا یکے ۱۸۷۸ء میں یہ بمبئی سے حیدرآباد گئے۔ ریل کے اسٹیشن سے ٹکٹ خریدا اور سو روپے کا نوٹ بھنایا۔ اتفاق دیکھیے کہ اُن کے بعد جو دوسرا مسافر آیا، اس نے بھی ٹکٹ کے لیے سو ہی کا نوٹ پیش کیا اور ستم یہ ہوا کہ اس دوسرے نوٹ کا نمبر بھی وہی تھا، جو سیاح کے نوٹ کا تھا۔ فوراً

تفتیش شروع ہوئی اور آخر کار سیاح حیدرآباد سے پکڑے آئے۔ مقدمہ چلا اور چودہ سال قید کی سزا ہوگئی۔ لیکن خوش قسمتی سے پوری مدّت قید خانے میں نہیں رہے۔ قید خانے کا منتظم ایک پارسی شخص تھا۔ اُس نے قید کے ایّام ہی میں اپنے لڑکوں کی تعلیم اِن کے سپرد کردی۔ پھر جب ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کا دربار ہوا، تو ان سے قصیدہ لکھوا کر اپنی سفارش کے ساتھ اوپر بھیج دیا، جس سے سزا میں تخفیف ہوگئی اور یہ قبل از وقت رہا ہوگئے۔

شروع میں تخلّص عشاق تھا۔ جب غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اسے بدل کر سیاح کردیا۔ چوں کہ اُنھوں نے ہندوستان کے طول و عرض بلکہ عرب و عجم میں بہت سفر کیے تھے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا، اس لیے یہ تخلّص اُن پر خوب صادق آتا تھا۔ غالب نے اُنھیں سیف الحق خطاب بھی دیا تھا اور اپنی مشہور اُردو کتاب ''لطائفِ غیبی'' اُن ہی کے نام سے چھاپی تھی۔

۱۸۶۲ء میں نواب میر غلام بابا خان☆ سی آئی ای (C.I.E) رئیسِ سورت کی مصاحبت اختیار کرلی۔ نواب صاحب کی زندگی بھر تو بہت عافیت سے گزری لیکن جب ۱۸۹۳ء میں ان کا انتقال ہوگیا، تو ان کا ستارہ بھی گردش میں آگیا۔ اس کے بعد کے دس بارہ سال بہت تنگی کی حالت میں بسر کیے۔ ان ایّام میں اُن کے ایک دوست اور مدّاح حکیم شیخ محمدؐ (یا محمود) میاں صاحب نے دست گیری کی اور اُن کے کفیل رہے۔

تقریباً ۸۵ برس کی عمر تھی جب ۱۹۰۷ء میں سورت میں وفات ہوئی۔ وہیں ر محلّہ ''بڑے خان کا چکلہ'' میں خواجہ دیوانہ صاحب (یعنی سیّد جمال الدّین) کی خانقاہ میں مدفون ہیں۔ سورت ہی کے ایک معزز خاندان میں شادی کرلی تھی۔ اس سے متعدّد اولادیں ہوئیں۔ لیکن مشیّتِ ایزدی کہ اُن میں سے کوئی بچہ زندہ نہیں رہا۔ آخر عمر میں محلّہ سیّد واڑہ (سورت) کے ایک شریف خاندان کی لڑکی کو گود لے لیا تھا۔ اس کی پرورش کی اور اپنے سامنے اس کی شادی کردی، اس کی اولاد موجود ہے۔

غالب کے محبوب شاگردوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اُردوئے معلّٰی میں متعدد

خطوط اُن کے نام کے موجود ہیں۔ غالب سے تلمذ کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

ہے تلمذ اسد اللہ سے ہم کو سیاح!
شاعروں میں ہو نہ کیوں فخر مدارا اپنا

☆

ظلِ کرم ہے حضرتِ غالب کا بس مجھے
سر پر نہیں ہے سایۂ بالِ ہُما، نہ ہو

دیوان اگرچہ مرتب کرلیا تھا، لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک مختصر رسالہ 'مسیرِ سیاح' ۱۸۷۲ء میں شائع کیا تھا۔ جس میں شمالی ہندوستان میں اپنی سیاحت کا مختصر حال اور دو مشاعروں کی رُوداد درج کی ہے۔ ڈاکٹر ظہیر الدّین مدنی نے کچھ مختصر کلام شائع کردیا ہے، یہ بھی غنیمت ہے۔

یہ ضرب المثل شعر اُنھیں کا ہے:

قیس جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

چند شعر ملاحظہ ہوں:

لیا بوسہ جو ابرو کا، تو کیا کیا غیظ میں آکر
کبھی دیکھی مری صورت، کبھی تلوار کی صورت

☆

مسندِ فقر پہ زاہد کرے کیوں کر تکیہ
ہم فقیروں کو ہوا، فضلِ خدا پر تکیہ
لطفِ املاک و امارت ہو امیروں کو نصیب
فضلِ خالق سے فقیروں کا ہوا گھر تکیہ

☆

کیا عجب گر ہوگئی رونے سے چشمِ تر سفید
ابر کالے، بعدِ بارش ہوتے ہیں اکثر سفید
خشک تھا یہ ناتوانی سے لہو اس جسم کا
ذبح قاتل کر چکا، لیکن رہا خنجر سفید

☆

اس بے کسی میں، میری رفاقت جو تم نے کی
جان اپنی تم پہ کرتا ہوں، رنج و محن نثار

☆

دیا ہے جس نے غم سیاح! راحت بھی وہی دے گا
ترقی ہوتی ہے دنیا میں، کہتے ہیں تنزل سے

☆

وجہِ بربادیِ عشاق ہے آرایشِ حُسن
اور الجھاتے ہیں خاطر کو سلجھ کر گیسو

☆

آئے ہیں عیادت کے لیے، غیر کے ہمراہ
ساتھ اپنے، مری موت کو بھی لائے ہوئے ہیں

☆

کہہ دو سنبھل کے سے کدے میں آئے محتسب
ٹوٹیں گے خُم ضرور، مگر اُس کے سر کے ساتھ

☆

قفس میں سیرِ گلشن کی اگر مانگے دعا دل سے
صدائے خندۂ گل آئے، فریادِ عنادل سے

☆

کہو گر جان، تو سمجھے کہ ہم کو بے وفا سمجھا
سمجھ اس بدگماں کی سارے عالم سے نرالی ہے

[میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام، سیرِ سیاح، سخنِ شعرا: ۲۳۰۔
۲۳۱، خم خانۂ جاوید، ۴: ۳۰۰۔ ۳۰۳، معاصر (۴): ۱۲۳۔ ۱۳۸،
گل دستۂ سخن، ۴۷۔ ۴۸)

حواشی

☆نواب غلام بابا خان ۴ شعبان ۱۲۵۰ھ (۶ دسمبر ۱۸۳۴ء) کوسورت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید اخی قاضیِ شہر اور درگاہِ سید جمال الدّین کے سجّادہ نشین تھے۔ جب ۲ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ (۸ مارچ ۱۸۴۸ء) کو اُن کا انتقال ہو گیا، تو اس کے بعد غلام بابا خان کی تعلیم و تربیت اُن کے بڑے بھائی سید جمال الدّین نے کی۔ اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے، لیکن شاعروں اور ادیبوں کے قدردان اور متکفل تھے۔ غالب سے بھی خط و کتابت رہی اور گاہے ماہے ان سے سلوک بھی کرتے رہے۔
۱۲ شوال ۱۳۱۰ھ (۲۹ اپریل ۱۸۹۳ء) کو انتقال کیا۔ اور اپنے خاندانی قبرستان درگاہِ حضرت سید جمال الدّین عرف خواجہ دیوانہ (داتا) میں مدفون ہوئے۔ (سخنورانِ گجرات: ۲۷۲۔ ۲۷۵)

سیّد... مفتی سیّد احمد خان بریلوی

اِن کا خاندان دراصل سنبھل کا رہنے والا تھا، لیکن اِنھوں نے نقلِ مکان کر کے پہلے بریلی میں اور بالآخر بدایوں میں توطّن اختیار کرلیا تھا۔ فاضل آدمی اور حاذق طبیب تھے۔ خدا نے حسنِ ظاہری و باطنی دونوں سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ شجاعت میں بھی فرد تھے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انگریزی حکومت کی ملازمت کرلی تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے آغاز کے وقت وہ تحصیل دار تھے۔ شورش شروع ہوئی تو اپنے وطن بریلی آگئے۔ اب اُنھوں نے کھلم کھلا سیاسی ہنگامے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا شروع کیا اور خان بہادر خان حافظ الملک حافظ رحمت خان کے پوتے کی قائم کردہ حکومت میں بریلی میں مفتی مقرّر ہوگئے۔ جب دوبارہ انگریزی تسلّط قائم ہوگیا تو یہ بھی گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا ہوگئی۔ وہیں جزیرہ انڈمان میں انتقال ہوا۔ لاولد رہے۔

غالب کے ایک دوسرے شاگرد قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی سے ان کی حقیقی بھانجی منسوب تھیں۔ ممکن ہے یہ تعلّق بھی غالب سے تلمّذ کا ذریعہ ثابت ہوا ہو۔ جنون کے نام ایک خط میں غالب نے اِن کا ذکر کیا ہے اور منشی نبی بخش حقیر کے ایک خط میں بھی ان کا نام "دستی گراں مایہ" کی حیثیت سے ہے۔ صرف دو منظوم دعائیں جو اُنھوں نے حضرت رسولِ ﷺ کے حضور میں قیامِ انڈمان کے زمانے میں لکھی تھیں، ملتی ہیں، بقیہ کلام اسی ہنگامے میں ضائع ہوگیا۔ انھیں کا انتخاب ملاحظہ ہو!

قسم ہے تجھے، اے نسیمِ سحر!
مری بے کسی پر ذرا رحم کر
میسر نہیں کوئی پیغام بر
مدینے میں ہووے جو تیرا گزر
تو میری طرف سے زمیں چوم کر
یہ کہنا بدرگاہِ خیر البشر
نبی الوریٰ! یا نبی الوریٰ!
ببیں حالِ ما، یا نبی الوریٰ!
شہا! تیرے محکوم ہیں بحر و بر
اشارے کے تابع قضا و قدر
جو آیا یمِ اعجاز کا موج پر
تو سورج کو پھیرا، کیا شق قمر
کیا دم میں اعمیٰ کو صاحب نظر
کیا رحم، اشتر کی فریاد پر
نبی الوریٰ! یا نبی الوریٰ!
ببیں حالِ ما، یا نبی الوریٰ!
بندھے بندِ آہن سے سب دست و پا
رہا بند یک چند آب و غذا
نہ سننا تھا جو کچھ، وہ سب کچھ سنا
نہ ہونا تھا جو کچھ، وہ سب کچھ ہوا
لٹا گھر، دیار و وطن بھی چھٹا
چھٹے سب کے سب دوست اور آشنا

نبی الوریٰ، یا نبی الوریٰ!
ببیں حالِ ما، یا نبی الوریٰ!
غضب ہے کہ سیّد پہ ہو یہ جفا
جو مشہور عالم میں ہو آپ کا
نہ ہو حال پر اُس کے فضلِ خدا
نہ اعدا کو ہو اس کے اب تک سزا
تعجب بہت ہے کہ ہے دیر کیا
رہا کیجیے جلد، مولا رہا!
نبی الوریٰ، یا نبی الوریٰ!
ببیں حالِ ما، یا نبی الوریٰ!

دوسری نظم کے چند شعر ہیں:

اتنے میں تصوّر کو ذرا رحم جو آیا
نقشے کئی تصویروں کے وہ سامنے لایا
اس غم میں کہ اس رشکِ قمر کو نہیں دیکھا
نالے بھی کیے کیا کہ بہت خوب سا رویا
کہنے لگا یوسف ہیں یہ موسیٰ ہیں، یہ عیسیٰ
میں نے کہا: ان میں سے کسی پر نہیں شیدا
جب سامنے کی اس نے شبیہِ شہِ بطحا
بے ساختہ اس وقت زباں سے مری نکلا
دل کو مرے تسخیر کیا اس عربی نے
مکّی، مدنی، ہاشمی و مطلبی نے
جب حشر میں ہووے گا بپا عرصۂ محشر
اور لائیں گے تشریف وہاں سارے پیمبر

عشاق سے فرمائے گا یوں خالق داور
دنیا میں کہو، کس کے لیے رہتے تھے مضطر
جو شخص کہ ہے بحرِ محبت کا شناور
محبوب کا نام لائے گا اس وقت زباں پر (کذا)
میں عرض کروں گا! مرے مولا، مرے داور!
بیٹھا ہے ترے پاس جو یہ برسرِ منبر
دل کو مرے تسخیر کیا اِس عربی نے
مکّی، مدنی، ہاشمی و مطّلبی نے

(آئینۂ دلدار : ۱۲۸، یادگارِ بریلی: ۲۷۔ ۲۸، غالب اور عصرِ غالب: ۱۲۷۔ ۱۳۵)

سیّد... قاضی سرفراز علی شاہجہانپوری

شاہجہان پور کے سیّد امانت علی کے بیٹے، محلّہ قاضی خیل کے رہنے والے تھے۔ خاندان کا مسقط الرّاس ترمذ (وسط ایشیا) تھا جہاں سے اُن کے مورثِ اعلیٰ، اللہ داد عہدِ عالمگیر (۱۶۵۸۔ ۱۷۰۷ء) میں ہندوستان آئے۔ شاہجہانپور کے مشہور قاضی صاحبان عبدالہادی اور سعد اللہ دونوں اُنھیں کے خاندان سے تھے۔ امانت علی اِن قاضی سعد اللہ کے فرزندِ ارجمند تھے، اُن کا سعد اللہ کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا، لہٰذا سعد اللہ کے بعد سرفراز علی قاضی مقرر ہو گئے۔

سرفراز علی ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں شاہجہان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی۔ اس کے بعد ان کے ماموں نیاز علی بلگرامی نے مزید تحصیل کے لیے اُنھیں دلّی بھیج دیا۔ دلّی کے شعری ماحول کے صدقے اُنھیں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ سیّد تخلص اختیار کیا۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے لیکن اپنے مذہبی رجحان کے باعث کلام زیادہ تر حمد و نعت نبی میں کہا۔

نثر بھی لکھنے کا شوق تھا اور اس میں بھی مناظرانہ قسم کی چیزوں پر زیادہ توجہ مبذول رہی۔ پادری عماد الدّین پانی پتی کی مخالفانہ کتاب ''نیاز نامہ'' کا جواب ''ہدایتِ شامہ'' لکھا تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ بھی انگریز مخالف سرگرمیوں میں شریک رہے۔ نواب خان بہادر خان نے اُنھیں شاہجہان پور میں منصف مقرر کر دیا تھا۔ امن بحال ہونے کے بعد یہ بھی گرفتار ہوئے اور کالے پانی کی سزا ہو گئی۔ روایت ہے کہ

متھرا داس سرشتہ دارِ حاکمِ پورٹ بلیر کی تحریک پر اُنھوں نے جزیرۂ انڈیمان کی ایک مبسوط تاریخ مرتب کر کے سرشتہ دار موصوف کے نام سے مشتہر کی۔ اس پر متھرا داس نے اُنھیں حاکمِ جزیرہ کرنیل بروس کے پیش کیا۔ بروس فارسی پڑھنا چاہتا تھا، اس کو موقع مل گیا اور وہ ان سے فارسی پڑھنے لگا۔

پورٹ بلیر میں اور بھی کئی قیدی تھے، ان لوگوں سے اُجرت پر مشقت لی جاتی تھی۔ اجرت کی شرح بہت کم بلکہ برائے نام تھی۔ اُن قیدیوں نے اجرت میں اضافے کا مطالبہ کیا اور جب شنوائی نہ ہوئی تو مسکوٹ کر کے کرنیل بروس کے بنگلے پر چڑھ دوڑے۔ عین ممکن تھا کہ بلوائی بروس کو یا اُس کے خاندان کو کچھ نقصان پہنچاتے۔ اتفاق سے قاضی سرفراز علی اُس وقت بنگلے میں موجود تھے۔ وہ فوراً باہر نکل آئے، اُنھوں نے ان لوگوں کو سمجھا بُجھا کے ٹھنڈا کیا اور یوں بلا ٹل گئی۔

سیّد کرنیل بروس کے استاد تو تھے ہی، اس واقعے کے بعد وہ گویا اُن کے محسن بھی بن گئے۔ اُنھوں نے صدر میں پورے واقعے کی رپورٹ لکھ کر پُر زور سفارش کی کہ سیّد کا قصور معاف کر کے اُن کی رہائی کا حکم صادر کردیا جائے۔ سفارش منظور ہوئی اور اُن کی رہائی کے احکام پہنچ گئے۔ بروس چاہتا تھا کہ یہ وہیں، انڈیمان میں کوئی ملازمت قبول کرلیں اور ہندوستان نہ جائیں۔ لیکن سیّد نے اپنے اعزّہ سے ملنے اور وطن واپس آنے کو ترجیح دی اور بروس سے معذرت کر کے ہندوستان چلے آئے۔

یہاں وطن میں طلبہ کو پڑھاتے رہے۔ پھر جب گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کی تعلیم کا انتظام ہوا، تو یہ مدرّسِ دوم کے عُہدے پر مقرر ہوگئے۔

سیّد کو حضرت رسولِ کریم ﷺ کی ذات سے عشق تھا۔ وہ مولوی عبدالرحمٰن نقش بندی سے بیعت تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن موصوف کے پوتے مولوی عبدالغفور خان نے محفلِ میلاد کا انتظام کیا۔ سیّد بھی مدعو تھے۔ جب یہ نعت پڑھنے لگے تو ان پر کچھ ایسی بے خودی کی کیفیت طاری ہوئی کہ سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ اسی حالت میں فالج کا حملہ ہوا۔ چند دن بیمار رہ کر جمادی الثانی ۱۲۹۳ھ (جون / جولائی ۱۸۷۶ء) میں

رہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ محلہ چکنی میں دفن ہوئے تھے۔

حمد و نعت میں ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ اُنھوں نے کریما کی تضمین بھی قلم بند کی تھی۔ لیکن یہ کہیں شائع نہیں ہوئی۔ روایت ہے کہ ۱۳۰۶ھ میں مولوی عبدالحکیم آروی نے اس تضمین میں کچھ معمولی ردّ و بدل کر کے یہ اپنے نام سے شائع کردی لیکن چوں کہ سیّد کی تضمین شہرت پا چکی تھی اور متعدد حضرات کے پاس اُس کی نقل موجود تھی، اس لیے عبدالحکیم آروی کے جعل کا پردہ چاک ہو گیا۔ لیکن اس بہانے یہ تضمین شائع ہو کر محفوظ ہو گئی۔

نمونۂ کلام میں یہی چند شعر ملے ہیں:

سیّد! اگر آئے تجھے مشکل بھاری
کر جا کے مزارِ شہدا پر زاری
مردہ نہ سمجھ اُن کو، ذرا آنکھیں کھول
ان سوتوں سے ہے فیض کا چشمہ جاری

☆

محشر میں خوف ہوگا جو رب کے عتاب کا
ہر شخص مُنھ تکے گا رسالت مآب کا
لب اس کے واں کھلیں گے شفاعت کے واسطے
یارا جہاں نہ ہوگا سوال و جواب کا

☆

جاں نثارِ قدمِ جانِ جہاں ہونے دو
عاشقوں میں مجھے بانام و نشاں ہونے دو
آگے اس ماہِ عرب کے نہیں پانے کے فروغ
حشر میں مجمعِ خوبانِ جہاں ہونے دو

سیّد! اس خانۂ دل میں نہ کرو آہ کو ضبط
در گہِ یار میں دیکھو نہ دھواں ہونے دو

[تاریخِ شاہجہان پور میں صراحت سے ان کے تلمذِ غالب کا ذکر نہیں، لیکن چوں کہ اُن کے ماموں سیّد نیاز علی نے اپنے بیٹوں (آلِ نبی فگار اور واجد علی) کو دلّی لا کر غالب کے حوالے کیا تھا اور سرفراز علی سیّد بھی اُنھیں کے ساتھ آئے تھے، اس لیے میرے خیال میں یہ بھی غالب ہی کے شاگرد تھے]
(تاریخ شاہجہان پور، ۲: ۲۶۶_ ۲۶۸)

شاداں و خیالی... میرزا حسین علی خان دہلوی

میرزا زین العابدین خان عارف کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ جب عارف ۱۸۵۲ء میں واصلِ حق ہوئے، تو یہ صرف دو برس کے تھے۔ چوں کہ اِن کی والدہ کا چند ماہ پہلے انتقال ہو چکا تھا، اس لیے غالب کی بیوی امراؤ بیگم اِنھیں اپنے پاس لے آئیں۔ عارف کی والدہ بنیادی بیگم (جیسا کہ عارف کے ترجمے میں بیان ہوا ہے) امراؤ بیگم کی بڑی بہن تھیں۔ حسین علی خان کے بڑے بھائی باقر علی خان جو عمر میں اِن سے تین برس بڑے تھے، عارف کی وفات کے بعد اپنی دادی لتاں بنیادی بیگم ہی کے پاس رہے تھے۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد وہ بھی غالب کے پاس آ گئے۔

حسین علی خان کی تعلیم و تربیت شروع سے غالب کی نگرانی میں ہوئی۔ چونکہ اُن کی اپنی صلبی اولاد کوئی نہیں تھی، اس لیے اُنھوں نے ان دونوں بچوں کی نہایت دل سوزی اور محبت سے پرورش کی اور اُن کے ہر طرح کے ناز نخرے برداشت کیے۔ یہ ہر وقت ان کے گلے کا ہار بنے پھرا کرتے تھے۔ میرزا جہاں کہیں جاتے یہ اُن کے ساتھ ہوتے، رام پور کے دونوں سفروں میں بھی ساتھ رہے۔

میرزا حسین علی خان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ اُردو میں تخلص شاداں تھا اور فارسی میں خیالی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تخلص راقم تھا۔ بہت کمسنی میں لکھنا شروع کیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامے کے بعد جو معرکے کا مشاعرہ ہوا تھا اور جس میں بیش تر مشہور حاضر الوقت شعرا نے حصہ لیا تھا، اس کا مجموعہ "فغانِ دہلی" کے نام سے اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا

تھا (۱۸۶۳ء)، اس مشاعرے کے وقت ان کی عمر ۹۔۱۰ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس مجموعے میں ان کا فقط یہ ایک شعر شامل ہے:

مٹ گیا، خوب ہوا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

غالب کی زندگی تک اُنھیں سے مشورہ کرتے رہے اور اُن کے بعد کم تر حالی سے اور بیش تر سالک سے اصلاح لی۔ اسی زمانے میں یہ زمرۂ شعرا ملازم ہو کے رام پور چلے گئے۔ یہ خلد آشیان نواب کلبِ علی خان بہادر کا زمانہ تھا اور اُس قدردانِ کمال کا شہرہ سن کر ہر طرح کے علوم وفنون کے ماہر رام پور میں جمع ہو گئے تھے لیکن نواب خلد آشیان نے ان تمام اصحاب کے ذمّے کچھ کام اور فرض لگا دیا تھا، تاکہ یہ لوگ احدیوں کی طرح مفت کی تنخواہ نہ کھائیں۔ شاداں بھی شروع میں پچیس یا تیس روپے کے ملازم ہو کے گئے۔ بعد کو اضافہ ہوا تو ساٹھ ملنے لگے۔

مئی ۱۸۷۶ء میں شاداں کے بڑے بھائی باقر علی خان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ محبوب بھائی کی دائمی جدائی نے اُن کا دماغی توازن بگاڑ دیا اور یہ نوکری چھوڑ کر دتی چلے آئے، بلکہ ایک طرح کے مالیخولیا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انھیں یہ توہّم ہو گیا تھا کہ شاعر کے لیے دُبلا پتلا ہونا لازم ہے اور موٹا آدمی شاعر نہیں ہو سکتا چوں کہ داغ ماشا اللہ خاصے تن و توش کے مالک تھے، اس لیے لالہ سری رام کی روایت کے مطابق شاداں کہا کرتے تھے کہ داغ کو کبھی شعر کہنا نہیں آئے گا کیوں کہ شاعری اور فربہی میں بہت بُعد ہے۔ آخری ایّام میں ان کا یہ وہم اس حد تک بڑھ گیا تھا، کہ کھانا پینا بالکل ترک ہو گیا، سیپیوں میں پانی پیتے تھے۔ قدرتاً تن درستی بالکل تباہ اور کم زوری حد سے سوا ہو گئی۔ اسی حالت میں یکم شوال ۱۲۹۶ھ (۷ ستمبر ۱۸۸۰ء) کو انتقال کیا۔ نسّاخ نے تاریخ کہی:

برفت آہ شاداں ز دُنیائے دوُں
خدایا مقامش، بفردوس باد

برائے سنِ رحلتش، خامہ ام
رقم کرد: ''شادانِ فرخ نہاد''
(۱۲۹۶ھ)

سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی اپنی خاندانی ہڑواڑ میں بڑے بھائی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ کلام جمع نہیں ہوا۔ بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ کتاب خانہ رامپور کے ایک قلمی نسخے میں کچھ شعر ہیں، جن سے متعلق خیال ہے کہ خود شاداں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ سری رام صاحب خم خانۂ جاوید نے بھی مختلف ذرائع سے کچھ کلام فراہم کر کے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے۔ بہرحال بہت کم کلام محفوظ رہ گیا۔ پختگی، محاورہ اور روزمرہ، شوخی اور تازگی اس کے نمایاں وصف ہیں۔ افسوس، عمر نے وفا نہ کی، ورنہ بہت ترقی کی صلاحیت تھی۔

تری ہر ادا پہ مرتا، تیرے ہر سخن پہ جیتا
مجھے موت زندگی پر، اگر اختیار ہوتا
مری خاک ہو تسلّی، ترے وعدۂ غلط پر
تجھے گر ہنسی نہ آتی، مجھے اعتبار ہوتا

☆

غیروں پہ ہیں وہ لطف کہ بڑھتے ہیں ہمیشہ
ہم پر یہ ستم ہے کہ سِوا ہو نہیں سکتا

☆

شاداں نے دل لگا کے بتوں سے بُرا کیا
اس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

☆

پردہ اٹھا ہوا ہے رُخِ پُر جمال کا
اڑتا ہے آج رنگ، ہمارے خیال کا

کیا اس پہ پڑ گئی، کوئی اس شوخ کی نگاہ
بدلا ہوا جو طور ہے قاصد کی چال کا

☆

عالم نہ مجھ سے پوچھیے میرے خیال کا
آئینہ بن گیا ہوں، کسی کے جمال کا
بھڑکے اگر چراغ، تو ہستی تمام ہو
ہرچیز کا کمال ہے، باعث زوال کا

☆

بھول جاؤ گے سب خوشی شاداں!
کسی غمگیں سے جب ملیں گے آپ

☆

کل ہو کے دوچار، اس نگہِ شوخ سے یارب!
آنکھوں میں ٹھہرتی ہی نہیں میری نظر آج
دیکھا ہے مری بے خودیِ شوق کو تو نے
قاصد نہ رہے گی تجھے اپنی ہی خبر آج

☆

شبِ ہجراں میں یہ تڑپا میں سحر ہونے تک
مل گیا خاک میں اس بُت کو خبر ہونے تک
گر یہی جنبشِ مژگاں کے اشارے ہوں گے
دل نکل جائے گا پہلو سے نظر ہونے تک
تم تو آتے ہی رہے بہرِ عیادت، اور ہم
مرگئے چارۂ آزارِ جگر ہونے تک

دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے اُن سے اچھی
رنگ کھل جائے گا اس کا بھی سحر ہونے تک
شام تک گریہ و زاری میں بسر ہوتی ہے
اور بھی جان پہ بنتی ہے سحر ہونے تک
جلد شاداںؔ کی خبر لے کہیں، ظالم! ورنہ
گزرے گا جان سے وہ تیرا گزر ہونے تک

☆

میں اپنی داستانِ محبت جو کہہ چکا
وہ پوچھتے ہیں مجھ سے، یہ قصّے کہاں کے ہیں
دیکھا ہے میں نے خوب، مریدوں کو شیخ کے
اچھے وہی ہیں یار، جو پیرِ مغاں کے ہیں
پہلو میں میرے، اور یہ پیدا ہوا رقیب
آثارِ عشق رُخ پہ مرے رازداں کے ہیں
شاداں چھپائے لاکھ، یہ چھپتے بھی ہیں کہیں
آثار اس کے چہرے پہ عشقِ بتاں کے ہیں

☆

اس کی شوخی سے کم نہیں شبِ وصل
گرچہ پہلا سا اضطراب نہیں
بے خودی کام آگئی آخر
کہ اُنھیں مجھ سے کچھ حجاب نہیں
خیر ہو آج بزم کی، شاداں!
کہ وہ آتے ہیں اور نقاب نہیں

☆

شرماتے ہو کہ نیند کا آنکھوں میں ہے خمار
کل کی سی بات ہی نہیں، طرزِ نگاہ میں

☆

ہو چکی شیشے میں ہے مجھ تک جو آیا دورِ جام
گردشِ قسمت تھی اپنی، گردشِ ساغر کے ساتھ

☆

کہتے ہیں عہد شکن سمجھے ہو کیا تم مجھ کو
وعدے کے ساتھ جو آتا ہے تبسّم مجھ کو
وہ ادا ہے، نہ وہ غمزہ، نہ وہ شوخی، نہ ادا
آج کچھ اور ہی آتے ہو نظر تم مجھ کو

☆

اُٹھ کر درِ جاناں سے کہو، کوئی کدھر جائے
جی سے نہ گزر جائے، تو دنیا سے گزر جائے
ساغر کشِ مے خانۂ توحید ہوں ناصح!
وہ نشہ نہیں مجھ کو، جو باتوں سے اتر جائے
رنجوریِ الفت کا مری پوچھ نہ انجام
آغاز میں وہ درد ہے، جو حد سے گزر جائے

☆

بس اب خاموش، کیا کیا کہہ چکے ہو
نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے

فارسی کا کلام کہیں سے نہیں ملا۔ تذکرۂ انتخابِ یادگار میں یہ پانچ شعر ہیں۔ پہلے دو غزل کے اور آخری دو قصیدوں میں سے، جو خلد آشیاں نواب کلب علی خان کی مدح میں کہے گئے ہیں۔

آغوشِ گور تنگ شد از بے قراریم
اے دل! زپہلوے کہ جدا گشتہ ایم ما

☆

شرم می آید خیالی راجنگِ آسماں
کایں جوانے ہست و اویک پیرِ دیریں سالہ است

☆

چہ احتیاجِ نگہباں، بہ عہدِ دولتِ اُو
کہ پاسبانِ جہان است طالعِ بیدار
اگر غلط نہ کنم ناو کش خطا نکند
رہا کند سوے عنقا اگر بہ عزمِ شکار

☆

غم نیز در خوشی ست، کہ فارغ شدہ ز کار
ہرجاے خود بہ بسترِ خواب آرمیدہ است

[انتخابِ یادگار، ۲ : ۱۲۷، خم خانۂ جاوید، ۴ : ۳۷۹ـ ۳۸۸، ذکرِ غالب : ۱۴۰ـ۱۴۲، فغانِ دہلی : ۱۵۵، نگار (رام پور) فروری ۱۹۶۴ء : ۳۱ـ ۳۸] ۔

شاکر ... سیّد محمّد عبدالرّزاق مچھلی شہری

ان کا خاندان عربی الاصل تھا۔ اِن کے آباو اجداد جزیرۃ العرب سے پہلے غزنی آئے، جہاں اب تک اِن کے سلسلے کی ایک خانقاہ موجود ہے۔ غزنی سے اِن کے مورث قاضی سنا الدّین نام شاہانِ شرقی (جون پور) کے زمانے میں واردِ ہندوستان ہوئے اور یہاں حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بعد کو اس خاندان کی دو شاخیں ہوگئیں، ایک پھلواری شریف جا بسی اور دوسری مچھلی شہر میں۔ شاکر کا تعلق اسی موخر الذکر شاخ سے ہے۔ اُن کے والد کا اسمِ گرامی سیّد عبدالوہاب تھا۔ شاکر ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ (مارچ ۱۸۳۵ء) میں پیدا ہوئے۔

شاکر عربی، فارسی کے فاضل تھے، جیسا کہ غالب کے اُن کے [illegible] کے خطوں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں زبانوں میں بے تکان لکھتے اور گفتگو کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ علمِ انساب کے بھی بڑے عالم تھے۔ اُنھیں اپنے نسب کے تحفظ کا بے حد خیال تھا۔ اپنا نسب نامہ بڑی کاوش سے جمع کیا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر عراق اور عرب اور افغانستان آدمی بھیج کر بصرفِ کثیر معلومات فراہم کیں اور اس موضوع پر کچھ رسالے بھی مرتب کیے تھے۔ چوں کہ حضرت جعفر طیار اور حضرت فاطمۃ الزہرا بنتِ رسول اللہ صلعم کی بڑی صاحب زادی حضرت زینب کی نسل سے تھے، اسی لیے کبھی کبھی اپنے نام کے ساتھ جعفری الحیدری یا جعفری الذینبی لکھا کرتے تھے۔ اپنی غزلوں کے بعض مقطعوں میں بھی اس نسب کی طرف اشارہ کیا ہے:

اڑ کے میں پہنچوں گا شاکر، خلد میں
نسل سے ہوں جعفرِ طیار کی

☆

خاندانِ شاکرِ بیکس نہ کیوں مظلوم ہو
آلِ زینب ہے، اسے میراثِ زینب چاہیے

اس کے علاوہ حضرت غوثِ اعظم سیّد عبدالقادر جیلانی سے بہت عقیدت تھی۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

محو بودم در تلاشِ کعبۂ امن و اماں
لوحش اللہ، آستانِ شاہِ جیلاں یافتم

اسی غلو کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی وصیّت میں لکھ گئے کہ میری اولاد میں سے کوئی فرد کسی غیر ہاشمی خاندان میں رشتۂ ازدواج قائم نہ کرے۔

۱۸۶۳ء میں وکالت کا امتحان دیا اور اس میں کامیابی کے بعد گورکھ پور میں وکالت شروع کی۔ اسی لیے غالب نے ایک خط میں اشرف الوکلاء کہہ کے خطاب کیا ہے۔ ۱۸۷۱ء میں گورکھ پور سے الٰہ آباد منتقل ہوگئے۔ ۱۸۷۳ء میں سرکاری ملازمت قبول کر کے منصف بن گئے اور ترقی کر کے پہلے سب جج اور پھر عدالتِ خفیفہ کی ججی کے عہدوں پر مامور رہے۔ دورانِ ملازمت میں بہت دن تک الٰہ آباد میں قیام رہا۔ یہیں غالب کے دوست اور مہربان خواجہ غلام غوث خان بہادر بے خبر☆ سے ملاقات ہوئی۔

۱۸۹۴ء میں علی گڑھ میں تھے، جب ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ اس کے بعد وہیں سکونت اختیار کر لی۔

تقریباً اسّی برس کی عمر میں جون ۱۹۱۴ء میں اپنے وطن مچھلی شہر میں انتقال کیا۔ طلبِ علم اور علم دوست اصحاب سے استفادے کا شوق، اخیر تک نہیں چھوٹا۔ آخری ایام میں جب کہ کان آنکھ بالکل جواب دے چکے تھے، کتاب پڑھوا کر سنتے اور احباب کی خاطرداری میں مشغول رہتے۔ جسمانی یادگار تین صاحب زادے چھوڑے۔ سب سے بڑے سیّد محمد تقی تھے۔ یہ بھی تعلیم پوری کر کے سرکاری ملازم ہوگئے تھے، اخیر عمر میں ریاستِ جے پور میں نو برس تک وزیرِ مال رہے اور وہیں ۱۹۲۲ء میں انتقال فرمایا۔

اُن سے چھوٹے سیّد علی نقی علی گڑھ میں ایڈووکیٹ اور مسلم یونی ورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے، یہ ۱۹۲۳ء میں جنّت سدھارے۔ سب سے چھوٹے محمد ہادی (ہادی مچھلی شہری) شاعر تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ اُردو مجموعۂ کلام ''نوائے دل'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ ان کا اواخر ۱۹۶۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ لیکن کبھی دیوان مرتب کرنے کا خیال نہیں کیا۔ اس لیے چند غزلوں کے سوائے سارا کلام ضائع گیا۔ اُن ہی کا انتخاب درجِ ذیل ہے۔ پہلے فارسی سنیے، جس میں نمک زیادہ ہے:

غالب کی مشہور غزل ہے:

دُودِ سودائی تتق بست آسماں نامیدمش
دیدہ برخوابِ پریشاں زد، جہاں نامیدمش

اسی زمین میں شاکر کی ایک غزل ہے۔ اس کے چند شعر ہیں:

سربمن دادند و من بارِ گراں نامیدمش
سُودِ ایں عالم نمودندم، زیاں نامیدمش

من سرودم نغمۂ وصفت ہزار آواشدم
غیر در مدحِ تو دم زد، باد خواں نامیدمش

روزیم صدرہ بہ یُمن میہماں چوں دست داد
خویش رامہماں نوشتم، میزباں نامیدمش

حضرتِ دہلی مقامِ حضرتِ غالب چوشد
غیرتِ شیراز و رشکِ اصفہاں نامیدمش

مولوی غلام امام شہید کا ایک بہت مشہور شعر ہے:

ہر کجا تخمِ محبت کاشتیم
خاک ہم برباد رفت و دانہ ہم

اسی زمین میں شاکر کی غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

بادہ ہست و شیشہ و پیمانہ ہم
کاش بودے ساقیِ مستانہ ہم
ہر یکے در دورِ چشمش شد خراب
میفروش و میکش و پیمانہ ہم
درشبِ ہجرِ تو داغِ دل گم است
شد خموش امشب چراغِ خانہ ہم
ہر کسے در عشقِ تو، از من برید
آشنا ہم، خویش ہم، بیگانہ ہم
دید شاکر ابروے خمدارِ یار
شکر کرد و سجدۂ شکرانہ ہم

قدسی کی مشہور نعت کی تضمین لکھی تھی، جس کی تعریف غالب نے اپنی اور آزردہ کی طرف سے لکھی ہے، یہ مجموعہ "حدیثِ قدسی" میں بھی شامل ہے اور چند شعر ملاحظہ ہوں:

جبہہ اش را غیرتِ خورشیدِ تاباں یافتم
چشم راچشمک زنِ چشمِ غزالاں یافتم
خالِ مشکین ست بر لعلِ لبِ جاناں مقیم
زنگیے را حارسِ شہرِ بدخشاں یافتم

☆

آفتابِ حشر باشد روے تو
نامۂ اعمالِ من گیسوے تو
مرحبا برزخمِ دامن دارِ من
آفریں برقوتِ بازوے تو

مثلِ خسرو گشت شاکرؔ را ہمیں
''غمزۂ تو، چشمِ تو، ابروے تو''

☆

بادہ و معشوق ایمانِ من است
مے پرست و بت پرستم یللّی
بادۂ وحدت مرا از خود ربُود
سرخوشِ عہدِ الستم یللّی
نیست شاکر نشۂ افلاس تو
از ازل من فاقہ مستم یللّی

☆

بے مہری و بے لطفی و کج خلقی و نفرت
کیا کیا نہ مرے یار نے اغیار سے سیکھا
گرنا کبھی، اٹھنا کبھی، رہ رہ کے چمکنا
بجلی نے مری آہِ شرر بار سے سیکھا

☆

بادہ پیمائی میں مجھ سا رندِ مشرب چاہیے
قلزمِ مے میرے ساغر میں لبالب چاہیے

☆

تاک میں ہوں ساغرِ سرشار کی
اس میں کیفیت ہے چشمِ یار کی
ہیچ ہے دنیا، ولے با ایں ہمہ
دھوم ہے عالم میں اس مُردار کی

[اردوئے معلّٰی (ماہنامہ) دسمبر ۱۹۱۲ء مکتوباتِ ہادی مچھلی شہری

بنامِ مؤلف]

حواشی

☆۔ خواجہ غلام غوث خان بے خبر، نجیب الطرفین، خواجہ حضور اللہ بن خواجہ خیر الدّین کشمیری کے بیٹے تھے، دادھیالی سلسلۂ نسب سلطان زین العابدین والیِ کشمیر تک پہنچتا ہے۔ ناںھیال کی طرف سے خواجہ داؤد خاکیؔ ان کے اجداد میں سے تھے۔ ان کے بزرگ خاندانِ مغلیہ کے زمانے میں بالعموم قضا کے عہدوں پر فائز رہے۔ جب ملازمت کا سلسلہ ہاتھ سے جاتا رہا تو تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔

بے خبر ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۳۵ء میں نیپال میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے جب ان کے والد نقلِ مکان کر کے ہندوستان آئے اور بنارس میں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ بے خبر کی نشوونما اور تعلیم و تربیت اسی شہر میں ہوئی پہلے لیفٹیننٹ گورنر غرب و شمال کے نائب میر منشی اور بعد کو میر منشی ہوئے۔ ۴۴ برس تک نیک نامی سے ملازمت کرنے کے بعد ۱۸۵۵ء میں پنشن پائی۔ ''خان بہادر'' اور ''ذوالقدر'' خطاب ملے۔ اُردو سے کم اور فارسی سے زیادہ شغف تھا۔ فارسی نظم و نثر کا ایک مجموعہ ''خونابۂ جگر'' کے نام سے اور اردو خطوط فغانِ بیخبر (۱۸۹۱ء) کے نام سے اُن کی زندگی میں چھپے۔ بقیہ کلامِ نظم و نثر اُن کی وفات کے بعد ایک عزیز مولوی خواجہ حسین الدّین بناری نے ''رشکِ لعل و گہر'' کے عنوان سے ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں شائع کیا تھا۔ ۱۸ شوال ۱۳۲۲ھ (۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء) کو الہ آباد میں انتقال کیا۔ وہیں حسن منزل کے قبرستان میں اپنی والدہ کی پائینتی دفن ہوئے۔ لوحِ مزار پر جو قطعۂ تاریخ ہے، اس کا آخری شعر ہے:

رضوانش دیدہ گفت کہ ایں نو رسیدہ کیست
گفتند حوریانِ جناں ''خواجۂ بہشت''
(۱۳۲۲ھ)

(بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ بے خبر دائرۂ شاہ محمدی، الہٰ آباد میں دفن ہوئے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ صحیح قبرستان حسن منزل ہی ہے) (صحیفۂ زرّیں (آگرہ اُودھ): ۱۰۳۔ ۱۰۵، خم خانۂ جاوید، ۱: ۶۴۷۔ ۶۴۸، انشائے بے خبر (دیباچہ، مکتوب جناب جلال الدّین مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء از الہٰ آباد)

شائق... شاہ سردار گیلانی

یہ سیّد محمد شاہ گیلانی متوطن لاہور کے بیٹے تھے۔ زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے، صاحب دیوان تھے۔ غالباً ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں انتقال ہوا۔

ندید از عشق خالی لامکاں راہم نگاہ (کردم)
خدا ہم نیست بے معشوق، پیغمبر گواہ (کردم)

☆

تشبیہ [اُس کے] کاکلِ پُر پیچ و تاب کی
تصویر کیا کھنچی ہے مرے اضطراب کی

(تذکرۂ بشیر بحوالہ مضمون ''غالب اور تلامذۂ غالب'' از مشفق خواجہ مشمولہ اردو سہ ماہی، کراچی، ۴۵: ۱: ۲۳۸۔ ۲۳۹)

شائق... سیّد شاہ عالم مارہروی

اِن کے اجداد زیدی سیّد تھے۔ اُن میں سے سیّد حسین حکومتِ وقت کے خلاف اظہار نارضامندی کے لیے بطورِ احتجاج ترکِ وطن کر کے واسط (عراق) میں آمقیم ہوئے۔ اُن کی اولاد میں سیّد ابو الفرح واسطی سب سے پہلے محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے لیکن مختصر قیام کے بعد وطن واپس چلے گئے۔ اِس کے بعد اُن کے پوتے سیّد محمد جعفری خاندانِ غلامان کے دوسرے بادشاہ التمش (۱۲۱۱۔ ۱۲۳۲ء) کے عہد میں واردِ ہندوستان ہوئے۔ وہ حضرت خواجہ قطب الدّین بختیار کاکیؒ کے مرید تھے۔ التمش نے اُنھیں بلگرام اور ملحقات کا علاقہ جاگیر میں عطا فرمایا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے اپنے اہل و عیال کو بھی واسط سے یہاں بلا لیا اور یوں یہ خاندان مستقلاً یہیں کا ہوگیا۔ میر عبدالواحد بلگرامیؒ کے زمانے تک خاندان بلگرام ہی میں قیام پذیر رہا۔

سب سے پہلے جو صاحب بلگرام سے نکلے، وہ میر عبدالواحد کے بڑے صاحب زادے سیّد عبدالجلیل بلگرامی تھے۔ انھوں نے عہدِ جہانگیری (۱۶۰۵۔ ۱۶۲۷ء) میں بلگرام کو خیرباد کہہ کے مارہرہ میں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں اُن کی خاصی آؤ بھگت ہوئی۔ ان کے معتقدین نے اُن کے لیے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرا دی، یہیں ان کی دوسری شادی بھی ہوگئی۔ اُن کے انتقال (۸ صفر ۱۰۵۷ھ/ ۵ مارچ ۱۶۴۷ء) کے بعد اُن کی بلگرامی بیوی کے فرزند سیّد شاہ اویس سجادہ نشین ہوئے۔ اُن کی اولاد مارہرہ میں آج تک موجود ہے۔

شاہ اویس کے بڑے صاحب زادے شاہ برکت اللہ بڑے پائے کے بزرگ

ہوئے۔ ایک کثیر تعداد نے اُن سے رُشد و ہدایت حاصل کی۔ شاہانِ وقت نے بھی ہر طرح سے عقیدت و ارادت کا اظہار کیا۔ عوام و خواص کا بڑا طبقہ اُن کے مریدوں میں شامل ہوگیا۔ محمدؔ شاہ بادشاہ نے اُنھیں متعدد دیہات خانقاہ کے خرچ کے لیے معافی میں دیے۔ شاہ برکت اللہ اپنی روحانی صلاحیتوں کے علاوہ شعر کا بھی شوق رکھتے تھے۔ فارسی میں تخلّص عشقی تھا اور ہندی میں پیمی۔ دونوں زبانوں میں قلمی دیوان اُن کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ اُن کا یومِ عاشورہ محرم ۱۱۴۲ھ (۲۵ جولائی ۱۷۲۹ء) کو انتقال ہوا۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ شاہ آلِ محمدؔ بڑے اور شاہ نجات اللہ عرف شاہ میاں چھوٹے۔ مارہرہ میں اس خاندان کی دو درگاہیں ہیں۔ سرکار کلاں اور سرکارِ خُرد، یہ بالترتیب اِنھیں دونوں حضرات سے منسوب ہیں۔

سیّد شاہ نجات اللہ ۱۱۱۷ھ (۱۷۰۵۔ ۱۷۰۶ء) میں بلگرام میں پیدا ہوئے اور یکم شوال ۱۱۹۰ھ (۱۳ نومبر ۱۷۷۶ء) کو مارہرہ میں فوت ہوئے۔ ان کا عقدِ نکاح اپنے چھوٹے چچا سیّد شاہ رحمت اللہ کی بیٹی سے ہوا تھا، اولاد میں سیّد امام عرف شاہ گدا اور سیّد شاہ مقبول عالم عرف شاہ سوندھا اور ایک صاحب زادی ہوئے۔ اُن کے علاوہ حرم ہائے مختلفہ سے پانچ بیٹے اور تھے۔ لیکن سجّادہ نشینی کا حق خاندانی بیگم کی اولاد یعنی دونوں مندرجہ صدر صاحب زادگان ہی کو ملا۔

شاہ سیّد امام کی ولادت ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵۔ ۱۷۲۶ء) میں ہوئی اور وفات ۱۲۰۵ھ میں (۱۷۹۰۔ ۱۷۹۱ء)۔ انھوں نے اپنے پیچھے دو بیٹے چھوڑے۔ سیّد شاہ برکات بخش بھکاری صاحب اور سیّد نجات بخش فقیر صاحب۔

چھوٹے صاحب زادے سیّد مقبول عالم شاہ سوندھے ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷۔ ۱۷۲۸ء) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے صرف ایک بیٹا سیّد مخدوم عالم پیارے صاحب اور ایک بیٹی تھی۔ ۲۹ شعبان ۱۲۱۳ھ (۵ فروری ۱۷۹۹ء) اُن کی تاریخِ وفات ہے۔ اُن کے بعد سیّد مخدوم عالم شاہ سجّادہ نشین ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: سیّد سلطان عالم اور سیّد صاحب عالم۔ یہی وہ سیّد صاحب عالم ہیں جن کے نام غالب کے خطوط

عودِ ہندی اور اُردوئے معلّٰی میں موجود ہیں۔ یہ[1] ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۱۱ ھ (۲۹ اکتوبر ۱۷۹۶ء) کو بلگرام میں پیدا ہوئے، لفظ ''تاریخ'' سے سالِ ولادت (۱۲۱۱ھ) نکلتا ہے۔ اُنھوں نے ایک مرتبہ غالب کو لکھا کہ میری پیدائش کا سال لفظ ''تاریخ'' سے برآمد ہوتا ہے، تو چوں کہ غالب کی اپنی تاریخِ ولادت ۱۲۱۲ھ تھی، انھوں نے لکھا:

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا
ان کی ''تاریخ'' میرا ''تاریخا''
(۱۲۱۱)　　　(۱۲۱۲)

سیّد صاحبِ عالم کا عقدِ نکاح سیّد نجات بخش فقیر صاحب (بن سیّد شاہ گدا صاحب) کی دخترِ نیک اختر سے ہوا تھا۔ اُن سے آپ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹوں کے نام ہیں: شاہ سیّد عالم۔ سیّد شاہ عالم، سیّد مقبول عالم۔ یہی منجھلے ہمارے صاحبِ ترجمہ سیّد شاہ عالم شائق ہیں۔ غالب کے خطوں میں تینوں بھائیوں کا ذکر بار بار آیا ہے۔

سیّد صاحب عالم کی بڑی بیٹی سیّد عبدالحیٔ عرف سیّد احمد بلگرامی سے منسوب ہوئیں۔ غالب کے ایک اور مشہور شاگرد سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی اسی بیٹی کی اولاد تھے۔ سیّد صاحب عالم شاعر بھی تھے۔ صاحب تخلّص تھا۔ اردو میں کم اور فارسی میں زیادہ کہا اور اس فن میں میرزا محمد حسن قتیل[2] کے علاوہ اپنے ماموں سیّد افتخار علی بلگرامی ذرّہ تخلّص سے بھی اصلاح لی، ۷۷ برس کی عمر میں ۲ محرم ۱۲۸۸ھ (۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء) کو مارہرہ میں انتقال کیا اور وہیں درگاہ شریف کے گنبد میں غربی جانب دفن ہوئے۔ شاہ علی احسن، احسن مارہروی مرحوم ان کے پر پوتے تھے۔

افسوس کہ سیّد شاہ عالم کے زیادہ حالات نہیں ملے۔ وہ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۲۰ اکتوبر ۱۸۸۵ء/ ۱۱ محرم ۱۳۰۳ھ کو ہوا۔ لاولد فوت ہوئے۔ یہ بھی اپنے والد کے پہلو میں غربی دالان میں مدفون ہیں۔

ان کے بھانجے سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی (شاگردِ غالب) کے ہاں ۹ ربیع الثانی

۱۲۸۳ھ کو صاحب زادہ ہوا۔ جس کا نام نور احمد رکھا گیا تو اس کی تاریخِ ولادت کہی:

چوں نشوم شاد، کہ ناگہ زشرق
مژدہ رساں پیکِ صبا آمدہ
گفت، کہ درخانۂ شمس الضحیٰ
رشکِ سُہا، بدرالدجیٰ آمدہ
ہاں بوجود آمدہ پورِ صفیر
کو ہمہ تن ذہن و ذکا آمدہ
شائق شاداں پے تاریخِ طفل
گفت : ''زہے شمس ضحیٰ'' آمدہ

(لطف یہ ہے کہ خود صفیر کا تاریخی نام شمس الضحیٰ ہے)

[جلوۂ خضر، ۲ : ۲۰۷، خاندانِ برکات : ۲۳۔۳۴، قاموس المشاہیر، ۲ : ۲۵، غالب اور عصرِ غالب : ۱۱۱۔ ۱۲۱، اردو ادب (اکتوبر، دسمبر۱۹۵۴ء) : ۱۱۳]

حواشی

☆۱۔ یہ ''خاندانِ برکات'' کی روایت ہے، جو خود ان کے خاندان کے ایک فرد کی تالیف ہے۔ اس کے مقابلے میں تذکرہ خازن الشعرا میں تاریخ ولادت ۱۶ ربیع الثانی ملتی ہے۔

☆۲۔ قتیل پیدائشی ہندو تھے۔ اصل نام دیوانی سنگھ تھا۔ بعض لوگوں نے کائستھ لکھا ہے، حالانکہ وہ بھنڈاری کھتری تھے۔ والد کا نام درگاہی مل اور بزرگوں کا وطن بٹالہ (ضلع گورداسپور۔ پنجاب) تھا۔ قتیل کے پر دادا نقلِ مکان کر کے باغ پت چلے آئے تھے۔ قتیل ۱۱۷۲ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے اور ۱۴ برس کی عمر میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تعلیم سے متاثر ہو کر فیض آباد میں اسلام قبول کیا۔ مرزا محمد حسن نام ہوا۔ دو برس تک اسے مخفی رکھ کر ۱۷ برس کی عمر میں اعلان عام کردیا۔ اپنے استاد شہید کی رعایت سے قتیل تخلص اختیار کیا۔ کچھ مدت کے لیے نواب سعادت علی خاں کی سرکار کے متوسلین میں شامل رہے، تو امامیہ مذہب کے پیرو بن گئے۔ بمرضِ استسقا بروز شنبہ ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ (۳۱ جنوری ۱۸۱۸ء) لکھنؤ میں بوقتِ صبح انتقال کیا۔ نساخ نے

تاریخ کہی:

سالِ ترحیل قتیل اے نساخ
گفتہ ام "شہرۂ آفاق قتیل" (۱۲۳۳ھ)

متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے رقعات اور چار شربت اور نہر الفصاحت زیادہ مشہور ہیں اور مدتوں درس میں شامل رہیں۔ انشا کی دریائے لطافت کی تصنیف میں بھی شامل رہے۔ مصحفی کے بھی بہت گہرے دوست تھے۔ مصحفی نے تذکرہ عقدِ ثریا انھیں کی فرمایش پر لکھا تھا۔

(نشترِ عشق: ۵۴۸۔۵۵۰ ب؛ عقدِ ثریا: ۴۶؛ شمعِ انجمن: ۳۹۰۔۳۹۱، خلاصۃ الافکار: ۵۷۳)

شائق... خواجہ فیض الدّین حیدر عُرف حیدر جان جہانگیر نگری

معزز خاندان کے فرد، خواجہ خلیل اللہ خان کشمیری کے بیٹے☆ اور جہانگیر نگر (ڈھاکا) کے رہنے والے تھے۔ سر عبدالغنی سے بھی عزیزداری تھی۔ غالبًا دتی اور کلکتے بھی آئے تھے اور ممکن ہے کہ غالب سے اُن کے قیامِ کلکتہ کے دوران میں ملاقات بھی ہوئی ہو۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک مختصر دیوان یادگار چھوڑا تھا، جو اب نہیں ملتا۔ خطوط کا بھی ایک مجموعہ قلمی صورت میں موجود ہے۔

تجھے عرش کا جس نے تارا بنایا
اسی نے بد اختر ہمارا بنایا
اسی نے کیا ہم کو رسوائے عالم
کہ جس نے تجھے عالم آرا بنایا
یہاں نالۂ بے اثر ہم کو بخشا
وہاں دل ترا سنگِ خارا بنایا
دیا درد وہ ہم کو گردوں نے شائق!
کہ تدبیر جس کی، نہ چارا بنایا

☆

جس کی ٹھوکر سے جی اُٹھے مُردے
اس کی رفتار نے ہمیں مارا

☆

یوں یہ تنِ خراب بنا، اور بگڑ گیا
جیسا کہ بس حباب بنا، اور بگڑ گیا

☆

مری فسق و فجور میں عمر کٹی، کوئی حُسنِ عمل تو کیا ہی نہیں
یہی فکر ہے دیکھیے کیا ہو وہاں، بجز اس کے تو اور پناہ ہی نہیں
کوئی رفتۂ ملکِ عدم نہ پھرا، کہ جو پوچھوں وہاں کا میں حال ذرا
ہے مقام عجب، کہ وہ کیسی ہے جا، جو گیا سو وہاں سے پھرا ہی نہیں
مجھے بھائی تھی دشتِ جنوں کی فضا، مرے دل میں بھرا وہ ذوق و مزا
گئے باغِ جنوں میں جو ایک ذرا، دلِ شائقِ خستہ لگا ہی نہیں

☆

کیا کہیں تجھ بن کیا کیا، ہم نے ساری رات کی
انتظاری، بے قراری، آہ و زاری رات کی
یاد میں اس سرو قامت کے یہاں تک روئے ہم
جوئے خوں چشموں سے شائقؔ! ہم نے جاری رات کی

☆

صبا! اس سے کہیو کہ تجھ کو خبر ہے
بہت حال شائقؔ کا تیرے بتر ہے
ہوا خواہ تھا میں کبھی جس چمن کا
یہ اڑتی سی پہنچی وہاں کی خبر ہے

نہ چلتی تھی جس جا نسیمِ سحر بھی
صبا کا وہاں آج شائق گزر ہے

☆

شیشہ گر کیا ہے بنا تجھ سے جو پتھر شیشہ
اشک کا اس سے بناتا ہوں میں بہتر شیشہ

☆

مت لے خدا کے واسطے نخچیر ہاتھ میں
دل کو ہمارے پہلو سے لے چیر ہاتھ میں
سودا ہے اس کی کاکلِ پیچاں کا سر میں آہ
ہو زلفِ یار کی مری زنجیر ہاتھ میں

فارسی کا نمونہ یہ ہے۔ پہلے حافظ کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو:

چند گویم شکوۂ آرام را
چند نالم بختِ نا فرجام را
مطربا جنبش کہ یابم کام را
ساقیا برخیز و دردہ جام را
خاک بر سر کن غمِ ایام را

ایک قصیدے کے چند شعر ہیں، جو نواب سر عبدالغنی بہادر کے فرزند رشید نواب سر احسن اللہ بہادر کی ولادت پر لکھا تھا:

للہ الحمد، کہ آمد بجہاں عہدِ بہار
خرم و شاد وہمہ تازہ و تر شد گلزار
از سما تا بہ سمک ہست ہجومِ اقبال
ہمچو عنقا شدہ معدوم وجودِ ادبار

نازد از زادنِ او مادرِ گیتی برخود
فخر صد فخر زماں را ز وجودش پندار
ہر زماں گردِ سرش چرخ بلا گردان ست
ہست از بہرِ ہمیں گردشِ چرخِ دوّار
فکرِ تاریخ چو کردیم "امیرِ اعظم"
ایں ندا آمدہ از غیب بگوشِ منِ زار
(۱۲۶۴)

☆

مسیحِ جہان است و جانِ منست ایں
ہمانا کہ روح و روانِ منست ایں
نہ پُرسید گاہے زحالِ دروںم
ادائے بُتِ بدگمانِ منست ایں
ہمیں بس بود خوں بہا، بعدِ قتلم
بفرما کہ "از کشتگانِ منست ایں"

[سخنِ شعرا : ۲۴۱، مشرقی بنگال میں اُردو : ۳۰۔ ۳۳، مشرقی پاکستان کے اردو ادیب : ۲۵۔ ۲۹، نگارستانِ سخن : ۴۵، سراپا سخن : ۱۹۷، تواریخِ ڈھاکا : ۲۳۷، نسخۂ دلکشا : ۱۴۱، مآثرِ غالب]

حواشی

☆۔ نسخۂ دل کشا میں والد کا نام خواجہ علیم اللہ لکھا ہے، جو غلط ہے۔

شرر... سیّد محمّد علی دہلوی

نصیر الدّین نقش حیدرآبادی اپنے تذکرے ''عروس الاذکار'' (مرتبہ ۱۲۹۲ھ) میں لکھتے ہیں:

شرر تخلص سیّد محمّد علی ابن میر ولایت علی ساکن دہلی، شاگرد اسد اللہ خان غالب، وارد حیدرآباد شدہ بود۔ اور است:

اس کے دہن پہ میرا دہن کل کی رات تھا
میں مثلِ خضر مالکِ آبِ حیات تھا،

افسر صدیقی امروہوی، کراچی نے اس پر حاشیہ لکھا ہے:

عبدالقادر مہر سقاف نے گلزار میں ان کا نام غلام محمّد علی لکھا ہے اور ایک غزل نقل کی ہے، جس کا مطلع و مقطع یہ ہے:

دیکھا ہوں کس کے گوہرِ دنداں کو خواب میں
نیساں کا حال ہے مری چشمِ پُر آب میں
راحت ملے گی مجھ کو شرر! زیرِ خاک بھی
مرجاؤں گر میں دوستیِ بوتراب میں

[مضمون ''تلامذۂ غالب'' از تحسین سروری مشمولۂ سہ ماہی صحیفہ، لاہور۔ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۳]

شفق... انور الدّولہ، سعید الملک نواب محمّد سعد الدّین خان صولت جنگ (عُرف منجھلے صاحب) رئیسِ کالپی

بڑے عالی خاندان کے نام لیوا تھے۔

آصف جاہ اوّل اُن کے جدِ اعلیٰ تھے، جن کے والد میر شہاب الدّین غازی الدّین خان فیروز جنگ نے اپنی زندگی میں اجمیری دروازہ، دلّی کے باہر اپنا مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ اسی عمارت میں بعد کو مشہور مدرسۂ غازی الدّین خان کی بنیاد رکھی گئی، جو بتدریج ترقی کر کے دلّی کالج کہلایا۔

آصف جاہ اوّل کے پوتے وزیر الملک، عماد الملک میر شہاب الدّین خان غازی الدّین خان بہادر ثانی تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ نظام تخلّص تھا۔

عماد الملک دورِ مغلیہ کے ایامِ زوال و انحطاط کی بہت اہم شخصیت ہے۔ شاہ احمد شاہ اسی کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوا۔ اُس نے بادشاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں اور اسے تخت سے اُتار کر اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو بٹھا دیا لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ اس کا سارا اقتدار دربار کی سازشوں کی نذر ہو گیا اور اسے دلّی سے جان بچانے کی خاطر نکلنا پڑا۔ وہ بھرت پور سے ہوتا ہوا فرّخ آباد پہنچا۔ نواب نے کچھ علاقہ جاگیر میں عطا کیا اور یوں قدرے عافیت کا سامان ہو گیا۔ لیکن یہاں کا دانہ پانی بھی

زیادہ دن قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ اب کی نکلے، تو مرہٹوں کی پناہ میں پہنچے۔ ظاہر ہے کہ دربارِ دلّی اور اس کے امرا کی ریشہ دوانیاں مرہٹوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھیں۔ یوں عماد الملک کو چین کا سانس نصیب ہوا۔ مرہٹوں نے انھیں کالپی اور کدورہ کا علاقہ جاگیر میں دے دیا جس سے یہ خاندان مستقلاً یہیں کا ہو گیا۔ عماد الملک کا ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰۔ ۱۸۰۱ء) میں انتقال ہوا۔

شفق اِنھیں عماد الملک کے پر پوتے تھے۔ یعنی عماد الملک کے بیٹے نواب ناصر الدّولہ بہادر ناصر تخلّص تھے اور ناصر کے بیٹے نواب احمد بخش خان بہادر بیتاب۔ یہی بیتاب ہمارے صاحبِ تذکرہ کے والد تھے۔

شفق جس خاندان کے چشم و چراغ تھے، اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن کی تعلیم کا معقول انتظام ہوا ہوگا۔ جب شعر گوئی کا شوق ہوا، تو اوّل سیّد امجد علی قلق☆[۱] سے مشورہ رہا، بعد کو بذریعۂ خط و کتابت غالب سے اصلاح لیتے رہے لیکن دونوں میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ شفق نے ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۰۔ ۱۸۸۱ء میں انتقال کیا۔ اپنے پیچھے اولادِ جسمانی میں چار بیٹے چھوڑے۔

صاحبِ دیوان تھے۔ دو مثنویاں ''چشمۂ فیض'' (۳۸۴ شعر) اور ''شعلۂ جان سوز'' مطبوعہ ہیں (مطبع مسیحائی، کان پور) حضرت رسولِ کریم کی مدح میں ایک مولود منظوم ''مخزن السعادت'' ۱۸۵۳ء میں شائع کیا تھا۔ ایک ''قصۂ مہر و ماہ'' نظم اُردو میں تصنیف کیا تھا (۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸۔ ۱۸۴۹ء) ان کے علاوہ ایک ''مثنویِ بہار'' بھی تھی، اس کی تاریخِ تصنیف میر امجد علی قلق نے کہی تھی۔

بلبلِ طبعِ شفق زد ایں نوا
''طرفہ دیرِ حسن و عشقِ جانفزا''
(۱۲۴۴)

ان کے چھوٹے بھائی خواجہ نور الدّین خان عرف سانولے صاحب بھی شاعر تھے اور شفیق اور فروغ دو تخلّص کرتے تھے۔ یہ بھی شفق کی طرح قلق ہی سے اصلاح

لیتے تھے۔ شفق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

آرزو دل کی نہ اے شوقِ شہادت نکلی
سخت جانی سے مری خنجرِ قاتل ٹوٹا

☆

ہوا ہے کس سے الٰہی، مقابلہ دل کا
کہ رشکِ ساغرِ جم ہے ہر آبلہ دل کا

☆

ہاتھ دکھلا کے مجھے دیوانہ و مفتوں کیا
ہیں لکیریں یا کہ ہے نقشِ محبت ہاتھ میں

☆

یاد ہے چشمۂ خنجر کی روانی مجھ کو
کر دیا نزع میں کس لطف سے پانی مجھ کو

☆

ایسا تھا شوقِ وادیِ وحشت کہ دوڑ کر
بوسے ہمارے آبلوں نے خار کے لیے
یہ ضعف ہے کہ سانس کا لینا محال ہے
بارِ گراں ہے روحِ تنِ زار کے لیے

☆

مقامِ عشق میں غفلت ہے عین ہشیاری
کہ رہنمائے زلیخائے زار خواب ہوا

☆

بگولے لیتے ہیں تعلیم مجھ سے، ہرزہ گردی کی
کہ آندھی ہوں میں، صحرائے جنوں کی خاک اڑانے میں

☆

حوصلے دل میں تڑپنے کے ہیں کیا کیا، دیکھیے
ذبح کر کے رقصِ بسمل کا تماشا دیکھیے

☆

گھر سے وحشت میں نکلتے ہی وطن بھول گئے
یہ فضا دشت کی دیکھی، کہ چمن بھول گئے

[گلستانِ سخن : ۲۸۹۔ ۲۹۰، سخنِ شعرا : ۲۴۸۔ ۲۴۹، ۲۵۰، ۳۶۶، خم خانۂ جاوید، ۵ : ۷۰۶، نادراتِ غالب، ۱ : ۱۶۴ ایضاً، ۲: ۱۴۳۔ ۱۴۴، تحریر، غالب نمبر (۱۸) : ۱۴۱۔ ۱۴۶، مکتوب ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس]

حواشی

☆۔ سیّد امجد علی قلق جناب سیّد محمدؐ علی کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا لیکن نقلِ مکان کر کے لکھنؤ میں مقیم ہوگئے۔ قلق خود کدورہ کالپی میں رہتے تھے۔ کلام پر اصلاح فخر الملک نواب میر منو بیتاب سے لی۔ صاحب دیوان ہیں۔ (سخن شعرا : ۳۸۷)

شوخی... مولوی مظفّر حسین خیّر آبادی

[دیباچۂ دیوانِ اثر (امام الدین خان چشتی)، کتاب ہذا : ۳۱]

شوخی، شوخ... نادر شاہ خان رامپوری

اُن کے والد محمد ضامن خان، رام پور کے پٹھان تھے، لیکن شوخی دتی میں پیدا ہوئے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اُن کی غالب سے ملاقات اور شاگردی کا دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب میرزا ۱۸۶۰ء میں فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خان بہادر کی دعوت پر رام پور تشریف لے گئے، تو شوخی وہاں موجود تھے۔ یہ غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح کی درخواست کی۔ میرزا کا یہ اصول تھا کہ چوں کہ میں دربارِ رام پور کا وظیفہ خوار ہوں، اس لیے رام پور میں والیِ رام پور کی اجازت کے بغیر کسی کو شاگردی میں قبول کرنا ٹھیک نہیں۔ اُنھوں نے شوخی کو بھی یہی جواب دیا اور اُن کے کلام پر اصلاح دینا منظور نہ کیا۔ شوخی اس جواب سے مایوس تو بہت ہوئے، لیکن ہمت نہیں ہارے۔ چند دن بعد جب پھر خدمت میں حاضر ہوئے، تو میرزا نے کہا کہ شراب کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اور یہ صرف مراد آباد میں مل سکتی ہے اور ملازموں میں کوئی بھی اس اہم خدمت کے سرانجام دینے کا اہل نہیں۔ شوخی نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ گھر آئے، منت سماجت کر کے والد سے دام لیے اور ایک کی جگہ پانچ بوتلیں لا کر غالب کی خدمت میں پیش کر دیں جب غالب نے قیمت ادا کرنا چاہی، تو اُنھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اگلے دن جب یہ پھر حاضر ہوئے تو میرزا نے پوچھا کہ بھئی، وہ تمھاری غزل کہاں ہے، جس پر تم اصلاح لینا چاہتے تھے! اُنھوں نے جھٹ سے کاغذ جیب سے نکال کے سامنے رکھ دیا۔ میرزا نے جگہ جگہ اصلاح دی اور ساتھ ساتھ اصلاح کے وجوہ بیان کرتے گئے۔ اس کے بعد جب میرزا دتی چلے آئے تو یہ دتی میں بھی ان

کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ شوخی نے غالب سے زیادہ استفادہ نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ دس پانچ غزلوں پر اصلاح لی ہوگی۔ شوخی کے علاوہ کبھی کبھی شوخ تخلص بھی کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں سر رشتہ دارِ بندوبست کی حیثیت سے ڈیرہ دون میں ملازم رہے تھے۔ بعد کو وسطِ عمر میں طلبِ معاش کے لیے بنارس گئے اور وہاں کلکٹری کے دفتر میں پہلے نائب ناظر اور بعد کو پیش کار مقرر ہوگئے۔ میرزا قادر بخش صابر ان دنوں بنارس میں مقیم تھے۔ شوخی اُن سے مشورہ کرنے لگے۔ اس کے بعد کلکتے چلے گئے اور وہاں کچھ تجارت کا سلسلہ شروع کرلیا، مولانا آزاد سے اُن کی ملاقات یہیں ہوئی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وفات پائی۔ متوسط درجے کا کلام ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

نہ رکھ اے شوخ! حاسد سے توقع شعر گوئی کی
تکلّم کا گماں کیا جنبشِ لب ہائے الکن پر

☆

کاٹے ہیں کس صفائی سے اس مبتلا کے ہاتھ
جی چاہتا ہے چومیے اس بے وفا کے ہاتھ
مرتے ہی مجھ سے ہاتھ اٹھایا، ہزار حیف!
اٹھے نہ فاتحہ کو کبھی بے وفا کے ہاتھ
ہر بر سخن میں جان نہ دینے کا ہے گلہ
اک بات آگئی ہے بتِ خودنما کے ہاتھ
بختِ مراد مثلِ زلیخا جواں ہوا
پیری میں دل بکا کسی یوسف لقا کے ہاتھ
رنگِ حنا گھٹا تو بڑھا، شوخی! اور حسن
اس سیم تن کے ہوگئے گویا طلا کے ہاتھ

☆

بنا کروں کوئی مے خانہ، جی میں ہے شوخی!
کہ بعدِ مرگ زمانے میں یادگار رہے

☆

کچھ روز جوانی کے مزے لینے دے، زاہد!
دو چار برس میں تو قیامت نہیں ہوتی

☆

حضرتِ شوخ ہوے ہجر میں مرنے کے قریب
نوجوانوں کو یہ آزار بُرا ہوتا ہے

[خم خانۂ جاوید، ۵ : ۶۶۔ ۶۷، نقشِ آزاد: ۳۲۱۔ ۳۲۶،
یادگارِ ضیغم : ۲۱۳۔۲۱۴، سہ ماہی صحیفہ، لاہور جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۷]

شوکت... نواب یار محمدؐ خان بھوپالی

اُن کے والد ماجد میاں فوجدار محمدؐ خان، نواب سکندر بیگم والیۂ بھوپال کے حقیقی ماموں تھے۔ شوکت ۲۷ صفر ۱۲۴۹ھ (۱۶ جولائی ۱۸۳۳ء) کو پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تکمیل مولوی سیّد محمدؐ عبداللہ متوطن خوشاب (پنجاب) اور اخوند منشی احمد علی صاحب بوہرہ اور مولانا محمدؐ عباس شروانی رفعت سے کی۔ دیگر فنون مثلاً ادب و آداب، طبابت اور تلوار زنی سیّد علی اکبر خان غازی سے اور سواریِ اسپ و فیل، سکندر محمدؐ خان رسالدار بھوپال سے حاصل کیے۔ غرض کہ استعدادِ علمی کے علاوہ سپہ گری میں بھی طاق تھے۔ بڑے جاگیردار اور متموّل ہونے کے باوجود ہمیشہ مقروض اور تنگ دست ہی رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حد درجہ کشادہ دست اور مہمان نواز ہونے کے علاوہ بے حد عیش پرست بھی تھے۔ ایسی زندگی کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کفایت نہیں کر سکتا۔

غالب کے تعلّقات اُن کے والد میاں فوجدار محمدؐ خان سے بہت دوستانہ تھے۔ غالب کے قدیم اُردو کلام کا مجموعہ جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے، اُنھیں کے کتاب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔ شوکت نے غالب کے علاوہ اُن کے شاگرد مولانا محمدؐ عباس شروانی رفعت سے بھی اصلاح لی۔ شوکت کا انتقال ۱۸ اگست ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ بھوپال ہی میں بیرسیہ روڈ پر نواب یاسین محمدؐ خان کے باغ میں مدفن ہے۔ اس باغ میں مغرب کی طرف یاسین محمدؐ خان کا عظیم الشان مقبرہ ہے۔ اس کے اندر کی قبروں کے زینے کے پاس، نیچے کی طرف جالی دار پختہ قبر ہے۔ قبر پر کتبہ نہیں ہے۔

متعدد تصانیف اپنے پیچھے چھوڑیں۔ جن میں سے زیادہ مشہور دیوانِ شوکت۔

تذکرۂ فرح بخش، انشائے نور چشم، گلدستۂ نرگس، گلدستۂ رحمت، عیدگاہِ شوکت، مراسلاتِ شوکت، چار باغ شوکت، ہفتخوانِ شوکت، قرابا د-ینِ شوکت، بازنامہ، فیل نامہ، فرس نامہ ہیں۔ نظم و نثر کی کتاب شہنشاہ نامہ بھی اُن سے منسوب ہے۔ لیکن بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہ اُن کی نہیں، بلکہ محمد عباس شروانی رفعت کی تصنیف ہے۔ اس شبہے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ تصنیفات سے اُن کے مذاق کی بوقلمونی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

یوں ہر اک کوچۂ سفاک سے باہر نکلا
کوئی بسمل، کوئی زخمی، کوئی مضطر نکلا
آ گئی موت، مگر ہم کو یہ حسرت ہی رہی
دم نہ بیمار کا، عیسیٰ کے قدم پر نکلا

☆

تم نے خرامِ ناز جو اے دل ربا کیا
ہر ہر قدم پہ فتنۂ تازہ بپا کیا
یاں ملکِ جان و دل تہہ و بالا ہوا کیا
واں آج لامِ زلفِ چلیپا بندھا کیا
دل پہ، جگر پہ، جان پہ کوہِ الم گرا
اس بے وفا سے دل کو لگایا، بُرا کیا
جوں جوں ترقیوں پہ رہی واں بہارِ حسن
یاں دل پہ اپنے داغ جنوں کا بڑھا کیا
پھونکا ہے سوزِ غم میں دلِ بے قرار کو
پارے کو قائم آگ پہ نامِ خدا کیا
شوکت! نہ کیوں بلند مضامین ہوں آپ کے
خالق نے تم کو صاحبِ فکرِ رسا کیا

☆

ہست اور نیست میں ہے سب کو کلام
عقل حیراں، دہانِ تنگ میں ہے
تیرِ مژگاں کا جو اثر دیکھا
توڑ ایسا کہاں خدنگ میں ہے!
عشق میں کس کو رنجِ رسوائی
کب کوئی فکرِ نام و ننگ میں ہے

فارسی میں یہ رنگ ہے:

در دلم زاں سرو قد، رفتار می باشد لذیذ
اُز لبِ شکّرِ فشاں، گفتار می باشد لذیذ
بے محابا، دست ہا انداختن، در گردنم
ایں ادائے طرفہ، اے میخواری باشد لذیذ
مے زدستِ دیگرے زہرست در کامِ دلم
شوکتا جام ازکفِ دلدار می باشد لذیذ

[فرح بخش، ۲۸۔ ۳۷، آثار الشعرا: ۱۴۰۔ ۱۴۳، غالبیات، چند عنوانات: ۴۳۔ ۶۱، مکتوب نادم سیتاپوری بنام مؤلف، انشائے نورچشم، شہنشاہ نامہ: ۱۰۵تا ۱۰۶]

شہاب... شہاب الدّین خان رامپوری

حکیم نصیر الدّین خان کے صاحب زادے تھے۔ تقریباً ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ریاستِ رام پور میں ایک پلٹن کے حوال دار تھے۔ فنِ طب میں بھی کچھ شُد بُد رکھتے تھے۔

فتنۂ دہر ہو، بیٹھے ہی رہو
گر اُٹھو گے تو قیامت ہوگی

☆

تو بھول گیا ہے مجھے، اے سروِ گل اندام
اک دم میں تری یاد سے غافل نہیں ہوتا

(انتخابِ یادگار: ۱۸۵، یادگارِ ضیغم: ۲۶۴)

شہیر... افتخار الشّعرا حافظ خان محمدؐ خان رامپوری

مولوی غلام محمدؐ خان خلفِ حافظ غلام حسین خان رامپوری کے صاحب زادے تھے۔ ۱۲۶۲ھ میں نرسنگھ پور کندیلی میں پیدا ہوئے، "نورچشم راحت جان" تاریخِ ولادت ہے۔ اُن کے والد سرکارِ انگریزی میں معزز عہدوں پر ملازم رہے۔ ملازمت کا زیادہ زمانہ صوبہ جاتِ متوسط کے مختلف مقامات پر تحصیل داری میں گزرا۔ پنشن لینے کے بعد وہ چھندواڑا میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں کچھ جاداد بھی خرید لی تھی، جو شہیر کو ورثے میں ملی۔

شہیر کو شعر گوئی کا شوق اوائلِ عمر سے تھا۔ حسنِ اتفاق سے غالب کا سا استاد میسّر آگیا، اور یہ شعر وسخن کے رموز سے خوب آگاہ ہو گئے۔

شہیر غالب کی وفات کے بعد ۱۸۷۲ء میں بھوپال میں ساٹھ روپے مشاہرے پر ملازم ہو گئے۔ چندے نواب صدّیق حسن خان بہادر کے دونوں صاحب زادوں مولوی نور الحسن خان اور مولوی علی حسن خان کے اتالیق رہے، بلکہ مولوی نور الحسن خان کلیم تو بعد کو اپنے کلام پر اصلاح بھی اُنھیں سے لیتے رہے۔ شہیر کا سرمایۂ ناز ذخیرہ وہ فارسی قصیدے ہیں، جو اُنھوں نے نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال اور اُن کے شوہر نامدار امیر الملک نواب صدّیق حسن خان بہادر کی مدح میں کہے ہیں۔ وہ نظم ونثر میں غالب کی پیروی کی کوشش کرتے تھے۔ جب ۱۸۷۴ء (۱۲۹۰ھ) میں نواب شاہجہان بیگم کو حکومتِ انگریزی کی طرف سے "تاجِ ہند" (Crown of Hind) کا تمغہ ملا، تو شہیر نے ایک معرکے کا قصیدۂ تہنیت نذر گزرانا۔ اس پر اُنھیں ممدوحہ کی طرف سے خطاب

''افتخار الشعرا'' عنایت ہوا۔ اِس قصیدے کا مطلع ہے:

مضمونِ اوجِ عرش، مگر من در آورم
خواہم کہ سدرہ را بہ نشیمن در آورم

۱۳۱۸ یا ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۰۔ ۱۹۰۱ء) میں بھوپال میں لاولد فوت ہوئے۔ سیفیہ کالج کے متصل قلندر شاہ کے تکیے میں مدفن ہے۔

شہیر اگرچہ شروع میں اُردو میں بھی شوق کرتے رہے، لیکن بھوپال آنے کے بعد ان کی توجہ تمام تر فارسی پر مبذول رہی۔ بھوپال میں اُن کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔ نواب صدیق حسن خان کے بڑے بیٹے نور الحسن خان کے نام سے ایک تذکرۂ شعرا بعنوان ''طورِ کلیم'' چھپا ہے۔ محمد عباس شروانی رفعت (شاگردِ غالب) اپنی بیاض میں لکھتے ہیں کہ یہ تذکرہ دراصل محمد خان شہیر کا لکھا ہوا ہے۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

میں نام دارِ ہجر، عدو کام گارِ وصل
وہ کام کر گیا ہے، تو میں نام کر گیا

☆

پوچھو نہ اہلِ عشق کو، کیا ہیں، کہاں کے ہیں!
اچھے ہیں جس طرح کے ہیں، جو ہیں، جہاں کے ہیں

☆

بزمِ جاناں میں جو جاتا ہوں، تو فرماتے ہیں:
''ایک یہ بھی مرے ایام کی شامت آئی''

☆

کوئی ہو، اُن کی وحشتِ دل کا علاج ہو
اک ہم اگر نہیں، نہ سہی، غیر ہی سہی

☆

فارسی کلام کا انتخاب یہ ہے۔

بیطاقتی و ما و دلِ مستمندِ ما
اے پُر غرورِ ما، بتِ ما، خودپسندِ ما
ہنگامِ وصلِ یار چہ باکے زچشمِ زخم
در آتشِ فراق بسوزد سپندِ ما
رفعت در اوفتادنِ استادگاں بود
پستی بہ نرخ اوج فروشد بلندِ ما
آشفتۂ دوزلفِ محمدؐ شدم شہیر!
مارا ببامِ عرش رساند کمندِ ما

☆

اے فلک! ایں نہ تلافیِ شب ہجراں را
رنگ در باختہ امشب بہ زبردستیِ ما
اے شہیر! آہ ز معراجِ وصال افتادیم
آسماں اوج فروشے ست سرِ پستیِ ما

☆

بروے خاک، عجب افتادہ ہستم
کہ تا زمانہ در افگند بر نداشت مرا
جفائے چرخ، حریفِ دلِ شہیر نشد
قضا بدستِ ستم پیشگاں گذاشت مرا

☆

چمن ترا زِ دلِ داغدارِ ہجراں گشت
فغاں کہ عشق مراگشت و در بہاراں گشت
قتیلِ خنجرِ بیدادِ جاہلاں نہ شدم
شہیر! قطعِ نگاہِ سخن شناساں گشت

☆

دوش گلچینِ گلستانِ بہارش بودم
گہ بگلشن نگہے، گاہ بداماں نظرے

☆

کاش می ساخت کسے بادلِ سوزاں یک چند
شمع ہم سوختہ آخر ز شبستاں برخاست

☆

آئینہ را در آتشِ غیرت بسو ختم
کش جلوہ خریدم و حیرت فروختم

☆

نہ گل نہ غنچہ، نہ گلزار را نشاں باقی ست
زبلبلاں خس و خاشاکِ آشیاں باقی ست
توباش و شکوۂ بے مہریِ گل، اے بلبل!
بہارِ باغ اگر بگزرد، خزاں باقی ست
گماں مبر، زمن اے سوزِ غم! کہ نادارم
بیا کہ مغز اگر سوخت، استخواں باقی ست
گزشت غالب و رفت از جہاں بہادر شاہ
شہیر باد کہ نواب☆ قدرداں باقی ست

☆

طبعم ازیں جنوں، بجنونِ دگر کشد
راہم ز خارِ رہ بہ سوے نیشتر کشد
نمکیں فروش یار و چو دیوانگاں مرا
ایں اضطرابِ دل بہ سوے رہگزر کشد

☆

اے کہ چشم، بہ تماشاے سراپاے تو شد
حسنِ تو وسوسہ فرماے تمناے تو شد

☆

کس از بزمت نہ رفت امشب بہ سامانے کہ من رفتم
فغاں برلب، قلق در دل، شکایت بر دہن رفتم

☆

بنود بہر دو عالم بہ ازیں دوکار کردن
زمن اضطراب دیدن، ز تو بیقرار کردن
ہمہ عمر خویش عیشے کہ بخواستم، ندادند
منِ وزیں پس آرزوے غمِ روزگار کردن
زکجا کہ سرمہ سازد پےِ چشمِ یار مارا
کہ فلک نخواست خاکِ سرِ رہگذار کردن
چو صفا دریغ باشد بکدورتست قانع
کہ تواں شہیرؔ! مارا بدلے غبار کردن

☆

اے کہ سراغِ من بری، درتہِ پاش بنگری
چوں منِ خاک پاے را، نعش کجا، مزار کو

[صبحِ گلشن : ۲۸۔ ۲۳۸، شمعِ انجمن : ۲۴۹۔ ۲۵۱، طورِ کلیم : ۵۹۔ ۶۰، آثار الشعرا : ۱۴۳۔ ۱۴۵، غالبیات، چند عنوانات : ۹۸، مکتوب جناب نادم سیتاپوری بنامِ مؤلف]

حواشی

☆۔ نواب والاجاہ، امیر الملک سید محمد صدیق حسن خان بہادر مراد ہیں۔

شیر... سیّد محمّد شیر خان بہاری

قصبۂ بہار شریف کے روسا میں شمار تھا۔ سیّد محبوب شیر صولت رئیسِ اعظم آباد کے خویش تھے۔ انجمنِ رفاہِ عام بہار کے سیکریٹری رہے۔ حج بھی کیا تھا۔ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ میرزا غالب کے علاوہ وحید☆ الہ آبادی سے بھی مشورہ کیا۔

ہم کو دلیلِ عشقِ حقیقی ہوا مجاز
آوارگی نے کام دیا خضرِ راہ کا

☆

کس رنگ پر ہے حسن مرے گل عذار کا
سر سے قدم تک ایک ہے عالم بہار کا
سیماب و برق کو نہیں لاتا خیال میں
جو حال دیکھتا ہے ترے بے قرار کا

(یادگارِ ضیغم : ۲۰۹، تاریخِ شعرائے بہار : ۱۲۵)

حواشی

☆۔ مولوی وحید الدّین محمّد وحید خلفِ اوسط مولوی امیر الدّین عرف امراللہ کٹرہ (ضلع الہ آباد) کے رہنے والے تھے"(بیاضِ سخن" میں والد کا نام غلام حسین لکھا ہے، جو ٹھیک نہیں ہے) نہایت عالی اور باوقار خاندان کے نام لیوا تھے۔ غالباً ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً پہلے خود آتش سے اصلاح لی اور پھر شیخ بشیر علی بشیر (شاگردِ آتش) کے شاگرد رہے، اپنے زمانے کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی اور اکبر داناپوری انھی کے نام ور شاگرد تھے۔ وحید کی موت نہایت افسوس ناک طور پر ہوئی۔

ان کے پڑوس میں ایک شخص گلو میاں کے مکان میں آگ لگ گئی (رمضان ۱۳۰۹ھ) اور درمیان کے بہت سے مکانوں سے ہوتی ہوئی یہ وحید کے مکان تک پہنچ گئی۔ یہ اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔ یہاں انھیں خیال آیا کہ دیوان جو کہ عمر بھر کی کمائی تھی، وہ تو اندر ہی رہ گیا۔ چنانچہ یہ اسے لانے کے لیے واپس چلے گئے۔ جاتے وقت کسی نے اُنھیں دیکھا نہیں۔ یہ اندر گئے تو مکان دھویں سے بھر چکا تھا۔ دیوان ہاتھ میں لیے باہر نکلنے کی کوشش کی، لیکن راستہ نہ سوجھا۔ جب دیر تک کسی نے اُنھیں نہ دیکھا تو اُن کی تلاش شروع ہوئی۔ کچھ لوگ مکان کے اندر گئے، تو دیکھا کہ دیوان ہاتھ میں ہے اور کرسی پر بیٹھے ہیں۔
کٹرہ میں اُن ایام میں ایک طبیب حکیم ابو علی مرزا یعقوب علی تھے۔ فوراً ان سے رجوع کیا گیا۔ اُنھوں نے کہا کہ ۲۷ گھنٹے اسی طرح پڑے رہیں، ہوش میں آجائیں گے۔ لیکن ان کا وقت آلگا تھا۔ اب کیا ہوتا تھا! اس کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔

سر آہ از شعلۂ آہ سوخت
مکرر زدلہا برآمد "دخان"
(۶۵۵×۲-۱=۱۳۰۹)

(یادداشت مولانا ابوسعید ایرایانی فتح پوری سعید بر دیوان قلمی مملوکہ محمدؐ وسیم خاں شروانی)
یہ حادثۂ جانکاہ شنبہ ۱۱ رمضان ۱۳۰۹ھ (۱۹ اپریل ۱۸۹۲ء) کو پیش آیا تھا۔ دوسری تاریخ شاہ علیم اللہ آبادی کی ہے:

تشنہ کامی گفت تاریخش کلیم!
"جاے پاکش برلب کوثر بود"
(۱۳۰۹)

دیوان کا انتخاب انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) نے "انتخابِ وحید" کے عنوان سے ۱۹۳۹ء میں چھاپا تھا، اس کے شروع میں مختصر حالات بھی ہیں۔

شیفتہ و حسرتی... نواب محمد مصطفیٰ خان دہلوی

اُن کے والد عظیم الدّولہ، سرفراز الملک، نواب مرتضیٰ خان بہادر، مظفر جنگ بنگش تھے اور والدہ مشہور جرنیل محمد اسمٰعیل بیگ ہمدانی کی صاحب زادی اکبری بیگم تھیں۔ نواب محمد خان بنگش رئیسِ فرّخ آباد اور نواب مرتضیٰ خان کا خاندان دراصل ایک ہی تھا۔ سب سے پہلے شیفتہ کے دادا ولی داد خان فرّخ سیر کے عہد میں قسمت آزمائی کے لیے بنگشات (کوہاٹ، علاقۂ سرحد) سے واردِ ہندوستان ہوئے اور فرّخ آباد میں مقیم ہوگئے۔ جب سلطنتِ دلّی میں خلل رونما ہوا تو نواب مرتضیٰ خان، مہاراجا جسونت رائے ہلکر کے لشکر میں شامل ہوگئے۔ ایک پلٹن کی کمان، اُن کے سپرد ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب لارڈ لیک، ہلکر کی سرکوبی کے در پے تھا۔ نواب مرتضیٰ خان کی کوشش اور حسنِ تدبیر سے یہ لڑائی صلح و صفائی پر ختم ہوئی۔ لارڈ لیک اُن کی خدمات سے بہت خوش ہوا، اور اِن کے صلے میں اُنھیں ۱۸۱۳ء میں تین لاکھ سالانہ کی جاگیر ہوڈل و پلول (ضلع گوڑگانواں) حینِ حیات عطا ہوئی۔ نواب مرتضیٰ خان کی بلند ہمتی نے اِسی پر قناعت نہ کی اور انھوں نے اگلے ہی سال ۱۸۱۴ء میں جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) کا علاقہ اپنے ہونہار فرزند محمد مصطفیٰ خان کے نام پر خود خرید لیا۔ جو پہلے راجا کھودس رائے کی ملکیت تھا اور مال گزاری ادا نہ کیے جانے کی پاداش میں نیلام ہو رہا تھا۔

جب نواب مرتضیٰ خان کی وفات ہوئی تو ہوڈل و پلول کی جاگیر انگریزوں نے واپس لے لی لیکن خاندان کی گزشتہ خدمات کا خیال کر کے اُس کی جگہ بیس ہزار

روپیہ سالانہ زرِ نقد کی صورت میں مقرر کردیا۔ البتہ جہانگیر آباد کا علاقہ چوں کہ نواب مرتضیٰ خان کا اپنا خریدا ہوا تھا، وہ بدستور اُن کے خاندان میں رہا۔

نواب مصطفیٰ خان ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم کے تمام مدارج بھی مختلف اساتذہ کی نگرانی میں یہیں طے ہوئے۔ وہ عربی اور فارسی دونوں میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی میاں جی مالا مال سے پڑھی، جو اپنے زمانے کے مشہور اہل اللہ میں سے اور ممتاز معلّم تھے۔ حدیث اور فنِ تجوید حاجی محمدؐ نور دہلوی نقش بندی سے حاصل کیے۔ دورانِ حج میں حدیث کے چند سبق شیخ عبداللہ سراج حنفی اور شیخ محمدؐ عابد سندھی سے لیے اور اُن سے سند حاصل کی۔

اپنے زمانے کے رئیسوں کی عام روش کے مطابق اُن کی ابتدائی زندگی بھی بے راہ روی اور لغزشوں سے پاک نہیں تھی۔ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے اُن کے حالات میں نارنول والی رجو☆[1] کا ذکر کیا ہے۔ غالب سے اُن کا شراب کا لطیفہ مشہور ہی ہے کہ ایک دن جاڑے کے موسم میں سرِ شام شیفتہ اُن سے ملنے کو گئے، تو میرزا اُس وقت ''ساغر و مینا'' سے شوق کر رہے تھے۔ اُنھوں نے شیفتہ کو بھی دعوت دی۔ اِنھوں نے جواب دیا: ''حضرت! میں نے توبہ کرلی ہے تو غالب بولے: ''ارے غضب کیا، کیا جاڑوں میں بھی''۔ اُسی زمانے کا شعر ہے:

ماحسرتی! ز شیوۂ غالب گرفتہ ایم
آمیختن بہ بادۂ صافی، گلاب را

بہرحال بعد کو ''شوقِ صنم'' اور ''خواہشِ صہبا'' تمام منہیات سے توبہ کرلی۔ ۱۸۳۹ء (۱۲۵۴ھ) میں حجِ بیت اللہ کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے۔☆[2] اس سفر کے حالات اُنھوں نے فارسی سفر نامہ ''ترغیب السالک الی احسن المسالک'' میں بیان کیے ہیں، اس کا دوسرا فارسی نام ''رہ آورد'' ہے، اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس سفر میں اُنھیں مختلف طرح کے حادثے پیش آئے۔ یمن کی بندرگاہ حدیدہ سے کچھ آگے جہاز ایک تہہِ آب پوشیدہ چٹان سے ٹکرا کر غرق ہوگیا اور تمام مسافر

کشتیوں کے ذریعے ایک قریب کے ویران جزیرے پر اُتار دیے گئے۔ شیفتہ یہاں سے خشکی کے راستے یمن کا علاقہ عبور کر کے حجاز پہنچے اور زیارتِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور آخر دو برس کی غیر حاضری کے بعد ۱۵ فروری ۱۸۴۱ء (۲۳ ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ) کو واپس دلّی پہنچے۔

شیفتہ کو بزرگانِ دین کی خدمت کا شروع سے بہت شوق تھا۔ سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے شاہ محمدّ اسحاق محدّث سے بیعت کی۔ ان کے وصال کے بعد شاہ غلام علی نقش بندی☆[۳] (سجادہ نشین و خلیفۂ حضرت میرزا جانِ جاناں مظہر) کے دونوں خلفا شاہ ابو سعید اور شاہ احمد سعید کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوئے اور اُن سے فیوضِ باطنی حاصل کیے۔ آخر میں حضرت شاہ عبدالغنی مجدّدی سے سلسلۂ نقش بندیہ میں سلوک کی تکمیل کی اور اُنھیں سے سندِ خلافت لے کر خود صاحبِ اجازت ہوئے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب اپنے مریدوں کو تکمیل کے لیے اُن کے پاس بھیجا کرتے تھے۔

شیفتہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ چونکہ جہانگیر آباد غیر محفوظ جگہ تھی، یہ احتیاطاً وہاں سے اٹھ کر اپنے دوست عبداللطیف خان رئیس خان پور کے یہاں آن مقیم ہوئے۔ ٹھاکروں نے موقع دیکھ کر جہانگیر آباد کو لوٹ لیا اور اُن کے مکانات کو نذرِ آتش کر دیا، جس میں دوسرے اثاث البیت کے ساتھ اُن کا قیمتی کتاب خانہ بھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ بارے، رام پور کی فوج جو تلنگوں کی گوشمالی کے لیے دلّی جا رہی تھی، یہاں سے گزری اور اُس کی مدد سے ٹھاکروں کو بے دخل کیا گیا، اور یوں جہانگیر آباد پر نواب مصطفیٰ خان کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد اُن پر مقدمہ قائم ہُوا، کہ تم نے اپنی جاگیر کو یوں غیر محفوظ چھوڑ کر گویا باغیوں کی اعانتِ مجرمانہ کی تھی۔ جاگیر ضبط ہو گئی اور ابتدائی عدالت نے سات برس قید کی سزا دی۔ بارے اپیل میں بری ہو گئے۔

ان کی رہائی کے لیے (نواب والا جاہ امیر الملک) مولوی صدّیق حسن خان

(بھوپال) نے بعض انگریزی حکّام کے توسّط سے خاص کوشش کی تھی۔ اُن کا مقدمہ مولوی مومن علی خان سندیلوی صدر الصدور کی عدالت میں تھا۔ نواب صدّیق حسن خان نے ان کے نام سفارشی خط لکھا۔ خدا کے فضل سے شیفتہ رہا ہوگئے لیکن جاداد ضبط ہوگئی۔ رہائی کے بعد اُنھوں نے نواب صاحب کو شکریے کا خط لکھا اور کہا کہ نجاتِ صوری تو ہوگئی، لیکن نجاتِ معنوی ابھی باقی ہے، یعنی جب تک ذریعۂ معاش پیدا نہ ہو، زیست محال ہے۔ اُس پر نواب صاحب نے دوسرا خط صدر الصدور موصوف کے نام لکھا، تو نصف جاداد بھی واگزاشت ہوگئی۔

مصیبت کس پر نہیں آتی، لیکن بہت کم ہیں، جو اس حالت میں بھی اپنی وضع داری اور آن قائم رکھ سکتے ہیں۔ شیفتہ کے بعض واقعات سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس میدان میں بھی فردِ فرید کا مقام رکھتے تھے مثلاً ۱۸۵۷ء کے ایام میں جب جیل میں تھے، اُنھوں نے بہت کوشش کرَ کے اپنے مہربان قدیم ٹرمیل صاحب کو بُلا بھیجا، جو پہلے بلند شہر میں کلکٹر اور پھر میرٹھ میں جج رہے تھے اور اب بھی کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مدّعا یہ تھا کہ صحیح واقعات بتا کے اُن کے ذریعے سے اپنی صفائی کرالیں۔ اتفاق سے وہ صبح کے وقت پہنچے، جب شیفتہ نمازِ فجر کے لیے نیت باندھ چکے تھے۔ سورۂ دہر کی تلاوت شروع کی اور باوجود اطلاع کے نیت نہ توڑی۔ ٹرمیل صاحب انتظار کے بعد واپس چلے گئے۔

اسی طرح کا اور ان ہی ایام کا ایک اور واقعہ ہے:

ایک دن پا پیادہ بیڑی پیتے سڑک پر جارہے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھ کے فرمایا: ''تیری شانِ کریمی کے قربان کہ اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا''۔

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ نے ان کے ضبط اور استقلال کا ایک حیرت ناک واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نواب شیفتہ کو مرضِ سرطان لاحق ہوگیا۔ ڈاکٹر نے عملِ جراحی تجویز کیا۔ وہ آتا اور ناقص گوشت کاٹتا، جس سے قدرتی طور پر سخت

تکلیف اور درد ہوتا۔ اوپر سے دیکھنے والے برداشت نہ کر سکتے، اُن کے ماتھے پر بل بھی نہ آتا۔ ایک دن بڑے صاحب زادے (رشکی) بے اختیار ہو کر رونے لگے تو فرمایا: ''میاں اس جسمِ خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی ہے۔ انسان کو اپنی مصیبت پر صبر کرنا چاہیے''۔

شیفتہ کے غالب سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ غالب کو اُن پر ناز تھا، وہ اُن کی رائے کو خاص وقعت کی نظر سے دیکھتے اور اُن کے پایۂ سخن سنجی کے معترف تھے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل، تا مصطفےٰ خاں خوش نہ کرد

ایک دوسری جگہ اُن کی مضمون آفرینی اور دقّتِ نظر کی یوں داد دیتے ہیں:

غالب ز حسرتی چہ سرایم، کہ در غزل
چوں اُو تلاشِ معنی و مضموں، نکردہ کس

غالب نے اپنے زمانے کے مشہور اور مستند فارسی دانوں کا اپنی ایک غزل میں ذکر کیا ہے، اس میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

ہند را خوش نفسا نند سخنور، کہ بود
باددر خلوتِ شاں، مشک فشاں، از دمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود، اعظمِ شاں
غالب سوختہ جاں، گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدمِ شاں

جب ۱۸۴۷ء میں غالب پر جوا خانہ قائم کرنے کے سلسلے میں ابتلا آیا اور وہ چھ ماہ کے لیے قید خانے بھیج دیے گئے، تو یہ شیفتہ ہی کی ذات تھی، جس نے دامے، درمے، قدمے، ہر طرح غالب کی خدمت کی۔ حالاں کہ اس زمانے میں میرزا کے

بعض نہایت عزیز دوست اور رشتہ دار بھی پیٹھ دکھا گئے تھے۔ غالب نے قید کے دوران میں جو تاریخی نظم لکھی تھی، اس میں شیفتہ کی اِن خدمات کا پرزور اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

خود چرا خوں خورم از غم، کہ بہ غمخوارئ من
رحمتِ حق، بہ لباسِ بشر آمد، گوئی
خواجۂ ہست دریں شہر، کہ از پرسشِ وے
پایۂ خویشتنم، در نظر آمد، گوئی
مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بمیرم، چہ غم از مرگ، عزادارِ من است

غالب نے اُن کی مدح میں ایک مستقل قصیدہ بھی لکھا تھا، جو ان کے فارسی کُلیات میں موجود ہے۔

آزردہ نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو مرثیہ دہلی مرحوم کا لکھا تھا اور جو "فغانِ دہلی" میں شامل ہے۔ اس کے ایک بند میں اُن کا ذکر بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جان پہ بن آتی ہے
مصطفیٰ خان کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اِس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

☆

اسی طرح ایک غزل میں بھی جو اسی زمانے میں کہی تھی، لکھتے ہیں:

رہے ہم نہ کچھ مصطفیٰ خاں کے غم میں
نہ فکرِ سخن، نہ پڑھانے کے قابل

شیفتہ کی تعلیم اور استعداد کا ذکر ہو چکا ہے۔ وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلّص کرتے تھے۔ پہلے مومن سے، اور اُن کی وفات کے بعد غالب سے اصلاح لی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ کُلّیات اُن کے صاحب زادے نواب محمد اسحاق خان کے اہتمام سے نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اُردو، فارسی نظم و نثر سب شامل ہے۔

گارسین دتاسی لکھتا ہے کہ اُنھوں نے ابنِ جوزی کے مولد محدّث کا بھی عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا، جو لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ میری نظر سے نہیں گزرا۔

شیفتہ بلند پایہ نقّادِ سخن بھی تھے۔ اردو شاعری کا مشہور فارسی تذکرہ "گلشنِ بے خار" انھیں کی تصنیف ہے، جو ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں مختلف شاعروں کے کلام پر جچی تلی تنقید کی ہے، وہ مذاقِ سخن بدل جانے کے باوجود آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اور جب یہ خیال میں رہے، کہ اس تذکرے کی تالیف کے وقت ان کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی، تو اُن کی ژرف نگاہی اور اصابتِ رائے کی داد دینا پڑتی ہے۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی سے متعلق لکھتے ہیں :

اشعار بسیار دارد کہ برزبانِ سوقیین جاری ست و نظر بآں ابیات در اعدادِ شعراء نشایدش شمرد۔

اس رائے پر اُن کے زمانے میں بھی کافی لے دے ہوئی تھی اور اب بھی بعض لوگوں کی زبان پر حرفِ شکایت آجاتا ہے کہ صحیح معنی میں نظیر ہی وہ شاعر ہے جس نے ملک کے عوام کے خیالات کی ترجمانی کی اور شیفتہ کا اسے نظری کر دینا اُن کی اپنی کوتاہ نظری کا ثبوت ہے۔ اس سے قطعِ نظر کہ جس ماحول میں شیفتہ نے تربیت پائی تھی، اس میں نظیر کی شاعری حد درجہ عامی اور غیر ثقہ شمار ہوتی تھی اور اس لیے وہ اس رائے کے علاوہ جو اُنھوں نے ظاہر کی، کوئی دوسری رائے دے ہی نہیں سکتے تھے، میرے خیال میں یہ بہت اچھا ہوا کہ اُس زمانے میں لوگوں نے عام طور پر نظیر کو پسند

نہ کیا۔ کیوں کہ پسند بالعموم تقلید کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ نظیر کے زمانے میں اُردو ابھی تکمیل کے مدارج طے کر رہی تھی۔ میرو میرزا اور دوسرے اساتذۂ قدیم کی کاوشوں کے باوجود زبان ابھی ترقی کی معراج تک نہیں پہنچی تھی۔ اگر اس ابتدائی زمانے میں لوگ نظیر کے کلام کی پیروی کر دیتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی ترقی رک جاتی اور وہ متبذل ہو کر رہ جاتی۔ وجہ ظاہر ہے۔ ''نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند'' سنجیدگی سے ظرافت اور طنز کو نباہنے کے لیے بڑے سلیقے کی ضرورت ہے، جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ یہ نظیر ہی تھے جو اِس رنگ کو نباہ گئے۔ اگر اُن سے کم درجے کا شاعر اِن موضوعات پر قلم اٹھاتا تو یقیناً منہ چڑانے لگتا اور مسخرہ ہو کے رہ جاتا۔ اگر کسی کو اس رائے سے اختلاف ہو، تو وہ آج بھی تجربہ کر کے دیکھ لے۔

شیفتہ نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیگم سے صرف ایک صاحب زادہ جناب محمدؐ علی خان رشکی ہوئے (جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں) جناب افضل بیگم دوسری بیوی سے دو لڑکے نقش بند خان اور نواب محمدؐ اسحاق خان اور دو صاحب زادیاں ہوئیں۔ یہ نقش بند خان ہی تھے، جن کی تعلیم کے لیے حالی مقرر ہوئے تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے، مجبور تخلّص تھا۔ اُن کا انتقال پچیس☆[۴] برس کی عمر میں یک شنبہ ۵ نومبر ۱۸۷۷ء (۲۸ شوال ۱۲۹۴ھ) کو دن کے گیارہ بجے ہوا۔

حالی نے قرآنِ کریم کی ایک آیت سے تاریخ نکالی: ''وحلوا اساور مِن فضۃ''
(سورۂ دہر)

دو صاحب زادیوں میں سے بڑی منوّر جہاں بیگم مسرّت عرف بڑی بیگم کا عقدِ نکاح نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کے چھوٹے بھتیجے نواب عالمگیر محمدؐ خان نمود سے ہوا تھا۔ ان کا دیوان بعنوان 'گلستانِ مسرّت'' شائع ہو چکا ہے (مفیدِ عام، آگرہ ۱۳۶۷ھ)۔

دوسری کا نام مشرف جہان بیگم ثروت (عرف چھوٹی بیگم) تھا، یہ نمود کے چھوٹے بھائی صدر محمدؐ خان کی بیوی تھیں۔ ان کا مجموعۂ کلام بھی ''گلستانِ ثروت'' کے

عنوان سے چھپ چکا ہے۔ (مفیدِ عام، آگرہ۔ ۱۳۱۷ھ)

شیفتہ کا بعمر ۶۳ برس اواخرِ ستمبر یا اوائل اکتوبر ۱۸۶۹ء (۱۲۸۶ھ) میں انتقال ہوا۔☆[5] ذیابیطس کا عارضہ ایک زمانے سے سوہانِ روح تھا۔ ''آخری وقت ہاتھ پر ایک کالا دانہ نکلا جو موت کا بہانہ بن گیا۔ دلّی میں نواب مصطفیٰ خان کی دو حویلیاں مشہور ہیں : ایک جامع مسجد کے جنوب کی طرف چتلی قبر کے قریب ہے، اسے ''چھپا میم کا چھتہ'' بھی کہتے ہیں۔ یہاں اب حویلی کا نام بھی نہیں رہا، چھوٹے چھوٹے مکان بن گئے ہیں، محلّے کا نام البتہ رہ گیا ہے۔ دوسری، کوچۂ چیلان میں علی جان والوں کی عمارت کے برابر میں ہے۔ شیفتہ وفات کے وقت اسی کوچۂ چیلان والی حویلی میں مقیم تھے۔ مولانا حالی نے بہ ادنیٰ تغیر قرآن مجید کی ایک آیت ''وجزاھُم بما صبروا جنات و حریرا'' (سورۂ دہر) سے تاریخِ وفات نکالی۔ یہی لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ اپنا کفن آبِ زمزم سے دھو کر خود حجاز سے ساتھ لائے تھے۔ اسی میں کفنائے گئے اور درگاہِ سلطان جی میں اپنی خاندانی ہڑواڑ میں سپردخاک ہوئے۔

قطعۂ تاریخِ وفات ہے :

چو رئیس ابنِ رئیسِ نامدار
کرد رحلت زیں جہانِ بے بقا
سالِ تاریخِ وفاتش فی البدیہہ
ملہمِ غیبی بمن کردہ عطا
کز سرِ زاری باید گفت ایں
''رحمتِ حق بر محمدؐ مصطفیٰؐ''
(۷+۱۲۷۹=۱۲۸۶ھ)

شیفتہ کے چھوٹے بھائی محمد اکبر خان بھی شعر کہتے تھے۔ اکبر تخلص تھا اور مومن ہی سے اصلاح لیتے تھے۔

شیفتہ کے کلام سے متعلق کسی رائے کا اظہار کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ وہ

یک فنے تھے۔ یعنی غزل کے سوائے اور کوئی صنفِ کلام اُن کے یہاں نہیں ملتی۔ لیکن انھوں نے غزل کو اس طرح نباہا کہ اس کا حق ادا کردیا۔ اگرچہ اس زمانے کے عام رنگ سے الگ کچھ زیادہ کلام نہیں، لیکن جہاں اس سے ہٹ کے کہا ہے، خوب کہا ہے۔ زبان اور اسلوبِ بیان اور خیالات ہر لحاظ سے شیفتہ کا کلام زندہ رہنے کا حق دار ہے۔ پہلے انتخابِ اُردو ملاحظہ فرمایئے:

ایک دن شام ہماری بھی سحر کر دے گا
وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے

☆

کچھ انتظار مجھ کو نہ مے کا، نہ ساز کا
ناچار ہوں کہ حکم نہیں کشفِ راز کا

☆

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا!

☆

دیکھتے ہم بھی، کہ آرام سے سوتے کیوں کر
نہ سُنا تم نے کبھی، ہائے فسانہ دل کا
ہم سے پوچھیں، کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر
کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا
شیفتہ! ضبط کرو، ایسی بھی کیا بے تابی
جو کوئی ہو، تمھیں احوال سنانا دل کا

☆

نہ دیا ہائے مجھے لذّتِ آزار نے چین
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

☆

وہ مجھ سے خفا ہے، تو اسے یہ بھی ہے زیبا
پر شیفتہ! میں اس سے خفا ہو نہیں سکتا

☆

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

☆

محبت نہ ہرگز جتائی گئی
رہا ذکر کل اور ہر باب کا

☆

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے، تو کیا نام نہ ہوگا!

☆

سب باتیں انھیں کی ہیں یہ، سچ بولیو، قاصد!
کچھ اپنی طرف سے تو تصرّف نہیں کرتا
کیا حال تمھارا ہے، ہمیں بھی تو بتاؤ!
بے وجہ کوئی شیفتہ! اُف اُف نہیں کرتا

☆

دامن تک اُس کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا
مشاطہ کا قصور سہی، سب بناؤ میں
اُس نے ہی کیا نگاہ کو، پُر فن بنادیا!
اظہارِ عشق اُس سے نہ کرنا تھا، شیفتہ!
یہ کیا کیا، کہ دوست کو دشمن بنادیا

☆

حسرت سے اس کے کوچے کو کیوں کر نہ دیکھیے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

☆

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اُس کی بزم میں
آئے وہ اِس طرح کہ مجھے پیار آگیا

☆

یار کو محرومِ تماشا کیا
مرگِ مفاجات نے یہ کیا کیا
عرضِ تمنا سے رہا بے قرار
شب وہ مجھے، میں اُسے چھیڑا کیا
غیر ہی کو چاہے ہیں اب شیفتہ!
کچھ تو ہے جو یار نے ایسا کیا

☆

یاد نے جس کی بھلایا سب کو
اس کی میں یاد، بھلاؤں کیوں کر

☆

آشفتہ زلف، چاک قبا، نیم باز چشم
ہیں صحبتِ شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز
جو بات مے کدے میں ہے، اک اک زبان پر
افسوس مدرسے میں ہے بالکل نہاں ہنوز
اے تابِ برق! تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خاروخسِ آشیاں ہنوز

☆

آمد آمد میں اس قدر شورش
دیکھیے کیا کریں بہ بند میں ہم
وہ تو سو بار اختیار میں آئے
پر نہیں، اپنے اختیار میں ہم

☆

بچتے ہیں اِس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم
کم التفاتیوں کا ہے وہم اہلِ بزم کو
شرمندہ ہوگئے تری شرم و حیا سے ہم

☆

کچھ ہم سے وہ خفا ہیں، کچھ اُن سے خفا ہم
مدّت سے اسی طرح نبھی جاتی ہے باہم

☆

کہتا ہوں، جو غیر سے نہ ملیے
کہتا ہے کہ "کیا میں بے وفا ہوں؟"

☆

طوفانِ نوح لانے سے، اے چشم، فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں، اگر کچھ اثر کریں
اہلِ زمانہ دیکھتے ہیں عیب ہی کو بس
کیا فائدہ کہ شیفتہ عرضِ ہنر کریں

☆

شیفتہ! عشق کی یہ دھوم اور اب تک حسرت!
دلِ بے تاب نہیں، دیدۂ بے خواب نہیں

☆

الفت چھپا کے اور بھی شرمندہ میں ہوا
اظہارِ عشق غیر سے وہ منفعل نہیں
جو حال پوچھنا ہے، تم اُس سے ہی پوچھ لو
مجھ کو دماغ قصۂ غم ہائے دل نہیں

☆

دل کا گلہ، فلک کی شکایت، یہاں نہیں
وہ مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں
ہم آج تک چھپاتے ہیں یاروں سے رازِ عشق
حال آنکہ دشمنوں سے یہ قصہ نہاں نہیں
رنگیں ہے بے گناہوں کے خوں سے سوادِ شہر
حال آنکہ واں ہنوز سرِ امتحاں نہیں

☆

اُس نوبہارِ حسن کو بدنام مت کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

☆

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
دونوں کا ایک حال ہے، یہ مدّعا ہو کاش!
وہ ہی خط اُس نے بھیج دیا کیوں جواب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو
دیکھو وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں

بے باک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز
ملزم ہوا ہے، پر نہیں عاجز جواب میں

☆

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ!
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذّت گناہ میں

☆

ہے دل کو شکرِ وفائے عدو سے بے تابی
کروں میں کچھ گلۂ لطف، گر عتاب نہ ہو
حجابِ منظرِ مقصود ہے طلسمِ خودی
جو یہ طلسم نہ ٹوٹے تو فتحِ باب نہ ہو

☆

ہر شیوے سے ٹپکے ہے ادا، ناز تو دیکھو
ہر بات میں اک بات ہے، انداز تو دیکھو

☆

ہائے، وہ شیفتہ کی بے تابی
تھام لینا وہ تیرے محمل کو

☆

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

☆

شاید اسی کا نام محبت ہے، شیفتہ!
ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

☆

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں، کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

☆

لطف اوروں پہ رہے، ہم کو ستم بھی بس ہے
نہ سہی وہ بھی ہمیشہ، کوئی دم بھی بس ہے

☆

دل لگایا تو ناصحوں کو کیا!
بات جو اپنے جی میں آئی، کی
شیفتہ وہ، کہ جس نے ساری عمر
دین داری و پارسائی کی
آخرِ کار مے پرست ہوا
شان ہے اُس کی کبریائی کی

☆

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا
قاصد! وہ بہت الم کریں گے

☆

اتنی بھی بڑی ہے بے قراری
اب آپ سے اُنس کم کریں گے

☆

ناشکیبی کی دعا مانگیں گے
صبر کی ہم کو ضرورت ہی سہی
ازدحامِ غم و اشک و حرماں
پھر بھی فرصت، ہے تو فرصت ہی سہی

میری خاطر سے چلو، شیفتہ! واں
خیر، اُن سے تمھیں نفرت ہی سہی

☆

زیاں ہے عشق میں ہم خود بھی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو، اگر زیاں کے لیے
فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

☆

نہ پوچھو شیفتہ کا حال، صاحب!
یہ حالت ہے کہ، اپنے میں نہیں ہے

☆

پھر بلا سے کوئی بیٹھے، شیفتہ!
اٹھ گئے جب آپ کوئے یار سے

☆

ناصح! تری زبان، ترے بس میں جب نہ ہو
انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

☆

ایسی رغبت سے کرے قتل، گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ! اس کو تو، لو، تم سے محبت نکلی

☆

ان کی فارسی دانی اور ذوقِ سخن سے متعلق آپ غالب کی رائے ملاحظہ فرما چکے ہیں، بالکل اہلِ زبان کا رنگ ہے۔ کلام کا نمونہ دیکھیے۔

تہدید بر ریا کردِ دِی شیخِ شہر مارا
امروز ساغرِ مے، خوردیم آشکارا

در دہر، مجو خرابات، جاے دگر نیابی
آنجا کہ خندہ آید، بر پادشہ گدا را

☆

تادیدہ نہ بندی، نتوانی کہ بینی
آں جلوہ کہ مشہود شود اہلِ نظر را

☆

نہ بیمِ محتسب، نے خوفِ قاضی، نے غمِ فردا
نمی دانم، کہ ازمے چیست لذت گبر و ترسا را
یکیے صبحدم صاحب دلے می گفت با زاری
بعصیاں ہاے پنہاں بخش، طاعت ہاے رُسوا را

☆

خندہ چہ خوش شیوہ ایست، از پسِ خشم و عتاب
لذتِ دیگر بود، زخمِ نمک سُود را

☆

رازِ نہفتہ گفتم اگر ساقیا! مرنج
می گفتمت کہ بادہ مدہ ایں قدر مرا

☆

رحم ست بر کسے کہ دراں کوے می رود
در دست نامۂ من و برلب سلامِ ما

☆

سحر بہ مہرِ دل افروز کردہ ام امشب
ہزار عشرتِ نو روز کردہ ام امشب

☆

از پے صید تو صد دام بہرجاے ہست
جرمِ من چیست، مرا نیز تمناے ہست
خاررا خوارنگیری، کہ گلش در جیب است
قطرہ راابہل مپندار، کہ دریاے ہست
کیست کایں مژدہ برد معتقدانِ اُورا!
خلوت و حسرتی و شاہدِ رعناے ہست

☆

بے تابم و یار را خبر نیست
می نالم و نالہ را اثر نیست
در انجمنت بسر رسیدم
در عشق تمیزِ پا و سرنیست
مائیم و فغاں، کہ در محبت
دستورِ ترانہ دگر نیست
چشم بددُور، از جمالش
می بینم و طاقتِ نظر نیست

☆

پردہ داری چونہ شد، بُت کدہ بدنام افتاد
ورنہ پوشیدہ بصد جا بُت و زُنّارے ہست

☆

یار را دل ربودنم ہوس ست
برق اندر کمینِ شستِ خس ست
شیوۂ چند، لازمِ رندی ست
زاں یکے ارتباط باعسس ست

نگہے، غمزۂ، شکر خندے
اند کے التفات از تو بس ست

☆

زباں زبانہ فشان و نفس شرر ریزست
مرا گناہ نباشد، مےِ مُغاں تیزست
غم و سرور نباشد بیک دل اندر جمع
برنجِ عشقِ تو نازم کہ راحت انگیز ست

☆

گر بمستی قدم، رغبتِ طاعت در دل
مسجدے ہم بسرِ کوے مُغاں می بایست

☆

آناں کہ درسکوت، دل ازکف ربودہ اند
آیا چہاکنند، اگر گفتگو کنند

☆

نازم اندازِ بتاں را، کہ دل و صبر و شکیب
ہمہ بُردند عیان وبہ نہانم دادند
چوں بہ پیری کنم، اے شیخ! زرندی توبہ
کارسازانِ قضا، بختِ جوانم دادند
شب کہ دربزمِ تو جز غیر کسے بارنداشت
آتش از شمع گرفتند و بجانم دادند
حسرتی! از اثرِ نشۂ توفیق مپرس
درِ میخانہ زدم، کعبہ نشانم دادند

☆

گفتمش، عشقِ تو ام حوصلہ می فرساید
گفت، عشق ست، چرا حوصلہ فرسا نبود

☆

حسرتی! سیر زجاں گشتہ، خبر باید داشت
کہ مبادا بہ درِ آں ستم ایجاد رسد

☆

تو مپندار کہ ایں کم نگہی عشوہ گری ست
حسرتی! سادہ رخاں شرم و حیا نیز کنند

☆

شہیدِ جلوۂ نازِ تو جاں شکارانند
اسیر حلقۂ دامِ تو رم شعارانند
چہ بودۂ تو، کہ آزادگاں بہ بندِ تو اند
تو کیستی کہ گدائے تو شہریارانند
خرابِ حوصلۂ آں قرابہ نوشانم
کہ سم بہ بادہ کشیدند و ہوشیارانند
بکوش و نامۂ خودرا سپید کن، زاہد!
ترا ازاں چہ، کہ رنداں سیاہ کارانند

☆

جانم بلب رسیدہ و چشمم براہِ تست
دارم زعمرِ رفتہ، اُمیدِ وفا ہنوز

☆

عمرِ کوتاہ دادہ اند مرا
گو شبِ غم بود دراز، چہ باک!

☆

برآں سرم کہ زہر نیک و بدکنارہ کنم
خورم شراب و رُخِ نیکواں نظارہ کنم

☆

نہ چوں عشق سازگارم، بہ مزاجِ دردمنداں
نہ چو حسن اعتبارم، بہ نگاہِ خودپسنداں
برُخ چو آفتابت، نگہِ قمر عذاراں
بکمندِ عنبرینت، سرِ عنبریں کمنداں
شب وصلِ غیر رفتم، پےِ اکتسابِ نفرت
چو ہجومِ عیش دیدم، شدہ شوقِ من دو چنداں
زچہ حسرتی، ننالم، زجفاے طالعِ بد
بمذاقِ یار تلخم، چو فغانِ دردمنداں

☆

دل دادہ نہ دردِ دلِ زار چہ دانی!
دردام نہ حالِ گرفتار چہ دانی!

☆

اے چشم چہ دیدی، از نگاہش
بے وعدہ در انتظار چونی!

☆

رباعیات

من تشنہ و سیراب زصہباے خودم
من کعبۂ خویشم و کلیساے خودم
باغیر خودم ہیچ سروکارے نیست
من عاشق و معشوقِ خود آراے خودم

☆

چندے بہ حریم شہریاراں رفتم
چندے بدرِ زُہد شعاراں رفتم
دیدم ہمہ لہو و سہو و کبر و طامات
ناچار بکوے میکساراں رفتم

[دیباچہ کلیات شیفتہ، صبح گلشن : ۱۲۱۔۱۳۲، شمع انجمن: ۱۳۴۔۱۳۶، خم خانۂ جاوید، ۵: ۱۵۵۔۱۶۲، نقوش (جون ۱۹۵۶): ۱۷۲، معارف (ستمبر ۱۹۵۴ء) : ۱۸۸۔۲۱۲، تاریخِ صحافتِ اردو، ۲ (۱) : ۲۳۵]

حواشی

☆۱۔ یہ دو بہنیں تھیں: رجو اور جنگلو دونوں بڑی طرح دار اور یکتائے روزگار تھیں۔ رجو چندے شیفتہ کے پاس رہی، جنگلو میر رحیم مختار کار عدالت فوجداری کے گھر پڑ گئی تھی۔ چرخہ والوں (دلی) میں اُن کا عالی شان مکان اب تک موجود ہے، مشن اسکول کے برابر والی عمارت ہے۔ یہ اُن سے سیٹھ لچھمی نرائن نے خریدی اور موخرالذکر نے بعد کو حکیم احسن اللہ خان بہادر کے ہاتھ بیچ ڈالی۔ رجو شعر بھی کہتی تھی۔ نزاکت تخلص تھا۔ مرنے کے بعد سلطان جی میں دفن ہوئی۔
(گلشنِ بےخار ۲۲۸۔ ۲۲۹، چمن انداز، ۱۵۰، سخنِ شعرا : ۵۸۰)۔

☆۲۔ روایت ہے کہ شیفتہ نے اُسی سال حج کیا، جس سال منشی کرامت علی شہیدی بھی وہاں گئے تھے۔ اور اُسی سفر میں شیفتہ کی موجودگی میں شہیدی کا انتقال مدینہ کے باہر ہوا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کے سفر میں دونوں ایک ہی محمل میں تھے۔ شہیدی اسہال کے مریض تھے اور بہت کم زور ہو رہے تھے۔ ضعف سے غش پر غش آ رہے تھے۔ جب مدینے کا سواد نظر آنے لگا، تو شیفتہ نے اُن سے کہا: شہیدی آنکھیں کھولو، دیکھو گنبدِ خضرا سامنے نظر آ رہا ہے۔ شہیدی نے آنکھ کھولی۔ روضۂ مبارک پر نظر ڈالی اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے روضۂ رسول کے درختوں پر جا بیٹھا:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(صلائے عام دسمبر ۱۹۲۹ء : ۲۷)

☆۳۔ دلی میں چتلی قبر سے ترکمان دروازے کی طرف جائیں تو میر مہدی کی خانقاہ کے آگے الٹے ہاتھ کو کوچہ میر ہاشم کے آخری سرے پر شاہ غلام علی کی خانقاہ ہے۔ ان کا اصلی نام شاہ عبداللہ تھا۔ لیکن مشہور شاہ غلام علی کے نام سے ہوئے۔ نسباً سادات علوی میں سے تھے۔ اصلی وطن بٹالہ (ضلع گورداس پور، پنجاب) تھا۔ آپ کے والد شاہ عبداللطیف، شاہ ناصر الدّین قادری کے مُرید تھے (جن کا مزار رشیدی پورے، دہلی میں محمّد شاہی عیدگاہ کی پشت پر ہے) شاہ غلام علی ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت "مظہرِ جُود" ہے۔ ۱۶ برس کے

تھے کہ بٹالہ سے دلّی پہنچے اور میرزا جانِ جاناں مظہر کی بیعت کی اور اُن کی وفات کے بعد سجّادہ نشین ہوئے۔ تمام عمر قناعت اور توکل سے بسر کی اور قرآن اور حدیث اور فقہ کا درس دیتے رہے۔ خود سندِ حدیث حاجی محمّد افضل سے لی تھی، جو میرزا مظہر کے بھی حدیث میں استاد تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، مُلیؔ تخلص تھا۔ تصوّف میں ایک کتاب ''سیّد المرشدین'' بھی آپ سے یادگار ہے شنبہ ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ (۱۶ اکتوبر ۱۸۲۴ء) کو واصلِ حق ہوئے۔ اسی خانقاہ میں اپنے مرشد میرزا مظہر کے پہلو میں دفن ہیں۔ ''نور اللہ مضجعہ'' تاریخ وفات ہے۔ ان کے خلیفہ شاہ ابو سعید مجدّدی، حضرت مجدّد الف ثانی سرہندی سے پانچویں پشت میں علمِ قرأت و تجوید میں یکتائے زمانہ تھے۔ دور دور سے لوگ اُن سے ملنے اور قرآن سننے کو آتے تھے۔ حج سے واپسی پر شنبہ یکم شوال ۱۲۵۰ھ (۳۱ جنوری ۱۸۳۵ء) کو ٹونک میں وصال ہوا۔ نعش دلّی آئی اور اب شاہ غلام علی کے پہلو میں محوِ خواب ہیں ''نور اللہ مضجعہ'' سے تاریخ نکلتی ہے۔ اُن کے بعد ان کے بڑے بیٹے احمد سعید صاحب سجّادہ نشین ہوئے ''مظہرِ یزداں'' تاریخ ولادت ہے۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح کلام اللہ اور حدیثِ رسول کے عاشق تھے۔ ساری عمر درس و تدریس میں گزاری۔ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں ۲ ربیع الاوّل ۱۲۷۷ھ کو وفات پائی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روضے کے قریب دفن ہوئے۔ اُن کے بعد ان کے چھوٹے بھائی یعنی شاہ ابو سعید کے دوسرے بیٹے شاہ عبدالغنی صاحب سجادہ نشین ہوئے، جو اس سلسلۃ الذہب کے لیے بھی باعثِ فخر تھے۔ ۲۵ شعبان ۱۲۳۵ھ (۸ جون ۱۸۲۰ء) کو پیدا ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں مکّہ معظّمہ جا کر علمِ حدیث شیخ محمّد عابد سندھی سے حاصل کیا اور واپسی پر شاہ محمّد اسحاق سے تکمیل کی سند لے کر خود درس دینے لگے۔ مشہور محدّث اور عالم مولانا رشید احمد گنگوہی اُنھیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے، جہاں ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں انتقال فرمایا اور اپنے بڑے بھائی شاہ احمد سعید کے جوار میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(تذکرۂ اہلِ دہلی : ۱۱۔ ۲۱، واقعات دارالحکومت دہلی، ۲ : ۱۵۳۔۱۵۴)

☆۴۔ یہ عمر تذکرے میں لکھی ہے۔ لیکن ایک معاصر اخبار (لٹن گزٹ، دہلی، شمارہ ۷ نومبر ۱۸۷۷ء) میں عمر بوقتِ وفات ۲۳ برس کی لکھی ہے۔

☆۵۔ اکمل الاخبار ۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء بحوالہ تاریخِ صحافت اردو، ۲ (۱) : ۲۳۵۔

صاحب دہلوی... نواب سیّد شیر زمان خان

دودمانِ عالی کے نام لیوا تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اُنھیں حافظ احسان جیو کا پوتا لکھا ہے، لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا، اگرچہ وہ تھے غالباً اِسی خاندان سے۔ البتہ سعادت یار خاں رنگین اُن کے نانا تھے۔ یہ چھوٹے بیٹے تھے نواب شیر علی خان المخاطب بہ فتح نصیب خان کے۔ اُن کے اجداد میں دین و دنیا کا قابلِ رشک اجتماع ملتا ہے۔ سیّد علی ہمدانی اُن کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ اُن کی اولاد میں نواب حمید الدّین خان عہدِ عالمگیری میں سپہ سالارِ افواجِ شاہی ہوئے۔ پھر نواب شرف الدّین محمدؐ خان بہادر بخشی الممالک صوبہ دارِ کشمیر تھے۔ ایک اور بزرگ مجد الدّولہ عبدالاحد خان بہادر بہرام جنگ شاہ عالم ثانی کے وزیر تھے۔ غرض اُن کی خاندانی عظمت سے کسی کو انکار نہیں۔

سیّد شیر زماں خان ۱۲۴۰ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے اقتضائے وقت کے پیشِ نظر انگریزوں کی ملازمت اختیار کرلی۔ اُن کے فرزندِ ارجمند سیّد وزیر الزّماں خان نے عین جوانی میں حیدرآباد کی راہ لی اور وہاں افواجِ آصفیہ میں لفٹنٹی کا عہدہ قبول کرلیا۔ سیّد شیر زمان خان جب حکومتِ انگریزی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو یہ بھی اپنے بیٹے کے پاس حیدرآباد چلے گئے اور پھر اپنی موت تک یہاں سے نہیں نکلے۔ یہیں ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴۔ ۱۸۹۵ء میں بعمر ۷۲ سال وفات پائی۔

سیّد شیر زمان خان نے فارسی کی تعلیم مکمل کی، تو اس کے بعد شاعری کا شوق ہوا، جو اس وقت دلّی میں ہر کہہ ومہ کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اسی زمانے میں [illegible]

ذوق کا ڈنکا بج رہا تھا، یہ بھی اُن کے شاگرد ہوگئے۔ اُن کی شاگردی اور ان ارادت کا اظہار کئی اشعار میں کیا ہے:

الٰہی، رکھ مرے استاد کو قائم قیامت تک
ہمیشہ رہوے سر پر اُن کے سایہ ابرِ رحمت کا
طفیلِ خاکِ پائے حضرتِ ذوق اب تو اے صاحب!
گیا عرشِ معلّٰی پر دماغ اپنی طبیعت کا

ایک قطعے میں لکھتے ہیں:

سب ہیں مقر کہ افصحِ ہندوستاں ہیں ذوق
سودا و میر رتبے سے جن کے ہیں کم تر آج
ہندوستاں سے کشورِ ایران تک کہیں
کہتے ہیں ذوق سا نہیں پیدا سخن ور آج
شاگرد ہوں میں ایسے کا، صاحب! ہزار شکر
زورِ سخن یہ جس کا ہے، اللہ اکبر آج
آتش زباں ہوں فیض سے میں اُس کے اِس قدر
کیا ہے عجب کہ ہوویں عدو خاک جل کر آج

نومبر ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہوگیا، تو یہ غالب کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئے، لکھتے ہیں:

بعدِ مُردنِ ذوق کے کم ہوگیا تھا ذوقِ شعر
ہوتے ہی شاگردِ غالب، پھر وہ غالب ہوگیا

پھر ایک رباعی میں لکھتے ہیں:

غالب کا کلام سب سے غالب پایا
اشعار کا اُن کے سب کو طالب پایا
صاحب! شاگردِ ذوق و غالب ہو کر
اللہ اللہ، عجب مراتب پایا

غالب کے فوت ہو جانے کے بعد دونوں استادوں کو یوں یاد کرتے ہیں :

شاگرد ہوں میں ذوق سے عالی دماغ کا
کیوں قبح کوئی میرے سخن سے نکال دے
فیضانِ روح گر نہ ہو غالب کی صاحبا!
پھر کون اس ردیف کٹھن سے نکال دے

ان کا دیوان اُن کی زندگی میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد سیّد وزیر الزمان کی فرمایش پر محمدؐ وحید الدّین خان نے اسے مرتب کیا اور یہ ۱۳۱۹ھ میں مطبع مقتنِ دکن، حیدرآباد میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے نسخے بھی کم یاب ہیں۔ ایک نسخہ جناب آغا حیدر حسن مرزا کے ذاتی کتاب خانے میں دیکھنے میں آیا۔ اس کے شروع میں صاحب کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ زبان اور ضلع جگت پر خاص توجہ ہے، جو احسان کا بھی طرّۂ امتیاز تھا۔ مذہبیّت کا بھی جا بجا میلان ملتا ہے۔ نعتِ رسولؐ کے علاوہ حضرت غوثِ اعظم، سیّد عبدالقادر جیلانی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی بزرگ دسوندے شاہ لودیانوی کے مُرید تھے۔ دیوان کے آخر میں تین قصیدے ہیں : ایک حضرت علی کی منقبت میں اور دو نظامِ ششم نواب محبوب علی خان کی مدح میں۔ مختصر انتخاب ملاحظہ ہو :

کب زخمِ دل ہمارا مِنّت کشِ رفو ہے
کب دردِ دل ہمارا محتاج ہے دوا کا

☆

کوئی گر پوچھتا ہے اون سے : صاحب کس کا بندہ ہے
تو کہتے ہیں وہ، کس انداز سے کھا کر قسم : ''میرا''

☆

پکڑ کر ہاتھ میں شمشیر جب وہ مہ جبیں اٹھا
فلک پر الاماں، شورِ قیامت بر زمیں اُٹھا

☆

کہہ دی جب بات سچّے کی تو بگڑنا کیا تھا
جو کیا خوب کیا، اُس کا مکرنا کیا تھا

☆

مرتبہ ملتا ہے شاہوں کو گدائی کا یہاں
رتبہ ہے اقلیمِ الفت میں گدا کو شاہ کا
کیوں نہ میں اس رشک سے مر جاؤں بولو تو سہی
میرا کہنا ٹال کر، کہنا کیا بدخواہ کا
جو سمجھتے ہیں، وہی سمجھے ہیں اس کو، صاحبا!
کام حکمت سے نہیں خالی کوئی اللہ کا

☆

ناصح! نہ مجھ سے پوچھ کہ کیوں تجھ کو کیا ہوا
جو کچھ ہوا، درست ہوا، اور بجا ہوا
افسانہ میرے درد کا سُن کر کہا، تو یہ
قصّہ ہے یہ تو روز کا صاحب! سنا ہوا

☆

انساں بگڑے، زمین بگڑے، آسماں بگڑا
تیری نظر کے بگڑتے ہی سارا جہاں بگڑا

☆

جس دن سے تیرے رام ہوئے، اے بتِ فرنگ!
آرام نے تو ہم سے اوسی دن سے رم کیا

☆

پوشیدہ میں رکھتا تھا سدا رازِ محبت
افسوس کہ اِس چشم نے کی پردہ دری آج

☆

شرابِ شوق پیتے ہیں، نہیں کچھ کام ہے مے سے
الٰہی! کام میں رہوے نصیبِ دوستاں ہو کر

☆

تم کہتے رقیبوں سے یہاں اور، وہاں اور
کھلواؤ نہ منھ میرا کہ میری ہے زباں اور
واں مجھ سے وہ بدظن ہے، یہاں اس سے میں بدظن
واں اس کو گماں اور ہے، یاں مجھ کو گماں اور
کیا ٹھہرے عدو سامنے روباہ کی مانند
صاحب! یہ سمجھ لیں کہ یہ ہے شیرِ ژیاں اور

☆

بندے بتوں کے اور ہیں، ہم تو خدا کے ہیں
بے جا کے نوکر اور ہیں، یاں تو بجا کے ہیں
قیدی جفا کے جھیلنے والے جفا کے ہیں
بس اے جفا شعار! یہ معنی وفا کے ہیں
ساماں جو تمھیں نظر آتے گھٹا کے ہیں
یہ تو دھویں ہماری ہی آہِ رسا کے ہیں

☆

کس کس کو میں بتاؤں، کہ بارِ غمِ فراق
دل پر نہیں، جگر پہ نہیں، جان پر نہیں

☆

ذرا آنکھوں میں اِس کو رکھنا، صاحب!
کہیں یہ طفلِ اشک ابتر نہ ہووے

☆

عقدہ جو تیرے جعد کا رشکِ قمر کھلے
عشاق کے دلوں کی گرہ سر بسر کھلے
جان اُن کی آسمان کو پرواز کر گئی
لیکن کبھی نہ تیرے اسیروں کے پر کھلے

☆

شعلہ ہے یا برق ہے، یا نورِ پیراہن میں ہے
کس لطافت سے وہ رشکِ حور پیراہن میں ہے

☆

اگرچہ عشق کی منزل کڑی ہے
سہی جاوے گی، جو سر پر پڑی ہے

☆

جب پھنسے دامِ محبت میں، تو راحت کیسی
جھیلنی پڑتی ہے، پڑ جائے مصیبت کیسی
ابھی تو عشق کی ہے پہلی ہی منزل، صاحب!
چار دن میں یہ بنی آپ کی صورت کیسی

[گلستانِ سخن : ۳۲۵، بزمِ سخن : ۳۷، خم خانۂ جاوید، ۵ : ۲۳۹، دیباچۂ دیوان]

صاحب... محمد حسین بریلوی

نومسلم تھے۔ ان کے والد کا نام بہادر سنگھ تھا۔ فارسی اور ریاضی میں بھی اچھی مہارت تھی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹۔ ۱۸۹۰ء) میں انتقال ہوا۔

بوسۂ مژگان و ابرو کا چکھاتا ہے مزہ
لب سے زخمِ دل کا مل جانا تری تلوار کا

قیس سے جو دشت بالکل صاف تم نے لے لیا
بستیوں پر چل کے دعوئ اب کرو کہسار کا

☆

اسیرِ پنجۂ خورشید، ماہ را دیدم
گرفت دستِ نگاریں چو جامِ مینا را

[یادگار ضیغم (قلمی)]

صادق (عزیز)... مولوی محمدؐ عزیز الدّین بدایونی

شیخ صدّیقی تھے، نسب محمدؐ بن قاسم بن محمدؐ کے واسطے سے حضرت ابوبکر صدّیقؓ خلیفۂ اوّل تک پہنچتا ہے۔ خاندانی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اجداد میں سے قاضی کمال الدّین فرشوری خاندانِ غلامان کے سلطان التمش کے عہد میں اوّل بلگرام آئے اور پھر اُن کے عزیزوں میں شیخ یوسف فرشوری اپنے اہل و عیال سمیت وہاں سے بدایوں منتقل ہوئے۔ اُن کے اخلاف میں شیخ محمدؐ اکرم فرشوری اور ان کی اولاد نے بہت ترقی کی۔ شیخ محمدؐ اکرم کے پانچ بیٹے ہوئے، ان میں سے دوسرے کا نام محمدؐ فصیح الدّین تھا۔ اُنھیں ۱۸۱۷ء جلوسِ محمدؐ شاہی میں فصیح اللہ خان خطاب اور دو ہزاری ذات اور دو صد سوار کا منصب عطا ہوا۔ ساتھ ہی سرکارِ بدایوں کی سوانح نگاری کی خدمت تفویض ہوئی۔ بدایوں، اور دلّی اور کرنال اور پانی پت میں اُن کی جاگیر تقریباً دس لاکھ دام کی تھی۔

محمدؐ فصیح اللہ خان کے اکلوتے بیٹے شیخ مُؤید الدّین عرف حافظ ابو المؤید خان تھے۔ اِس خاندان میں خانی کا خطاب صرف اِن دو باپ بیٹوں کو ملا۔ حافظ ابو المؤید خان عربی اور فارسی میں منتہی تھے۔ ہمیشہ طلبہ کی جماعت اُن کے ہاں مقیم رہتی، جن کے قیام و طعام کا انتظام بھی اُن کے ذمّے تھا اور اوراد و وظائف سے جو وقت بچتا، وہ تعلیم و تدریس میں صرف ہوتا۔ اُن کا ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۵۵ھ (۲۴ جون ۱۸۳۹ء) کو انتقال ہوا۔

حافظ ابو المؤید خان کے بیٹے اساس الدّین احمد تھے، جن کا ۲۵ ذی قعدہ

۱۲۹۹ھ (۳۰ جنوری ۱۸۸۲ء) کو انتقال ہوا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ حکیم محمد سعید الدّین اور مولوی محمد عزیز الدین۔ خان بہادر محمد رضی الدّین بسمل صدّیقی فرشوری بدایونی جن کی کتابیں "انساب شیوخ فرشوری" اور "تذکرۃ الواصلین" مشہور ہیں، اُنھیں حکیم محمد سعید الدّین کے فرزندِ رشید تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے پہلے تخلّص کامل تھا، بعد کو اُسے ترک کر کے سعید کرلیا تھا۔ ۲۷ رجب ۱۳۱۶ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۹۸ء) کو فوت ہوئے۔ میرزا زین العابدین خان عارف کے شاگرد تھے۔ دوسرے صاحب زادے محمد عزیز الدّین، یہی ہمارے صاحبِ ترجمہ ہیں۔ وہ ۱۷ صفر ۱۲۴۴ھ (۲۹ اگست ۱۸۲۸ء) کو پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم و تربیت اپنے جدّ امجد حافظ ابو المؤید خان کی نگرانی میں دلّی میں ہوئی۔ عربی اور فارسی میں منتہی تھے۔ خوش خطی میں میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انگریزی حکومت کی ملازمت میں شامل ہوگئے۔ ۱۸۵۵ء میں وکالت درجۂ اعلیٰ کی سند لے کر دلّی میں وکیلِ ضلع مقرر ہوئے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک یہیں رہے۔ اس کے بعد شاہجہان پور کا نیا ضلع تشکیل ہوا، تو یہ وہاں وکیلِ سرکار بنا کر بھیج دیے گئے۔ یہ اُن کی کامیاب وکالت ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد منصف مقرر کردیے گئے۔ وہ اس حیثیت سے پیلی بھیت میں بھی رہے۔

تقریباً دس برس تک بمشاہرۂ چار سو روپیہ منصفِ درجۂ اوّل رہنے کے بعد ۵۵ سال کی عمر میں پنشن پر اس عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

بعمر ٦٦ برس ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ (۴ جنوری ۱۸۹۴ء) رحلت کی اور بدایوں میں قدیم باغ فرشوریاں کے قبرستان (فرشوری ٹولہ) میں دفن ہوئے۔

اُنھوں نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی نجابت النساء دخترِ شیخ عابد علی تھیں۔ یہ سوا سال کا ایک بیٹا چھوڑ کر فوت ہوگئیں۔ اس بچے کا نام محمد ابو الحسن تھا۔

محمد ابو الحسن اپنے خاندان میں پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزی پڑھی۔ مدرسۃ العلوم، علی گڑھ میں مدرّس مقرر ہوئے اور اس کے بعد سر سیّد کے پرائیویٹ سکتر بھی رہے۔ اخیر میں ریاست حیدرآباد میں ہائی کورٹ میں رجسٹرار رہے، بعد کو ضلع بیدر

کے جج اور بلدہ حیدرآباد میں چیف مجسٹریٹ مقرر ہوگئے تھے۔ مصنف بھی تھے۔ اعجاز القرآن، تنقید لسان الغیب وغیرہ اُن سے یادگار ہیں۔

صادق کی دوسری بیوی مقبول النساء دختر شیخ مجیب اللہ تھیں۔ اُن کے بطن سے تین بیٹے (محمّد وہاب الدّین احمد، محمّد دہاج الدّین اور محمّد ضیاء الدّین) اور ایک بیٹی افضل بانو پیدا ہوئیں۔

محمّد وہاب الدّین بھی شعر کہتے تھے، طالب تخلّص تھا۔ اپنے والد ہی سے اصلاح لی۔ اُن کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی تھی۔

قاطعِ بُرہان کے قضیّے میں غالب نے ایک کتاب ''قاطع القاطع'' کے مصنّف منشی امین الدّین پر ازالۂ حیثیتِ عرفی (دفعات ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱ تعزیراتِ ہند) کا مقدّمہ دائر کیا تھا۔ یہ مقدّمہ دسمبر ۱۸۶۷ء میں دائر کیا گیا تھا۔ اس مقدمے میں یہی محمّد عزیز الدّین ان کی طرف سے وکیل تھے۔ غالب نے مختار نامہ ۱۴ دسمبر کو داخلِ عدالت کیا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، غالب کو آخر کار راضی نامہ کرنا پڑا تھا۔ اُن کی طرف سے عزیز الدّین نے ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو اِس کی اطلاع عدالت کو دی تھی، جس پر مقدّمہ خارج اور داخلِ دفتر کردیا گیا تھا۔ عزیز الدّین یہاں دلّی میں لال کنواں کے علاقے میں رہتے تھے۔ جہاں آج کل سنیما ایکسلیر ہے، اس سے نیا بانس کی طرف جائیں، تو بہت سی چھوٹی چھوٹی گلیاں اُلٹے ہاتھ پڑتی ہیں، ان میں سے کوچہ پنڈت میں داخل ہوں تو آگے چل کر سیدھے ہاتھ کو ''گلی عزیز الدّین وکیل'' ملتی ہے۔ یہ اُنھیں کے نام سے منسوب ہے، اور گمانِ غالب ہے کہ ان کی سکونت اِسی گلی کے کسی مکان میں رہی ہوگی، اِس کے سرے پر نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

گزر کیسے ہو ایسے آستاں تک
تصوّر بھی نہیں جاتا جہاں تک
یہی گر آہ و نالہ ہے، تو صادق!
رہے گا دم نہ تاثیرِ فغاں تک

☆

قاتل جو اپنا ہے، وہی اب سوگوار ہے
اس موت پر حیات فدا، جاں نثار ہے

☆

ہماری آتشِ شوق اور بھڑکی
چلے جس وقت وہ دامن اٹھا کے

☆

سارے اندازِ ستم، ختم نہ کر تو مجھ پر
کچھ تو دشمن کے لیے طرزِ جفا رہنے دے

☆

ہے یہ تنہائی میں، مجھ سوختہ جاں کی غم خوار
شمعِ مرقد کو مری بادِ صبا رہنے دے

☆

لے گئی دل اک نظر میں، اس کی چشمِ نیم خواب
مست ہم سمجھے تھے اس کو پر بہت ہشیار ہے

☆

وہ حکم سناتے ہیں مجھے قتل کا ہنس کر
کچھ لطف کا انداز بھی ہے اُن کی جفا میں
صادق یہ تمنا ہے کہ جب تک ہو مری زیست
معشوق رہے بغل میں، دل یادِ خدا میں

(تجلیاتِ سخن (نظامی) : ۳۳۔ ۳۴، ۳۶، گلستانِ سخن : ۳۱۶، انسابِ شیوخِ فرشوری : ۸۵۔ ۱۰۹، غالب و عصرِ غالب : ۱۵۴۔ ۱۵۹، یادگارِ ضیغم : ۲۲۷، ۲۳۷، سخنِ شعرا : ۲۱۷۔ ۲۷۴، خم خانۂ جاوید، د : ۲۵۰، ایضاً : ۳۹۸)

صفیر... سیّد فرزند احمد بلگرامی

اِن کے والد سیّد عبدالحیٔ عرف میر سیّد احمد، احمد تخلّص حسینی واسطی سیّد تھے۔ چالیس واسطوں سے اِن کا سلسلۂ نسب حضرت رسولِ کریم صلعم سے جا ملتا ہے۔ بزرگوں کا وطن شروع میں ضلع ہردوئی کا مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام رہا، بعد کو خاندان کواتھ میں منتقل ہوگیا جو آرہ (ضلع شاہ آباد۔ بہار) کے قریب سادات کی مشہور بستی ہے۔ صفیر پیر ۷ اپریل ۱۸۳۴ء (۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ) اپنی نانھیال مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ ''شمس الضحیٰ'' سے تاریخِ ولادت نکلتی ہے۔ دوسرا تاریخی نام، غلام حسنین، بھی تھا، جو ان کے نانا حضرت سیّد عالم صاحب نے رکھا تھا، لیکن یہ مشہور نہیں ہوا۔ پانچ برس کی عمر تھی جب یہ اپنے والد کے ہمراہ آرہ آئے، اور اُس کے بعد ساری عمر یہیں گزار دی۔

اِس عہد کے رواج کے مطابق اُن کی تعلیم بھی گھر پر ہوئی۔ اس زمانے میں اُنھوں نے درسی کتب کے علاوہ خطّاطی پر خاص توجہ دی اور اِس میں بھی نستعلیق اور شکستہ اور نسخ میں خاصی مہارت پیدا کی۔

صفیر نے شاعری گویا ورثے میں پائی۔ دادھیال اور نانھیال دونوں طرف کے اجداد پشتوں سے شاعر تھے۔ پر دادا کے والد سیّد خورشید علی فارسی میں شعر کہتے اور خورشید تخلّص کرتے تھے، پہلے فصاحت تخلّص کرتے رہے، جسے اُن کے استاد غلام علی آزاد بلگرامی نے بدل کر خورشید کردیا۔ شیخ علی حزیں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ احیاناً اُردو سے بھی شوق کرتے تھے۔ ساری عمر انگریزی ملازمت میں بسر ہوئی۔ پیر ۱۲ صفر ۱۲۰۱ھ

(۴ دسمبر ۱۷۸۶ء) بلیا میں رحلت کی۔ نعش آرہ آئی اور یہیں دفن ہوئے۔

صفیر کے پردادا سیّد بندہ علی بندہ تخلّص تھے۔ اُنھوں نے حیدرآباد (دکن) میں ملازمت کرلی تھی۔ اُن کا شنبہ ۹ ذی قعدہ ۱۲۵۳ھ (۴ فروری ۱۸۳۸ء) کو گھوڑے سے گرنے سے حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ اپنے مکان حیدرآباد ہی میں مدفون ہوئے۔

صفیر کے دادا سیّد غلام یحییٰ فارسی کے شاعر یحییٰ تخلّص کرتے تھے۔ اُنھیں نظم سے زیادہ نثر سے مزاولت تھی۔ صفیر کے والد سیّد احمد صفر ۱۲۳۲ھ (دسمبر ۱۸۱۶ء/ جنوری ۱۸۱۷ء) میں مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سیّد بندہ علی نے اُنھیں اپنے پاس حیدرآباد بُلا لیا، اور اُن کے انتقال تک سیّد احمد کا وہیں قیام رہا۔ جب دادا نے رحلت کی، تو ان کی وطن کو واپسی ہوئی۔ آخر کار یہاں کلکٹری میں ملازمت مل گئی۔ پہلے مظفر پور (ضلع ترہت) میں محافظِ دفتر رہے، بعد کو مونگیر میں ڈپٹی مقرّر ہوگئے تھے۔

سیّد احمد کے تاج پور ضلع ترہت کے قیام کے زمانے میں تین برس صفیر بھی اپنے والد کے ساتھ رہے۔ میر سیّد احمد کا بعمر ۶۴ سال جمعرات ۲۸ شوال ۱۲۹۶ھ (۱۵ اکتوبر ۱۸۷۹ء) آرہ میں انتقال ہوا۔ صفیر نے والد کی تاریخِ وفات کہی: سالِ وفات گفتم: داخل بہ خلد زیبا (۱۲۹۲) وہ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے، عاصی تخلّص تھا۔

میر سیّد احمد کا نکاح حضرت صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ کی بڑی صاحب زادی سے ہوا تھا۔ اپنے پیچھے تین بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ فرزند احمد بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، چھوٹے بھائیوں کے نام اولاد احمد اور خورشید احمد تھے۔

صفیر کا کوئی ۱۴ برس کا سن تھا کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اپنے پھوپھا سیّد محمد مہدی خبر بلگرامی سے اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ چھ برس تک جاری رہا۔ پھر لکھنؤ جا کر شیخ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے۔ پانچ برس بعد غدر کے زمانے میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجّہ ہوئے، تو میرزا دبیر سے مشورہ کرنے لگے، اور ایک مدّت تک ان کے ساتھ پٹنہ میں رہ کر مشقِ سخن کی۔ اُنھوں نے پے در پے سات تخلّص اختیار کیے۔ قلب، آثم، اثیم، صبا، نالاں، احقر اور صفیر۔ آخر میں صفیر ہی سے زیادہ

مشہور ہوئے۔

مرزا غالب کے مکتوب الیہم میں مارہرہ شریف کے سجادہ نشین حضرت صاحبِ عالم بھی ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا، یہی صاحبِ عالم صفیر کے نانا تھے۔ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں صفیر نے غالبًا نانا جان کے ایما پر اپنی فارسی اور اُردو غزلیں اصلاح کے لیے غالب کی خدمت میں دلّی بھیجیں۔ دو سال بعد مئی ۱۸۶۵ء میں اپنے ماموں جناب شاہ عالم شائق کے ساتھ دلّی پہنچ کر غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بہت دن تک اُن کے پاس رہ کر استفادہ کیا۔ عبدالرّؤف عشرت کی روایت ہے کہ غالب کی وفات کے بعد صفیر چندے غلام حسنین قدر بلگرامی سے بھی مشورہ کرتے رہے لیکن ظاہراً یہ بات غلط ہے۔

صفیر کی زبان میں لکنت تھی، جس سے بزمِ مشاعرہ میں پڑھنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ بعض اوقات پڑھتے میں سانس پھول جاتی اور لیٹ جانا پڑتا تھا۔ اس لیے بالعموم ان کے پیچھے گاؤ تکیہ لگا دیا جاتا تھا، تاکہ اس کے سہارے آرام سے بیٹھ سکیں۔

بروز یک شنبہ ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء (۲۱ رمضان ۱۳۰۷ھ) کی دوپہر پٹنہ میں ہیضے سے انتقال کیا۔ نعش خشکی کے راستے آرہ لائی گئی اور یہاں میر گنج کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ''شہر رمضان المبارک'' تاریخِ وفات ہے۔

صفیر نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے صرف ایک بیٹا سیّد نور احمد زندہ رہے یہ شعر بھی کہتے تھے۔ گرامی تخلّص تھا اور اپنے والد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ صفیر کا دوسرا عقد آرہ میں ہوا۔ اُن بیوی سے دو بیٹے ہوئے سیّد غنی حیدر اور سیّد ولی حیدر گہر۔ نور احمد گرامی کا بعمر ۳۲ سال ۱۰ جون ۱۸۹۸ء کو انتقال ہوا۔ اُنھوں نے دو صاحب زادے اپنی یادگار چھوڑے۔ سیّد عنایت احمد اور سیّد وصی احمد۔ دونوں انگریزی عہد میں ملازم رہے۔ سیّد وصی احمد کے دو نثر مضمون بہت مشہور ہیں۔ ملکِ خطا کے شاہزادے اور ''س، ش، ص''۔ آخری مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سلطان اور شاد دونوں صفیر کے شاگرد تھے۔ دونوں بھائی شعر بھی کہتے تھے۔

بڑے بھائی کا تخلص دلگیر تھا، اُن سے چھوٹے سیّد محمدّ وصی احمد فانی تخلص کرتے تھے۔ ان کا ۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ سیّد مرتضٰی حسین بلگرامی (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) انھیں گرامی کے نواسے ہیں۔

صفیر نظم و نثر دونوں پر یکساں حاوی تھے اور اس میں شک نہیں کہ بدرجۂ غایت قادر الکلام اور زود گو تھے۔ متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات اُن کی یادگار ہیں۔ ان کا تذکرہ جلوۂ خضر اور دس جلدوں میں بوستانِ خیال کا اردو ترجمہ بہت مشہور ہیں۔ اُردو کے آٹھ دیوان تھے جن میں سے دو صفیرِ بلبل (۱۲۸۰ھ) اور خم خانۂ صفیر (۱۲۹۶ھ) اُن کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ تین دیوان فارسی کے تھے، چار فارسی کی مثنویاں اور چھبیس اُردو کی۔ قصائد، رباعیات، قطعات اور واسوختوں کے مجموعے اُن کے علاوہ۔ کلام بہت پختہ ہے۔ زبان پر قدرت ہر ایک شعر سے ہویدا ہے۔

ایک لطیفہ بھی سنیے :

ناسخ نے انیس و دبیر کے کلام پر اعتراض کیے اور اُنھیں، انتخابِ نقص، کے تاریخی نام سے شائع کیا۔ لکھنؤ کے حضرات اِس پر بہت بھنائے۔ ادھر عظیم آباد کے بہت سے لوگ صفیر سے بگڑے ہوئے تھے کیوں کہ اُنھوں نے کئی شاعروں کو غلط طور پر اپنا شاگرد کہا تھا۔ اُنھوں نے لکھنؤ والوں کو لکھا کہ ہم ناسخ کا کلام بھیجتے ہیں، اس کی دھجیاں اڑائیے۔ اور ستم یہ کیا کہ ناسخ کے کلام میں بہت سا صفیر کا کلام مخلوط کر دیا۔ اسیر مرحوم نے تو اس پر کچھ لکھنے سے انکار کر دیا، لیکن بعض دوسرے شعرائے لکھنؤ نے اس پر خردہ گیری کی اور ''تفضیح'' اور ''گستاخی معاف'' کی قسم کے رسائل شائع ہوئے۔ اس طرح گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا، اور ناسخ کے ساتھ صفیر کا کلام بھی معرضِ بحث میں آ گیا۔ اسی کا جواب ''طومارِ اغلاط'' کے نام سے دیا تھا۔

کلام کا مختصر انتخاب یہ ہے :

راز خلوت کا بیاں، کس نے کیا، کیا جانیں
ایک میں، ایک ہو تم، بس کوئی آیا نہ گیا

☆

بادۂ عشرت ہوش رُبا تھا، رات جو میں نے جام لیا
بارے یہ جرأت ساقی بنے کی، دوڑ کے مجھ کو تھام لیا
قتل کیا تو خجلت کیسی، چھپ سکتا تھا خون کہیں
جس نے سُنا احوال ہمارا، اس نے تمھارا نام لیا
دیکھنے مجھ کو آجاتے، تو بات تو ہوتی کہنے کو
عمر تو آخر ہو ہی چکی تھی، تم نے عبث الزام لیا

☆

میں، اور تمھیں، خلق میں بدنام کروں حیف!
یوں تم پہ کھلے میری زباں، ہو نہیں سکتا

☆

عذر کرتے ہو لو قصور ہوا
کہہ دو منھ سے، کہ رنج دور ہوا

☆

اے صفیر! اس سوزِ غم سے کون عاشق بچ سکے
جل بجھا کل رات، دیکھی تم نے پروانے کی بات

☆

بھلا، تم تو بھلے ہو، میں بُرا ہوں
محبت جھوٹ، میرا چاہنا جھوٹ

☆

تبسّم سے، تکلّم سے، حیا سے
مجھے مارا بھی تو کس کس ادا سے

☆

تعذیر میں میری نہ کمی کر ستم ایجاد
وہ آج ہی ہو جائے، جو کچھ روزِ جزا ہو

☆

قابو میں دل نہیں ہے، بھلا آپ کس لیے
تسکین دیتے ہیں مجھے، سمجھائے جاتے ہیں
کیا یاد آگیا اُنھیں صبحِ شبِ وصال
منھ میرا دیکھ دیکھ کے شرمائے جاتے ہیں

☆

آئے وہ میرے گھر، تو رقیبوں کو لے کے ساتھ
یارب، قبول یوں بھی کسی کی دعا نہ ہو

☆

بہار میں گل و بلبل سے کیا ہے سرگوشی
یہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی

☆

اتنا تو یاد ہے کہ وہ آئے تو بیٹھے تھے
معلوم کچھ نہیں ہے کہ پھر ہم کہاں رہے

☆

قصہ ہمارا تم سے سُنا بھی نہ جائے گا
تم کیا سنو گے، ہم سے کہا بھی نہ جائے گا

☆

کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اُٹھانے کے لیے

اب فارسی کے چند شعر دیکھیے:

ہستم صفیرِ گوہرِ بحرینِ عقل و دیں
وازِ سلسلۂ مسلسلِ نسلِ پیمبری

نسبد مرا کہ ناز کنم برعطاے حق
کو تاکجا رساند ز پاکیزہ گوہری
ز اولادِ پاکِ زید شہیدم، زہے شرف!
یعنی حسینی و حسنیم و حیدری
از پیروِ ائمہ اثنا عشر منم
مشرب کہ حیدری شدہ مذہب کہ جعفری
"شمس الضحیٰ" کہ سالِ ولادت بودمرا
مارہرہ است مولدِ پاکم ز برتری
شکرِ خدا کہ موطنِ من بلگرام شد
در ہند اوست مطلعِ شمسِ ہنروری
آرہ کہ گشت مسکنِ من یافتم بدل
یوسف نہانست درچہِ کنعاں ز مشتری
الکن اگر شدم، چہ غم، ایں کلکِ دو زباں
داردیکے زمن، دگر از خود بساحری
استادِ من بشیوۂ اُردو بود سحر
کزناسخ است یافتہ تمغاے شاعری
در مرثیہ دبیر بود استادِ من
مقبولِ کبریا شدہ از مدحِ حیدری
غالب بود ہنرورِ شعرم بہ پارسی
کوہست در زمانہ علم یا ہنروری
دارم بدل ذخیرہ ازینہا صنوفِ علم
چوں ابر مخزنِ گہرِ نکتہ پروری

از نثر و ہم ز نظم بسے قسم قسم را
دارم زکلکِ خویش نگارش بہ زیوری

☆

شاہدانِ دہر تا با ساغرِ مُل ساختند
آنچہ ماند از بیخودی، صرفِ تغافل ساختند
آتش افشاندند از برقِ تبسم، تو گماں
اخگرے بردند و آہِ گرمِ بلبل ساختند
آہ از حالِ منِ محزوں و نا پرسانیش
داستہانہا از پےِ فریادِ بلبل ساختند
پیش داور چیست خونِ حسرتِ مارا جواب
ایں کہ سفاکاں بقتلِ من تامّل ساختند
ذرّہ ذرّہ اصلِ خورشید ست، درعین الیقین
جُزوہا چوں جمع شد، موسوم بِاکُل ساختند
شمع را رونق نباشد، باوجودِ آفتاب
پیشِ رُوے تو چراغِ طور را گُل ساختند
تا خیالِ حیدرِ صفدر بچشم آید، صفیرؔ!
حلقۂ چشم زنقشِ پاے دُلدل ساختند

☆

من کشتۂ ایں شیوہ کہ دیدن نگزارند
وز سینہ بلب آہ کشیدن نگزارند
رشکم بحریفانِ سیہ مست کہ از شوق
تا موسمِ گل بادہ رسیدن نگزارند

فریاد از آناں کہ چو انوار سرِ طور
گیرند نقاب از رُخ و دیدن نگزارند
فریاد ازیں دام نگاہاں کہ چو آہو
از پیش برانند و دمیدن نگزارند
ایں خوش نگہاں از نظرِ شوخ و سیہ مست
میخانہ فروشند و خریدن نگزارند
ایں لالہ رُخاں، آہ، صفیرؔ! از سرِ شوخی
از چہرۂ من رنگِ پریدن نگزارند

☆

مرا در سینہ جُز غم نیست باقی
ولے بوداست، آں ہم نیست باقی
بیا ظالم! دمے بنشیں ببالیں
کہ چندانے بمرگم نیست باقی
عزیزاں! برسرِ نعشم مگریید
چو او خندید، ماتم نیست باقی
بیا، ساقی! غنیمت داں دمے چند
نماند جام، چوں جم نیست باقی
صفیرؔ! از وصلِ جاناں میشوی شاد
توقف غیرِ یک دم نیست باقی

☆

طائرِ جانم بہ بندِ پیچتابِ دیگرست
رقصِ بسمل دیگر و ایں اضطرابِ دیگراست
بر تغافل می زنی گاہے سوالِ مطلبم
ایں سخن را، جانِ مشتاقاں! جوابِ دیگراست

دشمنم می گفتی و دیدی کہ جاں دادم بہجر
بندہ اکنوں آرزو مندِ خطابِ دیگر است

☆

از حسنِ عارضِ تو خجل آفتاب شد
امروز حسنِ مطلعِ اُو را جواب شد
چوں از رُخِ تو زلف، صبا یک طرف فگند
یک روز ماندہ بود زعمرم حساب شد

☆

از تبِ ہجر تو دل سخت عذابے دارد
کشتنم گرچہ گناہ است، ثوابے دارد

قطعۂ فخریہ

تلمیذِ [خاصِ] غالب شیوا بیاں منم
سازم نوائے غالبِ شیوا بیاں دہد
تہ کردہ ام بخدمتِ او زانوے ادب
بے خدمتِ چنیں نہ نوائے چناں دہد
آں بحرِ فیض گرز بزمیں شد نہاں چہ غم
امروز فیضِ روحِ ویم ہر زماں دہد

[جلوۂ خضر، ۱ : ۲۱۹_ ۲۲۱، ایضاً، ۲ : ۲۱۲_ ۲۲۶، تاریخِ شعرائے بہار : ۱۲۶_ ۱۳۱، بہار اور اُردو شاعری، ۱۱۵_ ۱۲۰، خم خانۂ جاوید، ۵ : ۳۳۹_ ۳۴۱، آبِ بقا : ۷۶_ ۷۹، یادگارِ ضیغم : ۳۰۱، ماہنامہ آجکل، فروری ۱۹۵۶ء : ۲۷_۳۳، ایضاً، فروری، ۱۹۵۷ء : ۲۱]

صوفی... سیّد ابو محمّد جلیل الدّین حسین عرف شاہ فرزند علی مُنیری

یہ خاندان اصل میں ضلع پٹنہ کے موضع شرف آباد پارتھو کا رہنے والا تھا لیکن صوفی شب ۹ شوال ۱۲۵۳ھ (۶ جنوری ۱۸۳۸ء) کو اپنی ننھیال مُنیر شریف (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے بڑے بھائی شاہ اولاد علی نے ''مظہرِ حق'' سے تاریخ نکالی۔ اُن کے والد کا نام سیّد شاہ محمّد علی تھا۔ مُنیر حضرت مخدوم یحییٰ مُنیری کے مزار کی وجہ سے اہلِ دل میں دور و نزدیک مشہور ہے۔ شاہ فرزند علی کا سلسلۂ نسب، دادھیال کی طرف سے حضرت سیّد علیم الدّین گیسو دراز دانش مند نیشاپوری (دیباجی الحسینی) سے اور ننھیال کی طرف سے مخدوم شاہ خلیل الدّین برادر مخدوم الملک شاہ شرف الدّین بہاری (خلف الرشید حضرت مخدوم یحییٰ مُنیری) کے واسطے سے حضرت امام محمّد تاج فقیہ فاتحِ مُنیر تک پہنچتا ہے۔ سیّد علیم الدّین گیسو دراز، حضرت امام جعفر صادق کے پانچویں صاحب زادے محمّد دیباج کے واسطے سے رسولِ کریم صلعم سے بارھویں پشت میں تھے۔

صوفی نے ۶ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ (۲۵ فروری ۱۹۰۱ء) کو اسلام پور (ضلع پٹنہ) میں انتقال کیا اور وہیں اپنے سسرالی خاندان کی خانقاہ کی مسجد کے بغل کے جنوبی حصے میں دفن ہوئے۔ شاہ احتشام الدّین حیدر مشرقی نے تاریخ کہی:

شاہ فرزند، عم و استاذم
آں کہ شانے بفقرِ اُو افزود

داشت صوفی تخلص اندر شعر
بود شعرش ہمہ ثنا و درود
سالِ نقلش ز دل ہمی جستم
صورتِ مدعا ولے نہ نمود
ناگہہ از ہاتفم رسید بگوش
''صوفیِ وقت و مرشدِ دیں بود''
(۱۳۱۸)

اُنھوں نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے تین صاحب زادے، سیّد شاہ محمد عبدالقادر صاحب سجّادہ نشین خانقاہِ اسلام پور، حکیم حاجی شاہ محمد عمر صاحب عامر اور شاہ سیّد علی صاحب کامل اور دو صاحب زادیاں ہوئیں۔ دوسری بیوی سے جناب شاہ اسد اللہ صاحب مُنیری تھے۔ اُن کی اولادِ امجاد اسلام پور اور مُنیر شریف میں موجود ہے۔

صوفی کا خط بہت پاکیزہ اور خوب صورت تھا۔ اُن کی تصنیفات کے قلمی نسخے اُن کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ فارسی میں بہت اعلیٰ استعداد تھی۔ عربی بھی اچھے جانتے تھے۔ تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ نظم و نثر میں متعدد اُردو فارسی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ جن میں سے مخدوم الملک شاہ شرف الدّین کی سوانح عمری ''وسیلۂ شرف'' مشہور تالیف ہے۔ ''راحتِ روح'' اردو نثر میں تصوّف سے متعلق تمثیل ہے۔ اردو، فارسی کے دیوانوں کے علاوہ تین اُردو کی مثنویاں ''لواء الحمد''، ''روشِ عشق'' اور ''کششِ عشق'' چھپ چکی ہے۔ لواء الحمد میں حضرت رسولِ کریم ﷺ کا حلیہ ہے۔ لواء الحمد میں لکھتے ہیں :

فخرِ عالم، گہرِ تاجِ رسُل
خواجۂ کون و مکاں، مرجعِ کُل

قرۂ باصرۂ عینِ حضور
اوّلیں موجۂ دریائے ظہور
نورِ حق، جلوۂ ربّ، شانِ الٰہ
ہے تو بندہ، مگر اللہ اللہ

آخری شعر پر غالب نے چار صاد بنائے اور اسے بہت پسند کیا۔
استاد کی مدح میں اُن کے مخالفوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

ہیں شعر کے معرکے میں صفدر غالب
ہاتھ اُن کے ہے کھیت، یہ ہیں سب پر غالب
اس نام کا پاس ہے خدا کو صوفی
پھر ہوں اسد اللہ نہ کیوں کر غالب

☆

سب تیغِ زباں سے اُنھیں پہچانتے ہیں
غالب ہیں وہ، سب اہلِ سخن جانتے ہیں
یہ شیرِ خدا کے نام کی ہے برکت
لوہا اسد اللہ کا سب مانتے ہیں

صوفی غالب کے آخری دور کے شاگرد ہیں۔ اُنھوں نے ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ (۸ مئی ۱۸۶۶ء) کو مُنیر شریف سے غالب کی مدح میں ایک فارسی قصیدے کے ذریعہ اپنی درخواست تلمّذ بھیجی۔ اسی کے ساتھ مذکورۂ صدر تینوں مثنویاں اور کچھ اور کلام بھی اصلاح کے لیے روانہ کیا۔ اس قصیدے کے چند شعر دیکھیے (بعدِ اصلاحِ غالب):

بنورِ خویش خرد جُست دوش راہِ کمال
بکوچۂ دلم افروخت طبع شمعِ خیال
قرار و صبر بہ تعظیمِ اُو ز جا برخاست
نگاہِ شوق دوید از برائے استقبال

خیال گفت کہ یوسف بخوابم آمدہ است
نہ دیدہ بود بہ بیداری ایں چنیں چو جمال
شگفت گفت کہ روزے بخاک بودنِ تو
دہد ثمر کہ برآرد ز تومرادِ نہال
زہے مکانِ فلک پایۂ رفیع الشان
خہے مکینِ فلک رتبۂ ستودہ خصال
نہادہ عینکِ شمس و قمر بدیدہ، فلک
بشرق و غرب بگر دید روز و شب مہ وسال
فلک جناب اسد اللہ خانِ والا جاہ
بصدر مرتبہ مسند نشینِ جاہ و جلال

غالب نے قصیدے کی رسید لکھی اور ان کا تلمذ قبول کرلیا اور اپنی تصنیفات کے نسخے ہدیتہً بھیجے (یہ خط چھپا ہوا موجود ہے)

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

قدم بوسی تری کرتا، زمینِ آستاں ہو کر
خجل ہے آسماں قسمت سے اپنی آسماں ہوکر
اٹک کر رہ گئے زُہاد، ہم مے پی کے چل نکلے
گئی ہے راہ کوئے یار کی باغِ جناں ہو کر

☆

گر حسب خواہ، گردشِ ایام چاہیے
تو دورِ جامِ مے سحرو شام چاہیے
تقویٰ کی رُت بدل گئی، رندی کے دن پھرے
شیشہ بغل میں، ہاتھ میں اب جام چاہیے

کل ہم کریں گے عرض کہ، رحمت کی نذر کو
ہدیہ گناہ لائے ہیں، انعام چاہیے

☆

لاکھوں دنیا میں ہوں، زہد اور عبادت والے
کہیں دو چار ہی نکلیں گے محبّت والے
باتیں اچھی ہیں، برائی ہے تو بس اتنی ہے
نیک اپنے کو سمجھتے ہیں نصیحت والے

☆

جلوے کو تیرے، حشر کا کیوں انتظار ہے
جلوہ ترا ہے حشر کا ساماں کہیں جسے
خوش ہوں جنوں سے میں کہ وہ کرتے ہیں التفات
ہے صبحِ عید، چاکِ گریباں کہیں جسے
صوفی! بتائے منزلِ جاناں کی راہ کون!
اب چُپ ہے وہ جرس، دلِ نالاں کہیں جسے

فارسی کی ایک غزل کے چند شعر ہیں۔

در سینہ، دل تپاں نہ گنجد
رازم بہ دروں، ازاں نہ گنجد
از قیدِ وجود، ہر کہ وارست
در دائرۂ جہاں نہ گنجد
ساقی قدحے، کہ عُجب و پندار
در خاطرِ مے کشاں نہ گنجد
عشق آمد و حکمِ عقل برخاست
یک ملک، دو حکمراں نہ گنجد

شورے کہ مراست درسر، از عشق
در گنبدِ آسمان نہ گنجد

[معارف (اعظم گڑھ) جون ۱۹۳۲ء، ہندستانی : ۱۹۳۵ء : ۲۳، ۳۳، تاریخ شعرائے بہار : ۱۳۱، ۱۳۳، اردو کراچی، جولائی۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء، حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے : ۳۱۔ ۵۹]

صوفی... حکیم محمد علی نجیب آبادی

ریاستِ جے پور سے ملازمت کا تعلّق تھا :

بیٹھے یوں غیر تری مسندِ کم خواب کو داب
بارِ غم کیوں کہ نہ ہووے، سرِ احباب کو داب

ضیا... منشی نور محمدؔ

''جناب منشی نور محمدؔ صاحب ضیا تلمیذ غالب مرحوم

اور پہلو میں مجھے کیا چاہیے
اک حسیں اچھے سے اچھا چاہیے

کچھ مریضِ عشق کی بھی ہے دوا
حضرتِ موسیٰ سے پوچھا چاہیے

ہم نیا لائیں کہاں سے روز دل
روز اُن کو اک کھلونا چاہیے

آئے دن اس ماہ رُو کے واسطے
چاند تارے کا دوپٹا چاہیے

مانگ لے مجھ سے وہ آکر، اے ضیا!
جس کو مضموں کا خزانا چاہیے

[ماہنامہ ''جلوۂ یار''، میرٹھ، مئی ۱۹۰۹ء (ص ۱۴) بحوالہ غالبیات: چند عنوانات'' (ص ۱۹۷۔ ۱۹۸)]

طالب... سردار محمدؐ خان

افسوس کہ نہ حالات معلوم ہو سکے، نہ کلام ہی دستیاب ہوا۔ صرف اتنا پتا چلا کہ اُردو کے مشہور ڈراما نویس پنڈت نارائن پرشاد بے تاب اِن ہی کے شاگرد تھے۔
(خم خانۂ جاوید، ۱: ۶۴۱)

طالب... میرزا سعید الدّین احمد خان عرف نواب احمد سعید خان دہلوی

نواب ضیاء الدّین احمد خان نیرّ رخشاں کے دوسرے بیٹے یعنی میرزا شہاب الدّین احمد خان ثاقب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوے۔ سلسلۂ نسب حضرت کرّم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ ایک مرثیے کی بیت میں کہتے ہیں:

المختصر کہ خادمِ شاہِ نجف ہیں ہم
مشکل کشا ہیں جن کے سلف، وہ خلف ہیں ہم

تعلیم و تربیت اپنے والدِ نامدار کی نگرانی میں پائی۔ چندے دلّی کے سرکاری

اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ لیکن ۱۸۷۳ء میں شادی کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نیّر رخشاں کے رسُوخ سے اولاً دلّی میں ۱۸۷۵ء میں آنریری مجسٹریٹ اور پھر مارچ ۱۸۷۹ء میں لیفٹیننٹ گورنر، پنجاب سر رابرٹ ایجرٹن کی مردم شناسی کے طفیل عارضی E.A.C بھرتی ہو کر فیروز پور میں تعینات ہوئے۔ سال بھر بعد ۱۸۸۰ء میں محکمانہ امتحان پاس کرلیا تو ملازمت میں مستقل کر دیے گئے۔ کچھ دن کرنال میں رہے۔ وہ اِسی عہدے پر ہوشیار پور میں تھے، جب ۲۷ جون ۱۸۸۵ء کو نیّر رخشاں کا انتقال ہوا ہے۔ اس پر مستعفی ہو کر دلّی چلے آئے۔ پھر کوئی ملازمت نہیں کی، اور خانہ نشین ہو گئے۔ اس دوران میں دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر نامزد ہو گئے تھے۔

نہایت خوش رُو اور جامہ زیب شخص تھے۔ گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔ عام طور پر کاٹھیا واڑ اور بالوترے کی نسل کے گھوڑے اپنی سواری میں رکھتے تھے۔ اتنے ماہر شہسوار تھے کہ سرِ بازار گھوڑے کو الف کر کے اُسے پچھلی ٹانگوں سے چلانے لگتے۔ جب سوار ہو کر چاوڑی بازار سے نکلتے، تو لوگ باگ تماشا دیکھنے کو کوٹھوں پر نکل آتے تھے۔ مہذب، متین، وضع کے پابند، وسیع الاخلاق اور منکسر مزاج تھے۔ خوش دل اور بذلہ سنج ایسے کہ جس مجلس میں پہنچ جاتے، وہ زعفران زار بن جاتی۔ شعر بھی نہایت دل آویز انداز میں پڑھتے تھے۔

آخری عمر میں پاؤں پر ورم آجانے کے باعث زیادہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بروز یک شنبہ ۳۱ اگست ۱۹۱۹ء (۴ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ) کو انتقال کیا، اور درگاہِ قطب صاحب میں نواب ضیا الدّین احمد خان کی ہڑواڑ یعنی صندل خانہ کے صحن میں دفن ہوئے۔ اُن کا نکاح اپریل ۱۸۷۲ء میں بادشاہ بیگم دختر سیّد احمد شاہ نواب سردھنہ سے ہوا تھا۔

قربان علی بیگ سالک نے اس کی تاریخ کہی :

نیّر و رخشاں، وہ گردوں اقتدار
جن کو مہرِ پُر ضیا کہتا ہوں میں

مظہرِ خُلق و کرم لکھتا ہوں میں
مصدرِ جود و سخا کہتا ہوں میں
اُس کو بحرِ لُطف کہنا ہے بجا
پھر یہ کہتا ہوں کہ ''کیا کہتا ہوں میں!''
آپ ہی کچھ دل میں ہو کر منفعل
لاکھ دریا سے سوا کہتا ہوں میں
پوچھتے ہیں تجھ سے کیا اہلِ جہاں
مژدۂ راحت فزا کہتا ہوں میں
اُس کے فرزندِ سعادت مند کو
کدخدا حق نے کیا، کہتا ہوں میں
انعقادِ بزمِ عشرت خیز کو
جشنِ بہجت انتما کہتا ہوں میں
دُور پھینکا اُس سے تو نے کیوں مجھے
اے فلک، تجھ کو بُرا کہتا ہوں میں
کیا ہوا آنکھوں سے گر دیکھا نہیں
دل شریکِ بزم تھا، کہتا ہوں میں
بسکہ اس شادی کی عشرت عام ہے
''عشرتِ شادی'' بجا کہتا ہوں میں

(۱۲۸۹ = ۴+۱۲۸۵)

لاولد فوت ہوئے۔

نومشقی کے ابتدائی زمانے میں ثاقب اور غالب سے اصلاح لی۔ اُن کی وفات کے بعد چند دن سالک اور مولانا حالی سے مشورہ کرتے رہے اور آخرکار اپنے والد کے کہنے پر میر مہدی مجروح کو کلام دکھانے لگے۔ اگرچہ کبھی کبھی اپنے خاندانی

ورثے کے زیرِ اثر فارسی کی ترکیبیں بھی لکھ جاتے ہیں، لیکن بالعموم دلّی کی صاف ستھری زبان، محاورہ، روزمرّہ اور بلاغت اُن کے کلام کے امتیازی نشان ہیں۔ افسوس کہ دیوان شائع نہ ہوا۔ اس کا قلمی نسخہ لوہارو ریاست کے کتب خانے میں تھا اور یہ اب کتب خانۂ رضائیہ رام پور میں محفوظ ہے۔ چند شعر درج ہیں :

یہ سب کچھ ہے طفیلِ حضرتِ غالب
وگر نہ ہم میں طالب! خاک طاقت ہے

☆

بہار آئی، یہ سن کر یوں ہوئی محوِ طرب بلبل
کہ ہر کنجِ قفس، اس کی نظر میں اک گلستاں تھا

☆

اس سے ستم کی وجہ کوئی پوچھتا نہیں
پرُساں ہے اک زمانہ، ہمارے ہی حال کا

☆

طالب کی لو خبر، کہ وہ بیمارِ ناتواں
دنیا میں کوئی دم کے لیے میہماں ہے اب

☆

محتسب نے خوب پی، پیرِمغاں کے ہاتھ سے
راہ پر آیا، جو پہنچا مرشد کامل کے پاس

☆

ساقیا! ہے بزمِ آخر، دور بھی ہے آخریں
دیکھنا، محرومؔ رہ جائیں نہ اک ساغر سے ہم

☆

اُس کے در سے اٹھے اٹھائے ہوئے
ناتوانی ذرا سنبھال ہمیں

☆

[رخ سے اٹھایا] بزم میں اُس نے نقاب کو
شوخی نے کچھ بڑھا دیا لطفِ حجاب کو

☆

اپنے بیگانے ہوئے سب، لطفِ ساقی دیکھ کر
پھر گیا ہم سے زمانہ گردشِ ساغر کے ساتھ

☆

مگر چل گیا وار تیرِ نگہ کا
خلش دل میں ہے اور پیکاں نہیں ہے
ترے ساتھ تھے، دل کے ارمان سارے
نہیں جب سے تو، کوئی ارماں نہیں ہے

☆

جب یہ چاہا کہ لکھوں میں سوئے دلبر کاغذ
اشکِ خونیں سے ہوا بادۂ احمر کاغذ
نامہ بر کی نہیں پروا کہ رہِ الفت میں
شکلِ تیرِ نظر اُڑ جائے گا بے پر کاغذ
خط کے لکھنے میں پڑا عکس جو عارض کا ترے
ارغوانی تھا، مگر ہو گیا اصفر کاغذ
دلِ خونیں کو نہ کیوں بھیجیں عوض نامے کے
خطِ عاشق کو سدا چاہیے احمر کاغذ

یار کی زلفِ پریشاں کا، جو نقشہ کھینچے
کم ہے کم چاہیے بہزاد کو گز بھر کاغذ

☆

نہیں اس میں گنجایشِ کینِ دشمن
وہ دل جس میں تیری محبت بھری ہے
نہیں فکر کچھ، ہم جو بیٹھے ہیں خالی
صراحی تو مے کی لبالب بھری ہے

☆

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے
زمانے کو کیوں کر نئی سوجھتی ہے
قیامت کے وعدوں پہ تم جی رہے ہو
تمھیں زاہدو! دُور کی سوجھتی ہے
یہاں حال پر ہے ہنسی اپنے آتی
وہ سمجھے، کہ اِس کو خوشی سوجھتی ہے

☆

ہیں دل فریب نقش و نگارِ جہاں ولے
کیا اس کا اعتبار ہے، جو مستعار ہے

فغانِ دہلی، (مرتبہ منشی محمد تفضل حسین خان کوکب) میں ان کا یہ قطعہ بھی شامل ہے:

دلّی والوں کی زباں پر ہے بیانِ دہلی
اور فلک پر ہیں ملک مرثیہ خوانِ دہلی
بارے، آباد ہوا پھر سے جہانِ دہلی
بنتے جاتے ہیں، جو ٹوٹے تھے مکانِ دہلی

شہرِ دہلی تھا عجب رشک دہ خلدِ بریں
ہم نشیں! تجھ سے کروں خاک بیانِ دہلی
فتنۂ غدر کو ہنگامۂ محشر کہیے
نالۂ صُور سے ملتی ہے فغانِ دہلی
سارے عالم میں پھرا، اور سنی سب کی زباں
پر نہ طالب نے کہیں پائی زبانِ دہلی

ایک نعت کے چند شعر ہیں:

نوعِ بشر میں کیوں کہ نہ وہ انتخاب ہو
جس کا ازل سے رحمتِ یزداں خطاب ہو
کھلتا کسی پہ بھید نہ شانِ نزول کا
الحق کہ تم ہی کاشفِ اُمّ الکتاب ہو
تم سے ملے، تو مل گئے گویا خدا سے ہم
سچ ہے کہ لطفِ خاص سے تم بہرہ یاب ہو
سب آفتابِ حشر کی ٹھنڈی ہوں گرمیاں
ماہِ منیر میرا، اگر بے نقاب ہو
سکتہ ہے تیرے عکس کو بھی تیرے سامنے
آئینہ کہہ رہا ہے کہ تم لاجواب ہو
بندے ترے گناہ کریں جب کہ بے شمار
اللہ، کیوں کرم نہ ترا بے حساب ہو
بیڑا ہے پار، طالب! اگر یہ شرف ملے
آنکھیں ہوں میری اور درِ بوتراب ہو

(گلدستۂ سفینۂ نجات، دہلی یکم دسمبر ۱۸۹۹ء)

زمانے کی حیا سے ہو گیا ہمراہ قاتل بھی
اٹھا جس دم جنازہ طالبِ مہجورِ جاناں کا
کسی نے اُس سے یوں پوچھا کہ کس کے ساتھ جاتے ہو
تو بولا، ہے جنازہ ایک بے چارے مسلماں کا

[خم خانۂ جاوید، ۵ : ۴۱۱ ـ ۴۱۸، فغانِ دہلی، ماہِ نو، (مشاعرۂ دہلی (۱) ۱۲۹۷ھ) کراچی، جنوری، فروری ۱۹۶۹ء ''پچاس برس پہلے کی دہلی''۔ ساقی، جنوری ۱۹۴۶ء]

طالب... سیّد شیر محمدؔ دہلوی

خم خانۂ جاوید میں دو جگہ اس تخلص کے تحت بالترتیب سیّد شیر محمدؔ اور منشی شیر محمدؔ خان کا ذکر ہے۔

سیّد شیر محمدؔ کو غالب کا شاگرد (۵ : ۴۰۲۔۴۰۳) لکھا گیا ہے اور شیر محمدؔ خان کو حافظ عبدالرحمٰن احسان کا (۵ : ۴۱۰۔ ۴۱۱)۔ طبقات الشعرائے ہند (ص ۴۱۸۔ ۴۱۹) اور گلستانِ بے خزاں (ص ۱۵۱) میں صرف آخر الذکر کا نام ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں شخص واحد ہوں۔ بہرحال احتیاطاً میں نے صرف مقدم الذکر کا نام یہاں لیا ہے اور شیر محمدؔ خان کو ترک کردیا ہے۔

اُس چشمِ سرمگیں سے ملائی نہ آنکھ تھی
لڑنا پڑا ہے اب تو خدایا، قضا کے ساتھ
رنگت نہ ہاتھ پانو کی جائے تمام عمر
میرا لہو ملا کے مَلو تم حنا کے ساتھ
بچتا کسی طرح سے کوئی شیفتہ نہیں
کیا لاگ ہے اجل کو ترے مبتلا کے ساتھ
طالب! یہاں جو کرنا نہ تھا، وہ بھی کر چکے
اب دیکھیے بنے گی وہاں کیا، خدا کے ساتھ

(خم خانۂ جاوید، ۵ : ۴۰۲۔۴۰۳)

طالب... خان بہادر ڈاکٹر محمدؐ حفیظ اللہ اکبرآبادی

شاہی زمانے میں ان کے آباو اجداد اسلحہ سازی میں مہارت رکھتے تھے اور یہ ایک طرح سے خاندانی پیشہ ہو گیا تھا۔ طالب نے عربی تعلیم اپنے طور پر کی۔ اپنے استاد بھائی محمدؐ اقبال حسین عاشق کے دیوان ''افکارِ عاشق'' (شاملِ دیوان) کی جو تقریظ لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو اور فارسی دونوں میں لکھتے تھے۔ اُردو نثر میں بھی اچھی مہارت تھی۔ ۱۹۱۶ء میں انتقال ہوا (؟)

''جو بھلا کرتا ہے، اس کا بھی بھلا ہوتا ہے''
اُس کے کوچے میں یہی ہم نے صدا رکھی ہے

☆

لے چلا پھر خیالِ یار مجھے
سوئے صحرا و کوہسار مجھے
پھر جنونِ شباب کا ہے جوش
مےِ اُلفت کا ہے خمار مجھے

(شاعر، آگرہ نمبر، ۸۹)

طالب... مولوی محمدؐ ریاض الدّین

گلدستہ ''ارمغان'' سے ان کے پانچ شعر دستیاب ہوے۔ ان میں سے آخری دو خم خانۂ جاوید میں بھی نقل ہوئے ہیں :

میں یادِ زلف میں جو غریب الوطن ہوا
مارِ سیاہ جادۂ راہِ ختن ہوا

مہمان میرے گھر جو بُتِ گل بدن ہوا
خلوت کدے کا رنگ بہارِ چمن ہوا

وہ چُپ رہے جو سُن کے سوالِ وصال کو
عالم میں لاجواب ہمارا سخن ہوا

کیا اور وصف زاہدِ مے کش کا کیجیے
بدعہد اس قدر ہے کہ توبہ شکن ہوا

طالب! پسِ فنا نہ ہوا کوئی پردہ پوش
میرا لباسِ عمر ہی آخر کفن ہوا

[گلدستۂ ارمغان، حیدرآباد، دسمبر ۱۸۹۶ء : ۱۲، خم خانۂ جاوید ۵: ۲۱۱]

طالب (شریف)... حکیم سیّد محمدؔ شریف سیتاپوری

سیتاپور کے رہنے والے، حکیم مفتی سیّد اولاد علی کے فرزندِ ارجمند طبابت میں اپنے والد کے شاگرد اور حاذق طبیب تھے۔ اُن کے والد بھی شعر کہتے اور جریحؔ تخلص کرتے تھے۔ اُن کا انتقال غدر ۱۸۵۷ء سے ۸۔ ۹ برس قبل (۱۸۴۸/ ۱۸۴۹ء میں) ہوا۔ اُنھوں نے ساری عمر مدّاحیِ اہلِ بیتِ رسولِ اکرم میں صرف کردی۔ اُن کے اِن قصائد کا نامکمل مجموعہ نادم سیتاپوری کے پاس تھا۔

یہ مشہور جعفری نیشاپوری خاندان کے نام لیوا تھے۔ سلسلۂ نسب ۳۲ واسطوں سے امامِ سادس حضرت جعفر صادق تک پہنچتا ہے۔ اِن کے مورثِ اعلیٰ سیّد شاہ اسمٰعیل نیشاپور سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان وارد ہوئے اور پنجاب اور اودھ کے مختلف مقامات میں سکونت اختیار کرتے ہوئے بالآخر عہدِ شاہ جہانی میں یہ خاندان سیتاپور میں مقیم ہوگیا۔

بزرگوں کا چھوڑا ہوا کافی ورثہ تھا۔ سیّد اولاد علی کے پاس کچھ زمینداری بھی تھی۔ لیکن اُن کی وفات کے ساتھ ہی ہوا کا رُخ بدل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ قرض چھوڑ مرے تھے۔ طالب ان جھمیلوں کی تاب نہ لاسکے اور اُنھوں نے سب چیزوں سے دامن جھاڑ کر لکھنؤ کی راہ لی۔ حاذق طبیب تھے، خدا نے اُن کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ یہاں پہنچے، تو شاہی خاندان کے کسی مریض کا علاج کیا۔ شافیِ مطلق نے اپنے فضل سے اُسے تن درستی ارزانی فرمائی۔ اِس پر اُن کی شہرت ہوئی اور یہ واجد علی شاہ کے اخیافی بھائی نواب سلیمان قدر کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔

اُنھوں نے ابتدا میں شریف تخلّص اختیار کیا اور مزاولت بھی زیادہ فارسی سے رہی۔ ان ایام میں مشورہ اپنے والد سے رہا۔ لیکن جب غالب سے رجوع کیا تو اُن کے تخلّص کے وزن پر طالب اختیار کرلیا اور شریف ترک کردیا۔ اپنے اُستاد کے عاشقِ زار تھے۔

معلوم نہیں، لکھنؤ کی سکونت کب اور کیوں ترک کی۔ ممکن ہے جب ۱۸۵۶ء میں خاندانِ اودھ پر زوال آیا اور واجد علی شاہ کلکتے سدھارے ہیں، تو یہ وہاں سے چلے آئے ہوں۔ پھر سرکار انگریزی میں ملازمت کرلی۔ معلوم ہوتا ہے ولاہر پور (ضلع سیتاپور) میں بحیثیت سب رجسٹرار قیام رہا۔ جب ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو اپنے مکان پر آگئے۔ اُن کی زمیں داری میں ایک گاؤں، کرکی، تھا (اب بھی ہے) زیادہ طور پر یہیں رہتے تھے۔

۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ (۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء) کو اچانک اپنے وطن سیتاپور میں انتقال کیا۔ وفات کے وقت عمر کم و بیش سو برس کی ہوگی۔ تکیہ مدارا شاہ، محلّہ قضیارا، سیتاپور میں سپردِ خاک ہوئے۔ اولادیں تو بہت ہوئیں، لیکن ان میں سے صرف ایک بیٹا مفتی سیّد احمد شریف اور ایک بیٹی زندہ رہے۔ احمد شریف گہر تخلّص کرتے تھے، جون ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ مختصر دیوان یادگار رہ گیا ہے، اُس کا انتخاب نادم سیتاپوری نے چھپوایا تھا، اسی سے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

ثابت قدمی کر دلِ شیدا ابھی کچھ اور
واں ہیں ستمِ حوصلہ فرسا ابھی کچھ اور

☆

بسمل بخوں طپیدہ کہ رنگِ پریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں
موجِ صبا پہ بوئے گلِ نو دمیدہ ہوں
اک آہِ سرد و نالۂ درد آرمیدہ ہوں

بے تابی اپنی طالبِ دل خستہ کیا کہوں
نالے سے رعد، آہ سے برقِ طپیدہ ہوں

☆

تیرے دیوانے کو ہے صحرا کا یوں دامن عزیز
جس طرح یعقوب کو یوسف کا پیراہن عزیز
یوں رقیبِ روسیہ سے اور ہم سے ربط ہے
خار کو رکھتا ہے جیسے دامنِ گلشن عزیز

☆

کبھی دل آپ کو رُسوا نہ کرتا
مگر مجبور مرتا کیا نہ کرتا
جو بھولے سے بھی ہوتی پرسشِ حال
دلِ شوریدہ گھبرایا نہ کرتا

☆

پہلے حیاتِ خضر مہیا کرے کوئی
پھر انتظارِ وعدۂ فردا کرے کوئی
ہر سنگ وخشت شمعِ تجلّی کا دے فروغ
شوقِ دلِ کلیم تو پیدا کرے کوئی

☆

طالب! وہ جس کے عیب کو چاہے صفت کرے
داغِ سفید کو یدِ بیضا بنا دیا

☆

جامہ کیسا! نہ رہا رشتۂ جاں بھی تن میں
رہ گیا دستِ جنوں سر بہ گریباں ہو کر

نابلد ہوں میں [ابھی] دشتِ جنوں سے بالکل
لے چل، اے وحشتِ دل! خضرِ بیاباں ہو کر

☆

واعظ سُنا رہا ہے جو دوزخ کی گرمیاں
کچھ اس میں خوئے یار سے گرمی سوا ہے کیا!
بلبل بوقتِ خندۂ گل نالہ کش نہ ہو
اتنا تو دیکھ لے کہ چمن کی ہوا ہے کیا

☆

بارور گر نہ ہوا نخلِ تمنا، نہ سہی
کیا شجر ہوتے ہیں سب پھولنے پھلنے والے
سخت ہو کیسی ہی منزل، مگر آگے پیچھے
بیٹھتے اٹھتے پہنچ جاتے ہیں، چلنے والے

☆

کچھ کم نہیں شاہی سے ترے در کی گدائی
سایہ تری دیوار کا، سایہ ہے ہما کا

☆

طالب! آئے بھی، گئے بھی لوگ، اُن کی بزم سے
اور تو وقفِ کشاکش ہائے درباں ہی رہا

☆

ہے حسن و تخیل میں اک فرق بہرصورت
واں زلف پریشاں ہے، یاں فکر پریشاں ہے

☆

زندگی اُس کی، نصیب اس کا، زمانہ اس کا ہے
جو ہے بے خوفِ عدو، دن رات ہم پہلوئے دوست

طالبِ خلدِ بریں، طالب! ہو کس کے واسطے
دل تمنائے جہاں رکھتا نہیں جز کوئے دوست

☆

فروزاں ہے جو دل میں داغ عشق شعلہ رُویاں کا
گماں ہوتا ہے دُودِ آہ پر، دُودِ چراغاں کا
یہی ہے زور گرودستِ جنونِ فتنہ ساماں کا
نگہباں ہے خدا ہی صبحِ محشر کے گریباں کا

☆

فروغِ شعلۂ حسن رُخِ پرُنور کے آگے
تجلّی اک چراغ مُردہ ہے گورِ غریباں کا
دہن سے ہر نفس کے ساتھ اک شعلہ نکلتا ہے
فضائے سینہ جولانگاہ ہے کس برقِ تاباں کا
لگی ہے جس کی لو تجھ سے، اسے کیا خوفِ صرصر ہو!
چراغِ لالہ کو فانوس ہے دامن بیاباں کا

☆

تمھاری دوستی ہی میری بربادی کو کافی ہے
ضرورت کیا ہے جو دشمن بنے یہ آسماں پھر بھی
بہت جاں کاہیوں سے کوششیں کیں طرزِ غالب میں
ہوا ممکن نہ اے طالب! وہ اندازِ بیاں پھر بھی

حمدیہ فارسی مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

ثناہا ہمہ ایزدِ پاک را
کہ درگنہ او حسرت ادراک را

دو رنگ آفرینندۂ روز و شب
ثریا عطا سازِ تاکِ عنب (؟)
فرازندۂ کاخِ گرداں سپہر
فروزندۂ گوہرِ ماہ و مہر
دہد نطق وہم فہم و سمع و بصر
کنی تا کہ ادراکِ نفع و ضرر
سفید و سیاہ و بہ نقشِ کبود
بسے رنگہائے گزیں وانمود
عطای کند آنچہ می شایدت
کہ ہریک بہ ہر لحظہ کار آیدت
معین و مددگارِ ہر مستمند
رہانندۂ عاجزاں از گزند
ادا کے شود شکرِ احسانِ اُو
خوش آنکس کہ پوید بفرمانِ او

[''مضمون'' ''غالب کا ایک گم نام شاگرد'' از نادم سیتاپوری
مشمولۂ نگار رام پور، فروری ۱۹۶۳ء ص ۲۲-۳۰]

طرار... مرزا سرفراز حسین دہلوی

صرف اتنا معلوم ہوا کہ پنڈت جگ موہن ناتھ ہکّو فدا اِن کے شاگرد تھے۔
(بہارِ گلشنِ کشمیر، ۲: ۶۱)

طرزی (ثاقب)... مولانا سیّد قطب الدّین دلاور علی جعفری ہاپوڑی

دلاور علی نام اور قطب الدّین لقب تھا۔ نسباً حسینی سیّد تھے یعنی یہ بیٹے تھے سیّد امداد علی بن اللہ بخش بن سیّد اویس بن سیّد محمدؒ بن عبدالکریم کے، اسی طرح سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق تک پہنچتا ہے۔ اِس خاندان میں سب سے پہلے سیّد عبدالکریم ہی ہرات سے دلّی آئے۔ اُس زمانے میں حضرت حسن رسول نما زندہ تھے اور ان کی مجلسِ علم و ارشاد مرجعِ انام تھی۔ سیّد عبدالکریم نے بھی ان کی خدمتِ با برکت میں رہ کے علومِ ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ پھر اُن سے خرقۂ خلافت پایا اور خود ہاپوڑ میں رہ کے مسندِ رُشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔

طرزی کے والد سید امداد علی بلند شہر میں وکیلِ سرکار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں یہ نواب ولی داد خان رئیس مالا گڑھ (ضلع بلند شہر) کے کارمختار اور نائب الرّیاست تھے۔ جب ہنگامہ ختم ہوا، تو نواب ولی داد خان پر بھی بغاوت کا الزام عائد ہوا اور انھیں موت کی سزا دی گئی۔ سیّد امداد علی بھی گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس گئے۔ بارے، جان تو بچ گئی لیکن جاداد کے ماتھے گئی اور یہ ضبط ہو کر نیلام ہوگئی۔ اس کے بعد یہ الور جا کر سرشتہ دار کلکٹری ہوگئے۔

ان کے والد کا ۱۲۹۳ھ میں انتقال ہوا۔ والدہ اس سے پہلے ۱۲۹۰ھ میں رحلت کر چکی تھیں۔ طرزی نے دونوں کے مرثیے لکھے۔ والد کے مرثیے میں اُن کے اوصاف بیان کرتے ہیں:

زصبح تا بہ مسا، در تلاوتِ قرآں
ز شام تا بسحر، در وظائف و اوراد
ہنرورے کہ بکیتی بخطِ نستعلیق
ربودہ گوے ز عبد الرّشید و میر عماد
کسے بخطِ شفیعا، باو بنود عدیل
کسے بخطِ شکستہ، چو او بنود استاد
زہے، ز بخشش و جودِ تو، شہرتِ آبا
خہے، بخوے نکوئی تو نازشِ اجداد

☆

شدم بامرِ توآں [کہ] بکشورِ میوات
اگرچہ کوہِ غمے برسرِ دلم افتاد
نبودم از تو جدا ہیچ گاہ درہمہ عمر
بروزِ واقعہ ماندم جدا کہ شرمم باد

میانہ نود و سہ پس از ہزار و دویست
زسالِ ہجرتم ایں سخت واقعہ رُوداد
(۱۲۹۳ھ)

والدہ کے مرثیے میں لکھتے ہیں:

مادرِ مشفقم کہ در شفقت
مثلِ او مادرِ زمانہ نزاد
نود افزوں زیک ہزار دویست
رخت بربست ازیں خراب آباد
(۱۲۹۰ھ)

طرزی نے غالب و حسرتی (شیفتہ) وآزردہ کی وفات کے بعد ایک مرثیے میں تینوں کو یاد کیا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

نادیدہ ہیچ عیشی بسی سالہ زندگی
ناچیدہ برگِ گل، ز گلستانِ روزگار
گاہے ز موتِ حسرتی و غالب، آہ کش
گاہے بمرگِ حضرتِ آزردہ سوگوار

آزردہ، غالب اور حسرتی تینوں کا آگے پیچھے ۱۲۸۵ھ اور ۱۲۸۶ھ میں انتقال ہوا۔ اگر طرزی نے یہاں ''سی سال'' سے محض طویل زمانے کا استعارہ نہیں کیا، بلکہ واقعی اپنی عمر ظاہر کی ہے، تو اِس سے معلوم ہوگا کہ وہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰۔ ۱۸۴۱ء) میں پیدا ہوئے، ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳۔۱۸۷۴ء) میں جب اُن کی والدہ کا انتقال ہوا ہے، تو اُن کی عمر ۳۳۔۳۴ سال کی ہوگی اور والد کے انتقال (۱۲۹۳ھ) کے وقت ۳۶۔ ۳۷ سال کی۔

طرزی بلند شہر ہی میں پیدا ہوئے اور اُن کی ابتدائی تعلیم بھی اسی جگہ ہوئی۔ جب یہاں سے فارغ ہوئے تو تکمیل کے لیے دلّی پہنچے اور مفتی صدر الدّین خان

صدر الصدور سے منطق اور ریاضی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی سے حدیث اور ادبِ عربی اور مولوی سیّد مدالدّین سے فارسی پڑھی۔ درسیاتِ متعارفہ کے علاوہ طب اور مصوری اور خوش نویسی میں بھی مہارت پیدا کی۔ طب حکیم امام الدّین خان سے پڑھی۔ خوش نویسی میں میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ فنِ سپہ گری میں بھی ماہر اور خصوصاً بنوٹ کے اُستاد تھے۔ شطرنج بھی بہت اچھی کھیلتے تھے۔ پتنگ بازی کا بھی شوق تھا۔

دلّی میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ہاپوڑ کے سرکاری اسکول میں صدر مدرّس (ہیڈ ماسٹر) مقرر ہوئے۔ ریاضیات میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ یہاں ایک دن ڈپٹی انسپکٹر مدارس سے کسی ریاضی کے مسئلے میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ یہ گھر پر آئے اور استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب نے کتنا کہا، کہ میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے، آپ استعفیٰ واپس لے لیں لیکن یہ اپنی ضد پر قائم رہے اور نوکری ترک کردی۔ اِس کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور وہاں بندوبست میں ناظرِ اوّل مقرر ہوگئے، پھر منصرم بن گئے اور بندوبست ختم ہوتے تک اِسی عہدے پر رہے۔ اُس زمانے میں فارسی کے مشہور شاعر خواجہ عزیز الدّین عزیز زندہ تھے۔ طرزی اور اُن کے درمیان بہت گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے (عزیز کے کُلیات میں بھی ایک خط طرزی کے نام موجود ہے)۔

جب سیّد امداد علی کا انتقال ہوا، تو طرزی اپنے والد کی جگہ الور میں سرشتہ دار کلکٹری مقرر ہوئے۔ یہاں سے تحصیل دار ہو کے رام گڑھ گئے اور اخیر میں ترقی کر کے ۱۸۸۷ء میں ریاست کے چیف مجسٹریٹ ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے پنشن لی اور اس کے بعد مستقلاً ہاپوڑ میں رہنے لگے۔ یہیں چند روز بعارضۂ بخار علیل رہ کر ۴ شوال ۱۳۲۹ھ (۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء) کو واصل بحق ہوئے۔ ان کے دوست قاضی محمّد علیم سہنوی نے تاریخ کہی:

چو واحسرتا! طرزیِ خوش بیاں
بحق جانِ خود داد و در قبر خفت

ہجری علیمِ حزیں سالِ فوت
"غمِ طرزیِ پاک دل آہ" گفت
(۱۳۲۹ھ)

عیسوی تاریخ ہوئی:

رفتہ بخلدِ بریں طرزیِ شیریں زباں
باد بہ روحش لبے رحمتِ تو، یا خدا!
سالِ مسیحی علیم گفتہ پے یادگار
"وائے دریغا بمُرد طرزیِ اہلِ صفا"
(۱۹۱۱ء)

ہاپوڑ ہی میں مدفون ہیں۔ لوحِ قبر پر علیم ہی کا لکھا ہوا یہ کتبہ ہے:

یا غفار واحد و واجب
(۱۳۲۹)

آہ طرزی زجہاں رفت و کنوں
اندریں قبر دریغا خفتہ
بہرِ تاریخ، علیم ایں مصرع
"تربتِ طرزیِ نامی" گفتہ
(۱۳۲۹ھ)

بڑی آن بان اور وضع کے بزرگ تھے۔ بعض معمول ایسے تھے، جن میں عمر بھر فرق نہیں آیا۔ مثلاً روزانہ بعدِ ظہر کپڑے بدل لیتے تھے۔ تیسرے روز صافہ یا اچکن یا انگرکھا بدلتے۔ ساری عمر کوٹ، شیروانی وغیرہ استعمال نہیں کی۔ جوتا ہمیشہ زرد مخمل کا پہنتے اور مہینے کی پہلی تاریخ کو اُسے بدل ڈالتے، حال آنکہ ٹوٹنا تو درکنار، ابھی یہ میلا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں!

اپنے پیچھے اولادِ جسمانی کوئی نہیں چھوڑی۔ دو بیٹے تھے! سعید اور سیّد احمد۔

ان کے لیے ایک قطعے میں دعا کرتے ہیں لیکن افسوس، دونوں نے داغِ مفارقت دیا۔

دو فرزندم سعید و سیّد احمد
کہ نورِ دیدہ و آرامِ جانند
سعید و نیک خوے و نیک بخشند
تو گوئی با سعادت توامانند
الٰہی، برخورند از عمر و دولت
ہمیشہ تا جہاں ماند، بمانند

اُن کے چھوٹے بھائی سیّد نظام الدّین تھے۔ یہ حافظِ قرآن اور شاعر بھی تھے۔ نظام اور نظامی دو تخلص کرتے تھے۔ طرزی نے اس کے بعد ان کے بڑے بیٹے سیّد احمد کو متبنّیٰ کرلیا۔ ان کا بھی اگست ۱۹۴۸ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کے صاحب زادے لاہور میں ڈاکٹری کرتے تھے۔ خاندان کی ایک شاخ ہاپوڑ میں بھی ہے۔

دلّی کی تعلیم کے دوران ہی میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ وہ فضا ہی ایسی تھی کہ کوئی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر یہ تو اپنی تعلیم کے سلسلے میں مفتی صدر الدّین آزردہ کے ہاں جاتے آتے ہی رہتے تھے۔ اُن ہی کے واسطے سے غالب، صہبائی، شیفتہ اور دوسرے اساتذۂ وقت سے مراسم پیدا ہوئے۔ آغاز میں ثاقب تخلّص کرتے اور آزردہ سے اصلاح لیتے رہے۔ اُستاد نے ثاقب بدل کر تخلص طرزی کردیا (تذکرۂ یادگارِ ضیغم میں نام ثاقب ہی کے تحت ہے) غالباً اُسی زمانے میں غالب سے مشورہ کرنے لگے۔☆ اردو میں بھی کچھ نہیں کہا، ہمیشہ فارسی لکھا کیے۔ شروع میں عام روش کے مطابق مذہب سے کچھ زیادہ تعلّق نہیں تھا۔ چنانچہ شاعری میں بھی وہی رسمی عاشقانہ اور فلسفیانہ مضامین لکھتے رہے لیکن آخر میں مولانا شاہ بہاء الدّین امروہی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اِن باتوں سے ہاتھ اٹھا لیا اور پرانی قسم کے پکّے حنفی مولوی بن گئے۔

فارسی کے دو دیوان (ایک غزلیات کا، دوسرا قصائد کا) اور ریاضیات میں ایک کتاب ''تہذیبِ اقلیدس'' مطبوعہ موجود ہیں۔ قصائد میں ایک قصیدہ غالب کی مدح میں بھی ہے۔ بہت پختہ اور مرصّع کلام ہے۔ ہر ایک شعر سے اُن کی قدرتِ زبان اور نکتہ آفرینی کا ثبوت ملتا ہے۔

اُن کی غزلیات میں واقعی غزل ہے یعنی سادہ زبان اور دلی جذبات اور خلوص نہ پیچ، نہ فلسفہ، نہ دوراز کار استعارہ اور تشبیہ۔ وہ جو متاخرین نے غزل کو الفاظ کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے، اس کا طرزی کے کلام میں کہیں نشان نہیں۔ اُن کا کلام دیکھ کر سعدی اور خسرو یاد آجاتے ہیں۔ نمونہ دیکھیے :

آخر اے یارِ سفر کردہ! کجائی، باز آ
بیش ازیں نیست مراتابِ جدائی باز آ

☆

طرزی! الحق کہ قیامت نرسد پیش ازوقت
مگر آں وقت کہ ازیار شود یار جُدا

☆

بُردی ازخانہ بحیلہ غیر را بیرونِ در
سوئے من باز آمدی، نازم باحسانِ شما

☆

ازغمِ دوریم، آرامِ دلِ زار کجاست
باشد آرامِ دل ازیار، ولے یار کجاست!

☆

حاش للّٰہ کہ ترکِ تو در آید بخیال
ایں خیال، اے بُتِ طنّاز! نمی دانم چیست

☆

غیر گویذ سخنِ تلخ و بسویت نگرد!
دانم ایں جرأتِ بیجاش بایماے ہست

☆

طرزی! چو بود رنجشِ بیجا ازیں طرف
شرمندہ پیشِ او شدم از گفتگوے صلح

☆

قسمت ایں بوذ کہ در راہ بمانم وزدور
من بحسرت نگراں باشم و محمل برود

☆

گرچہ دل بر سرِ صد شکوۂ بیداد رود
چوں کنی نیم نگاہے، ہمہ از یاد رود

☆

آہ ازاں حیلہ کہ از ہم نفسے می آید
مضطرب گشتن و گفتن کہ کسے می آید
از پے رخصتم از بزم مگر خاستۂ
کہ ازیں نوع ترا حیلہ بسے می آید
ایں قدر ہست نصیبم ز گلستاں طرزی
کہ نسیمے ز شگافِ قفسے می آید

☆

ز بیتابی و شوق از اوّلِ شب تا سحر طرزی!
رود ہر لحظہ زاں کوے و ہماں دم بازی آید

طرزی آورد ز ہر بابِ سخن وقتِ وداع
تا بتقریبِ سخن ہمرہِ محمل برود

☆

بہرکس بے سبب ہم گفتگوے می کنم تا دیر
کہ باشد حیلۂ ازبہرِ ماندن زیرِ دیوارش

☆

باُو آہستہ گویم حرفِ مطلب، چوں کسے آید
بآوازِ بلند از مصلحت حرفِ دگر گویم

☆

باہمہ رشکِ رقابت، ہر دم آیم سوئے تو
نیست آں صبرم کہ یک ساعت نہ بینم روے تو

☆

تابوصلِ خویشتن اُمیدوارم کردۂ
زاں شکایت ہا، کہ کردم، شرمسارم، کردۂ

(خطوطِ مولانا معشوق حسین اطہر ہاپوڑی مرحوم و سیّد محمد جمیل ہاپوڑی بنام مؤلف، یادگارِ ضیغم : ۹۳، ۹۴، دُودِ چراغِ محفل)

حواشی

☆ تذکرۂ ضیغم میں ہے۔ ''فن شعر میں غالب مرحوم دہلوی اور ہرگوپال تفتہ سکندر آبادی کے شاگرد ہیں''۔ اطہر ہاپوڑی مرحوم جو طرزی کے ملنے والے، بلکہ اُن کے کچھ رشتے دار بھی تھے، تفتہ کے تلمذ کے منکر تھے۔

ظفر... ظلِّ سبحانی ابوظفر سراج الدّین محمدؐ بہادر شاہ تاج دارِ دہلی

ظفر کے خاندان کا حال کیا لکھا جائے کہ اُس سے ہندوستان کی تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ مختصراً یہ کہ ہندوستان میں جس خاندانِ مغلیہ کی ابتدا ۱۵۲۶ء میں بابر کے ہاتھوں پڑی تھی، ظفر اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے۔ ظفر کے دادا شاہ عالم ثانی آفتاب تخلص کا نام اس لحاظ سے مشہور ہے کہ غلام قادر روہیلے نے اُن کی آنکھیں نکلوا دی تھیں اور اُنھیں کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو لال قلعہ دہلی پر وہ تصرّف حاصل ہوا جس کا نتیجہ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ شاہ عالم ۱۸ نومبر ۱۸۰۶ء (۷ رمضان ۱۲۲۱ھ) کو رہگرائے عالمِ بقا ہوئے اور اُن کے بعد ان کے دوسرے بیٹے اکبر شاہِ ثانی جلوہ آرائے سریرِ سلطنت ہوئے۔ ظفر ان ہی اکبر شاہِ ثانی کے بڑے بیٹے تھے۔ بدھ ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ (۳۰ اکتوبر ۱۷۷۵ء) لال قلعے میں ایک ہندو رانی لال بائی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے بعد قانونی طور پر ظفر کو ولی عہدِ سلطنت ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اکبر شاہ اپنے دوسرے بیٹے جہانگیر کو ولی عہد مقرر کرنا چاہتے تھے، جو اُن کی چہیتی بیگم نواب ممتاز محل کے بطن سے تھے۔ جب انگریزوں نے اُنھیں اس سے منع کیا کہ یہ نا انصافی ہے، تو اِس پر اُنھوں نے جھلّا کے کہہ دیا کہ سراج الدّین میرا بیٹا ہی نہیں۔ ان ذہنی اور روحانی صدموں کے سامنے بھی ظفر کے پائے استقلال میں

لغزش نہیں آئی۔ ان کا مقولہ تھا۔ "خدادارم، چہ غم دارم"۔ قادرِ مطلق خدا دیکھ رہا تھا اور انسانِ ضعیف البنیاں کی خام خیالیوں پر ہنس رہا تھا۔

جہانگیر کے مزاج میں شورش بہت تھی، شامتِ اعمال اُنھوں نے ایک دن انگریز ریزیڈنٹ آرچبولڈ سیٹن پر طپنچہ داغ دیا۔ بارے، وار خالی گیا اور ریذیڈنٹ کی جان بچ گئی۔

لیکن اُن کے ماتھے گئی۔ یہ گرفتار کر کے الٰہ آباد بھیج دیے گئے۔ یہی واقعہ دلّی کے مشہور میلے "پھول والوں کی سیر کا" باعث بن گیا۔ ہوا یوں کہ اُن کی والدہ نواب ممتاز محل نے منت مانی کہ میرزا جہانگیر رہا ہو کر آجائیں گے تو میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کا چھپرکھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی۔ جب یہ الٰہ آباد سے واپس آئے، تو یہ منت پوری کی گئی۔ پھول والوں نے ایک جدّت کی کہ چھپرکھٹ میں پھولوں کا ایک پنکھا بھی لٹکا دیا۔ یہ چھپرکھٹ بڑی دھوم دھام سے قطب صاحب پہنچایا گیا اور بادشاہ کی چہیتی بیگم کی خاطر سے قلعے اور شہر کے لوگ اُمنڈ کے تماشا دیکھنے کو آئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا اور ایک میلا سا لگ گیا۔ اکبر شاہ کو یہ بہت پسند آیا۔ حکم دیا کہ ہر سال ساون کے مہینے میں اسی طرح چھپرکھٹ نذر دیا جائے۔ چنانچہ یہ میلا اب تک ہر سال دلّی میں ہوتا ہے۔

میرزا جہانگیر آنے کو تو آگئے، لیکن اُن کے مزاج کی وحشت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جلد ہی پھر ایسی حرکت کی کہ واپس الٰہ آباد بھیج دیے گئے، جہاں کثرتِ شراب نوشی سے ۱۸۲۱ء (۱۲۳۶ھ) میں انتقال ہو گیا۔ شاہ نصیر نے تاریخ کہی۔ ماتم جہانگیر ست، آہ (۱۲۳۶ھ) وفات کے وقت عمر صرف ۳۱ برس تھی۔ لاش الٰہ آباد سے دلّی لائی گئی اور سلطان جی کی مسجد کے صحن میں ایک خاص حجر کے اندر دفن ہوئی۔

انگریزوں نے اب اعلان کردیا کہ ہم ظفر کے سوائے کسی اور کو ولی عہد تسلیم

نہیں کریں گے۔ ظفر نے لکھا:

کیسی تدبیر ظفر، جب وہ کرے اپنا کرم
کام بگڑے ہوئے بن جائیں یونہی آپ سے آپ

اکبر شاہ ثانی ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو ۸۲ برس کی عمر میں عالمِ جاودانی کو سدھارے اور اُن کی جگہ ابوظفر سراج الدّین محمدؔ بہادر شاہ ثانی، ظفر تخلص تختِ دہلی پر جلوہ آرا ہوئے۔ اُس وقت اُن کی عمر ۶۲ برس کی تھی۔ صہبائی نے تاریخ کہی:

از نشۂ دولتِ بہادر شاہی
شد پُر ز مےِ طرب، ایاغِ دہلی
بنشست بہ تختِ دولتِ روز افزوں
نزہت بہ فزُود ازو بہ باغِ دہلی
تاریخِ جلوسِ آں شہِ والا قدر
آمد بہ لبِ خرد: ''چراغِ دہلی''
(۱۲۵۳ھ)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شاہی نام کی تھی۔ کہنے والے تو اُن کے دادا کے وقت ہی سے کہنے لگے تھے ''عملداریِ شاہ عالم، از دہلی تا پالم'' (پالم دتی سے سات کوس پر ہے) ظفر تک پہنچتے پہنچتے یہ اور بھی مختصر ہوگئی۔ لال قلعۂ دتی کے باہر حکومت اور انتظام کمپنی بہادر کا تھا۔ یہ صرف قلعے کی چار دیواری کے اندر تک کے بادشاہ تھے۔ کارکنانِ قضا و قدر کے ترکش میں ابھی ایک اور تیر باقی تھا اُنھیں اس بوڑھے، خداترس، دین دار بادشاہ کا یہ گوشۂ عافیت بھی نہ بھایا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں دیسی فوج نے انگریزوں کے خلاف ہنگامہ کھڑا کردیا۔ یہ فوج میرٹھ سے آکر دتی پر قابض ہوگئی اور بہادر شاہ کے شہنشاہِ ہندوستان ہونے کا اعلان کردیا۔ ابھی اِس اعلان پر مشکل سے چار ماہ گزرے تھے، کہ ستمبر میں انگریزوں نے ہندوستانی فوج کو شکست دی اور دوبارہ شہر اور قلعے پر بھی مسلّط ہوگئے۔ بہادر شاہ نے قلعے سے راہِ فرار اختیار کی اور اپنے دادا

ہمایوں بادشاہ کے مقبرے میں پناہ لی۔ مخبر نے انگریزوں کو پرچہ دیا کہ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں چھپا بیٹھا ہے۔ کپتان ہاڈسن اُنھیں شہر لانے کے لیے پہنچا۔ بادشاہ نے پہلے تو انکار کیا، وہ بھلا کیسے اس کا اعتبار کرلیتے۔ لیکن ہاڈسن کے وعدہ کرنے اور مرزا الٰہی بخش کے سمجھانے بجھانے پر کہ اُن کی جان پر آنچ نہ آئے گی، اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیا۔ اُن کی جان کی امان کی ضمانت انگریز جرنیل ولسن نے بھی دی۔ دیکھا جائے تو وہ سپردگی کے سوائے اور کر بھی کیا سکتے تھے! قصہ کوتاہ یہ پکڑے آئے اور زینت باڑی (لال کنواں) میں نظر بند کردیے گئے۔ ایامِ نظربندی میں پانچ روپیہ یومیہ خرچ کے لیے ملتے تھے۔

جب ملک میں دوبارہ ہر جگہ انگریزوں کا پورا تسلّط ہو گیا اور کسی طرف سے خطرہ نہ رہا تو سرجان لارنس چیف کمشنر پنجاب کی منظوری سے ظفر پر مقدمہ قائم ہوا اور اُنھیں ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو دیوانِ خاص میں ایک فوجی کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ فردِ جُرم یہ تھی :

(۱) فوجی باغیوں (جرنیل محمدؐ بخت خان) کی امداد و اعانت۔

(۲) شاہزادے مرزا مغل اور دوسرے اشخاص کو حکومتِ انگریز کے خلاف جنگ کرنے پر اُبھارنا اور اُن کی مدد کرنا۔

(۳) انگریزی حکومت کی رعایا ہونے کے باوجود اپنی بادشاہت کا اعلان اور حکومت کے خلاف جنگ۔

(۴) انچاس (۴۹) عیسائیوں کا قتل کرانا اور قاتلوں کی اعانتِ مجرمانہ۔

سب سے پہلے تو جو فوجی عدالت ظفر کے مقدّمے کی سماعت کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی، اُسے ظفر پر مقدمہ چلانے کا کوئی اختیار ہی نہیں تھا، نہ ملکی قانون کی رُو سے، نہ بین الاقوامی قانون کے تحت۔ ظفر انگریزوں کی رعایا نہیں تھے۔ ہندوستان میں وہ خود قانون کے بنانے والے اور اس کے نافذ کرنے والے تھے۔ چوں کہ وہ شاہِ ہندوستان کی حیثیت سے سلطنت اور اس کے مرکز تھے، اس لیے وہ قانون سے بالا

تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ظفر نے مقدمے کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن آخر میں ایک بیان دیا جس میں جرم سے انکار کیا اور کہا کہ، میں مجبورِ محض اور باغیوں کا قیدی تھا۔ القصہ، بنا بنانا کیا تھا۔ مقدمہ ۹ مارچ کو ختم ہوا۔ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ ظفر نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غداری کی اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اس لیے یہ سزائے موت کے مستحق ہیں۔ کمیشن نے اپنا فیصلہ سر جان لارنس کے پاس کلکتے بھیج دیا اور اس نے اپنی سفارشات کے ساتھ اسے مرکزی حکومت کو کلکتے بھیج دیا۔ آخری حکم یہ صادر ہوا کہ ظفر کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا جائے۔ اُن کی ملکہ زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کو اختیار ہے کہ بادشاہ کے ساتھ چلے جائیں یا کلکتے میں نظر بند رہیں۔ اِن دونوں نے ظفر کے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔

یہ مختصر قافلہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں کلکتے سے رنگون پہنچا۔ انگریزوں نے چھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا، جو اُنھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ چار سال نہایت عسرت اور مصیبت میں بسر کرنے کے بعد ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو مغرب کے قریب بعارضۂ فالج جاں بحق ہوئے۔ اِنا للہ واِنا الیہ راجعون۔ نساخ نے تاریخ کہی:

وائے ویلا چوں بہادر شاہ مُرد
عالمے شد با غم و با رنج جُفت
سالِ ترحیلش ملک از آسماں
ناگہاں "بخشایشِ اللہ" گفت
(۱۲۷۹ھ)

موت کے وقت عمر ۸۷ برس کی تھی۔ وہیں رنگون میں بدھوں کے مشہور شودگون پگوڈا کے نواح میں بہادر شاہ ظفر روڈ پر آخری آرام گاہ ہے۔ آرام گاہ تو کیا، چشمِ بصیرت کے لیے سامانِ صد عبرت ہے۔ ایک مختصر چوکھنڈی کے اندر سنگِ مرمر کا سادہ سا تعویذ ہے۔ اُن کے دائیں طرف ملکہ زینت محل محوِ خواب ہیں۔☆[1] دوسری طرف

کی قبر کس کی ہے، اس کا تعین نہیں، لیکن یقیناً یہ بھی ہوگی شاہی خاندان ہی کے کسی فرد کی۔ پچھلی جنگ سے پہلے ایک تحریک شروع ہوئی تھی کہ قبر ان کے شایانِ شان تعمیر کردی جائے۔ کافی سرمایہ بھی جمع ہو گیا تھا اور کام بھی ہونے لگا تھا کہ جنگ شروع ہوگئی۔ شاید شاہی خاندان ہی کے کوئی نام لیوا قبر کے مجاور ہیں۔

اس وقت قبر کے سرمانے یہ کتبہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ

حضرت ابوظفر سراج الدّین بہادر شاہ ظفر رحمتہ اللہ علیہ

۱۸۳۷ جلوس تا ۱۸۵۸ء

آج بتاریخ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق تاریخ ۱۴ جمادی الاوّل ۱۲۷۹ھ دن جمعہ کو وہ روح جو نواسی سال بہادر شاہ کے جسم میں موجود رہی، زندگی کے تمام تماشے دکھا کر وداع کی تیاری کر رہی ہے۔ دن ڈھل چکا ہے اور دن کے ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔ رنگون کی خاک اس کو آغوش میں لیتی ہے جو خاندانِ تیموریہ کا آخری چراغ تھا، جس نے جہان آباد میں جنم لیا۔ وہ وطن سے ہزار کوس دور ایک معمولی پلنگ پر دم توڑ رہا ہے۔ سکرات طاری ہے، سانس اکھڑ چکا ہے، جس کی زندگی چچ چچ کا میلا تھا جس نے زندگی کا ہر لمحہ جمگھٹوں میں گزارا، آج صرف تین آدمی، ایک بیوی اور دو بچے اس کے دمِ واپسیں میں ساتھ ہیں۔ آفتاب ابھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی عسرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ کیا اور شاہ جہان آباد کا یہ گوہرِ آب دار رنگون کی خاک میں ابدی نیند سو گیا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

تاریخِ وفات

چودہ جمادی الاوّلیں، جمعہ کا روز وقتِ عصر
حالتِ قید و بیکسی، تھی یہ گھڑی بہت کٹھن
وقت نے شاہِ ہند سے عرض کیا وطن سے دور
خلد ہے آپ کا وطن اے "ظفرِ جلاوطن"
(۱۲۷۹ھ)

ظفر کی رسمی تعلیم بہت اچھی تھی۔ سب سے پہلے حافظ ابراہیم (شمس العلما منشی ذکا اللہ کے دادا) اُن کے اتالیق مقرر ہوئے۔ قاری محمد خلیل نے قرآن پڑھایا۔ مرصّع قلم سیّد جلال الدّین حیدر اور ان کے والد میر ابراہیم علی دونوں سے خوش نویسی کی مشق بہم پہنچائی اور سندِ تکمیل حاصل کی۔ اِس کے علاوہ مردانہ فنون میں تیر اندازی، تیغ زنی، نشانہ بازی، بانک، بنوٹ، لکڑی، شہسواری میں مہارتِ تامّہ رکھتے تھے۔ شہسواری سے متعلق مشہور تھا، کہ اُن کے زمانے میں ہندوستان بھر میں صرف ڈھائی سوار تھے۔ سالم ایک یہ خود اور ایک ان کے چھوٹے بھائی مرزا جہانگیر اور آدھے کوئی اور بزرگوار۔ اِن علوم کے علاوہ اپنے زمانے کے عام ذوق کی رعایت سے بٹیر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی کا بھی شوق تھا۔

ظفر نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلے میر قدرت اللہ قاسم (صاحبِ تذکرۂ مجموعۂ نغز) کے صاحب زادے میر عزّت اللہ عشق سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد جب دلّی میں شاہ نصیر کا طوطی بولنے لگا، تو یہ بھی اُن سے اصلاح لینے لگے۔ جب نصیر دکن گئے تو میر کاظم حسین بے قرار سے مشورہ کرنے لگے۔ لیکن اس شاہِ سخن کی استادی کا شرف ازل سے شیخ محمدّ ابراہیم ذوق کی قسمت میں لکھا تھا۔ ۱۸۰۸ء میں بے قرار بھی ماؤنٹ سٹوارٹ الفنسٹن کے ساتھ میر منشی بن کے کابل سدھارے اور یوں میدان ذوق کے لیے خالی ہو گیا۔ چار روپیہ مہینہ تنخواہ مقرر ہوئی اور ذوق ولی عہدِ سلطنت کے استاد بن گئے۔ تھوڑے دن بعد ترقی ہوئی تو آٹھ ہو گئے۔

جب ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے تو مشاہرہ تیس روپے مقرر ہوا۔ بعد کو اور اضافہ ہوا تو ایک سو روپے ماہانہ ہو گیا، جو انھیں موت تک (۱۸۵۴ء) ملتا رہا۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب استادِ شہ مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے تین برس تک یہ خدمت انجام دی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رُونما ہوا۔ وہ بساط ہی الٹ گئی، نہ قلعۂ معلےٰ رہا، نہ اُستاد رہے، نہ شاگرد۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ظفر نے طبیعت بہت دردمند پائی تھی۔ اگرچہ اُنھوں نے آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی اپنے اردگرد عیش و عشرت کے سامان دیکھے۔ بعد کو خود ولی عہدِ سلطنت بنے، لیکن زوالِ حکومت، اور انگریزی اقدام نے خاندانِ شاہی کا حالِ بہت پتلا کر دیا تھا۔ شاہ عالمِ ثانی کو بسر اوقات کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ ماہانہ ملتا رہا جس میں سے ظفر کے والد اکبر شاہ کو حصہ رسدی دس ہزار ملتے تھے۔ جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے، تو ان کے اختیارات میں اور بھی کتر بیونت ہوئی۔ ۱۸۳۲ء میں پہلے دلّی صوبۂ غرب و شمال کی عمل داری میں شامل ہوئی اور ۱۸۳۵ء میں سکّہ بھی کمپنی بہادر کا چلنے لگا۔ الغرض ظفر کی تخت نشینی (۱۸۳۷ء) سے پہلے ہی خاندانِ مغلیہ کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ بادشاہ کا اختیار لال قلعے میں بھی کامل نہیں تھا۔ اِن سب انقلابات نے ظفر کی حساس طبیعت پر بہت اثر کیا۔ اُن کا رجحان شروع سے مذہب اور تصوّف کی طرف تھا۔ وہ حضرت مولانا فخر الدین☆[۲] کے گھرانے کے مُرید تھے اور آخر میں خود بھی لوگوں کو مُرید کرنے لگے تھے۔ یہ شوق اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے گلستانِ سعدی کی ایک شرح لکھی، جس میں تصوّف کے نکات بیان کیے اور اُن کے ایما پر مفتی میر لال نے ایک کتاب سراج المعرفت اوراد و اشغال کے بیان میں لکھی۔ غرض جیسا کہ غالب نے کہا ہے، واقعی شاہی اور درویشی ظفر کی ذات میں جمع ہوگئی تھیں۔ اُن کے کلام میں یہ تمام داخلی اور خارجی اثرات نمایاں ہیں۔

موئے کو مارے شاہ مدار، شاہی اور دنیوی اختیارات کا یہ عالم تھا۔ لے دے کے ایک شاعری رہ گئی تھی، لیکن تذکرہ نگاروں نے یہاں بھی اُن سے انصاف نہ کیا۔

آزاد نے حق پوشی سے کام لے کر ظفر کی عمر بھر کی کمائی اپنے استاد ذوق کی جھولی میں ڈال دی اور لکھ دیا کہ:

> مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی آدھ مصرع، فقط بحراور ردیف قافیہ معلوم ہو جاتا تھا، باقی بخیہ۔ یہ (یعنی ذوق) ان ہڈیوں پر گوشت و پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔

کئی مصنفوں نے اُن کے اس بیان کی قلعی کھولی ہے اور ثابت کردیا ہے کہ ذوق کی اُستادی مسلّم اور ان کا کلامِ ظفر پر اصلاح دینا بھی تسلیم، لیکن اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ ظفر کے چاروں مطبوعہ دیوانوں میں سے ساڑھے تین ذوق نے خود کہہ کر ظفر کے حوالے کردیے تھے اور خود بے چارے ظفر ساری عمر دو مصرعے تک ٹھیک موزوں نہ کر سکے، تو اس سے بڑا ظلم اور بہتان اور ہو نہیں سکتا۔ ایک معاصر تذکرہ نگار مولوی کریم الدّین اپنے انتخابِ شعرا ''گلدستۂ نازنیناں'' (۱۱۸۔ ۱۱۹) میں ذوق کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ''حالتِ صبا سے آج تک یہ عادت طبیعت میں متمکن ہے کہ جو شعر کہتے ہیں، کسی کو نہیں دیتے''۔ اِس شہادت کی موجودگی میں کون باور کرے گا، کہ ذوق نے اپنا سارا کلام ظفر کی نذر کردیا لیکن افسوس ہے کہ حالی نے بھی غالباً استاد پرستی کے جذبے میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ بلکہ رہی سہی کسر اُنھوں نے پوری کردی۔ انھوں نے جو روایت ناظر حسین مرزا کی زبانی نقل کی ہے اُس کا بھی یہی مطلب ہے کہ غالب خود کہہ کر کلام ظفر کے حوالے کردیا کرتے تھے۔

ظفر نے اُس لال قلعے میں آنکھیں کھولیں، جہاں کی زبان اردوئے معلّیٰ کہلائی۔ اس لیے یہ کہنا محض سخن گسترانہ بات نہیں کہ اردو اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ پھر یہ بیان ہو ہی چکا ہے کہ وہ ایک خانوادۂ فقر و تصوّف کے مرید اور خود بھی صوفی صافی بزرگ تھے۔ اس لیے اُن کے کلام میں تصوّف کی چاشنی کا ہونا تعجب کا مقام نہیں ظفر نے اپنی عمر میں پانچ استادوں سے اصلاح لی اور اس میں شک نہیں کہ اُن میں

سے کم از کم تین اپنے اپنے رنگ کے بے مثل استاد ہیں۔ اُن اصحاب کی مشکل پسندی اور زبان اور محاورے پر قدرت کسی سے مخفی نہیں۔ ظفر کے کلام میں اِن سب کے رنگ کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ کسی سے بھی اتنے متاثر نہیں ہوئے کہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھے ہوں۔ وہ نصیر کی طرح ٹیڑھی بیڑھی اور سنگلاخ زمینوں کو بھی پانی کر دیتے ہیں۔ وہ ذوق کی طرح زبان اور محاورے اور روزمرّہ کے بھی بادشاہ ہیں اور فنی پہلو سے بھی اُن کا کلام بے عیب ہے۔ غالب کا اصلاحی کلام ہم تک نہیں پہنچا کیوں کہ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا۔ لیکن ظفر کے ہاں خیال آرائی، جدّت آفرینی اور مشکل پسندی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ چوں کہ اُن کی نشوونما ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس کی اخلاقی پستی افسوس ناک حد تک پہنچ چکی تھی، اس لیے ظفر کے ہاں عریاں اور فحش اشعار بھی ہیں، اگرچہ خال خال، لیکن اِن تمام خصوصیات کے باوجود اُن کے کلام کا ایک اپنا خاص رنگ ہے۔ یہ ہے اُن کا حزن و ملال اور سوگواری، اور یہی اُن کا اصلی اور مستقل رنگ ہے اور اسی رنگ کے اشعار کی اُن کے کُلّیات میں فراوانی ہے۔ باقی تمام رنگ خارجی اثرات کا نتیجہ ہیں لیکن یہ چیز اُن کی داخلی ہے۔ اُن کے چار ضخیم دیوان اُن کی زندگی میں، بلکہ غدر سے پہلے ہی چھپ چکے تھے۔ ہر صنفِ سخن میں کلام موجود ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

دنیا میں بلا سے، اگر نام نہ پایا
ہم نے یہی پایا کہ بُرا نام نہ پایا

☆

ضبطِ فریاد کروں، گریہ کو روکوں، لیکن
دلِ بے تاب کو تھاموں، یہ نہیں ہو سکتا

☆

ظالم، ترے چُپ رہنے کا عقدہ نہیں کھلتا
کیا جانے کہ ہے دل میں ترے کیا، نہیں کھلتا

☆

دل نہیں مانتا، ناصح! یہ مانے تو کام چلے
تو نے جو کچھ مجھ سے کہا، سب سچ ہے میں نے مان لیا

☆

خیر تو ہے کیا ہوا! بگڑی کہیں اُس یار سے
آج کیوں تو اے ظفر! پھرتا ہے گھبرایا ہوا

☆

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

☆

کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہو مزہ
محفل میں وصفِ بادہ و ساغر کہے بغیر

☆

داغ دل میں، آگ لختِ دل میں، چشمِ تر میں آگ
عشق کی سوزش سے ہے پھیلی ہوئی گھر گھر میں آگ

☆

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد
اب تو اس کوچے میں اے بادِ سحر خاک نہیں

☆

دل دے کر اُن کو، ایسی اذیت ہوئی ہمیں
اب دل کبھی نہ دیں گے، نصیحت ہوئی ہمیں

☆

منّت کشِ اجل نہ ہوئے ہم، کہ ہو گیا
کام اپنا، ایک تیری نگاہِ عتاب میں

☆

نہ جانا چاہیے کوچے میں اس کے، سچ کہا تو نے
پر اے غم خوار، کیا کیجیے، نہیں دل اپنے قابو میں

☆

ترے ہاتھ سے، دشتِ وحشت کی میں
جنوں! کب تلک خاک چھانا کروں
خرد کچھ کہے ہے، جنوں کچھ مجھے
کہو، میں کہا کس کا مانا کروں

☆

نہیں معلوم، ظفر اس سے ہوئیں کیا باتیں
چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

☆

آشنا ہو تو آشنا سمجھے
ہو جو نا آشنا، تو کیا سمجھے
ہم اسی کو بھلا سمجھتے ہیں
آپ کو جو کوئی برا سمجھے
اے ظفر! وہ کبھی نہ ہو گم راہ
جو محبت کو رہنما سمجھے

☆

تری آنکھوں نے، خدا جانے کیا کیا جادو
ہم بھی دانا تھے، پر اب پھرتے ہیں دیوانے سے

☆

جو درد ہوتا تو غل مچاتا، جو سایہ ہوتا تو سر ہلاتا
الٰہی دل کو مرض یہ کیا ہے، نہ منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے

☆

وہ آئے یا نہ آئے، پر دلِ بے تاب کو اپنے
تسلّی میں یہ دیتا ہوں، لب آتا ہے اب آتا ہے
کہاں تک روئے گا، اے دیدۂ تر! روک اشکوں کو
ہماری آبرو کو، خاک میں، تو کیوں ملاتا ہے

☆

موت آئے تو ٹل نہیں سکتی
اور آئی نہیں، تو پھر کیا ہے
نہیں رونے میں گر ظفر! تاثیر
جگ ہنسائی نہیں، تو پھر کیا ہے

[تاریخِ عروجِ عہدِ انگلشیہ، بہادر شاہ ظفر، بہادر شاہ کا مقدمہ، مجموعۂ نغز ۱۷ : ۳۷۲۔ ۳۷۳، آبِ حیات (حالاتِ ذوق)، یادگارِ غالب : ۲۲، خم خانۂ جاوید، ۵ : ۴۶۰۔ ۴۷۷]

حواشی

☆۱۔ زینت محل کی وفات ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو رنگون میں ہوئی اور جوان بخت کی ۱۸۸۴ء میں مولمین (شمالی برما) میں۔

☆۲۔ حضرت مولانا فخر الدّین چشتی ۱۷ ربیع الاوّل ۱۱۲۶ھ (۲۲ مارچ ۱۷۱۴ء) کو پیدا ہوئے۔ وہ مولانا نظام الدّین اورنگ آبادی کے چھوٹے بیٹے تھے جو نگرام کے رہنے والے اور حضرت مخدوم شیخ سعدی کاکوروی کی اولاد میں سے تھے، اور اپنے مرشد سرگروہِ چشتیہ نظامیہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے حکم سے اورنگ آباد میں مقیم ہوگئے تھے۔ مولانا فخر الدّین نے خرقۂ خلافت اپنے والدِ ماجد سے پایا اور اُنھیں کے ارشاد کے مطابق ۱۱۲۰ھ (۱۷۴۷ء) میں پہلے اجمیر اور پھر دہلی آئے۔ یہ محمدّ شاہ کا زمانہ تھا، سب اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوے۔ خود بادشاہ اور وزرا و اُمرا کمالِ عقیدت و نیاز سے اُن کی مجلس میں حاضر ہوتے۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ (۷ مئی ۱۷۸۵ء) بروزِ شنبہ بوقتِ عشا واصلِ حق ہوئے۔ ''حق پسند فخرالدّین'' اور خورشیدِ دوجہانی'' تاریخ ہوئی۔ مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مجر کے باہر محوِ خواب ہیں۔ مزار مرجع انام ہے۔ ان کے

صاحب زادے حضرت مولانا غلام قطب الدّین بھی بلند پایہ بزرگ تھے وہ بھی اُن سے تھوڑی مدّت بعد ۱۷محرم ۱۲۰۰ھ (۲۰ نومبر ۱۷۸۵ء) کو خدا کو پیارے ہوئے۔ غالب کے دوست (اور ظفر کے پیر) مولانا نصیر الدّین عرف میاں کالے، انھیں قطب الدّین کے بیٹے تھے۔ اُن کی وفات منگل کے دن ۱۵ صفر ۱۲۶۸ھ (۱۰ دسمبر ۱۸۵۱ء) کو ہوئی۔ (تاریخ ''کالے صاحب کو سرخرو پایا'' از مومن) حضرت میاں کالے کے بیٹے میاں نظام الدّین کا ذکر غالب کے خطوں میں آیا ہے، اُن کا انتقال ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں ہوا ''خدا جوے و خداداں آہ'' تاریخ ہے (تذکرۂ اہلِ دہلی : ۲۳۔۲۶)

ظہیر... لالہ پیارے لال دہلوی

قوم کے کائستھ تھے۔ مجذوب سے آدمی تھے، ہمیشہ فکرِ شعر میں غرق رہتے۔ عین جوانی میں ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۴ء) میں انتقال کیا۔ کبھی اجمیر میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا تھا، جہاں اُن کی بشاش (مؤلفِ تذکرۂ آثار الشعراے ہنود) سے ملاقات ہوئی تھی۔ غالباً پہلے کلام پر اصلاح مومن سے لی۔ غالب اُنھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

رات دن ایک سا رہتا ہے اُجالا مرے گھر
آتشیں آہ ہے، یا آٹھ پہر کی بتّی
پڑ گئی رکھتے ہی ناسورِ جگر میں ٹھنڈک
اُس کا پیکاں بھی ہے کیا خوب اثر کی بتّی
شبِ فرقت کا اندھیرا نہ گیا، پر نہ گیا
کام کچھ موم کی آئی، نہ اگر کی بتّی☆
رات گھر اس کے دیے میں کہیں جلتی تھی ضرور
تارہاے نگہِ اہلِ نظر کی بتّی
شمع کی مجھ کو ضرورت نہیں واللہ ظہیر!
میری روشن ہے ہر اک مصرعِ تر کی بتّی

☆ (تذکرۂ آثار الشعراے ہنود : ۹۱۔۹۲، تذکرۂ بشیر مشمولۂ سہ ماہی

(''اُردو'' کراچی، ۴۵: ا: ۲۴۱، بہارِ سخن ۲۶۷۔ ۲۶۸)

حواشی

☆۔ شبِ ہجراں کا اندھیرا نہ گیا پر نہ گیا
کام کافور کی آئی نہ اگر کی بتی
(تذکرۂ بشیر)

عارف ... میرزا زین العابدین خان دہلوی

اِن کے والد شرف الدّولہ نواب غلام حسین خان بہادر سُہراب جنگ تھے اور وہ بیٹے تھے نواب فیض اللہ خان بہادر کے اور وہ نواب قاسم جان کے جو عارف جان کے بھائی تھے، جن کی اولاد میں نواب احمد بخش خان بہادر (والیِ لوہارو) اور الٰہی بخش خان معروف تھے۔

نواب غلام حسین خان شعر بھی کہتے تھے۔ مسرور تخلّص تھا۔ موسیقی خصوصاً ستار نوازی میں طاق تھے۔ غالب کے ہم زلف تھے۔ یعنی اُن کا پہلا نکاح میرزا الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی صاحب زادی بنیادی بیگم سے ہوا تھا۔ اِس نکاح کا نتیجہ دو صاحب زادے تھے۔ زین العابدین خان عارف اور حیدر حسین خان۔ لیکن بعد کو میاں بیوی میں بگاڑ ہوگیا اور نوبت علیحدگی تک پہنچی۔ چنانچہ مسرور نے ایک مکان بیوی کے نام ہبہ کردیا اور وہ اپنے طور پر الگ رہنے لگیں۔ اِس کے بعد مسرور نے ایک عورت سنگی بیگم سے نکاح کرلیا۔ غلام حسین خان محو اسی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ مسرور نے اکتوبر ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔ غالب نے ان کی مروّت اور مہر و محبت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں پیدا ہوئے۔ میاں بیوی میں ناچاقی کے باعث بیٹے کی تعلیم و تربیت کا بارکلیتہً ان کی والدہ کے سر آپڑا۔ لیکن اُس نیک بخت بی بی نے اسے ہمت سے اٹھایا۔ اُن کی تعلیم کے تمام مراحل گھر پر طے ہوئے۔ دوسرے علوم و فنون کے علاوہ خطِ نسخ کے بھی استاد تھے اور اِس فن میں یاقوت رقم خان ثانی

میر جلال الدّین خوش نویس کے شاگرد تھے۔ استاد کی توجہ اور اپنی محبّت سے سال کے اندر اندر ایسی مشق بہم پہنچائی کہ استاد نے اصلاح دینا چھوڑ دی اور سند لکھ دی۔

جب غالب کے اپنے بچّوں میں سے کوئی زندہ نہ رہا تو اُنھوں نے عارف کو بیٹا بنالیا۔ غالب کو ان سے جو شدید محبت تھی وہ اُن کے اُردو فارسی کلام سے ظاہر ہے۔ عارف نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا اور اپنے نانا میرزا الٰہی بخش خان معروف کے تخلص کی رعایت سے عارف تخلص اختیار کیا۔ طبیعت میں غضب کی آمد تھی اور بڑے پُرگو تھے۔ شروع میں شاہ نصیر سے اصلاح لی اور تھوڑی مدّت میں اُن کے رنگ میں ایک دیوان بھی ''مطلعِ مہرِ سعادت'' کے نام سے مرتّب کرلیا۔ گلدستۂ نازنیناں (۲۲۲۔۲۴۲) میں کلام کا جو انتخاب درج ہے وہ سراسر نصیر کے رنگ میں ہے۔ اسی طرح کی سنگلاخ زمینیں ہیں، شرمسار ہو کے چلے، اشکبار ہو کے چلے، برابر بجلی، گوہر بجلی، قبا میں بل پڑا، پارسا میں بل پڑا۔ نظر سے فلک پر بجلی زمیں پہ باراں، گہر سے فلک پر بجلی زمیں پہ باراں، بیمار اٹھے اور بیٹھے، اغیار اٹھے اور بیٹھے وغیرہ لیکن جب نصیر دکن سدھارے، تو عارف نے غالب سے استفادہ شروع کیا۔ رنگِ سخن بھی بدل دیا اور پہلا دیوان بھی نظری کردیا۔ اب وہ شاعری میں غالب کی پیروی کرنے لگے اور دوسرا دیوان مرتّب کیا۔ انھی خوبیوں کے باعث میرزا اُن پر فخر کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عارف اُردو میں میرے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعۂ مدحیہ میں لکھتے ہیں :

اے کہ میراث خوارِ من باشی
اندر اُردو کہ آں زبانِ من است
ارمغانے، ز مبدءِ فیّاض
باد آنِ تو، ہرچہ آنِ من است

لیکن افسوس کہ اس ہونہار نوجوان کی جوانامرگی کا داغ بھی غالب کی قسمت میں لکھا تھا اور اُن کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔

عارف نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلا نواب شمس الدّین احمد خان والیِ لوہارو کی ہمشیر، نواب بیگم (بنت فخر الدّولہ نواب احمد بخش خان) سے ہوا۔ یہ ستوانسہ بچّہ پیدا ہونے پر زچگی میں فوت ہوگئیں، تو اِس کے بعد دوسرا مرزا محمدؐ علی بیگ بخارائی کی صاحب زادی بستی بیگم عرف نواب دلھن سے ہوا۔ عارف کو اِس بیوی سے حد درجہ محبّت اور شیفتگی تھی۔ جب یہ بھی جنوری ۱۸۵۲ء میں دردِ گردہ کی تکلیف سے رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئیں، تو عارف کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ طبیعت پہلے ہی کئی دن سے نڈھال رہتی تھی، یوں بھی دُبلے پتلے اور کم زور قوام کے تھے، اِس صدمے نے اور پست کردیا۔ بیماری نے جلد ہی تشویش ناک صورت اختیار کرلی اور پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ موت سے چند دن پہلے خون کی قے ہوئی اور یوں بیوی کی وفات کے تین چار ماہ بعد یہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ جب مرض الموت میں غالب عیادت کو گئے، تو مزاج پوچھنے پر یہ شعر پڑھا:

آنکھوں میں دم ہے، مثلِ چراغِ سحر ہوں میں
لو لگ رہی ہے، جان کو کیا انتظار ہے

اُن کی قبر بھی مزارِ غالب کے احاطے میں ہے۔ عارف کی موت پر غالب نے وہ درد ناک نوحہ لکھا تھا، جو اُردو نظم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کا پہلا شعر ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

میر قربان علی بیگ سالک نے تسکین، مومن اور عارف تینوں کی تاریخِ وفات ایک قطعے میں لکھی ہے:

برس دن میں، موئے یہ تین شاعر
کہ جو تھے حضرتِ دہلی کے ساکن

نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخِ رحلت
رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن
کہا دلؔ نے کہ داخل ہوگئے سب
اِرم میں عارف و تسکین و مومن
(۲۴۱+۳۵۱+۵۴۰+۱۳۶=۱۲۶۸ھ)

نسّاخ نے تاریخ کہی:

مُرد امروز میرزا عارف
دوستانش شدند باغمِ جُفت
سالِ مرگش چو از خرد جُستم
"خلدِ اعلا مقامِ عارف" گفت
(۱۲۶۸ھ)

عارف بھی مذہباً غالب کی طرح اثنا عشری شیعہ تھے۔ اپنے پیچھے دو خرد سال بچے باقر علی خان اور حسین علی خان چھوڑے۔ اِن دونوں کی پرورش بھی غالب نے کی (اُن کے حالات کے لیے حسین علی خان شاداں کا ترجمہ ملاحظہ ہو) افسوس کہ عارف کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ اس کا ایک نسخہ لوہارو کے کتب خانے میں تھا اور اب رضا لائبریری رام پور میں منتقل ہوگیا ہے۔ دو نسخے لالہ سری رام مرحوم مؤلف خم خانۂ جاوید کے کتاب خانے میں تھے جو اب ہندو یونی ورسٹی بنارس کے ذخیرے میں ہیں۔ ایک انتخاب کتاب خانۂ سالار جنگ حیدرآباد میں بھی ہے۔ مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

اے فلک! خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو
دشت میں رہتے ہیں، مدّت ہوئی، گھر چھوڑ دیا

☆

مت کہو وہ بات، عارف جو گراں خاطر پہ ہو
کیا مزہ ہے، گر جبینِ آشنا میں بل پڑا

☆

صبحِ ہجراں کی مصیبت جو یہ ہوتی معلوم
میں شبِ وصل کی ہرگز نہ تمنا کرتا
سخت شرمائے ہیں اتنا نہ سمجھتا تھا اُنھیں
چھیڑنا تھا، تو کوئی شکوۂ بیجا کرتا

☆

دیکھ کے اک بار ہی اس کو، یہ بے خود ہوئے
پھر نہ ہوا حشر تک، بارِ دگر دیکھنا

☆

جو کعبے میں ہے، ہے وہی بت خانے میں جلوہ
اک پردہ ہے سو شیخِ حرم اُٹھ نہیں سکتا

☆

اب تلک آئینہ شاید آپ نے دیکھا نہیں
آپ جو کہتے ہیں ''ہم رکھتے نہیں، اپنا جواب''
میں تو مر جاتا وہیں، غیرت سے کوہِ طور پر
اِس طرح سے صاف گر ملتا مجھے، موسیٰ! جواب

☆

چرخ تک جا کے نہ بدنام ہو، اے نالۂ دل!
بیٹھ جانے کو ہے یہ سقفِ کہن آپ سے آپ

☆

باتیں ہزار پیچھے بناتے ہیں بیٹھ کر
مقدور کیا کہ بول سکیں رُو بروئے دوست

☆

گو زخم ہائے تن مرے بھر آئے چارہ گر!
اے بے خبر! جراحتِ پنہاں کا کیا علاج!

☆

ساغر اک ہاتھ میں، اک ہاتھ میں مینائے شراب
ہے یہ انداز ترا، ساقیِ سرشار پسند

☆

ہم بے کسوں کا آن کے تو ہی ثواب لے
اے موت! رحم کر، مرے حالِ تباہ پر

☆

چُپ پڑے رہتے تو کیوں یاں سے اُٹھائے جاتے
ہائے، کیوں شور مچایا تری دیوار کے پاس!

☆

اک دیکھنا ہے، کہیے تو اس کو بھی چھوڑ دیں
رکھتے نہیں ہیں آپ سے، اِس کے سوا غرض

☆

پھر دشمنوں کی خاک شکایت کریں بھلا
جب دوست دیکھ سکتے نہیں آرزوئے دل

☆

اُٹھتا قدم جو آگے کو، اے راہبر نہیں
پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں!

☆

مانا، یہ ناصحا! کہ نہ اُس سے ملا کریں
بہتر تو ہاں یہی ہے، مگر دل کو کیا کریں

تکلیف آپ آنے کی کیوں آشنا کریں
بیٹھے ہوئے وہیں مرے حق میں دعا کریں
خود ہیں خجل کہ جیتے رہے اُس کے ہجر میں
اپنا یہ منہ نہیں ہے، کہ اُس سے گلا کریں

☆

لذّتِ درد ہے محفوظ وہ ناکام نہیں
جس کو بے تابیِ دل باعثِ آرام نہیں

☆

زاہدا! مے کدے کی راہ سے گزرا مت کر
رہن ہو جائے نہ یہ جُبّہ و دستار کہیں!

☆

جنگ تھی عشق و ہوس میں، کام اپنا ہو گیا
ہے ہماری مثل وہ: گھن پس گیا آٹے کے ساتھ

☆

عارف! بتا کہ بہر ہے یہ کس دن کے واسطے
پھرتا ہے آج تیغ وہ عریاں لیے ہوئے

☆

آج کیا تیغ بکف اس کو سُنا ہے، عارف!
آپ اس وقت جو یوں جاتے ہیں گھبرائے ہوئے

☆

لذّتِ درد سے بے چارہ نہیں ہے واقف
لے گیا چھین کے غم خوار نمک داں مجھ سے

☆

آغازِ دردِ عشق کے انجام کو نہ پوچھ
یہ ابتدا ہے وہ، کہ نہ جس کی خبر ملے

☆

گھر کے لٹنے ہی سے تم غم میں پڑے ہو عارف!
اور کیا کیا وہ ابھی کرتے ہیں، دیکھا کیجیے

☆

چین اک دم نہیں بیتابیِ دل سے، عارف!
کس نے رکھ دی ہے، مرے سینے کے اندر بجلی

☆

رہتی غمِ فرقت میں کچھ بھی جو توانائی
شہرت مری افغاں کی تا عرشِ بریں جاتی

☆

اُمید ہے کب، عارف! نالے کی رسائی کی
یہ بیل منڈھے چڑھتی، معلوم نہیں ہوتی

☆

اوروں کو ہو تو ہو، ہمیں مرنے سے ڈر نہیں
خط لے کے ہم ہی جاتے ہیں، گر نامہ بر نہیں

☆

اس ضعف کا بُرا ہو، کہ ناکام رہ گئے
آج اس کا، اپنے ہاتھ سے، دامن نکل گیا

☆

جبہہ سا دیکھیے جبریل کو جس جا عارف!
شک نہیں وہ ہی درِ آلِ عبا ہوتا ہے

☆

ہوتا سلوک برہمن و شیخ میں اگر
کتنی قریب دیر سے کعبے کی راہ تھی

اپنے استاد غالب سے عقیدت کا اظہار کئی جگہ کیا ہے، بلکہ اُن کی مدح میں ایک قصیدہ بھی اُن کے دیوان میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں :

حضرتِ غالب کی شاگردی کا ادنیٰ ہے یہ فیض
عقلِ اوّل کے جو عارف، ہوگئے استاد ہم

☆

عارف ہوئے ہیں حضرتِ غالب کے خوشہ چیں
کیونکر نہ ایک رکن ہوں ملکِ سخن میں ہم

فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے :

بہ ہجرِ یار چہ باک از شنودنِ پندست
گرفتم ایں کہ ز تلخی بہ زہر مانندست
نزاکت ست ترا، باعثِ درستیِ عہد
وگرنہ شیوۂ خوباں، شکستِ سوگندست
ہزار سال کند مشقِ دیدنِ خورشید
بدیدنِ رُخِ تو، ہر کہ آرزو مندست
کسے ز دوست شکایت کند، خدانکند
بلطفِ دشمن و عارف بجور خورسندست

☆

دمے بہ پرسشِ من گر زباں بجنباند
کلاہِ گوشۂ من آسماں بجنباند

ز دردِ دل بدرت آنچناں فرو گویم
کہ موجِ آبِ سرشک، آسماں بجنباند

(نادراتِ غالب ۲، : ۶۸، سخنِ شعرا: ۴۳۱، ذکرِ غالب: ۱۳۵۔
۱۳۷، روزِ روشن : ۴۲۱، خم خانۂ جاوید، ۵ : ۵۰۹۔ ۵۱۷،
گلدستۂ نازنیناں، ۲۲۲۔۲۴۴)

عاشق... ماسٹر شنکر دیال اکبر آبادی

اِن کے والد گردھاری لال بن چھبیلے رام بن خوشحال رائے تھے۔ خاندان کے مورث موضع سانڈی کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ یہ خاندان شروع میں شاہانِ اودھ کی ملازمت سے سرفراز رہا۔ حکومتِ اودھ کی طرف سے اُنھیں ''رائے زادہ'' کا خطاب ملا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بعض خدمات کے عوض میں سرکارِ انگریز کی طرف سے بھی ''بہی خواہِ گورنمنٹ'' کا خطاب عطا ہوا۔ اُسی زمانے میں اُن کے جدّ اعلیٰ ترکِ وطن کر کے بازنگر (ضلع ایٹہ) میں مقیم ہو گئے۔ عاشق کے خسرِ بزرگوار دیوان ہرچرن لال تھے۔ دیوان صاحب موصوف کے اجداد بھی سرکارِ اودھ میں ممتاز عہدوں پر متمکن رہے اور ''دیوان'' کا خطاب حاصل کیا۔ یہ ۱۸۵۷ء کے زمانے کی خدمات کے انعام میں بدایوں کے تحصیل دار مقرر ہوئے تھے۔ منشی گنگا پرشاد آگرہ ہائی کورٹ کے مشہور وکیل، عاشق کے بہنوئی تھے۔ عاشق کی رسمی تعلیم بہت اچھی تھی۔ انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں کلکتہ یونی ورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی۔ وکالت میں بھی بی ایل کی سند لی۔ آگرہ کے ممتاز امیر، آنریری مجسٹریٹ اور آگرہ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ شہر کے کامیاب وکیلوں میں سے تھے۔ ساری عمر فارسی میں کہا۔ اُردو پر توجہ نہ کی۔ ۷۰ برس کی عمر میں ۳ فروری ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا۔ جسمانی یادگار دو صاحب زادے بابو پربھو دیال اور بابو کرشن دیال چھوڑے۔ چھوٹے بابو کرشن دیال وکالت کرتے تھے۔ بڑے بابو پربھو دیال عرف شام بابو بھی شعر کہتے تھے۔ شام تخلّص تھا اور آگرے کے مشہور شاعر مولانا سیّد نثار علی شاہ نثار (متوفی ۲۷ اپریل ۱۹۲۱ء) کے

شاگرد تھے۔ مدّتوں نظام دکن کے چھوٹے صاحب زادے شاہزادہ معظم جاہ شجیع کے مصاحب رہے۔ دونوں کا انتقال ہو گیا۔

افسوس کہ عاشق کا کلام مہیا نہ ہو سکا۔ صرف ایک اُردو کا شعر ملا :

پھر تمنا کو ہوا جوش کہ اصرار کرے
پھر تغافل نے نکالا، نیا طرزِ انکار

[نہالستانِ نثار : ۲۲]

عاشق... منشی محمد اقبال حسین دہلوی

منشی نور الدین احمد دہلوی کے فرزندِ ارجمند تھے۔ دلّی میں اجمیری دروازہ اور حوض قاضی کے درمیان شاہ تارا کی گلی میں سکونت تھی۔ ۱۸۵۸ء میں ریاستِ لوہارو میں ملازم ہوگئے تھے اور یہیں غالب سے رسم و راہ کا ذریعہ ہوا۔ اِس کے بعد ۱۸۶۸ء میں ریاستِ بیکانیر میں چلے گئے اور آخرکار ۱۸۸۴ء میں ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے راجپوتانہ کے وکیل حاضر باش کے عہدے پر فائز ہوکر مدّتوں اجمیر میں مقیم رہے۔

بڑے دلچسپ بزرگ تھے۔ لالہ سری رام مرحوم نے اُن کے جو حالات لکھے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں اپنی قابلیت اور قادر الکلامی سے متعلق بہت کچھ غلط فہمی تھی۔ استادوں کی غزل پر غزل کہتے اور قافیے کا جواب قافیے سے دیتے۔ چنانچہ داغ کے دیوانِ ثانی ''آفتابِ داغ'' کا جواب ترکی بہ ترکی اور قافیہ بہ قافیہ لکھا اور لطیفہ یہ کہ جہاں ایک جگہ داغ کے دیوان میں کتابت کی غلطی سے قافیہ غلط چھپ گیا ہے، آپ نے بھی اُسے اِسی طرح غلط باندھ دیا ہے، اس دیوان کا نام ''افکارِ عاشق'' ہے۔ اس کے آخر میں امیر مینائی کے دیوان ''مراۃ الغیب'' کی ردیف الف کی غزلیات کا بھی قافیہ بہ قافیہ جواب شامل ہے۔ امیر مینائی نے ایک قصیدہ ''مناظرۂ شانہ و آئینہ'' کے نام سے لکھا تھا۔ عاشق نے انھی قافیوں میں ''مناظرۂ زلف و رُخ'' کے نام سے نواب محبوب علی خان، نظامِ دکن کی مدح میں قصیدہ لکھا ہے۔

بیان الحقائق کے مصنف کا بیان ہے کہ جن دنوں عاشق بیکانیر میں مقیم تھے، اُنھوں نے اپنے دو مطبوعہ دیوان جو مرزا خان داغ کے ہر دیوان اور ہر غزل کے

ردیف وار جواب میں تصنیف کیے تھے، مولانا سید عبید اللہ فرحتی (مصنفِ کتاب کے والدِ بزرگوار) کے آگے بہ مرادِ اصلاحِ کلام رکھ دیے۔ چنانچہ موصوف نے بہ اندب توجہ بہت سے مواقع پر اصلاح پسندیدہ کی۔ جس کو مولوی اقبال مرحوم نے بہ منت و سپاس قبول کر کے مکرر انطباع دواوین کا تہیہ و اہتمام کیا۔

عاشق کے دماغ میں سنک تو ضرور تھی اور اُن سے کوئی فعل بھی بعید نہیں، لیکن اُنھیں اپنی ہمہ دانی کا جو غرّہ اور اپنی شاعرانہ عظمت کا جو زعم تھا، اس کے پیشِ نظر یہ روایت حد درجہ مشکوک ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عاشق نہایت زُود گو اور نظم و نثر پر یکساں حاوی تھے۔ اُردو کے تین دیوان: اسرارِ عاشق، افکارِ عاشق، اعجازِ عاشق اور فارسی کا ایک "ترانۂ عشق" (بشمولِ افکارِ عاشق) چھپے ہوئے موجود ہیں۔ زبان واقعی بہت صاف ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اچھا میں بُرا سہی و لیکن
تم اپنی کہو، تمھیں ہوا کیا

☆

مر کے پردہ رہ گیا عاشق کا، یہ اچھا ہوا
دربدر، کوچہ بکوچہ، مدّتوں سے خوار تھا

☆

ہائے کس ناز سے کہتے ہیں وہ ہردم مجھ سے
"اپنی صورت کو تو دیکھو، تمھیں چاہیں کیوں کر"

☆

کرتے ہیں مجھ کو ہی وعظ و پند، ناحق رات دن
حضرتِ واعظ، اُسے کچھ جا کے سمجھاتے نہیں

اُنھیں غصّہ کہ میری بزم میں یہ کس لیے آیا
مجھے یہ غم کہ وہ پہلو میں کیوں دشمن کے بیٹھے ہیں

☆

شوخی نے رخنے ڈال دیے ہیں حجاب میں
سو بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

☆

وہ دل ہے خاک، جس میں تری آرزو نہ ہو
وہ گُل ہے خار، جس میں محبّت کی بُو نہ ہو

☆

توبہ تو کر چکا ہوں، مگر کچھ کچھ اِن دنوں
دیتی ہے دم بہار کی آب و ہوا مجھے

☆

گر ہماری بندگی ہے نا قبول
تو بتوں کی بھی خدائی ہو چکی

[گلستانِ سخن: ۲۵۲، خم خانۂ جاوید، ۵: ۵۲۹۔۵۳۳، بیان الحقائق:۴۲]

عاشق... محمدؐ عاشق حسین خان اکبر آبادی

محمدؐ مشتاق حسین خان کے بیٹے اور آگرے کے رہنے والے تھے:

شور سُن کر وہ دریچے سے نظر کرتے ہیں
آج نالے مرے ممنونِ اثر کرتے ہیں

[سخنِ شعرا: ۳۱۸]

عاصی... منشی شیام لال

اُن کے والد منشی سندر لال ویش اگروال تھے۔ اِس خاندان کے لوگ اسلامی عہد میں مدّتوں قانون گوئی کے عہدے پر مامور رہے۔ ۱۸۵۷ء کی افتاد کے بعد اِن لوگوں نے راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں میں ملازمت کرلی اِس طرح منشی سندر لال بھی بوندیل کھنڈ پہنچ گئے۔ شیام لال بھی غالباً یہیں پیدا ہوئے۔

شیام لال مدّتوں بوندیل کھنڈ ایجنسی میں منشی کے عہدے پر فائز رہے۔ بعد کو ریاستِ پالدیو میں کامدار مقرر ہوگئے۔ سب لوگ اُن کی ایمان داری، خدا ترسی اور مستعدی سے مطمئن تھے۔ شعر کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے۔ اُن کی مرتبہ تاریخِ بوندیل کھنڈ چھپ چکی ہے (نو گاؤں پریس، ۱۸۸۴ء) اس کی تاریخِ ہائے طباعت شیخ کاظم حسین صدیقی نے کہی تھیں۔ عیسوی تاریخ ہے۔

هم از برای آں کہ دہی دادِ نکتہ سنج
هم در جوابِ آں کہ کند سال را سوال
کاظم! بگو کہ رتبہ اعلانِ عام یافت
''ملکِ بندھیل کھنڈ'' ز ''تاریخ شام لال''
(۱۸۸۴=۱۶۱۴+۲۷۰)

کتاب کے آخر میں عاصی کا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے جس سے ان کا تلمذ غالب بھی ثابت ہوتا ہے:

تاریخ ایک اور مری طبع زاد ہے
اظہار سالِ عیسوی جس سے مراد ہے

تحقیقِ معتبر سے لکھا ہے تمام حال
دل ہر بشر کا دیکھنے سے جس کے شاد ہے
دعویٰ سخن وری کا نہیں مجھ کو زینہار
کرتا ادب سے عرض یہ خاکی نہاد ہے
حاصل مجھے لیاقتِ ذاتی نہیں، ولے
غالب سے فیض یاب یہ ہندی نژاد ہے
عاصی! ہے تعمیہ سے عیاں سالِ عیسوی
''تاریخِ بے مثال'' پہ ہاتف کا ''صاد'' ہے
(۹۰+۱۷۹۴=۱۸۸۴ء)

[تاج التواریخ نیز تاریخ بوندیل کھنڈ بحوالۂ نشیدِ کاظم : ۸۹، ہماری زبان (علی گڑھ) ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء:۴]

عاقل... سیّد محمد سلطان دہلوی

بزرگوں کا وطن برست (ضلع کرنال) تھا، لیکن نقلِ مکان کر کے دتی میں آ رہے تھے۔ چنانچہ عاقل یہیں ۱۳ مئی ۱۸۵۴ء (۱۵ شعبان ۱۲۷۰ھ) کو پیدا ہوئے۔ نجیب الطرفین تھے۔ دادھیال اور ننھیال کے سلسلے نواب حامد علی خان بہادر اور نواب نجف علی خان بہادر تک پہنچتے ہیں۔ فارسی میں منتہی تھے اور عربی صرف ونحو کے بھی چند رسالے دیکھے تھے۔

غالب ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو فوت ہوئے ہیں۔ گویا اس وقت عاقل کی عمرِ عزیز پندرہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی کم عمری میں اُنھوں نے غالب سے کتنا استفادہ کیا ہوگا، شاید چند ابتدائی غزلیں دکھا سکے ہوں۔

عاقل عالمِ جوانی میں بنارس گئے۔ وہاں میر وزیر علی☆ پھکیت سفید پوش اپنے فن کے ماہر تھے، یہ عاقل کے خالو بھی ہوتے تھے۔ عاقل نے اُن سے پھکیتی سیکھی اور اُن کی دختر بلند اختر کو اپنے حبالۂ عقد میں لائے۔ اُسی زمانے میں صاحبِ عالم مرزا نادر بخش صابر گورگانی سے مشورہ کرنے لگے، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اکثر بنارس میں مقیم رہتے تھے۔ صابر کی قدرتِ کلام اور مہارتِ فن اور زبان دانی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ چنانچہ عاقل نے اُن سے پورا فائدہ اٹھایا اور اتنی مشق بہم پہنچائی کہ خود استاد کو ان کی شاگردی پر ناز تھا۔

اُن دنوں حیدرآباد میں ہُن برس رہا تھا، عاقل نے بھی قسمت آزمانے کو (۱۸۸۲۔ ۱۸۸۳ء میں) دکن کی راہ لی۔ صاحبِ استعداد ہونے کے علاوہ آدمی

موقع شناس تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی لسّانی اور جادو بیانی سے ہر مجلس میں نفوذ حاصل کرلیا۔ ایک اخبار ''ہزار داستان'' نکالنے لگے۔ پھر اُس سے قطع تعلّق کر کے ایک مطبع آصفی قائم کیا اور یہیں سے ۱۳۰۱ھ میں اخبار آصفی شائع کرنے لگے۔ تھوڑے دن بعد نواب نظام یار جنگ بہادر خانِ خاناں کے کہنے سے مطبع اور اخبار کو خیر باد کہا، اور اُن کے ہاں معتمدی کے عہدے پر مقرّر ہوگئے۔ زیادہ مدّت نہیں گزری تھی کہ نواب صاحب موصوف نے اپنے سابق معتمد مولوی بلگرامی کو بحال کردیا اور اب اُن کے لیے ایک اور عہدہ تجویز کیا۔ یہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ بارے نواب بہرام الدّولہ میر داور علی نے دست گیری کی، لیکن یکایک عاقل طاعون کا شکار ہوگئے۔ صرف ۳۷ برس کی عمر میں ۱۴ اگست ۱۸۹۱ء (۸ محرم ۱۳۰۹ھ) کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وصیّت تک نہیں کر پائے۔ دو صاحب زادے، فرّخ سلطان اور جعفر سلطان اپنی یادگار چھوڑے۔ اِس کے بعد خاندان دو جگہوں میں تقسیم ہوگیا۔ جعفر سلطان کو ان کے نانا میر وزیر علی اپنے ساتھ بنارس لے گئے۔ فرخ سلطان حیدر آباد ہی میں رہے، نظام یار جنگ اور بہرام الدّولہ نے اُن کی سرپرستی کی۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ کامل تخلّص تھا۔ بہرام الدّولہ کی توجّہ سے عاقل کا دیوان بھی شائع ہوا تھا۔ (مطبع انوار الاسلام: ۱۳۱۹ھ) چند شعر ملاحظہ کیجیے:

یہاں ہے ضبط مانع، صبر واں قفلِ دہاں ہوگا
ہمارا آپ کا انصاف، یاں ہوگا نہ واں ہوگا

☆

جب کہا میں نے، کہ کب آیئے گا
ہنس کے بولے، یونہی مرجایئے گا
چھیڑ کی حد ہے، چلو چپ بھی رہو
ہم جو چھیڑیں گے، تو گھبرایئے گا

☆

یہ زندہ، نہ مُردہ، نہ دنیا، نہ دیں کا
مجھے تو نے رکھا نہ ظالم کہیں کا

☆

تم نہیں، غیر سہی، غیر نہیں، مرگ سہی
مدعا یہ، کہ کوئی جان کا خواہاں ہوتا

☆

شرما کے منھ پھرانا، لڑانا نگاہ کا
ظالم یہ سیدھی سی ہے ادا بانکپن میں کیا!

☆

کیوں آئنے پر پیار کی پڑتی ہیں نگاہیں
ہو جائے نہ تم کو کہیں، اے جان! نظر آج

☆

نکلے ہیں پریشاں درِ مے خانہ سے واعظ
کچھ بات ہی ایسی ہے جو گھبرائے ہوئے ہیں

☆

زمانے میں رہی تعلیمِ خود بینی سکندر سے
رہے گا سلسلہ جاری یہ آئینے کے جوہر سے

☆

کہتا ہے کہ ہے حسنِ بتاں، قدرتِ اللہ
یہ شیخ ریاکار، اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

[محبوب الزمن، ۲ : ۸۰۹۔ ۸۱۱، یادگارِ ضیغم : ۲۴۸۔ ۲۴۹، تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم : ۱۲۵۔ ۱۲۶، خم خانۂ جاوید، ۵:۵۵۶۔ ۵۵۸، تذکرۂ رسول پور برشط: ۱۸۰۔۱۸۲]

حواشی

☆ اکثر اصحاب نے اِن کا نام وزیر حسین لکھا ہے، لیکن صحیح غالباً وزیر علی ہے۔ ''تذکرہ رسول پور برشط'' (ص ۱۸۰) میں ہے۔

عبّاس... عبّاس علی

جاورہ ریاست سے ایک گل دستہ "افتخار" شائع ہوتا تھا۔ اِن گل دستوں میں شعرا کا کلام چھپتا رہتا تھا، جس کے لیے طرح کا پہلے سے اعلان کردیا جاتا تھا۔ "افتخار" دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے (۳: ۱۲) میں اعلان ہوا ہے:

مصرعِ طرح	قافیہ	ردیف
جناب عباس علی صاحب تلمیذ غالب مرحوم		
یا الٰہی کون ہے وہ جس کی آمد دل میں ہے	دل	میں ہے

اِس سے زیادہ اُن سے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔

عرشی... سیّد احمد حسن قنّوجی

ان کا سلسلۂ نسب ۳۴ واسطوں سے حضرت امام حسین علیہ السّلام سے جا ملتا ہے۔ اِس خاندان میں بہت برگزیدہ ہستیاں گزری ہیں۔ جن میں سے آٹھ یعنی امامِ حسین، امام زین العابدین، امام محمدؑ باقر، امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، امام علی رضا، امام محمد تقی اور امام علی نقی علیہم السلام ائمۂ اہلِ بیت اور زمرۂ اثنا عشر آلِ اطہار میں شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ اور کئی اہل اللہ اور صُلحا اِس خاندان میں ہوئے۔ مثلاً مخدوم جہانیان جہان گشت (۷۸۵ھ) اور سیّد جلال معروف بہ گلِ سرخ بھی اُن کے بزرگوں میں سے تھے۔ خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں اور بعد کو بھی بزرگوں کا وطن بغداد رہا۔ سب سے پہلے جو بزرگ بغداد چھوڑ کر بخارا گئے، وہ سیّد محمد تھے، جو عرشی سے ۲۳ پشت اُوپر ہیں۔ اُن سے تیسری پشت میں سیّد ابو عبداللہ حسین گلِ سرخ ہوے، جو اپنے زمانے کے مشہور ولی اللہ تھے۔ یہ شیخ الاسلام بہاء الدّین زکریا ملتانی (۷۹۱ھ) کے خاص مُرید تھے اور اس خاندان کے پہلے مورث ہیں جو ہندوستان آئے۔ شیخ الاسلام کے ارشاد پر اُنھوں نے سرحدی علاقے میں اُوچہ کے مقام پر سکونت اختیار کرلی اور ساری عمر خلقِ خدا کی رشد و ہدایت میں بسر کردی۔ اُن کے صاحب زادے سیّد احمد کبیر تھے، جن کے نام پر آج بھی جاہل لوگ گاے ذبح کیا کرتے ہیں۔ اِن ہی سیّد احمد کبیر کے بڑے صاحب زادے حضرت مخدوم جہانیانِ جہان گشت تھے جن کے حالات سے تذکروں کے صفحات روشن اور اہل اللہ کی محافل گرم ہیں۔ مخدوم جہانیان کی چوتھی پشت میں جلال ثالث اوچہ سے نقلِ مکان کر کے دلّی آگئے، جس کا سبب بھائیوں کی باہمی

کش مکش کے علاوہ بادشاہِ وقت بہلول لودھی کی ارادت بھی تھی۔ بادشاہ نے جاگیر میں اُنھیں قنوج کی سرکار دے دی۔ جب سے یہ خاندان قنوج میں رہنے لگا۔ جب قنوج کا تعلق حکومتِ دلّی سے منقطع ہوا اور یہ علاقہ اودھ میں شامل ہوگیا تو اِس خاندان کے بزرگوں نے ''النّاس علیٰ دینِ ملوکہم'' کے مصداق مذہب امامیہ اختیار کرلیا۔ پانچ پشت تک یہ لوگ شیعانِ علی میں شامل رہے۔ آخر میں خاندان کے ایک فرد سیّد عزیز اللہ شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کے زوال اور تباہی سے متاثر ہوکر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں اُن کی مناسب آوَ بھگت ہوئی۔ سیّد اولاد علی خان انور جنگ ان ہی عزیز اللہ کے پوتے اور ہمارے صاحبِ تذکرہ عرشی کے دادا تھے۔

سیّد اولاد علی خان کو سرکارِ نظام سے نواب انور جنگ بہادر کا خطاب اور گولکنڈہ کی قلعہ داری عطا ہوئی۔ پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر ان کے خالصے میں تھی۔ نواب انور جنگ نے اپنے پیچھے فرزندِ نرینہ صرف ایک سیّد اولاد حسن بخاری چھوڑے جو قنوج ہی میں مقیم تھے۔ وہ بخلاف اپنے والد اور دوسرے اعزّہ کے اہلِ سنّت والجماعت کے مسلک پر قائم تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے حیدرآباد جا کر اپنے والدِ مرحوم نواب انور جنگ کے ترکے کا مطالبہ نہیں کیا کہ خدا معلوم یہ جاداد کسبِ حلال سے جمع ہوئی ہے یا نہیں! اگر وہ چاہتے تو منھ مانگا بیش قرار منصب اور جاہ و منالِ دنیوی اُنھیں مل سکتا تھا۔

مولانا سیّد اولاد حسن (۱۸۰۵ء۔ ۱۸۳۸ء) عالمِ باعمل تھے۔ ابتدائی تعلیم مولوی عبدالباسط قنوجی سے حاصل کی اور تکمیل دلّی جا کر شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدّین کی خدمت میں کی۔ یہاں سے علومِ دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ کے حصول کے بعد حضرت سیّد احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ جب سیّد صاحب سرحد کی طرف گئے، تو یہ بھی اُن کے ہم رکاب تھے۔ آخر اپنے مرشد سے اجازت اور سندِ خلافت لے کر یہ قنوج واپس آگئے اور یہیں بقیہ عمر مخلوق کی ہدایت اور تعلیم میں گزار دی۔ اُن کی شخصیت علم و عمل کے امتزاج کا عجیب و غریب نمونہ تھی۔ اُن کی تقریباً پندرہ تصنیفات

دستیاب ہوئی ہیں جو سب کی سب مذہبی مسائل سے متعلق ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے اور حسن تخلص کرتے تھے۔

سیّد اولاد حسن نے مفتی محمد عوض (ساکن بانس بریلی) کی صاحب زادی نجیب النساء بیگم سے نکاح کیا۔ اس عقد سے دو صاحب زادے، سیّد احمد حسن عرشی اور سیّد صدّیق حسن اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ سیّد اولاد حسن ۱۸۳۸ء (۱۲۵۳ھ) میں فوت ہوئے "مات بخیر" تاریخِ وفات ہے۔ محلّہ شیخ پورہ قنوج میں اپنے مکان کے متصل، موروثی باغ میں دفن ہوئے۔

سیّد احمد حسن عرشی شنبہ ۱۹ رمضان ۱۲۴۶ھ (۳ مارچ ۱۸۳۱ء) کو پیدا ہوئے۔ سیّد صدّیق حسن جو آگے چل کر "نواب والاجاہ، امیر الملک، سیّد صدّیق حسن خان بہادر" کہلائے، اُن سے ڈیڑھ برس چھوٹے تھے۔ عرشی نے ابتدائی تعلیم قنوج میں حاصل کی۔ پھر بدایوں، کان پور، فرخ آباد، بریلی، علی گڑھ اور دہلی میں اساتذۂ وقت کی خدمت میں رہ کے تکمیل کی۔ علومِ کتاب و سنّت کی سند مولانا سیّد عبدالغنی مدنی سے لی۔

کمالاتِ معنوی کے علاوہ فنونِ سپہ گری میں بھی طاق تھے۔ شہ سواری، شمشیرزنی اور نشانہ بازی میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ گھوڑوں کی شناخت اور ہتھیاروں کے حسن و قبح پر بھی بڑی گہری نظر تھی اور اُن کا معقول ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اُنھوں نے قنوج کے باشندوں کے جان و مال کی حفاظت میں بہت قابلِ تعریف کام کیا۔ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔

عرشی نے دو تین بار حج کا قصد کیا، لیکن اُن کی والدۂ ماجدہ چاہتی تھیں کہ سب مل کر ایک ساتھ اس مقدّس فریضے سے سبک دوش ہوتے۔ اس لیے یہ رُکے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ سب لوگوں کے لیے سفر کا سامان درست ہونے میں ابھی وقت لگے گا، تو زیارتِ بیت اللہ کے شوق میں ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) میں اکیلے چل کھڑے ہوئے۔ بڑودہ پہنچ کر غلام حسین قنوجی کے مکان پر ٹھہرے۔ ارادہ تھا کہ

چندے آرام کر کے آگے روانہ ہو جائیں گے۔ اثنائے سفر میں خارش کی شکایت پیدا ہوگئی تھی، بڑودہ پہنچ کر تپ اور اسہال کی شدید تکلیف بھی لاحق ہوگئی۔ اسی حالت میں بیس روز بیمار رہ کر بروز جمعہ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۳ نومبر ۱۸۶۰ء) واصلِ حق ہوئے۔ وہیں بڑودہ میں تکیہ☆ ماتریہ میں مدفون ہیں۔ وفات کے وقت عمر تیس برس سے کچھ زیادہ تھی۔ لاولد فوت ہوئے۔ مولوی محمد عباس رفعت نے قطعۂ تاریخ لکھا:

عرشیِ عالی گہر احمد حسن
در طفیلِ مصطفےٰ مغفور باد
رخت بربست از جہاں سوئے بہشت
زیرِ طوبیٰ ہمنشینِ حور باد
گفت رفعت از پے تاریخ اُو
"با امام المتقین محشور باد"
(۱۲۷۷ھ)

عرشی کو مطالعۂ کتب اور پڑھنے لکھنے کے سوائے اور کوئی شغل نہیں تھا۔ بہت پرگو اور زُود نویس تھے۔ ایک ایک نشست میں طولانی قصیدے اور ہر طرح کی نظم لکھنے پر قادر تھے۔ اُردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اِس کے باوجود سچ تو یہ ہے کہ نسبتِ شاعری اُن کے دُونِ مرتبہ ہے۔ وہ علم و فضل اور ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث اپنے اقران و اماثل سے کہیں بڑھ کر تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ اگرچہ شروع میں چندے مولانا فیض احمد رسوا بدایونی سے بھی مشورہ کیا۔ لیکن یہ تعلق زیادہ دن قائم نہیں رہا اور بعد کو اُردو اور فارسی دونوں میں غالب کا تلمذ اختیار کرلیا۔ ایک اُردو قصیدے میں یوں اعتراف کرتے ہیں:

مغلوب ہیں سب اہلِ جہاں، میرے سخن سے
ہوں زلّہ رُبا غالبِ اعجاز رقم کا

ان کا کلامِ نظم و نثر، ان کی وفات کے بعد، نواب والاجاہ نے جمع کر کے

شائع کردیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب ''شہابِ ثاقب'' مذہبی مناظرہ قسم کی بھی موجود ہے۔

اُردو اور فارسی کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو۔ اُردو کی بہ نسبت فارسی میں نمک اور شوخی زیادہ ہے!

سحر جو میں نے کہا، ہو قصور شب کا معاف
تو ہنس کے بولے کہ ''چل دور ہو، ہوا سو ہوا''

☆

اے وضعِ اختیار یہ فصلِ بہار ہے
گُل بانگ شوق، زمزمہ سنجِ فغاں نہ ہو
اتنی ہی آرزو ہے ہمیں تجھ سے، اے فلک!
یہ اُن کی اک نہیں بھی نہ ہووے، جو ہاں نہ ہو

☆

مجھے خوشی ہے ترے عشوہ ہائے پیہم کی
رہے نہ کوئی ستم عذرِ امتحاں کے لیے

☆

کیا اک بات میں جامے سے باہر
شب وصل اُس نے جب مجھ سے حیا کی
خود آرائی نہ چھوڑیں گے یہ کافر
خُدائی یوں تو برحق ہے خدا کی

☆

شعلۂ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے
یوں تو پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

اب فارسی کا نمونہ دیکھیے:

چو عاشق میشود معشوق، کار از چارہ می افتد
گریباں چاکی گل رانباشد بخیہ گر پیدا

☆

آبے نزند گریۂ من آتشِ دل را
فریاد کہ جانم ہمہ ایں چشم ترم سوخت
دردا کہ بسر منزلِ جاناں نرسیدیم
سرگرمیِ شوق ایں ہمہ در رہگزرم سوخت
عرشی! چہ بلا سحر در افسانہ دمیدی
آہنگِ سخن سنجی تو بے شررم سوخت

☆

گر اضطراب ندارم، ز آرمدن نیست
شہیدِ عشق ترا، فرصتِ طپیدن نیست

☆

کشم بزیرِ فلک، آہِ شعلہ زن تاچند
برنگِ شمع بفانوس سوختن تاچند
بیار بادہ کہ آتش زنم بکعبہ و دیر
دماغ وسوسۂ شیخ و برہمن تاچند
بیا کہ طرحِ جنونِ دگر بیندازیم
قدم بہ پیرویِ قیس و کوہکن تاچند
ز خویشتن بدر آ ہمچو بوے گل عرشی!
برنگِ بلبلِ شوریدہ درچمن تاچند

☆

مژدہ اے دل! کہ دگر سلسلہ از پا افتاد
کارِ دیوانگیم بازبصحرا اُفتاد
دلِ دیوانۂ من طاقتِ زنجیر نداشت
کار با سلسلۂ زلف چلیپا اُفتاد
پیش ازیں کیں گنبدِ چرخ مدوّرساختند
حسن را فرمانروائے ہفت کشور ساختند
ہر شرارے، کزدلِ پُرشورِ من، سربرکشید
قدسیاں برآسماں بُردند و اختر ساختند

☆

گر دغدغۂ تہمتِ غمّاز نباشد
ازیار نگاہِ غلط انداز نباشد

☆

چشمِ تو بایما سخنِ عشق سراید
از ضعف مگر طاقتِ گفتارندارد

☆

یا رب! آرامشِ دل را ز کجا می آرم
اندریں دشت کہ بانگِ جرسے می آید
وائے بے رحمیِ صیادِ جفا کار کہ گفت
وہ چہ خوش نالہ ز کنجِ قفسے می آید
عرشی، امروز کہ پیمانہ بکف می آئی
ہیچ پیسے بدلت از عسسے می آید!

(مآثر صدیقی، حصہ اوّل، شمعِ انجمن : ۳۲۲ـ ۳۲۷، تذکرۂ

علمائے ہند : ۱۴، ۲۴۔ ۲۵، حیواۃ العلما : ۱۷، خم خانۂ جاوید، ۵ :
۵۷۹)

حواشی

☆۔ بعض احباب نے کہا ہے کہ شاید یہ لفظ، ''ماتریدیہ'' ہے، یہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ بڑودہ کے باہر تالاب، ماتریہ، آج تک موجود ہے۔ اسی کے قریب سادات ترمذی (اخلاف سیّد یحییٰ ترمذی مرید مخدومِ جہانیاں) کے مقابر ہیں (نیز دیکھیے : خاتمہ مرأت احمدی : ۶۲)

عزیز (ولایت)... مولانا محمدؐ ولایت علی خان صفی پوری

شیخ صدّیقی، اولاد میں خواجہ عثمان ہارونی کی، جو پیر ہیں خواجہ معین الدّین چشتی اجمیری کے۔ یہ خاندان پہلے قنوج میں مقیم تھا۔ جب شاہانِ شرقی کے شاہ ابراہیم پر زوال آیا تو اِس خاندان کے مورثِ اعلیٰ منشی فیض محمدؐ قنوج سے ملانواں (ضلع ہردوئی) میں منتقل ہو گئے۔

یہ نواب آصف الدّولہ کا زمانہ تھا۔ منشی فیض محمدؐ لکھنؤ گئے اور اُن کے وزیر امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ کے پیش دست مقرر ہو گئے۔ اِس کے بعد گویا خاندان مستقل طور پر لکھنؤ کا ہو کے رہ گیا۔ فیض محمدؐ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے رونق علی (عزیز کے پردادا) بھی دربارِ شاہی سے وابستہ ہو گئے اور بتدریج ترقی کر کے نواب سعادت علی خان کے عہد میں دارالانشا کے میر منشی بن گئے۔ سعادت علی خان کو ان پر بے حد اعتماد تھا، انگریزوں سے جو معاملات پیش آتے یا خط و کتابت ہوتی، اس میں ہمیشہ منشی رونق علی کا مشورہ شامل رہتا۔ جب غازی الدّین حیدر نے خاندانِ مغلیہ کے مقابلے میں اپنی آزاد بادشاہت کا اعلان کیا، تو اُنھوں نے رونق علی کو مالائے مروارید کے ساتھ ایک چاندی کی مہر عطا کی، جس پر اُن کا نام کندہ تھا، امیر الانشا رونق علی خان، گویا عہدۂ امیر الانشا اور خانی کے خطاب سے مفتخر ہوے۔ کچھ مدّت بعد اُنھوں نے بیماری کا عذر پیش کر کے اپنے عہدے سے سبک دوشی کی درخواست کی، تو غازی الدّین حیدر نے اُن کا استعفیٰ تو منظور کرلیا، لیکن ان کی پوری تنخواہ بدستور جاری رکھنے کا حکم صادر فرمایا اور اُن کی جگہ ان کے بیٹے (یعنی عزیز کے دادا) منشی ثابت علی خان کو دو سو روپے

مشاہرے پر میر منشی مقرر کر دیا۔

غازی الدّین حیدر کی زندگی تک تو منشی ثابت علی خان بے غل و غش کام کرتے رہے لیکن جب ۱۸۲۷ء میں نصیر الدّین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے، تو وزیر اعلیٰ منتظم الدّولہ حکیم مہدی علی سے اُن کی تبھ نہ سکی اور بعض دوسرے اعیانِ سلطنت کے ساتھ یہ بھی معتوب ہو گئے۔

یہ صورتِ حال جولائی ۱۸۳۷ء تک قائم رہی۔ جب نصیر الدّین حیدر کی جگہ اُن کے چچا محمّد علی شاہ تخت پر بیٹھے تو اُنھوں نے ثابت علی خان کو اپنے عہدے پر بحال ہی نہیں کیا، بلکہ ترقی دے کر پانچ سو مشاہرے پر محکمۂ اخبارِ ملکی اُن کے سپرد کر دیا۔

ثابت علی خان نے کام میں اپنے بڑے بیٹے یحییٰ علی خان کو بطور معاون رکھ لیا تھا۔ اِس دوران میں حکیم مہدی علی جوڑ توڑ کر کے دوبارہ وزیر اعظم بن گئے۔ ثابت علی خان کے تعلّقات اُن سے پہلے سے خراب تو تھے ہی، انھوں نے عافیت اِسی میں دیکھی کہ خود ہی برضاو رغبت ملازمت سے دست کش ہو جائیں، تاکہ وزیر اعظم کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملے۔ چنانچہ اُنھوں نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ محمّد علی شاہ نے حالات کے پیشِ نظر اُسے منظور تو کر لیا، لیکن ایک تو اُن کی خدمات کے جلدو میں اُن کی ڈھائی سو روپے مستقل خاندانی پنشن مقرر کر دی اور دوسرے اُن کے بیٹے یحییٰ علی خان کو خلعت عطا فرما کر داروغۂ اخبار ڈیوڑھیات کے عہدے پر فائز کر دیا۔ وہ اِس عہدے پر محمّد علی شاہ کی وفات کے بعد امجد علی شاہ کے ابتدائی زمانے میں بھی کام کرتے رہے۔ چوں کہ بتدریج دربار پر مذہبی غلو کا غلبہ ہونے لگا تھا اور یہ فضا اُنھیں راس نہ آئی، اس لیے وہ مجبوراً مستعفی ہو گئے۔ اِس کے بعد بھی یہ خاندانی پنشن اُنھیں واجد علی شاہ کے عہد میں انتزاعِ سلطنت تک ملتی رہی۔ اسی لیے ۱۸۵۷ء تک یہ خاندان لکھنؤ میں مقیم رہا۔ اِس افتاد کے بعد مجبوراً انھیں یہاں سے نکلنا پڑا اور وہ آکر صفی پور (ضلع اناؤ) میں بس گئے۔

یحییٰ علی خان کی شادی صفی پور (ضلع اناؤ) کے شیخ محبوب عالم کی صاحبزادی سے ہوئی۔ اُن کے بطن سے عزیز اپنی نانھیال صفی پور[☆1] ۶/۲ صفر ۱۲۵۹ھ (۴/۸ مارچ ۱۸۴۳ء) کو[☆2] پیدا ہوئے۔ تعلیم فارسی اور عربی معقول ڈھنگ سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد حسن صاحب بنگالی اور مولانا عبدالوالی فرنگی محلی سے پائی۔ اِس کے بعد بانگرمئو (ضلع اناؤ) کے مولانا محمد رضا سے مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی۔ ان کے والد یحییٰ علی خان کی خواہش تھی، کہ یہ بھی اپنا خاندانی پیشہ اختیار کر کے کسی ریاست سے وابستہ ہو جائیں۔ لیکن عزیز کی طبیعت نے اسے قبول نہ کیا۔

عزیز کا اپنے زمانے کے مشاہیرِ علم و فضل میں شمار ہوتا ہے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کلام موجود ہے۔ صرف فارسی میں غالب سے مشورہ تھا۔ چنانچہ ایک قطعے میں لکھتے ہیں :

ممنون میں نہیں ہوں کسی کے کمال کا
شاگرد اِس زباں میں ہوں اُس ذوالجلال کا
ہاں نظمِ فارسی میں ہوں غالب سے مستفید
منت گزارِ لطف ہوں، دو تین سال کا
بھیجی تھی ایک نثرِ مطوّل بھی چار جزو
ہوں معتقد میں دونوں میں اُن کے کمال کا
لکھا کہ اس میں حکّ و تصرّف کی جا نہیں
ہرگز محل نہیں ہے کسی احتمال کا
پس نثر میں بھی مجھ کو تلمذ جو ہے، تو یہ
اس میں بھی معترف ہوں خدا کے نوال کا

یہاں جس نثر کی طرف اشارہ ہے، یہ اُنھوں نے منشی ارادت خان عالمگیری کے پنج رقعہ کے جواب میں ۱۷۔ ۱۸ برس کی عمر میں "پنج رقعۂ ولایت" کے عنوان سے لکھی تھی۔ لالہ سری رام کا بیان ہے کہ یہ نثر انھوں نے اپنے شاگرد منشی ٹھاکر

پرشاد طالب کے لیے تصنیف کی تھی۔ (خم خانہ جاوید ۵ : ۴۰۹) غالب نے اس نثر سے متعلق اپنی رائے ایک خط میں لکھی تھی جو مطبوعہ موجود ہے۔ انھوں نے اسے ارادت خان کے پنج رقعہ کا نقشِ ثانی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ رجب علی بیگ سرور کے مشہور ''فسانۂ عجائب'' کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ شاید یہ مسودہ ضائع ہو گیا۔

شروع میں تخلّص ولایت تھا۔ لیکن جب حضرت شاہ مخدوم خادم صفی محمدیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو اُنھوں نے نام بدل کے محمدؐ عزیز اللہ شاہ اور تخلّص عزیز کر دیا۔ ابتدا میں ہر طرح کا کلام لکھا، لیکن اخیر میں ساری توجّہ نعت پر مبذول رہی۔

فارسی میں چار دیوان تھے۔ دیوانِ ولایت، دیوانِ عزیز، اعجاز التواریخ، بیان التواریخ۔ نعت کے دو دیوان : نورِ تجلّی، نعتِ محبوب۔ اِن کے علاوہ مراۃ الصنائع (قصیدۂ نعتیہ) اور متعدد مثنویاں ذکرِ جمیل۔ حسرتِ دل (نعت)، خبرِ خیبر، اعجازِ محمدیؐ، فتحِ مبین وغیرہ۔ اُردو میں بھی تین دیوان (طورِ تجلّی، نورِ ولایت، نظمِ دل فریب) موجود ہیں۔ اِن کے علاوہ فارسی اور اردو نثر میں بھی مختلف چیزیں لکھی ہیں۔ اُن میں سے ایک ''پیش کشِ شاہجہانی'' میں جو والیۂ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم کے حضور میں پیش کی تھی، یہ التزام کیا ہے، کہ خالص پارسی میں لکھی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے مضمون میں عربی، فارسی، اردو نظم و نثر میں اُن کی تقریباً ۴۰ کتابوں کی نشان دہی کی ہے، زیادہ توجّہ فارسی پر رہی۔ غرض کہ آخری دور میں فارسی کے زبردست عالم، شاعر اور انشا پرداز تھے۔ افسوس کہ اُن کی کماحقہ، قدر نہیں ہوئی۔

۱۳ محرّم ۱۳۴۷ھ (۲ جولائی ۱۹۲۸ء) کو صفی پور میں انتقال کیا اور وہیں اپنے پیر کی درگاہ کے احاطے میں صدر دروازے کے قریب دفن ہوئے۔

شادی اُن کے بچپن ہی میں اُن کے والد نے اپنے پھوپھی زاد بھائی منشی احمد علی کی بیٹی سے کر دی تھی۔ عنفوانِ شباب میں اُن کے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا، جو چھ دن بعد داغِ مفارقت دے گیا۔ اس کے بعد کوئی اولادِ جسمانی نہیں ہوئی، لاولد فوت ہوئے۔

اے ہمہ حیرت ز تو دیدۂ بینا ے ما
صورتِ معنیٰ نما، روے دل آراے ما
رحمتِ حق بیرِ ماست، گر بہ ولایت چراست
روضۂ رضواں بود، بعدِ فنا، جاے ما

☆

ہر شب فروغ بزمِ تو از ماست ہمچو شمع
سوز و گدازِ دل ہمہ آمد بکارِ ما

☆

ہر چند کہ آگاہم، شوریدہ و گمراہم
در جوشِ انا اللّٰہم، دیوانہ چنیں باید
چوں شمع برافروزد، شب تا بسحر سوزد
گریاں بہ گداز آید، پروانہ چنیں باید
صد دیر و حرم جوشد، از ہر در و دیوارش
در مشربِ ماریداں میخانہ چنیں باید

☆

بیا کہ عشق، بہ پیری جواں بگردانیم
تواں بہ کالبدِ ناتواں بگردانیم

☆

گل بہ ہزار رنگ و بوست، بلبلِ زار محوِ اوست
شاہدِ لالہ رُو کجاست، ترکِ ستم شعار کو
گرچہ بہ تیغ یک نظر، می فگنی ہزار سر
ہمچو ولایت، اے صنم! کشتۂ دل فگار کو

☆

شرابِ عشق در پیمانہ کردی
بیک پیمانہ ام مستانہ کردی
بیک غمزہ مرا از خود ربودی
بیک عشوہ مرا دیوانہ کردی
بہ افسونِ نظر دادی فریبم
برسوائی مرا افسانہ کردی
بہ محفل شمع گشتی، گل بہ گلشن
ستم بر بلبل و پروانہ کردی
مرو سوے حرم اکنوں ولایت!
کہ عمرے خدمتِ بتخانہ کردی

اُردو کلام کا رنگ یہ ہے:

بُلا کے بات بھی کی، اور مسکرا بھی دیا
کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا بھی دیا
سنبھلتے حضرتِ موسیٰ، مگر ستم یہ ہوا
دکھا کے جلوۂ دیدار، کچھ سنا بھی دیا

☆

حلق پر خنجر چلا اور تھم رہا
جان دینے پر بھی اس کا غم رہا
ہم نے اک عالم کو چھوڑا عشق میں
لیکن اُن کا اور ہی عالم رہا
جان دی میں نے تو پائی مر کے جان
دم میں جب تک دم رہا بے دم رہا

کعبہ کیسا، سجدہ کیا، کیسی نماز
عمر بھر سر اُن کے در پر خم رہا

☆

الفتِ زندگی نہیں جاتی
جان بے عشق دی نہیں جاتی
جائے گی ایک دن فراق میں جان
کیا ہوا، گر ابھی نہیں جاتی
جان جائے تو آرزو جائے
یہ بلا جیتے جی نہیں جاتی
ہوش جاتے ہیں، جب وہ آتے ہیں
دل کی حالت کہی نہیں جاتی
کیا کہوں، طرفہ ماجرا ہے، عزیزؔ!
دل گیا، بے خودی نہیں جاتی

☆

ناتوانی سے نہیں اٹھتے ہیں پاؤں
دست گیری کر کرم سے ہمرہا!
کون جانے حال اُس محبوب کا
خلوتِ ادنیٰ میں جو محرم رہا
پیری آئی، جاگ، توبہ کر، عزیزؔ!
اب تو جینے کا زمانہ کم رہا

[اردوئے معلّٰی (علی گڑھ) اپریل ۱۹۰۴ء، زمانہ (کان پور، اکتوبر ۱۹۲۷ء) ۱۷۹۔۱۸۶، دیباچہ عرفانِ عزیز (دیوان)، سوانحِ اسلاف، دو ماہی اکادمی (لکھنو)]

حواشی

☆۱۔ ولادت کی تاریخ میں کچھ اختلاف ہے۔ ان میں سے دو قابلِ لحاظ ہیں: (۱) چودھری خصلت حسین نے اردو دیوان عرفانِ عزیز کے دیباچے میں ۲ صفر ۱۲۵۹ھ لکھی ہے (۲) ڈاکٹر احسان علی انصاری صفی پوری نے تتمہ المعتمد الشائع کے ضمیمے میں ۶ صفر ۱۲۵۹ھ۔ ان میں یقیناً ایک دوسرے کی تصحیف ہے یعنی ۶ کی جگہ ۲ لکھا گیا ہے، یا ۲ کی جگہ ۶، اسی لیے میں نے دونوں درج کردی ہیں، مہینہ بہرحال صفر ہے۔

☆۲۔ اُردو

☆۳۔ نظم ونثرِ فارسی

عزیز... مرزا یوسف علی خان بنارسی ثم دہلوی

بزرگوں کا وطن بنارس تھا۔ اِن کے والد میرزا نجف علی خان جنون (خلف میرزا محمدؐ علی خان دیوانہ بنارسی) تھے۔ جنون بنارس چھوڑ کے علی گڑھ میں آ رہے تھے اور وہاں کچھ جاداد بھی پیدا کر لی تھی۔ وہ مدّتوں دہلی کے اطراف میں سرشتہ داری اور تحصیل داری کے عہدوں پر مقرر رہے۔ جب جنوری ۱۸۵۴ء میں اُن کا انتقال ہو گیا، تو عزیز اُن کے وارث ہوئے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری یا کسی اور وجہ سے یہ ساری جاداد کھو بیٹھے، اور بہت جلد اُنھیں روزی کی فکر لاحق ہوگئی۔ آخر کار دلّی پہنچے اور یہاں کوشش کرنے لگے۔ بے کاری کے ایام میں غالب نے اُن کا کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور اپنے دوستوں سے بھی سفارش کر کے اُن کی ملازمت کی کوشش کرتے رہے۔ چندے بلّی ماران کے ایک ہندو رئیس کے لڑکوں کو پڑھانے کا شغل بھی رہا۔

مرثیہ گوئی اور سوز خوانی دونوں کا بہت شوق تھا اور اِن میں اچھی دست گاہ تھی۔ اسی واسطے سے غالب اُنھیں قلعے میں لے گئے اور احترام الدّولہ حکیم احسن اللہ خان بہادر مدارالمہامِ شاہی نے اُنھیں ابو ظفر بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ وہاں سے اُنھیں خلعتِ چارپارچہ اور گوشوارہ عطا ہوئے، ''سراج الشعراء سلطان الذاکرین'' خطاب ملا اور تیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب وظیفہ بند ہو گیا، تو محض مدّرسی ذریعۂ معاش رہ گئی۔

طبیعت میں مراق تھا اور اپنی زبان دانی کا بھی بہت خیال تھا، چنانچہ انیس

اور دبیر تک کے کلام پر اصلاح دینے سے نہیں چوکے۔ آخر عمر میں تلاشِ روزگار میں بھوپال گئے اور وہیں ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳-۱۸۷۴ء) میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

ان کے استاد بھائی قربان علی بیگ سالک نے تاریخ کہی :

کلیم مرتبہ یوسف علی عزیزِ سخن ،
کہ ظاہر است ز خوبیِ نظم او لالش
چہ نظم، حاویِ اقسامِ نظم، باید گفت
کسے نیافت چنیں دفترے زامثالش
معیل بود و عسیر المعاش تا تقدیر
کشید از وطن آخر بسوئے بھوپالش
نکشتہ کامِ دل آں جا روا ہنوز افسوس
کہ دستِ مرگ رسا شد بدامنِ حالش
بفکرِ سال ہمی بودہ ام کہ سالک گفت
"عزیز یوسفِ مصرِ سخن" بگو سالش
(۱۲۹۰ھ)

اس کے مقابلے میں خم خانۂ جاوید (۵ : ۵۸۷) میں تاریخِ وفات ۱۲۸۹ھ ملتی ہے۔ بشیر نے عزیز کی وفات پر تین تاریخیں کہی ہیں :

(۱) آج کسبِ سخن تمام ہوا، (۲) شاعرِ بے عدیل لاثانی، (۳) امامِ شاعراں تاج المعلیٰ۔ ان میں سے ہر ایک سے (۱۲۸۹) برآمد ہوتے ہیں۔

غالب کی وفات کے بعد سیف الحق ادیب نے چندے انھی سے اصلاح لی تھی اور یہ ایک شاگرد ہی استاد کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

بدطالعی سے نیک نہ ہوگا مآلِ کار
بگڑی میں کوئی کام بنایا نہ جائے گا
ناصح کی، ناتوانی میں ہم سُن کے کیا کریں
سر اُن کے آستاں سے اٹھایا نہ جائے گا

ہم یہ کہ اپنی مرگ کو، تم بن طلب کریں
تم وہ، کہ ہم کو تم سے بلایا نہ جائے گا

☆

بندہ نہیں بندہ، بُتِ بے شرم و حیا کا
امّت میں محمدؐ کے ہے، بندہ ہے خدا کا

☆

کیا کہوں، کوچۂ قاتل میں کیا کیا جا کر
ہم نشیں! خاک میں ملنا تھا مجھے، مل آیا

☆

اب خاک گُل رخوں سے کروں ارتباطِ عشق
وہ دل نہیں، دماغ نہیں، وہ جگر نہیں
نے تو رفو کی جا ہے، نہ مرہم کا ہے مقام
کوئی علاجِ زخمِ دل، اے بخیہ گر نہیں

☆

باغ میں سن کر غزل خوانی مری
بلبلِ شیدا ہے دیوانی مری

☆

ہوگئے شوقِ کوئے یار میں خاک
یہ نہ دیکھا، ہوا کدھر کی ہے

[گلستانِ سخن : ۳۵۷، اُردوئے معلیٰ : ۳۲-۳۳؛ نادراتِ غالب (۲)
۵۰-۵۱، خم خانۂ جاوید : ۵ : ۵۸۶-۵۸۸، گلستانِ بے خزاں :
۱۶۸-۱۶۹، تذکرۂ بشیر مشمولہ سہ ماہی ''اُردو'' کراچی، ۴۵ : ۱ : ۲۴۴]

عطا... شیخ عطا حسین مارہروی

حضرت خواجہ حسن ملتانی سے دسویں پشت میں حکیم نجف علی مارہروی (خلف اشرف علی) کے صاحب زادے تھے۔ گھر کی چھوٹی موٹی زمیں داری تھی، جس سے گزراوقات شریفانہ وضع پر رہی۔ لیکن بعد کو حالات کی مجبوری سے معلّمی کا پیشہ کرلیا تھا۔ مرزا غالب ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھتے ہیں۔

> صاحب! یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہوگئی۔ ہے ہے اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑیں گے، تب یہ تراوشِ خونابہ ظہور میں آئی ہوگی۔ مزہ یہ کہ عنوان بیان سے حق بجانب اُنھیں کے معلوم ہوتا ہے۔ چوں کہ اصلِ کار میری نظر میں نہیں، اور حقیقتِ حال مجھ پر مجہول ہے، اس واسطے انجام و آغاز، اندازہ ونداز ہ کچھ نہیں سمجھا حک و اصلاح کو آپ بنظرِ اصلاح ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے بحسبِ دستور ہر جگہ منشائے اصلاح لکھ دیا ہے، شیخ صاحب سے میرا سلام کہیے گا اور یہ کہیے گا کہ کیا کروں، دور ہوں، معذور ہوں، مدد نہیں کرسکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہنچا سکتا، خدا تمھارا نگہبان رہے۔ والسّلام (اردوئے معلّیٰ:۹۸)

یہاں جس مثنوی کی طرف اشارہ ہے اور جس پر غالب نے اصلاح دی تھی، وہ ان ہی عطا کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کا نام ''شکایتِ سعایت'' ہے۔ نام تاریخی ہے،

اس کی تاریخِ تصنیف لکھی تھی:

چندے غمِ دل بدل دروں پروردم
از خوفِ جنوں کنوں بروں آوردم
اعدادِ وقوع چوں موافق افتاد
ہم نام "شکایتِ سعایت" کردم
(۱۲۷۲)

اس میں اُنھوں نے لوگوں کی تمامی اور سازشوں کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے اُن کے خلاف یہ سب کارروائی کی تھی۔

ہوا یہ کہ عطا کے اکلوتے بیٹے حسن عسکری کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم حسنِ صوری و معنوی سے آراستہ تھے۔ قوی ہیکل اور مردانہ کھیلوں کے ماہر، کشتی، پنجہ، بانک، پٹہ بنوٹ کے استاد۔ اس کے علاوہ موسیقی کے دل دادہ و شیدا۔ ایسے بیٹے کی جوانامرگی سے غریب باپ کے دل پر جو گزری ہوگی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ غم غلط کرنے کو انھوں نے ایک مکتب کی طرح ڈالی۔ بیوی کے بھانجے کو گود لیا اور اس کی اپنے بیٹے کی طرح پرورش کی، اسے پڑھایا لکھایا۔ جب یہ لڑکا سنِ شعور کو پہنچا تو والدین نے مطالبہ کیا کہ ہمارا بیٹا واپس ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ عطا نے بلطائف الحیل عذر معذرت کی، لیکن بے کار، وہ نہیں مانے اور ایک دن ان کی غیر حاضری میں لڑکے کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اسی واقعے کا ذکر انھوں نے اس مثنوی میں کیا ہے۔ پہلے اس مثنوی کے کچھ اقتباس دیکھیے:

اے سخن آفرینِ مارہرہ
مکسِ انگبینِ مارہرہ
خللِ اندازِ بزمِ یکجہتی
تفرقہ سازِ بزمِ یکجہتی

نمکِ خوانِ تفرقہ سازی
شورشِ اندازِ فتنہ پردازی
ناوکِ سینۂ نیازِ دروں
کاہشِ خاطرِ دلِ محزوں
زلفِ سردادۂ پریشانی
آئنہ دارِ رُوے حیرانی
سُرمۂ دیدۂ سخن چینی
خالِ رخسارِ زیبِ خود بینی
کاوشِ سینۂ نیاز قریں
خارشِ دیدۂ نثار آئیں
عالمِ نکتہ ہاے غمازی
واقفِ رمز افترا سازی
کینہ توزِ دلِ محبت کیش
سینہ سوزِ سرِ وفا اندیش
رونقِ مسندِ سخن چینی
آبروے نگاہِ خود بینی
باعثِ سردیِ وفا و داد
سببِ گرمیِ عناد و فساد
تو ہے کون، اور کیا ہے تیرا دیں
اہلِ دل کا تو یہ نہیں آئیں
میں تو دل دادۂ محبت ہوں
اور گرفتارِ دامِ الفت ہوں

ہر کسی سے نیاز رکھتا ہوں
سوز کے ساتھ ساز رکھتا ہوں
گل ہوں میں گلستانِ الفت کا
سرو ہوں گلشنِ محبت کا
رنگِ رُوے گلِ وفا ہوں میں
مستِ بُوے گلِ وفا ہوں میں
بلبلِ گلستانِ یاری ہوں
قمریِ سروِ جاں نثاری ہوں
نہ سہی خوبیوں میں افسانہ
اچھی باتوں کا ہوں تو دیوانہ
بے حقیقت ہوں چوں شکستہ سفال
باحقیقت، ولے بہ صفِ نعال
مستمند و غریب بے چارہ
دشتِ ادبار میں ہوں آوارہ
دل شکستہ ہوں اور غم زدہ ہوں
خستہ تن اور میں ستم زدہ ہوں
دردمندِ جگر گداختہ ہوں
ایک غم سے میں زہرہ باختہ ہوں
تاب و طاقت رہینِ وحشت ہے
خواب و آرام وقفِ حسرت ہے
نہ چمن ہوں، نہ باغبانِ چمن
مرغِ گم گشتہ آشیانِ چمن

کیا کہوں، کیسا بدنصیب ہوں میں
ہوں وطن میں، ولے غریب ہوں میں
ماجرا اپنا گر سناؤں کبھو
چشمِ خورشید سے گریں آنسو
ابر کا سینہ چاک ہو جاوے
برق بھی جل کے خاک ہو جاوے
اشک سے میرے رشک جیحوں کو
آہ کی تاب کب ہے گردوں کو
غنچہ گر بے کلی مری دیکھے
نام کو بھی ہنسی کا نام نہ لے
لالہ ساں گر یہ دیکھے داغِ دلی
چشمِ نرگس رہے کھلی کی کھلی
گُل مرا حال دیکھ جلتے ہیں
کفِ افسوس برگ ملتے ہیں
لیک اے کینہ جو صفا دشمن!
اس قدر میرے ساتھ سوءِ ظن

☆

دیکھ کر حالِ چرخِ دُوں پرور
کی معلّم گری میں عمر بسر
گرچہ کچھ اس قدر نہ تھی پروا
مقتضائے زمانہ پر یوں تھا
ایک مدّت برنگِ فصلِ بہار
رہی مکتب کی گرمیِ بازار

پھر کچھ اس میں کساد آنے لگا
آخر آخر فساد آنے لگا
گو متاعِ سخن تھی بالادست
تھا ہر اک مشتری کا حوصلہ پست
نادہندی کو کام فرمایا
رسمِ دادن نہ لب تلک آیا
اور شاید جو کی طلب تنخواہ
حاصلِ امرِ خواستن تھا: "مخواہ"
جب ہوا حال ماضیِ مطلق
خواستن سے "مخواہ" کر مشتق
حرفِ مطلب پہ رکھ کے سب نے لب
متحرّک کیا کہا: "مطلب"
خوب مصدر سے اشتقاق کیا
متعدّی کو لازمی جانا
فعلِ مجہول سب وہ قول و قرار
تھا ندادن قریبِ استمرار
مانگنے میں سمجھ کے رسوائی
نہ ہوا اس کا میں تمنائی
دل کو اس پر بھی جب سکوں نہ ہوا
پھر بھی مکتب میں تفرقہ ڈالا
کر کے اثباتِ علّت و معلول
فعلِ معروف کردیا مجہول

ہو گیا خط کے آنے جانے پر
ادبستاں تمام زیر و زبر

☆

ہمدمو! کس لیے یہ کاوش ہے
کون سے بغض کی تراوش ہے
جرم ٹھہرا کے دو سزا اُس کی
حرکت دیکھو یہ نہیں اچھی
میں تو تعظیم میں رہوں سرگرم
تم کو اس کی بھی کچھ نہ آوے شرم
جرم کاروں کو یوں منا لانا
رحم کی جا پہ غیظ فرمانا
پے آزار یہ کمر بندی
اللہ اللہ رے خردمندی
عوضِ خدمتِ زن و اطفال
خوں مرا تم کو کیوں ہوا ہے حلال
اے سرِ سرورانِ دولت مند
کون کرتا ہے یہ طریق پسند
اُٹھ کے کیوں آئے تھے لڑائی کو
دیکھیے خوردی اور بڑائی کو
گھر پہ چڑھ آنا طرفہ تھا مضموں
مانیا فطرت اور تھا یہ جنوں
ورنہ یہ کیا وفورِ دانش تھا
یہ تو صاحب قصورِ دانش تھا

کہو کیا عقل تھی، یہ فرماؤ!
اپنے دل میں ذرا تو شرماؤ!

مثنوی پر مخالف اور چراغ پا ہوئے اور طرح طرح کی اوچھی حرکتیں کرنے لگے۔ اس پر جل کر کہا:

کاوشِ اہلِ وطن سے ہے یہ جی کی حالت
کہ مشبک ہے جگر، خانۂ زنبور صفت
جیتے جی ہے یہ ارادہ کہ اتاریں ٹوپی
بعدِ مردن ہے مگر اخذِ کفن کی نیت
اے عزیزِ دلِ استاد فلاں سلمہٗ
تا بکے در جگر ایں نشترِ کینِ تہمت

عطا کی عربی اور فارسی کی استعداد بھی اچھی تھی۔ نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ لیکن اکلوتے بیٹے کی جوانامرگی سے ایامِ زندگانی تلخ ہوگئے۔ اسی حال میں ۷ ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ (۲۲ نومبر ۱۸۷۹ء) کو انتقال کیا۔

کچھ اور کلام دیکھیے:

کہیں جو شیشۂ مے ساقیا ذرا ٹوٹا
تو جانیو کہ مرا دل ہزار جا ٹوٹا
مصاحب آئینہ ٹھہرا ہے، اس خود آرا کا
اب اپنی دید کا بھی اس کا آسرا ٹوٹا
کسی کا بال بھی ٹوٹے تو سانس لیتا ہے
یہ میرا شیشۂ دل تھا کہ بے صدا ٹوٹا
مری شکستہ دلی کی دلیل ہے یہ عطا!
کہ ہے ردیف غزل میں بھی جا بجا ٹوٹا

☆

تھی نکہتِ عیش سے یہ دل کو فرحت
خنداں خنداں سدا تھے ہم گل کی صفت
کیا بادِ خزاں چلی چمن میں کہ عطا!
شبنم کی طرح سے اب ہے روتی صورت

یہاں ایک بات لکھنا بے محل نہیں ہوگا۔

غالب کے محولۂ فوق خط بنام چودھری عبدالغفور سرور سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی خود عطا نے نہیں، بلکہ سرور نے بغرضِ اصلاح غالب کے پاس بھیجی تھی، ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء۔ ۱۸۵۶ء) کی بات ہے، جیسا کہ مثنوی کی تاریخ (شکایتِ سعایت) سے ظاہر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عطا کی غالب سے ملاقات نہیں تھی اور غالب اُن کے حالات سے ناواقف تھے۔ اس مثنوی کے علاوہ عطا کا اور کلام نہیں ملتا، صرف چند شعر ایک آدھ تذکرے میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ اُنھوں نے اس مثنوی کے علاوہ غالب سے اور کتنا استفادہ کیا۔

[المشاہیر: ۲۳۶۔ ۲۳۹، نیز ۲۸۰، قومی زبان (کراچی)، جولائی ۱۹۶۶ء: ۲۴۔۳۰]

علائی... نواب علاء الدّین احمد خان بہادر

والیِ لوہارو

اِن کے خاندان کا مفصّل حال نیّر رخشاں کے ترجمے میں لکھا گیا ہے۔ نواب احمد بخش خان بہادر کے چار صاحب زادے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جاداد کی تقسیم یوں کی تھی کہ اُن کے بعد فیروز پور جھرکہ سب سے بڑے بیٹے شمس الدّین احمد خان کو ملے اور لوہارو دونوں چھوٹے لڑکوں امین الدّین احمد خان اور ضیاء الدّین احمد خان کے حصے میں آئے۔ نواب احمد بخش خان کی وفات (اکتوبر ۱۸۲۷ء) کے بعد بھائیوں میں آپس میں اختلاف پیدا ہوگیا اور شمس الدّین احمد خان نے چاہا کہ کسی طرح لوہارو بھی مجھے مل جائے۔ بہرحال بہت کچھ مناقشے کے بعد لوہارو اُن ہی دونوں بھائیوں کے پاس رہا۔ بعد کو سرکارِ انگریزی نے لوہارو پر نواب امین الدّین احمد خان کا قبضہ بلا شرکتِ غیرے تسلیم کرلیا اور چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدّین احمد خان کے لیے ریاست کے خزانے سے سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔

امین الدّین احمد خان ۱۲۲۹ھ (خندہ از لطفِ الٰہی زد بہنگامِ سحر) یعنی ۱۸۱۴ء (دولت و اقبال و بخت و سال ایں باداجواں) میں فیروز پور جھرکہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی وفات بروز جمعہ ۲۷ رمضان ۱۲۸۶ھ (۳۱ دسمبر ۱۸۶۹ء) آدھی رات کے وقت ہوئی وفات کی تاریخ آیتِ قرآنی ''سبحٰن الذی اسری بعبدہ لیلاً'' سے نکلتی ہے۔ قطب صاحب میں نواب ضیاء الدّین احمد خان کی ہڑواڑ (کوٹھی مرزا بابر) کے دالان

میں دفن ہوئے۔ لوح پر کندہ تھا: ''مدفن امین الدّین احمد خان بہادر'' (۱۲۸۶ھ)

نواب امین الدّین احمد خان کا نکاح نواب غضنفر الدولہ معزز الملک، مستقل جنگ عرف مینڈھو خان رسالدارِ سلطنتِ اودھ کی صاحب زادی ولی النساء بیگم سے ہوا تھا۔ اس بیگم سے علاء الدّین احمد خان ۴ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ/ ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء) کو دِلّی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم شروع سے غالب کی نگرانی میں ہوئی اور میرزا اُنھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ فارسی، ترکی اور عربی کی استعداد عالمانہ تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی سے اُردو کی بہ نسبت زیادہ مزاولت اور شغف تھا۔ چنانچہ فارسی میں کلام بھی زیادہ ہے۔ غالب نے اُنھیں ایک سند میں اپنے بعد فارسی اور اُردو دونوں میں اپنا خلیفہ اور جانشین بھی مقرّر کیا تھا۔ ناظم ہروی کا مشہور قطعہ ہے، جس میں عنصری سے لے کر جامی تک تمام سر برآوردہ شعرا کا ذکر کیا ہے۔ اس کا آخری شعر ہے:

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید
زجامی سخن را تمامی رسید

غالب نے ایک شعر کا اضافہ کر کے اس سلسلے کو اپنے تک یوں منتہی کیا تھا:

زجامی بہ عرفی و طالب رسید
زعرفی و طالب بہ غالب رسید

علائی نے اسی سندِ جانشینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس پر مزید ایک شعر کا اضافہ کرتے ہوئے کہا:

علائی چو برجاے غالب نشست
ورق بر درید و قلم درشکست

غرض کہ اُنھیں پڑھنے لکھنے کے سوائے اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ لوہارو میں ایک چھاپا خانہ بھی فخر المطابع کے نام سے قائم کیا تھا، جہاں سے علمی اور ادبی کتابیں شائع کرتے رہے۔ ایک پندرہ روزہ اخبار بنام ''امیر الاخبار'' بھی یہیں سے چھپتا تھا۔

اس کے علاوہ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ ریورنڈ وہٹلی صاحب جب دہلی آگئے تو انھوں نے شہر کے اُن اصحاب سے راہ و رسم پیدا کی، جنھیں شطرنج سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۸۶۶ء کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کے بعد ایک شطرنج سوسائٹی (یا جلسۂ شطرنج) کی بنا ڈالی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ بلاناغہ بروز دوشنبہ مغرب کے بعد سوسائٹی کا جلسہ ہوا کرے گا۔ یہ جلسے علائی کے مکان (بَلّی ماران) میں ہوا کرتے تھے۔ رات کے دس دس بجے تک یہ کھیل اور خوش گپیاں جاری رہتیں۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر سوسائٹی کے عہدہ داروں کے نام یہاں لکھ دیے جائیں:

شیخ وارث علی	پریذیڈنٹ	یعنی	میرِ مجلس
میرزا علاء الدّین احمد خان بہادر	سیکریٹری	یعنی	منصرم
جناب ریورنڈ وہٹلی صاحب بہادر	ممبر	یعنی	رکن
جناب سمت وایٹ صاحب بہادر	ممبر	یعنی	رکن
میرزا قربان علی بیگ خان سالک	ممبر	یعنی	رکن
میرزا غلام حسن خان محو	ممبر	یعنی	رکن
میرزا شمشاد علی بیگ خان رضوان	ممبر	یعنی	رکن

یہ جلسے بہت دنوں جاری رہے۔ اِس سوسائٹی کی رُوداد اکمل الاخبار دہلی میں چھپتی رہتی تھی اور انگریز ممبروں کے ذریعے سے کھیل کے نقشے یورپ بھی بھیجے جاتے تھے۔

آخری ایام میں نواب امین الدّین احمد خان بہت بیمار رہنے لگے تھے، بلکہ کچھ دماغ پر بھی اثر تھا، علائی ۳۷ برس کی عمر میں اپنے والد کی حیات ہی میں لوہارو کی گدّی پر بٹھا دیے گئے تھے۔ ”ریاست خداداد“ اِس کی تاریخ ہے (۱۲۸۵) ۱۵ اگست ۱۸۷۴ء کو لارڈ نارتھ بروک وائسرائے کے عہد میں البتہ پورے اختیارات اور خاندانی خطاب ”فخر الدولہ، دلاور الملک، رستم جنگ“ ملے۔ ”خطاب خوب ملا“ (۱۲۹۱ھ) اِس کی تاریخ ہے۔ لیکن علمی سرگرمیوں اور دوسری مشغولیوں کے باعث اُنھوں نے ریاست

کے کاروبار کی طرف پوری توجہ نہ دی، جس سے معاملات روز بروز بگڑتے گئے۔ خرچ میں بھی اعتدال قائم نہ رہ سکا اور ریاست کی مالی حالت بہت سقیم ہوگئی۔ ۱۸۸۱ء میں ریاست پر ایک لاکھ سے زیادہ کا قرض تھا۔ آخرکار حکومتِ انگریزی نے مداخلت کی، جس پر اُنھیں انتظامِ ریاست سے دست بردار ہو کے فرّخ نگر میں مقیم ہونا پڑا۔ اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ اُن کا وظیفہ مقرر ہوا اور ریاست کا انتظام ان کے بڑے صاحب زادے امیر الدّین احمد خان (عرف فرخ مرزا) کے سپرد کردیا گیا۔

علائی کا نکاح نواب جلال الدّین خان (نبیرۂ نواب نجیب الدولہ) کی صاحب زادی شمس النساء بیگم سے ۳۰ جمادی الاوّل ۱۲۷۱ھ (۱۸ فروری ۱۸۵۵ء) کو نجیب آباد میں ہوا۔ اِس بیوی سے ان کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ علائی کی وفات جمعہ ۱۱ محرم ۱۳۰۲ھ (۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء) کو ہوئی۔ اپنی خاندانی ہڑواڑ قطب صاحب ہی میں اپنے چچا نیّر رخشاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔ امیر مینائی نے تاریخ کہی:

مزارِ سایۂ یزداں علاو الدّین احمد خان

کلام کو مدوّن کرنے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی اور واقعہ یہ ہے کہ اپنے علم و فضل کے شایانِ شان کوئی قابلِ قدر علمی یادگار نہیں چھوڑی۔ قلمی بیاض سے کچھ کلام انتخاب کر کے ذیل میں درج کرتا ہوں:

الطاف حق کو وقتِ مصیبت تو یاد رکھ
ہرگز نہ ہو بلا و عنا میں تو ناصَبور
روتا ہے، وقتِ رنج و بلا بھول کیوں گیا
آرام و عافیت وہ تمام عیش اور سرُور
کُتا بھی در سے اپنے خداوند کے کبھی
دوچار فاقوں میں کبھی ہوتا نہیں ہے دُور

بس شرم کر، کہ تھوڑی سی زحمت میں ہائے ہائے
کر یاد لطفِ سابقہ، اے بندۂ کفور!

☆

اللہ ری بے ثباتیِ عمرِ فنا پسند!
بجھتا ہے یہ چراغ پلک کی ہوا کے ساتھ
شکوہ ہے کیوں قبول میں، گر ہو مضائقہ
آخر کسی کا نام تو لوں میں دعا کے ساتھ
درماں پذیر درد اگر ہے، تو خاک ہے
دیں جان کیوں نہ درد کے بدلے دوا کے ساتھ

☆

مشتِ خاکستر ہے وہ بلبل کہ گلشن میں نہیں
داغ ہے وہ دل کہ خوں کے ساتھ دامن میں نہیں

☆

دنیا کی خیر و خوبی میں، لیل و نہار کو
کب جانتی ہے خلق کہ کیوں کر گزر گئے
راتیں جو تھیں تمام ہوئیں نائے و نوش میں
یوں دن کٹے کہ گھر سے اِدھر کو اُدھر گئے
جب عافیت کا قافیہ ہوتا ہے تنگ تر
روتے ہیں ان دنوں کو کہ ہے ہے، کدھر گئے

☆

آوارگانِ گل کدۂ آز و آرزو!
حاشا، اگر تمھیں سرِ سیرو فراغ ہے
رکھیو سنبھل کے پاؤں، جو بینا ہو چشمِ دل
کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے

وہ گُل جو آج ہے قدحِ موج خیز رنگ
وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
کل چُور ہوگا، سنگِ جفائے سپہر سے
گویا کہ غم کدے کا شکستہ ایاغ ہے
اور لالۂ شُد بادِ حوادث سے خاک و خوں
گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے
جس جا کہ تھا، ترانۂ بلبل نشاط خیز
اس جا پہ آج دل شکن آوازِ زاغ ہے
مغرورِ جاہ سے یہ کہو تم، علائیا!
کل ایک سطحِ خاک ہے جو آج باغ ہے

فارسی کلام یہ ہے:

پیدا نہ بُود پیشِ ازیں خود عیانِ ما
برداشت پردہ گریہ ز رازِ نہانِ ما
مشکل ببیں چگونہ خویشش خبر دہیم
کاتش بنامہ در زدہ سوزِ بیانِ ما
ازسوزش است رونقِ ما، چوں نہالِ شمع
عینِ بہارِ ماست، [illegible] خزانِ ما
ساز و جرس زنالہ ہر شبم بہ کوئے دوست
محتاجِ راہبر نشود کاروانِ ما
پروانہ نیستم کہ از تابِ جاں دہیم
برشاخِ شعلہ بستہ فلک آشیانِ ما
تلخیِ دردِ ہجر، زبس درتنم نشست
زیں پس ہما ہمی نخورد استخوانِ ما

لیلیٰ کند ملامتِ ما زاں سبب کہ قیس
گم کردہ راہِ شوق، ز شورِ فغانِ ما
گویی کہ مجراست، خلائی دلِ حزیں
ریزد شرارہ جاے سخن از زبانِ ما

☆

روزے نشد، کہ اشک ز فرقم گزر نکرد
از سر گزشت و دامنِ افلاک تر نکرد
در مرگ نیست بر سرِ من منّت، از اجل
تیرِ تو کارکرد، دعاے سحر نکرد
تا بہل تر نمیرم و بسمل تپم بخاک
از غمزہ کشت، لیک بسُویم نظر نکرد

☆

ہاں خدارا! زود تر گویید باجانانِ من
کے رسی آخر؟ کہ جاں برلب رسید، اے جانِ من
دعویِٔ الفت مکن، اے قیس! کاندر راہِ عشق
برتو دشوارست تمکیں، واں بود آسانِ من

☆

نازم شبِ وصلِ صنم، مہ جلوہ جاناں در بغل
من گشتہ از خود بے خبر، اُوخفتہ آساں در بغل
زلفے و صد مشکِ ختن، چشمے و چندیں سحر و فن
روے و گل در آستیں، بوے دبستاں در بغل

رباعی

صدرہ بہ خطا ز مرد معذوری بہ
صدرہ بہ عیوبِ دوست مستوری بہ

فتوئی کہ زپیر دل گرفتم، اینست
قربے کہ بہ عادلی نبود، دوری بہ

رباعی

اے چرخ! چراستیزہ با ما داری
دانم کہ غلط نہ، نہ بیجا داری
خواہی کہ دہی نقشِ وجودم برباد
آرے، کہ مرا بدہر یکتا داری

[بیاض علائی (قلمی، اُردو، جولائی ۱۹۴۴ء: ۳۰۹ـ ۳۳۸،
بساطِ فرنگ]

علی... نواب علی بہادر (باندہ)

اِس خاندان کی تاریخ پیشوا باجی راؤ اوّل سے شروع ہوتی ہے۔ باجی راؤ جب اپنے والد بالاجی کی وفات پر ۱۷۲۰ء میں شاہو اوّل (پسرِ سیواجی) کا پیشوا بنا ہے، تو اس وقت اُس کی عمر بمشکل ۱۹ برس کی ہوگی۔

۱۷۲۹ء میں نواب محمدؐ خان بنگش نے راجا چھترسال بندیلہ کو جیت پور کے [؟] میں گھیر لیا۔ چھترسال کی درخواست پر باجی راؤ اس کی مدد کو پہنچا۔ ادھر محمدؐ خان نے دلی سے کمک منگوانے کا انتظام کیا۔ لیکن باجی راؤ کی طاقت اور سیاست کے سامنے محمدؐ خان کی ایک نہ چلی، اور بالآخر اسے مرہٹوں کی شرائط پر صلح کرنا پڑی اور اُس نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ چھترسال سے کوئی تعرض نہ کرے گا۔

چھترسال نے اِس مصیبت سے چھٹکارا پایا، تو اُس نے پیشوا باجی راؤ کے اعزاز میں ایک شان دار دربار منعقد کیا، اُسے بہت بڑی جاگیر دی، اپنے دونوں بیٹوں کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ آج سے آپ ان کے سرپرست اور محافظ اور معاون رہیں گے اور تحفۃً مستانی اس کے پیش کی۔

مستانی☆ کون تھی، اس سے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن عام رائے یہ ہے کہ اس کا باپ ہندو اور ماں مسلمان تھی اور وہ خود اسلام کی پیرو تھی، رقص و سرود اُس کا پیشہ تھا، بہرحال وہ اپنے زمانے کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھی۔ باجی راؤ اُسے دیکھتے ہی جی جان سے اُس کا والہ و شیدا ہو گیا۔ اُس دن سے مستانی اُس کی سفر و حضر کی رفیق اور مصاحب بن گئی۔ مستانی کے بطن سے باجی راؤ کے ایک

لڑکا پیدا ہوا۔ چوں کہ مستانی مسلمان تھی اور قدامت پرست مرہٹوں نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ باجی راؤ نے اُس لڑکے کو بھی مسلمان بنایا اور اُس کا نام شمشیر بہادر رکھا، اُسے بعد کو اپنی بندھیل کھنڈ کی جاگیر میں سے باندہ بطور تحفہ دے دیا۔ شمشیر بہادر بعمر تقریباً ۲۷ برس پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۱ء) میں مارا گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا علی بہادر جانشین ہوا۔

علی بہادر کے مرہٹہ حکمرانوں سے بہت اچھے تعلقات رہے، خصوصاً مہاداجی سندھیا سے اس کا دانت کاٹی روٹی والا تعلق تھا۔ لیکن بعد کو کسی بات پر بگڑ گئی اور علی بہادر اس سے الگ ہو گیا۔ اب اس نے اپنی طاقت بڑھانا شروع کی۔ اُس نے باندہ کے اردگرد کے سارے علاقے پر قبضہ کرلیا اور اُس کی حیثیت ایک مضبوط اور مستحکم ریاست کی ہوگئی۔ وہ کالنجر کے قلعے کا محاصرہ کیے پڑا تھا کہ معمولی علالت کے بعد ۲۸ اگست ۱۸۰۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ شاہ عالم ثانی نے غلام قادر روہیلہ کی گرفتاری کے سلسلے میں علی بہادر کی خدمات کے جلدو میں اسے یہ حق عطا فرمایا تھا کہ اس کے خاندان کی اموات کی لاشیں درگاہ قطب صاحب دلّی میں دفن ہوسکیں گی۔ چنانچہ علی بہادر کی لاش کالنجر سے دلّی آئی، اور قطب صاحب میں دفن ہوئی۔

علی بہادر کے دو بیویوں سے دو بیٹے تھے: بڑا شمشیر بہادر اور چھوٹا ذوالفقار بہادر۔ شمشیر بہادر باپ کا جانشین اور گدّی کا وارث ہوا۔ ۱۸۰۴ء میں انگریزوں نے باندہ کی ریاست پر قبضہ کرلیا اور شمشیر بہادر اور اُس کے خاندان کے گزارے کے لیے چار لاکھ سالانہ کا وظیفہ مقرر کردیا۔ چندے بعد باندہ ہی کے قریب اُسے سکونت کے لیے بڑی جاداد دے دی گئی، جہاں یہ لوگ آرام و آسایش سے زندگی بسر کرنے لگے۔

شمشیر بہادر (ثانی) ۳۱ اگست ۱۸۲۳ء کو لاولد فوت ہو گیا، اور اب اس کا چھوٹا (سوتیلا) بھائی ذوالفقار بہادر خاندان کا سربراہ تسلیم کرلیا گیا۔ غالب جب اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں ۱۸۲۷ء میں کلکتے گئے ہیں تو انھوں نے کئی مہینے تک

باندہ میں ذوالفقار بہادر ہی کے وہاں قیام کیا تھا۔ ذوالفقار بہادر نے نہ صرف اُن کی میزبانی کی، بلکہ مالی امداد بھی دی اور باندہ سے سفر خرچ کے لیے قرض کا بھی انتظام کیا۔ ذوالفقار بہادر کا نام غالب کے فارسی کلام میں کئی جگہ آیا ہے۔ ان کا ۵ اگست ۱۸۴۹ء میں انتقال ہوا اور وہ بھی دلّی میں دفن ہوئے۔ علی بہادر (ثانی) اُن کے بیٹے وارث قرار پائے، یہی ہمارے صاحبِ ترجمہ ہیں۔ اگرچہ اُن کی تاریخِ ولادت کسی نے نہیں لکھی، لیکن قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کا عُرف میاں صاحب تھا۔

غالب کے ایک خط سے جو اُنھوں نے نواب انوار الدّولہ سعد الدّین خان شفق (کالپی) کے نام لکھا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی اُن سے دور نزدیک کی کچھ رشتے داری بھی تھی۔ لکھتے ہیں:

> میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشینِ حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہمشیر بھی تھا۔ یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا، وہ باعث ہوا تھا میرے باندہ بوندیل کھنڈ آنے کا۔ میں نے سب سامانِ سفر کرلیا، ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا، قصد یہ تھا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا، وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی سواری میں باندے جا کر، ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا، آپ کے قدم دیکھتا ہوا، بسبیلِ ڈاک دلّی چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضورِ والا (یعنی بہادر شاہ ظفر) بیمار ہوگئے اور مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا اور پھر مرزا اورنگ خاں (؟ اوز بک خان) میرا بھائی مر گیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ
> (اُردوئے معلّیٰ: ۲۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ غالب کی ممانی (یعنی عزّت النساء بیگم کی بھاوج)

ذوالفقار بہادر کی سگی خالہ تھیں۔ ذوالفقار بہادر کے اپنے بیٹے علی بہادر ثانی ہوئے اور اُن کی خالہ کے بیٹے اورنگ خان (؟ اوزبک خان) اُن کے بھائی۔ اسی لیے غالب نے اورنگ خان (اوزبک خان) کو علی بہادر کا چچا لکھا ہے۔ کیوں کہ جب ذوالفقار بہادر کی خالہ کے بیٹے ان کے بھائی تھے، تو وہ علی بہادر کے چچا ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں اگر اورنگ خان (اوزبک خان) غالب کے ماموں کے بیٹے بھائی۔ علی بہادر کے چچا ہیں، تو خود غالب بھی علی بہادر ثانی کے چچا ہوئے۔

غالباً اسی زمانے میں غالب نے وہ غزل کہی جس کا مطلع ہے:

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اس کے مقطعے میں علی بہادر ثانی کی طرف تلمیح ہے:

غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ علی بہادر ثانی ہی کے زمانے میں ہوا اور وہ بھی اِس سلسلے میں انگریزوں کے معتوب ہوگئے تھے۔ ہوا یہ کہ جب جون ۱۸۵۸ء میں دیسی سپاہ نے الٰہ آباد میں جیل کے دروازے کھول دیے تو یہ پورا جمِ غفیر کوچ کرتا باندہ پہنچا، اور یہاں اُنھوں نے علی بہادر کی نوابی کا اعلان کردیا۔ علی بہادر کو بھی طوعاً و کرہاً اُن کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔ باندہ کے انگریز کلکٹر مسٹر مین (O.Mayne) نے راہِ فرار اختیار کی اور وہ گرتا پڑتا الٰہ آباد پہنچ گیا لیکن مجسٹریٹ کاکرل دیسی سپاہ کے ہتھے چڑھ گیا اور اُسے اُنھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

علی بہادر اور اُن کے ساتھیوں کو میجر جنرل وہٹلاک نے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کو مدراس کی فوج کی مدد سے شکست دی۔ علی بہادر نے دیکھا کہ اب مزید مقابلہ بے سود ہے، تو ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کردیا۔ جاداد تو ضبط ہونا ہی تھی، جان یوں بچ گئی کہ علی بہادر بذاتِ خود کسی انگریز یا یورپی کے قتل میں شریک

نہیں تھے، بلکہ بعض انگریزوں کی جانیں محض اُن کی وجہ سے بچ گئی تھیں۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اُنھیں تین ہزار ماہانہ وظیفہ دے کر مہو چھاونی (اندور) میں نظر بند کردیا جائے اور وہ حکّام کی اجازت کے بغیر مہو سے باہر نہ جائیں۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

نواب کی والدہ نے بھوپال میں پناہ لی تھی، اُنھیں سیہور جانے کا حکم ہوا۔ ۱۸۶۰ء میں انھوں نے درخواست دی کہ سیہور کی آب و ہوا مجھے راس نہیں، میری صحت تباہ ہو رہی ہے۔ اگر سرکار کو میرا بھوپالؔ میں رہنا منظور نہیں، تو مجھے آگرہ، گوالیار، کانپور ان تین مقامات میں سے کسی ایک جگہ رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ اِس پر فیصلہ ہوا کہ وہ آگرے میں رہیں۔

نواب علی بہادر نے فروری ۱۸۶۲ء میں درخواست دی کہ اندور کی آب و ہوا میرے موافق نہیں، مجھے صوبۂ غرب و شمال (یو پی) میں الہ آباد، کان پور یا آگرہ میں رہنے کی اجازت ہو۔ الہ آباد اور کان پور کی اجازت تو نہیں ملی کہ یہ مقامات باندہ سے بہت قریب ہیں اور حکومت کو اُن کا اپنی سابقہ سرگرمیوں کے مرکز کے اتنا نزدیک رہنا گوارا نہ تھا اور چوں کہ آگرے میں ان کی والدہ پہلے سے موجود تھیں، اس لیے اُن کا بھی مستقل طور پر وہاں رہنا قرینِ مصلحت نہیں سمجھا گیا۔ آخر تجویز یہ ہوئی کہ انھیں ڈیرہ دون بھیج دیا جائے۔ لیکن آخری فیصلہ کرنے سے پہلے حکومت نے مقامی ڈاکٹر کو حکم دیا کہ نواب کا طبی معائنہ کر کے رپورٹ کی جائے کہ کیا واقعی مہو کی آب و ہوا کا اُن کی صحت پر بُرا اثر پڑا ہے! ڈاکٹر نے دیکھ کر رپورٹ کی کہ اس میں شبہ نہیں کہ بے اعتدالیوں اور افیون کے کثرتِ استعمال سے اُن کی صحت بہت کم زور ہو گئی ہے، لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی صحت کی بنا پر نقلِ مکانی لابد ہے۔ اُس پر حکومت نے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو جاڑے کے زمانے میں تین مہینے اپنی والدہ کے پاس آگرے چلے جایا کریں، مستقل سکونت مہو ہی میں رہے گی۔

نواب علی بہادر کا ۱۴ اگست ۱۸۷۳ء کو بنارس میں انتقال ہوا، جہاں وہ حکومت کی اجازت سے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔

نواب نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ اُن کی پہلی بیوی کا نام (یاخطاب) مبارک محل تھا، جن سے باندہ میں نکاح ہوا۔ بعد کو انھوں نے ان کی چھوٹی بہن افتخار محل سے نکاح کرنا چاہا لیکن چوں کہ شریعتِ اسلام کی رُو سے بیک وقت دو بہنوں سے نکاح کی ممانعت ہے، اس لیے وہ کھلے بندوں تو ایسا نہ کر سکے، البتہ افتخار محل اُن کی بیوی تسلیم کی جاتی تھی۔ آخرکار انھوں نے مبارک محل کو ۱۸۶۴ء میں طلاق دے دی، لیکن اُس کے بعد بھی وہ انھیں تین سو روپے ماہانہ خرچ کے لیے دیتے رہے، حال آنکہ افتخار محل کو صرف ۲۶۰ روپے دیتے تھے۔ مبارک محل سے ان کے دو بیٹے ہوئے۔ ذوالفقار بہادر عرف نواب بہادر سب سے بڑا بیٹا اور سردار بہادر تیسرا سب سے چھوٹا بیٹا۔ منجھلا بیٹا شمشیر بہادر عرف امراؤ بہادر اور دو لڑکیاں صغرا بیگم اور وزیر بیگم، افتخار محل کے بطن سے تھیں۔ تیسری بیوی کا نام مختار محل تھا، یہ دراصل رقاصہ تھیں۔ اُن سے قیامِ اندور کے زمانے میں نکاح ہوا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

علی بہادر کی وفات کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ نواب کا تہائی وظیفہ اُن کے وارثوں میں تقسیم کردیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق تقسیم یوں ہوئی۔ مبارک محل ۲۰۰ روپیہ، افتخار محل ۱۰۰ روپیہ، مختار محل ۱۰۰ روپیہ، نواب بہادر (عمر ۱۹ برس) ۴۰۰ روپیہ، دوسرے دونوں بیٹوں کو سو سو روپے۔ امراؤ بہادر اٹھارہ برس کا تھا اور سردار بہادر گیارہ برس کا، شمشیر بہادر (امراؤ بہادر) شعر بھی کہتے تھے۔ دلیر تخلّص تھا۔ منیر شکوہ آبادی اور جلال لکھنوی کے شاگرد تھے، دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

نواب علی بہادر نے اپنی زندگی میں صغرا بیگم اور وزیر بیگم کی شادی کے لیے حکومت سے درخواست کی تھی اور کہا تھا کہ میری حیثیت اور خاندان کی پرانی روایات کے مدِّ نظر اِن تقریبوں پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ آئے گا۔ وہاں سے جواب ملا کہ دونوں شادیوں کے لیے پانچ پانچ ہزار دیا جائے گا۔ ابھی اُن کے نکاح ہونے بھی نہیں پائے تھے کہ علی بہادر چل بسے۔ ان کی شادی بعد کو ہوئی۔ ان کا نکاح نواب کدورد (باونی) کے خاندان میں خواجہ سعد الدّین خان کے دو بیٹوں سے ۱۸۷۴ء میں ہوا۔

جب نواب کے انتقال کے بعد ان کے وارثوں کو ایک ہزار روپیہ بشرح صدر دینے کا فیصلہ کیا گیا، تو دونوں بہنوں نے بھی اپنے حصّے کا مطالبہ کیا۔ لیکن ان کی درخواست دو سبب سے رد کردی گئی۔ اوّل یہ کہ وہ ایک دوسرے خاندان میں منتقل ہو چکی ہیں، دوسرے یہ کہ اُن کی شادی کے لیے دس ہزار کی ''گراں قدر'' رقم پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ اس لیے جائز طور پر اُنھیں اب امداد نہیں دی جاسکتی۔

نواب علی بہادر حافظِ قرآن تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، علی تخلص تھا۔ ابتداً عبّاس بیگ عبّاس بریلویؒ سے مشورہ رہا۔ عبّاس بعد کو جب آتش کے شاگرد ہوگئے، تو استاد نے ان کا تخلّص بدل کر نادر کردیا تھا۔ وہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں باندہ میں تھے۔ بعد کو گرفتار ہوئے اور پھانسی پائی۔

اس کے بعد معلوم ہوتا ہے علی نے غالب سے مشورہ کیا۔ غالب نے جس خط میں ان کے کلام پر اصلاح دینے کا ذکر کیا ہے، افسوس کہ اس پر تاریخ نہیں چھپی ہے، چنانچہ معلوم نہیں ہوتا کہ علی کی غالب سے اصلاح کا کیا زمانہ ہے لیکن اس خط ہی سے ظاہر ہے کہ یہ علی کی ابتدائے مشق کا دور ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

> اوراقِ اشعار را کہ گویی فرۂ فہرستِ گنج خانۂ معنی بود، نورد از ہم کشودم وہر دو مخمّس و مسدّس و غزلیات را فروخواندم۔ زہے لطفِ طبع و حدّتِ ذہن و سلامتِ فکر وحسنِ بیان۔ ہرگاہ در آغاز چنیں بودہ اند، بشرطِ دوام و ورزش و التزامِ مشق، حقا کہ در اندک مایہ مدّت علم یکتائی خواہند افراشت فرمان بجاں آوردم وآں شاہد انِ معنوی را بحک و اصلاح آرائش کردم …

افسوس کہ علی کا زیادہ کلام نہیں ملا۔ یا تو شائع نہیں ہوا یا میری نظر سے نہیں گزرا۔ نادر نے اُنھیں صاحب دیوان لکھا ہے۔ صرف ان کی مثنوی ''مہر و ماہ'' دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ چھپ چکی ہے (مطبع محمدی، ۱۲۹۷ء)، اُسی کے چند اقتباسات اور غزلیات کے چند شعر آخر میں نمونے کے طور پر دیے گئے ہیں۔

علی نے غالب کے بعد منشی سیّد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے بھی اصلاح لی تھی۔ نمونۂ کلام میں پہلے مثنوی مہر و ماہ کے چند اقتباسات دیکھیے، صبح کا بیان ہے:

صبح کے جب عیاں ہوے آثار
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی اک بار
ہر طرف نور کا ہُوا عالم
لگی دھونے گلوں کا منھ شبنم
ہُوا بے نور آسماں پہ قمر
ہر طرف بولتے تھے مرغِ سحر
دل کو پروانوں کے بھی یاس ہوئی
روشنی شمع کی اُداس ہوئی
تھا اذاں کا کسی طرف کو غل
کوئی پیتا تھا اٹھ کے ساغرِ مُل
جاگ کر کوئی آنکھ مَلتا تھا
گھر سے بن کر کوئی نکلتا تھا
کوئی سوتا تھا، کوئی سُبحہ بدست
بھیرویں اُڑ رہی تھی ایک طرف
کوئی محوِ نماز تھا اس آن
کوئی پڑھتا تھا اک طرف قرآن
چرخ پر ڈوبنا ستاروں کا
باغ میں زمزمہ ہزاروں کا
وہ درختوں پہ طائروں کی دھوم
شاخِ گل پر وہ بلبلوں کا ہجوم

یار کے ساتھ کوئی سوتا تھا
غمِ ہجراں سے کوئی روتا تھا
وہ کرن آفتابِ تاباں کی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا گلستاں کی

ہیروئن کی ہجرِ یار میں کیفیت بیان کرتے ہیں:

کوششیں گرچہ سب نے کیں صدہا
شاہزادی کا بڑھ گیا سودا
ہوئے عاجز طبیب بھی یکسر
عاملوں کا چلا نہ کوئی ہنر
زلفیں سنبل نمط پریشاں تھیں
آنکھیں نرگس کی طرح حیراں تھیں
آئنہ دیکھنے سے سکتہ تھا
کنگھی سے دل الجھتا تھا اس کا
آنکھیں سرمے سے وہ چُراتی تھی
پان کو بھی نہ منھ لگاتی تھی
گہنے کو طوق اور رسن سمجھے
اچھی پوشاک کو کفن سمجھے

ہیرو، شاہزادی (ہیروئن) کے والد (شہنشاہِ چین) کی خدمت میں لکھتا ہے:

بعدِ حمدِ خدا و نعتِ نبی
بعدِ شرحِ مراسمِ عُرفی
اس کی خدمت میں یہ گزارش ہے
جس کے ابرِ کرم کی بارش ہے

شاہِ انجم سپاہِ عرش سریر
خسروِ تاج بخش عالمگیر
عقلِ اوّل، سکندرِ ثانی
شاہِ شاہان و ظلِّ سبحانی
آسماں تخت و آفتاب کلاہ
یعنی خاقانِ چین و شاہنشاہ
خلد اللہ مُلکہٗ کہہ کر
عرض کرتا ہے بندۂ احقر
ہے جو حضرت کا شہرۂ اخلاق
بادشاہانِ عصر ہیں مشتاق
اِسی صورت یہ مبتلائے بلا
کر کے ترک اپنا مسکن و ماوا
لے کے کچھ احتیاج آیا ہے
چھوڑ کر تخت و تاج آیا ہے
ظاہرا گو کہ بے حقیقت ہوں
پر میں نقشِ نگینِ دولت ہوں
ہو اگر حکمِ حضرتِ سلطاں
چوم لوں آ کے گوشۂ داماں
طوقِ درگاہ بے ہراس کروں
مطلبِ دل کی التماس کروں
اخترِ دولتِ شہِ شاہاں
اے خدا، حشر تک رہے تاباں

پڑھیں حضرت، حقیر کی عرضی
ہے یہ مہرِ منیر کی عرضی

ان اقتباسات سے واضح ہو گیا کہ اگرچہ اس مثنوی کو اُردو کی مشہور اور صفِ اول کی مثنویوں کے ساتھ تو نہیں رکھ سکتے، لیکن شاعر کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ قابلِ قدر ضرور ہے۔ اس کی زبان بہت پختہ ہے، حشو و زوائد سے بالکل پاک ہے، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خاص طور پر ایجاز و اختصار کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مطلب بیان کردے۔ اور اس میں شبہہ نہیں کہ وہ اِس میں کامیاب رہا ہے۔

آخر میں غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

خیالِ زلف میں ہے رنجِ بے حساب میں روح
بلا میں ہے دلِ آشفتہ، پیچ و تاب میں روح

☆

ہمیں سمجھتے ہیں اس رنگِ سرُخ کی تہہ کو
عتاب چہرے سے ظاہر ہے، پیار ہے دل میں
بغیر ابر کے برسے نہ جائے گی گرمی
رُلاؤ شوق سے مجھ کو، بخار ہے دل میں

☆

قلق نہیں، جو غمِ بے شمار دل میں ہے
ہزار بھیڑ ہو، پرجائے یار دل میں ہے
کدورت آئنۂ صاف کی چھپے کیوں کر
عیاں ہے منہ سے صفائی، غبار دل میں ہے
ہمیشہ اس کی زیارت کو آتی ہے حسرت
کسی شہیدِ جفا کا مزار دل میں ہے

مزاجِ پاک مکدر نہ ہو، میں ڈرتا ہوں
نکھر کے آپ نہ آئیں، غبار دل میں ہے
علی! بھرا ہے یہ عطرِ بہشت شیشے میں
تصورِ عرقِ رُوئے یار دل میں ہے

[آج کل (ماہنامہ دلّی) فروری ۱۹۵۸: ۳۳۔ ۳۷، ایضاً مئی ۱۹۵۹ء: ۳۔ ۷، خم خانہ جاوید، ۳: ۲۰۱۔ ۲۰۳، تذکرۂ نادر: ۱۱۴، تاریخ بوندیل کھنڈ، ۲: ۸۴۔ ۸۵ نیز ۴: ۶۱۔ ۶۵]

حواشی

☆۔ مستانی کی شیشے پر بنی ہوئی ایک تصویر پونے کے راجا کیلکر میوزیم کی پہلی منزل (مستانی محل) میں موجود ہے۔

غفور ... عبدالغفار خان

جنوری ۱۸۹۲ء کے شمارۂ ''پیامِ یار'' میں یہ اندراج ملتا ہے:

''جناب عبدالغفار خان صاحب غفور از جلیسر شاگردِ جنابِ غالب''

ادا سے قتل کر کے لاش کو عاشق کی ٹھکرایا
ملا کر خاک میں بولے کہ کچھ حسرت نہیں نکلی

[پیامِ یار، جنوری ۱۸۹۲ء: ۱۳]

فتنہ...بی شاماں جان

''بی شاماں جان طوائف ساکنۂ کلکتہ متخلص بہ فتنہ خوشہ چینِ خرمنِ غالب''

الجھن میں دل کو ڈال دیا ہے دکھا کے ہاتھ
زلفِ سیاہِ یار کے ہیں کس بلا کے ہاتھ

ہے ایسی موجِ اشکِ ندامت بڑھی چڑھی
افسردہ دل ہیں آتشِ رنگِ حنا کے ہاتھ

ہاتھ آگیا مگر کسی پہلو سے نقدِ دل
پھولے نہیں سماتے ہیں دُزدِ حنا کے ہاتھ

بے چینیوں سے ہو ابھی پامال دل مرا
دکھلائے گر وہ فتنۂ محشر ادا کے ہاتھ

[گل دستۂ نتیجۂ سخن، کلکتہ اپریل ۱۸۵۵ء بحوالہ دو ماہی ''اکادمی''،
لکھنؤ، ۲: ۱۰: ۴۹]

فداو جمالی... سیّد احمد حسن سہسوانی ثم بڑودوی

ان کا اصلی وطن سہسوان تھا، جہاں کے وہ عمائد میں سے تھے۔ سیّد احمد حسن حسینی سادات میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت خواجہ قطب الدّین مودود چشتی اور امام علی نقی کے واسطے سے شہیدِ کربلا حضرت امام حسین تک پہنچتا ہے۔ اُن کے بزرگوں میں خواجہ سیّد محمدؐ خطیر، سلطان غیاث الدّین بلبنؔ کے ولی عہد شاہزادہ محمدؐ کے اتالیق اور معتمدِ خاص تھے۔ جب شاہزادہ محمدؐ، ملتان (پنجاب۔ پاکستان) میں مقیم تھا، سیّد محمدؐ خطیر ہی اس کی جاگیر کے منتظم تھے۔ امیر خسرو بھی اُسی زمانے میں شاہزادے کے ندیم اور مصاحب تھے۔ تاتاری حملے میں شاہزادہ موصوف ملتان ہی میں ہلاک ہو گیا تھا، امیر خسرو نے اس کا دردناک مرثیہ لکھا ہے:

شاہزادے کے حینِ حیات سیّد محمدؐ خطیر نے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائی میں ایسی دیانت اور فرض شناسی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس سانحے کے بعد غیاث الدّین بلبن نے اُنھیں اپنا وزیر مقرر کردیا، بلکہ سیّد صاحب کی درخواست اور سفارش پر سلطان نے مرحوم شاہزادے کی جگہ اُسی کے بیٹے کے خسرو کو اپنا ولی عہد بھی مقرر کردیا لیکن بلبن کی وفات کے بعد امرائے مملکت نے اِس تقرر کو نظر انداز کردیا اور معز الدّین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔ قدرتاً اِس کے بعد خود سیّد محمدؐ خطیر بھی معتوب قرار پائے اور اُن کے دارالخلافہ میں داخلے پر پابندی عائد کردی گئی۔ یہ حکم بہت دن بعد کہیں جلال الدّین خلجی کے عہد میں منسوخ ہوا، جلال الدّین نے بھی اُنھیں خلعتِ وزارت عطا کیا تھا۔ (تاریخِ فرشتہ۔ مقالہ دوم)۔

اُنھیں سیّد محمدؐ خطیر کی ساتویں پشت میں قاضی محمدؐ اسمٰعیل بعہدِ سکندر لودی سہسوان کے قاضی مقرّر ہوئے۔ اُنھیں مرتبہ، منصب، جاگیر اور معافیات موروثی (۸۴ گانو) کے حقوق بھی عطا ہوئے۔ اس پر خاندان نے سہسوان کی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ شاہی فرامین آج بھی اُن کے خاندان میں موجود ہیں۔ قاضی محمدؐ اسمٰعیل کے صاحب زادے قاضی عبدالشکور اپنے والد کے خلفِ رشید ثابت ہوئے۔ تیس سال قضائت کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۰ محرم ۹۴۷ھ (۱۷ مئی ۱۵۴۰ء) کو بعض مخالفوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ (بے شبہہ شہید شد = ۹۴۷) ان کے پانچ صاحب زادے تھے۔ سب سے بڑے قاضی محمدؐ صالح تھے۔ پھر مفتی محمدؐ فاضل، خواجہ صدر الدّین محمدؐ حاکم الملقب بہ شاہ ولایت بندگی، اور مولانا محمدؐ قاسم، سب سے چھوٹے کا نام محمدؐ ہاشم تھا۔ پانچوں کی نسل اُنھیں کے نام کی نسبت سے صالحی، فاضلی، حاکمی، قاسمی، ہاشمی ہاشمی کہلائی۔

سیّد احمد حسن صالحی شاخ کے نام لیوا تھے۔ وہ قاضی محمدؐ عبدالشکور شہید سے آٹھویں پشت میں تھے۔ ان کے والد محمد حسن صالحی (بن قاضی فضل امام بن احسن اللہ بن فیض اللہ بن سلطان اللہ بن نصر اللہ بن محمدؐ صالح بن قاضی محمدؐ عبدالشکور شہید) تھے۔ احمد حسن نے تعلیم اپنے وطن سہسوان میں پائی تھی۔ لیکن وہ اس پر قانع نہ رہ سکے، تکمیل کے لیے دلّی پہنچے، جو اس زمانے میں گویا علوم و فنون کے اساتذۂ باکمال کا مرکز تھی۔ وہ قیامِ سہسوان کے زمانے ہی میں شعر بھی کہنے لگے تھے۔ اصلی تخلّص تو فدا تھا، لیکن کبھی کبھی اپنے پیر و مرشد حضرت سیّد جمال الدّین حسین خان (ف: ۳ رمضان ۱۲۷۷ھ) کی نسبت سے جمالی تخلّص بھی کر لیتے تھے۔ لیکن ایسا کلام جس میں تخلّص جمالی ہے، بہت کم ہے، بالعموم فدا ہی ملتا ہے۔ بہرحال جب وہ دلّی آئے تو یہاں وہ میرزا اسد اللہ خان غالب کی خدمت میں حاضر ہوے اور اُن سے مشورہ کرنے لگے۔ فدا کو فارسی نظم و نثر سے بھی خاصی مزاولت تھی اور دراصل یہی شوق اُنھیں غالب کی خدمت میں لے گیا۔ اگرچہ اُنھوں نے بالخصوص اپنے کلامِ فارسی پر غالب سے اصلاح

لی لیکن اردو میں بھی یہ مشورہ رہا۔

دلّی سے وطن واپس چلے جانے کے بعد اُن کی استاد سے خط و کتابت رہی۔ ان کے نام چند خطوط اُردوئے معلیٰ میں شامل ہیں۔

اُن کے خاندان کے بعض اصحاب کا تعلق ریاست بڑودہ سے تھا۔ اُنھیں کی ترغیب پر احمد حسن فدا نے بھی بڑودہ کی راہ لی۔ یہاں اُنھوں نے اُس زمانے کے نام ور ماہر حکیم ہاشم علی خان موہانی (ف: ۱۲۸۳ھ) سے طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور تکمیل کے بعد بڑودہ ہی میں اپنا مطب قائم کرلیا۔ چوں کہ کئی اعزہ پہلے سے اسی ریاست میں ملازم تھے، اُن کی سفارش پر اُنھیں ریاست کے بعض عمائد کی سرپرستی حاصل ہوگئی اور یوں باعزت اور باوقار زندگی بسر کرنے کے وسائل پیدا ہوگئے۔ اب اُنھوں نے اپنے بیشتر اہلِ خاندان کو بھی بڑودہ بلا لیا اور ریاست میں مختلف عہدوں پر تقرری میں اُن کی مدد کی۔

فدا بڑے سیر چشم اور مہماں نواز تھے۔ چوں کہ روزگار کے پہلو سے کوئی تشویش نہیں تھی، بلکہ سچ یہ ہے کہ اُن کی آمدنی اُن کی ضرورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی، اس لیے وہ نہ صرف اپنے اقربا اور خاندان کی مدد کرتے، بلکہ دوسرے اربابِ فضل و کمال، شعرا و ادبا بھی اُن کے خوانِ نعمت سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہے۔ وہ دامے، درمے، قدمے ہر ایک کی خدمت کرتے اور اُن کی حاجت روائی میں ہمیشہ مسرّت محسوس کرتے اور یہ کچھ مقامی حضرات ہی پر موقوف نہیں تھا، بلکہ باہر سے بھی کوئی صاحب علم واردِ بڑودہ ہوتا تو وہ بے تکلف اُن کا مہمان ہو جاتا اور جتنے دن چاہتا، اُن کے ہاں مقیم رہتا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

اُس زمانے میں حج پر جانے والے بالعموم سورت سے جہاز پر سوار ہوتے اور سورت تک کا سفر منزل بمنزل خشکی سے طے کرتے تھے۔ بڑودہ رستے میں پڑتا تھا۔ یہ مسافرینِ حج سستانے کو چندے یہاں ٹھہرتے اور تازہ دم ہو کر آگے روانہ ہوجاتے۔

غالب کے ایک دوسرے شاگرد سیّد احمد حسن عرشی قنوجی بھی تھے۔ یہ والا جاہ امیر الملک سیّد صدّیق حسن خان بہادر (بھوپال) کے بڑے بھائی تھے۔ عرشی نے ۱۸۶۰ء میں حج کا عزم کیا۔ وہ بھی اثنائے سفر میں بڑودہ میں رُکے اور یہاں اپنے ایک ہم وطن مولانا غلام حسین قنوجی کے مہمان ہوئے۔ بدقسمتی سے وہ یہاں پہنچ کر بیمار ہوگئے۔ خارش کی کچھ شکایت دورانِ سفر میں پیدا ہو چکی تھی۔ قیامِ بڑودہ کے زمانے میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی اور اس پر مزید تپ اور اسہال کی موذی بیماریاں بھی لاحق ہوگئیں۔ علاج میں کوئی فروگزاشت نہیں ہوئی۔ سیّد احمد حسن فدا اِن کے معالج تھے۔ وہ خود بھی اچھے طبیب تھے، تاہم اُنھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی اور اپنے استاد حکیم ہاشم علی خان سے بھی اُن کے علاج میں استمداد کی۔ لیکن عرشی کا وقتِ اخیر آ چکا تھا۔ بیس دن بعد وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ (۹ جمادی الاول ۱۲۷۷ھ) وہیں تکیۂ ماتریہ کے قبرستان میں دفن ہوئے، جہاں سیّد یحییٰ ترمذی کا مزار ہے۔

سیّد احمد حسن فدا نے جس دل سوزی اور محبت اور توجہ سے عرشی کا علاج کیا تھا اور اُن کے بڑودہ کے قیام کے زمانے میں اُن کی خدمت کی تھی، اِس کی اطلاع جب نواب والا جاہ کو بھوپال پہنچی تو اُنھوں نے شکریے کا اظہار کیا، اپنی متعدد کتابیں اُنھیں تحفے میں بھیجیں اور جب اتحاف النبلاء میں اپنے مرحوم بھائی کے حالات لکھے، تو وہاں سیّد احمد حسن کا بھی خاص طور پر ذکر کیا۔

سیّد احمد حسن کا بعمر ۶۵ سال ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۴ء) میں انتقال ہوا۔ اُن کے بیٹے سیّد محمود حسن افسر نے تاریخ کہی:

از مرگِ پدر یتیم گشتم، صد حیف!
بد صاحب دین و اعتقادِ صادق
افسر تاریخ فوت در معجمہ گفت
اے سوے اِرم رفتہ حکیم حاذق
(۱۳۱۰ھ)

اور استاد داغ نے کہا:

حکیم و طبیب و سخن آفریں
عدم کو گیا، تھا جو اصلی وطن
سرِ آہ سے داغ! تاریخ لکھ
"بنی تربتِ سیّد احمد حسن"

(۱+ ۱۳۰۹=۱۳۱۰)

گمان بدرجۂ یقین ہے کہ وہ تکیۂ ماتریہ، بڑودہ کے قبرستان ہی میں دفن ہوے تھے، لیکن مُرورِ زمانہ کے باعث قبر کا نشان مٹ گیا ہے۔ اِنا للہ واِنا اِلیہِ راجعُون۔

غالب نے اپنے سفرِ کلکتہ کے دوران میں کچھ دن بنارس میں قیام کیا تھا۔ وہ وہاں کے نظاروں سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے بنارس کی تعریف میں ایک مثنوی "چراغِ دیر" کے عنوان سے لکھی۔ فارسی شاعری کے وسیع دامن میں اس پائے کی بہت کم نظمیں ہوں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ بنارس کے دوران میں، وہ وہاں کے کسی "قیامت قامت" اور "مژگان دراز" سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہاں کے جانے کے بعد بھی وہ اُسے نہیں بھول سکے۔

ایک مقطعے میں کہتے ہیں:

کاش، کاں بُتِ کاشی در پذیردم، غالب!
بندۂ توام، گویم، گویدم ز ناز: آرے

فدا نے بھی بنارس کا سفر کیا تھا، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد کی سنّت پر عمل کرتے ہوئے اپنا نقدِ دل و جان وہاں کسی بُت کی بھینٹ چڑھا آئے تھے۔ شعر کہا ہے:

دکھائیں جا کے بتانِ دکن کو اب کیا منھ!
جو نقدِ دل تھا فدا، لٹ گیا بنارس میں

یہ پوری غزل دلی واردات اور ذاتی تجربات کی آئینہ دار ہیں۔ دیکھیے:

یہاں ہیں لینے کی دل کے نئی نئی رسمیں
مسافر آئے نہ، یارب! کوئی بنارس میں
وہ قوسِ ابرو و تیرِ نگہ سے کہتے ہیں
کسی کا دل نہ الٰہی! کسی کے ہو بس میں
ندیم! بوسہ پیاپے نہ لیجیے کیوں کر
کہ جوش شوق کا ہوتا ہے اُن کی نس نس میں
اثر جو خاکِ درِ دل ربا میں پایا ہے
وہ بات پائی ہے اکسیر میں، نہ پارس میں
ثنائے ابرو و مژگانِ یار کیا کیجیے!
زیادہ تیر و کماں سے ہے زور میں، کس میں
وہ یاد آتا ہے، اس کا بچشمِ نم کہنا
''سفر سے جلد پھر آنے کی کھائیے قسمیں''
دکھائیں جا کے بتانِ دکن کو اب کیا منھ
جو نقدِ دل تھا، فدا! لٹ گیا بنارس میں

۱۲۹۷ھ (نومبر۔ ۱۸۸۰ء) میں حجِ بیت اللہ کا فریضہ ادا کیا، تو اس کی تاریخ کہی:

عزمِ حج بادلِ مشغول مبارک باشد
فوزِ سرمایۂ مامول مبارک باشد
اے فدا! کن رقم ازروی وقوفِ عرفاں
''حجِ اکبر شدہ مقبول، مبارک باشد''
(۶+۱۲۹۱=۱۲۹۷ھ)

۱۹۲۷ء میں بڑودہ میں بڑا ہول ناک سیلاب آیا تھا، جس نے شہر میں بہت

مکانوں کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ اسی میں اُن کا قدیم سکونتی مکان بھی بیٹھ گیا۔ اِس حادثے میں قیمتی اثاث البیت کے ساتھ پہلا دیوان بھی دریا بُرد ہوگیا۔ اِس کے بعد وہ کلام جو اُن کی بیاضوں اور مختلف پرانے رسائل سے جمع ہو سکا۔ اسے اُن کے پرپوتے سیّد واجد حسین صاحب نے شائع کردیا ہے (عثمانی پریس، مدراس: ۱۹۷۹ء)

ان کے بڑے صاحب زادے سیّد محمود حسین تھے۔ وہ بروز بدھ ۱۴ محرم ۱۲۹۱ھ (۳ مارچ ۱۸۷۴ء) صبح صادق کے وقت بڑودہ میں پیدا ہوئے۔ فدا نے بیٹے کے تین تین تاریخی نام رکھے: اصغر، ظہور علی مودودی، سیّد اظہار علی (ان میں سے ہر ایک سے ۱۲۹۱ برآمد ہوتے ہیں) گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا اور خاندان کی روایت بھی علمی تھی، عربی اور فارسی اور اُردو کے علاوہ گجراتی میں بھی بہت اچھی دست گاہ حاصل کی۔ ہر طرح سے فارغ ہو کر طب کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر اپنے والد کی طرح اسے بطور پیشہ اختیار کیا اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

شعر گوئی کا شوق بھی ورثے میں پایا تھا۔ اوّلاً اپنے طور پر چند غزلیں ضامن علی جلال لکھنوی (ف: ستمبر ۱۹۰۹ء) کو دکھائیں۔ لیکن جب "دا" کو اُن کے اس رجحان کا علم ہوا، تو انھوں نے میر ذاکر حسین یاس لکھنوی (والد سیّد انور حسین آرزو لکھنوی) سے مشورہ کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ اُس کے بعد یاس کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئے۔

افسر کی بدولت بڑودے میں اردو کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مقامی شعرا کی کثیر تعداد نے اُن سے اصلاح لی اور تکمیل کے بعد خود دنیائے ادب میں نام پیدا کیا۔ اپنی کہنہ مشقی اور مہارتِ علم و فن کے باعث اُنھیں شہر کے اکثر مشاعروں کی صدارت کے فرائض سرانجام دینا پڑتے تھے۔ ۴ دسمبر ۱۹۴۸ء کو بڑودہ میں ایک مشاعرے کی صدارت کی۔ مصرع طرح تھا:

اُٹھ، رہروِ خوابیدہ! ہنگامِ سحر آیا

پیرانہ سالی، صوفیانہ مزاج اور مذہبی افتاد، اس پر طرح اتنی معنی خیز۔ انھوں

نے بڑی دردناک غزل کہی۔ اس کے بعد متواتر مضمحل اور اداس رہنے لگے، جیسے واقعی (ہنگامِ سحر) کا احساس تیز تر ہو گیا ہو۔ مشاعرے سے بارہ دن بعد ۱۶ دسمبر کو اچانک فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ہفتہ بھر بسترِ علالت پر رہ کر جمعہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۸ء (۲۲صفر ۱۳۶۸ھ) صبح کے وقت داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کے شاگرد عثمان خان عاشق القادری بڑودی نے ہجری میں صوری تاریخ کہی:

تیرہ سو اڑسٹھ، صفر بائیسویں اور جمعے کو
حضرتِ افسر نے، اے عاشقؔ، عدم کی راہ لی
فاتحہ پڑھنے کو جب شہرِ خموشاں میں گئے
بولا ہاتف: دیکھ لو، ہے تربتِ افسر یہی

اُنھیں نے دوسری عیسوی تاریخ صنعتِ توشیح میں کہی:

غم تو یہ ہے کہ شاعرِ معجزبیاں گیا
ظاہر ہے سب پہ، ہند کا شیریں زباں گیا
مجھ کو ہے یہ ملال کہ افسر سا نام ور
حاجی، حکیم و حافظ و قرآن خواں گیا

قبرستان ماتریہ، بڑودہ ہی میں اپنے والدِ ماجد کے جوار میں سپرد خاک ہوئے۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔ دیوان چھپ گیا ہے۔ (مدراس: ۱۹۸۳ء)

آخر میں فدا کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

ہوش اڑے، کالے ڈسے، خنجر پھرے بس دیکھ کر
چشمِ میگوں، زلفِ پیچاں، ابروئے خم دار آج

☆

چھپائے سے نہیں چھپتی محبت
جو ہو دل میں، وہ آتا ہے زباں پر

☆

ہنس کر، نہیں، کہنا، نہیں انکار کا انداز
سچ یہ ہے کہ ہے صاف یہ اقرار کا انداز
مُردوں کو جلائے وہ، یہ زندوں کو کرے قتل
گفتار کا وہ ڈھنگ، یہ رفتار کا انداز
شیدا ہے کوئی رُخ پہ، کوئی شیفتۂ زلف
یکساں ہے یہاں کافر و دیں دار کا انداز
بیداریِ شب آپ کی آنکھوں سے عیاں ہے
چھپتا ہے کہیں دیدۂ بیدار کا انداز

☆

نہ وہ ادا، نہ وہ غمزہ، نہ وہ کرشمہ ہے
نظر وہ کیا ہوئی اور وہ کہاں گیا اخلاص

☆

توسنِ عمرِ رواں گو کس قدر چالاک ہے
پر نہ اس سے بھی ہوا طے یہ بیابانِ فراق
آہِ سرد و اشکِ گرم و رنگِ زرد و چشمِ تر
رفتہ رفتہ کیا بہم پہنچے ہیں سامانِ فراق

☆

دشت گردی، چاک دامانی و ترکِ نام و ننگ
کام وہ ہم سے ہوے ہیں، جو کہ تھے شایانِ عشق

☆

عشق ہے جس کا دل گداز نہیں
درِ عرفاں بھی اس پہ باز نہیں

☆

فدا چشمِ بصیرت ہو تو دیکھو ہر جگہ اس کو
کہاں کا لائے ہو جھگڑا، یہ مسجد ہے، یہ بت خانہ

☆

ہمیں دونوں جہاں میں ایک خواہش ہے، فقط تیری
نہ غم دوزخ کا رکھتے ہیں، نہ ہم کو شوقِ جنت ہے
نہ نکلے فرق اصل و نقل کا اس میں، یہ کیا ممکن
یہاں جنت کا سنتے ہیں، ترے گھر کی سی صورت ہے

(مقدمۂ دیوانِ فدا، حیواۃ العلما، ۷۱، خزینۃ الانساب)

فدا... صاحب زادۂ فدا علی خان بہادر رامپوری

یہ رام پور کے حکمران خاندان کے فرد تھے۔ اُن کے والد نواب محمدؐ کاظم علی خان بہادر والی رام پور جنت آرام گاہ نواب محمد سعید خان (۲۰ اگست ۱۸۴۰ء، یکم اپریل ۱۸۵۵ء) کے چھوٹے صاحب زادے تھے، گویا فدا نواب فردوس مکان محمدؐ یوسف علی خان بہادر ناظم کے بھتیجے ہوے۔ انھوں نے شاعری گویا ورثے میں پائی، کیوں کہ ان کے والد محمد کاظم علی خان بھی شعر کہتے تھے اور سروری تخلص کرتے تھے۔ فدا نے شروع میں چندے نواب مرزا خاں☆ داغ سے اصلاح لی۔ پھر غالب سے فیض یاب ہوئے۔ اُن کے صرف تین شعر ملے۔ دو ایک قصیدے کے جو نواب کلبِ علی خان کی مدح میں کہا گیا تھا اور ایک غزل کا۔

تازگی ہے یہ ہوا میں کہ برنگِ تنبول
سبز ہو جائے جو گلشن میں گرے دانۂ بیل
شرف افزائے جہاں، صاحبِ تخت و اکلیل
حکم کی جس کے فلک کو بھی ہے واجب تعمیل

☆

یاد آتی ہے جب کاوشِ مژگاں مرے دل کو
دیتا ہے تسلّی ترا پیکاں مرے دل کو

(انتخابِ یادگار (۲) ص ۲۸۲)

حواشی

☆۔ داغ: نواب مرزا خان نام، نواب شمس الدین احمد خان لوہارو کے بیٹے تھے۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ (۲۵ مئی ۱۸۳۱ء) کو محلہ گلی ماران میں پیدا ہوئے۔ جب اُن کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم نے مرزا فخرو سے نکاح کرلیا اور نواب شوکت محل خطاب پایا تو یہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ قلعۂ معلّٰی میں آگئے۔ یہاں مرزا فخرو کے تعلق سے اُنھیں جملہ علوم وفنون بہترین اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ جب شاعری کا شوق ہوا تو غالبًا پہلے عارف سے اصلاح لی۔ بعد کو ذوق کے شاگرد ہوئے۔ غدر کے بعد اپنی خالہ عمدہ خانم کے پاس رام پور چلے گئے اور نواب خلد آشیاں کی زندگی بھر یہاں سے نہیں نکلے۔ جب وہ فوت ہوگئے تو یہ ۱۸۸۶ء میں دلّی آئے۔ پھر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۷ اپریل ۱۸۸۸ء کو حیدرآباد پہنچے۔ قسمت یاور تھی ساڑھے تین برس کی امیدواری کے بعد فروری ۱۸۹۱ء میں نواب محبوب علی خان بہادر آصف جاہ ششم نے نوازش کی اور اوّل روزِ ورودِ حیدرآباد سے چار سو روپیہ مشاہرہ مقرر کردیا۔ جو اضافے کے بعد ایک ہزار تک پہنچا۔ نظامِ دکن شاگرد ہوئے اور صلہ وستایش کی کمی نہ رہی۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں ''بلبلِ ہندوستان'' جہان استاد، دبیر الدولہ، فصیح الملک بہادر داغ دہلوی ناظم جنگ'' خطاب عطا ہوا۔ وہیں حیدرآباد میں ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء (۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) کو بعارضۂ فالج وفات پائی۔ یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے، اُن کے نام نواب مرزا خان داغ ہی سے تاریخ نکلتی ہے۔ چار دیوان اور ایک مثنوی ''فریادِ داغ'' یادگار ہیں۔ لے پالک بیٹا مرزا احمد صغرسنی ہی میں داغ دے گیا، تو پھر ایک لڑکی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا۔ داغ کی بیوی کی تین بہنیں تھیں فاطمہ بیگم، داغ کی بیوی (ف: ۱۸۹۷ء/ رجب ۱۳۱۶ھ)، دوسری اولیا بیگم یہ میرٹھ میں عبدالقدوس صاحب سے بیاہی گئیں۔ ان کے بطن سے کلثوم بیگم پیدا ہوئیں، جن کا عقد بھی وہیں میرٹھ کے ایک مختار (وکیل) میر تصدق علی سے ہوا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں، صغرا بیگم، اور لاڈلی بیگم، یہی لاڈلی بیگم داغ کی لے پالک بیٹی تھیں۔ جو اپنے پہلے شوہر بہاء الدین احمد خان آہ کے انتقال کے بعد ان کے بھائی نواب سائل دہلوی کے عقد میں آئیں۔ تیسری بہن عزیز النسا بیگم تھیں جن کا نکاح ایک نومسلم انگریز محمدؐ جان سے ہوا۔ (جان نل اصلی نام تھا) لاڈلی بیگم کا بدھ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۳ء بعمر ۹۳ برس لاہور میں انتقال ہوا۔

(خم خانۂ جاوید، ۳: ۱۰۴۔ ۱۳۶، داغ)

فسوں... میر فسوں، فرّخ آبادی

ان کا نام معلوم نہیں ہوسکا، لیکن غالباً مجذوب تھے اور مستان شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ غالب کے دوسرے شاگرد صوفی منیری نے اپنی کتاب، راحتِ روح، میں استطراداً اُن کا ذکر کیا ہے اور یہ شعر اُن کے نام سے لکھا ہے:

اشک اُلٹے جو بہے، دل کو ڈوبا کر چھوڑا
آہ کے تیر جو پلٹے، تو جگر پر بیٹھے
(راحتِ روح: ٦٧)

فراق (رشکی)... قاضی محمد عنایت حسین بدایونی

صدّیقی شیخ تھے۔ سلسلۂ نسب محمدؐ بن ابوبکر صدّیق (خلیفۂ اول) سے ملتا ہے۔ والد کا نام محمد نقی حمیدی تھا۔ ۱۵ شوال ۱۲۴۷ھ (۱۸ مارچ ۱۸۳۲ء) کو پیدا ہوئے۔ فارسی اپنے والد سے اور عربی اپنے نانا قاضی عبدالسّلام سے پڑھی۔ قاضی عبدالسّلام شعر بھی کہتے تھے، سلام تخلّص تھا۔ اردو، فارسی کی دیگر کتابوں کے علاوہ منظوم تفسیرِ قرآن اُردو میں ''زادالآخرت'' ان کی یادگار ہے۔ ۱۵ رجب ۱۲۸۹ھ (۱۸ ستمبر ۱۸۷۲ء) کو انتقال کیا۔

فراق پہلے سرکارِ انگریزی میں سر رشتہ دارِ عدالتِ بدایوں رہے۔ پھر نواب محمد علی خان رئیسِ ٹونک کی مصاحبت اختیار کی۔ جب دسمبر ۱۸۶۷ء میں انگریزی حکومت نے ٹھاکرانِ لاوا کے قتل کے جرم میں نواب صاحب موصوف کو معزول کر کے بنارس بھیج دیا تو رشکی نے بھی حقِ رفاقت ادا کیا۔ اُن کی وفات☆[1] کے بعد وکالت کرنے لگے اور اس سلسلے میں مختلف مقامات خورجہ، جودھ پور اور سب سے آخر حیدرآباد میں مقیم رہے۔ جب موسیٰ ندی میں طغیانی آئی (ستمبر ۱۹۰۸ء) اور اُن کا گھر نذرِ سیلاب ہوا، تو اِسی میں کلام بھی ضائع ہو گیا (تاریخ☆☆[2] طغیانی از اکبر: حیدرآباد دکن غرق شد'' اکبر نے کہا)۔ پہلے تخلّص رشکی تھا (تذکرۂ بہارِ بوستانِ شعرا: اشکی۔ یہ سہوِ کتابت ہے)۔ غالب کے بعد بدایوں کے مشہور شاعر سیّد مولوی دلدار علی مذاق (ف: ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ/ ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۴ء) سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ غالباً اُنھیں کے کہنے پر رشکی ترک کر کے فراق کرلیا۔ اُن کی جدّتِ ذہن اور مضمون آفرینی اور جملہ

فنونِ شاعری میں مہارت کا ذکر اُن کے معاصرین نے کیا ہے۔

سلسلۂ چشتیہ میں خواجہ اللہ بخش تونسوی (بنیرۂ خواجہ سلیمان تونسوی) سے بیعت تھے۔ طبیعت پر تصوّف کا غلبہ تھا۔ یہی کلام سے بھی ظاہر ہے۔ ۶ صفر ۱۳۳۷ھ (۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء) کو بدایوں میں انتقال ہوا۔

رشکی نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے صرف ایک بیٹی تھی۔ دوسری بیوی سے دو لڑکے ہوئے۔ عطا حسنین اور حبیب حسنین محمدؐ اکبر۔ ثانی الذکر کی اولاد آج کل محلۂ سوتھ بدایوں میں سکونت پذیر ہیں۔

دیوان غالباً شائع نہیں ہوا، بہرحال نظر سے نہیں گزرا۔ تذکروں سے یہ چند شعر ملے:

آئنہ دیکھا تو یہ حیرت ہوئی
آپ وہ محوِ تماشا ہوگیا
دیکھ کر اغیار کو، کی آنکھ بند
پردے پردے میں اشارا ہوگیا
دل میں رہتا ہے کسی بُت کا خیال
کعبۂ دل بھی کلیسا ہوگیا

☆

ہم گنہ گار ہیں، مانا، واعظ!
لطفِ داور نہیں دیکھا جاتا

☆

وقتِ آخر ہے، جو آنا ہو تو آؤ صاحب!
اب نہیں ہے ہمیں جینے کا بھروسا دم بھر

☆

مدینے میں نہیں جو دل، وہ کیا دل
مدینہ ہے چمن، دل ہیں عنادل

مٹے جو الفتِ خیرالوریٰ میں
ہمیں ایسا کہیں دے دے خدا دل

☆

دل دیا جان بھی دی، وصل کا سائل نہ ہوا
اور بھی آپ نے کچھ میری خطائیں دیکھیں؟

☆

وہ آئیں پس از مرگ اُمید کیا ہے؟
ہم اپنے نصیب آزمائے ہوئے ہیں

☆

یہ مانا، ہم نہ کریں شکوۂ ستم، لیکن
خدا کے سامنے ہونا کبھی حساب بھی ہے

☆

دیس کے گانے کی اس محفل میں لَے ہونے لگی
یاد ہم کو بھی وطن کی، پَے بہ پَے ہونے لگی

☆

روز گردش ہے نئی، جور کے انداز نئے
پیس ڈالے نہ یہ چرخِ ستم ایجاد مجھے
آگ سی آگ ہے، بے تاب ہوں، دیکھو خواجہ!
خاک کردے نہ کہیں، اب مری فریاد مجھے

☆

وہ آئیں بے بلائے میرے گھر یوں ہو تو بہتر ہے
ہماری آہ کا اُن پر اثر یوں ہو، تو بہتر ہے

کسی کی یاد دل میں ہو، کسی کا نام لب پر ہو
ترا رشکی! اگر آخر سفر یوں ہو، تو بہتر ہے

☆

پاؤں سے جاتے ہو کوئے یار میں
سر اُٹھا رکھا ہے کس دن کے لیے!

☆

تمھارا قامتِ موزوں ہے گویا مصرعِ اوّل
اور اس کا سایۂ دلچسپ ہے مصرع برابر کا
ملاؤ دل جو مجھ سے تم، تو مالا مال ہو جاؤں
تمھارا دل ہے پتھر کا، مگر پارس کے پتھر کا

☆

وہ ایک رات جلی، میں جلا کیا دن رات
کمال مجھ میں ہے یا شمعِ انجمن میں ہے!
کسی نے آنکھ سے دیکھا نہیں [لکھی] اے خضر!
سُنا ہے آبِ شفا یار کے دہن میں ہے

☆

قاصد! ذرا سنبھال کے تو دیجو اُن کو خط
سیماب وار دل مرا خط کی شکن میں ہے
مانا کہ مانی کھینچے گا تصویرِ یار کی
پر ہاں کلام ہم کو کمر اور دہن میں ہے
اُس کی زبان منھ میں جو لی ہے فراق نے
شیرینی اس سبب سے لب اس کے دہن میں ہے

☆

مرا مطلع ہے غالب آتش و ناسخ کے دیواں پر
نہ کیوں احسنت تحسیں ہو زبانِ ہر سخن داں پر
نہ آیا ہاتھ کچھ بجز حسرت و اندوہ و حیرانی
دیا دل مفت اُس پیماں شکن کے عہد و پیماں پر
نہ تڑپے زیرِ خنجر اس ادب سے اس ستم گر کے
نہ پڑ جاوے کہیں قطرہ مرے قاتل کے داماں پر
نہ بولے زندگی میں خیر، لیکن بعد مرنے کے
قدم رنجہ کبھی فرمایئے گورِ غریباں پر
یہ پہلا مرتبہ ہے، آگے آگے دیکھیے، کیا ہو
ابھی زورِ جنوں کا ہاتھ پہنچا ہے گریباں پر

☆

میری آنکھوں میں جو رہتا اُنھیں منظور نہیں
آ رہیں دل میں، دل آنکھوں سے بہت دور نہیں

☆

لو، نالۂ سحر بھی اثر کر کے رہ گئے
وہ آتے آتے، غیر سے کچھ ڈر کے رہ گئے
فصاد نے جو فصدلی میری، تو کیا ہوا
ٹکڑے ہی ٹوٹ ٹوٹ کے نشتر کے رہ گئے
جب اُن کی بزم ہی سے نکالے گئے فراق!
کہیے تو منھ دکھانے کے کس ڈر کے رہ گئے

[دیوان نظامی بدایونی (تجلّیاتِ سخن): ۲۹، تذکرۃ الواصلین: ۲۶۶۔ ۲۶۷، مکتوب قاضی غلام سجاد بسمل بدایونی بنام مؤلف،

بہارِ بوستانِ شعرا: ۳۲۔۳۴]

حواشی

☆۱۔نواب محمد علی خاں کا ۲۸ سال بعد اِسی جلاوطنی کے عالم میں بمقامِ بنارس شبِ جمعہ ۱۶ صفر ۱۳۱۳ھ ۱۲ (۹ اگست ۱۸۹۵ء) انتقال ہوا (تاریخ ٹونک: ۳۳۰)

☆۲۔ دکن ریویو: نومبر ۱۹۰۸ء۔

فگار... منشی سیّد آلِ نبی شاہجہانپوری

ان کا خاندان ساداتِ بلگرام سے تھا۔ اِن کے والد سیّد نیاز علی محافظِ دفترِ کلکٹری مقرّر ہو کر شاہجہان پور آئے اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے، قاضیِ شہر سیّد امانت علی کی ہمشیر سے شادی کرلی تھی، محلّہ قاضی خیل ہی میں سکونت بھی تھی۔

سیّد نیاز علی ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہوگئے تھے۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے زمانے میں وہ مراد آباد میں تعینات تھے۔ وہ بھی بغاوت کے الزام میں ماخوذ ہوگئے تھے، اسی میں پھانسی کی سزا پائی۔ اُن کے زہد و ورع اور پابندِ شریعت ہونے کی شہرت تھی۔

سیّد نیاز علی کے دو بیٹے تھے: بڑے سیّد واجد علی اور چھوٹے یہی سیّد آلِ نبی۔ دونوں کی تعلیم معقول پیمانے پر ہوئی تھی۔ سیّد واجد علی تحصیل دار مقرّر ہوگئے تھے۔ لیکن بے چارے تپِ دق کا شکار ہو کر جوانا مرگی کا داغ دے گئے۔

سیّد نیاز علی نے دونوں بیٹوں کو مرزا غالب کا شاگرد بنادیا۔ افسوس کہ سیّد واجد علی کا تخلّص معلوم نہیں ہوسکا۔ سیّد آلِ نبی نے فگار تخلّص اختیار کیا۔ سیّد نیاز علی کے پھانسی پاجانے کے بعد اُن کی جاداد بھی بحقِ سرکار ضبط کرلی گئی تھی۔ چنانچہ شاہجہان پور میں جو مکانات وغیرہ تھے، اُن پر بھی حکومت نے قبضہ کرلیا۔ سیّد آلِ نبی کو والد کے ترکے میں سے کچھ نہ ملا، اور اُنھیں ملازمت کی تلاش ہوئی، تو پولیس میں تھانے دار (سب انسپکٹر) بھرتی ہوگئے۔ جلد ہی ترقی کر کے اولاً سرشتہ دار محکمۂ بندوبست اور اس کے بعد سرشتہ دار پولیٹیکل ایجنٹ نیا گاؤں بنادیے گئے۔ ریاست کدورہ کے سرکاری انتظام کے زمانے میں وہاں بھی تعینات رہے تھے۔

کدورہ کے قیام کے بعد ملازمت کو خیرباد کہا اور وطن شاہجہاں پور آ گئے۔ حکومت نے اُن کے ضبط شدہ مکانات یا تو نیلام کر دیے تھے، یا انعام میں اپنے خیرخواہوں کو عطا کر دیے تھے۔ سیّد آلِ نبی نے ان لوگوں سے مکانات خرید لیے اور اُنھیں ازسرِنو اپنے شایانِ شان تعمیر کرایا اور امیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

چندے بعد، خدا معلوم کیا خیال آیا کہ حیدرآباد (دکن) کی راہ لی۔ بارے نصیبا یاور تھا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد چار سو مشاہرے پر تعلقہ دار درجۂ دوم مقرّر ہوگئے۔ نو دس برس تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ (نومبر/ دسمبر ۱۸۹۳ء) میں وہیں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ لاولد فوت ہوئے۔ دوسرے اثاث البیت کے ساتھ کلام بھی ضائع ہوگیا۔ اُن کے بھانجے سیّد محمد محسن حیدرآباد گئے کہ اُن کے سامان میں سے جو کچھ مل سکے وہ لے آئیں۔ لیکن اُنھیں بھی بے نیلِ مرام واپس آنا پڑا۔ معمولی چیزوں کے سوائے کچھ دستیاب نہیں ہوا۔

سید آلِ نبی بڑے خوش مزاج، خلیق اور سیر چشم، عالی حوصلہ اور بلند ہمت شخص تھے۔ پتنگ بازی اور بٹیر بازی کا بھی شوق تھا۔ وہ ہمیشہ رنگین کپڑے پہنتے۔ شاہجہان پور آتے تو اپنے قیام کے دوران میں ضرور مشاعرے کا انتظام کرتے۔

نمونۂ کلام میں یہ چند شعر ملے:

مسکرا کر جسے دیکھا، اُسے تسخیر کیا
پتلیاں سحر کی رکھتی ہیں تمھاری آنکھیں

☆

آتا کیوں مصر میں کنعاں سے نکل کر یوسف
جذبۂ شوقِ زلیخا جو نہ کامل ہوتا

☆

فکرِ عقبیٰ ہے، نہ کچھ خواہشِ دنیا دل میں
ہے فقط یار کے ملنے کی تمنّا دل میں

☆

گر ایک شب بھی وصل کی لذّت نہ پائے دل
پھر کس امید پر کوئی تم سے لگائے دل
ہم اپنا حال آپ ہی کہہ کر سنائیں گے
خامے کا منھ نہیں، جو کہے ماجرائے دل
ضبطِ فغاں فراق میں ممکن نہیں، فگار!
جس کو خدا خراب کرے، وہ لگائے دل

[تاریخ شاہجہان پور: ۲۵۷۔ ۲۵۹ بحوالۂ مضمون ''تلامذۂ غالب'' از تحسین سروری مشمولہ صحیفہ (سہ ماہی، لاہور)، جولائی ۱۹۷۰ء: ۴۹۔ ۵۱]

فگار... میر حسین علی دہلوی

میر فقیر اللہ فقیر کے نواسے تھے، جو ہندی میں مہارت رکھتے تھے، وہ شاہ عالم آفتاب (۱۷۵۹ـ ۱۸۰۶ء) کے دربار سے منسلک تھے اور اُنھیں کی طرح اُردو کے علاوہ ہندی میں بھی دوہے اور کبت کہتے تھے۔

فگار یار باش قسم کے آدمی تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ـ ۱۸۳۷ء) کے دربار کے متوسّل تھے۔ ایک مقطعے میں کہتے ہیں:

ہووے نہ فگار! اوس کی عنایت کا ادا حق
پلکوں سے کروں گرشہِ اکبر کے چرن صاف

لیکن خیال ہوتا ہے کہ یہاں اطمینان نصیب نہ ہوا اور کسی زمانے میں گردشِ روزگار اُنھیں جے پور لے گئی، جس سے یہ خوش نہیں تھے۔

شہر جے پور سے بھلا کیا کام تھا ہم کو فگار!
ہاں، مگر دہلی سے لایا اپنا آب و دانہ تھا

کلام پر بظاہر پہلے ممنون (ف: ۱۲۶۰ھ) سے اور پھر غالب سے اصلاح لی۔ اُن کا معتدبہ انتخاب پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے کتاب خانے کے ذخیرۂ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی ایک بیاض میں محفوظ ہے، وہیں سے لے کر محمدؔ اکرام چغتائی نے اسے شائع کیا ہے۔ (کتابیات۔ لاہور: ۱۹۶۸ء) مندرجۂ ذیل انتخاب اسی سے ماخوذ ہے:

یہ تمنّا ہے، فگارِ خستہ دل کی روزِ حشر
ہاتھ میں دامن ہو اس کے حیدرِ کرّار کا

☆

نہ تو دنیا کی تمنّا ہے، نہ دیں کی خواہش
ہے ہوس ہاے جہاں سے مرا ارمان نیا
کیا یہ دلچسپ مرا ہے کہ ہمیشہ جس میں
ایک جاتا ہے، تو ایک آئے ہے مہمان نیا

☆

مدّاحی اس کی فخر ہے کونین کا، فگار!
تھا جس کے ہاتھ سے درِ خیبر الٹ گیا

☆

جاتے ہی اس کے، آیا پیغام یاں قضا کا
دیکھا نہ روزِ فرقت، احسان ہے خدا کا

☆

ہیں اور تو ادائیں لاکھوں، پہ ہے قیامت
غصّے میں مسکرانا، اوس شوخ دل ربا کا

☆

کیا کیا نہ حسیں خاک میں یاں تونے ملائے
کچھ رحم تجھے گردشِ ایّام نہ آیا

☆

کوئی جام بادۂ وصل کا جو پیا تو کیا، نہ پیا تو کیا
نہیں عیش کو بھی سدا بقا، جو کیا تو کیا، نہ کیا تو کیا

☆

مرا جیب صورتِ جیبِ گل، یونہی چاک ہووے گا ناصحا!
اسے تو نے سوزنِ لطف سے جو سیا تو کیا، نہ سیا تو کیا

☆

عشق کا اخفا ہے گر منظور، تو پہلے فگار!
خشکیِ لب و رنگِ رُوے اور چشمِ تر چھپا

☆

بے قراری یہی کہتی ہے کہ ہوتا ہو، سو ہو
حلقۂ (در) تو ذرا یار کے گھر کا کھٹکا

☆

ہے سحر نزدیک، ایسا سو نہ غافل، اے فگار!
غور کر، تجھ کو سفر درپیش ہے کیا دُور کا!

☆

کیا تجاہل ہے کہ ہنس کر مجھ سے کہتا ہے، وہ شوخ
کس کا غم ہے تجھے، رہتا ہے جو چہرا اترا

☆

شب کو گھر میں تیرے بزمِ دل کشا تھی میں نہ تھا
جائے حسرت ہو کہ کیا ملنے کی جا تھی، میں نہ تھا

☆

کھول منہ شیشے کا، ساقی! ہاتھ میں ساغر اٹھا
دیکھ، تو کس جوش سے ہے آج ابرِ تر اٹھا
تفرقہ پڑ جائے گا اک مصر کے بازار میں
دیکھنا، جس دم نقابِ چہرۂ دل بر اوٹھا
خاکِ مجنوں کو جو ڈھونڈا میں [نے] دشتِ نجد میں
اک بگولہ سامنے کھاتا ہوا چکر اٹھا
ضعف کی شدّت یہاں تک ہے بہنگامِ خرام
صورتِ نقشِ قدم ہرگز نہ میں گر کر اٹھا

☆

شہر جے پور سے، بھلا کیا کام تھا ہم کو نگار!
ہاں، مگر دہلی سے لایا اپنا آب و دانہ تھا

☆

اگرچہ خوب ہے کارِ محبت
کسی کو ہو نہ آزارِ محبت
بتانِ دہر کو دیکھا جو ہم نے
تو ہے ہر یک دل آزارِ محبت
مزہ پایا نہ اس نے زندگی کا
ہوا جو شخص بیمارِ محبت

☆

جس کے ہر ذرّے میں ہے کحلِ جواہر کا اثر
مرتبہ رکھتی ہے یہ خاکِ درِ مے خانہ آج
بارِ تن تھا سر، سو قاتل نے کیا اس کو قلم
روح کرتی ہے ہماری سجدۂ شکرانہ آج

☆

باعثِ رنج فقط ہے یہ ظہورِ ہستی
ہوتے کب سیپ کے اندر ہیں گہر میں سوراخ

☆

ملیح دیکھ کے اوس غیرتِ چمن کا رنگ
چمن میں اوڑ گیا نسرین و نسترن کا رنگ
رہا نہ ساقی و مطرب، نہ مے، نہ شیشہ و جام
بدل گیا تیرے اوٹھتے ہی انجمن کا رنگ

عدم سے قافلہ اک دل جلوں کا آیا ہے
نہ پوچھ لالۂ پُرداغ کے چمن کا رنگ

☆

منھ زرد ہے، دم آنکھوں میں، اور آہ لبوں پر
ہے دید کے قابل ترے مجبور کا عالم
اتنا شبِ تنہائی میں گھبرا نہ فگار، اب
دیکھے گا ابھی تُو تو شبِ گور کا عالم

☆

اب اس جہاں میں خرابی مری فگار، نہ پوچھ
بسانِ طائرِ گم گشتہ آشیاں ہوں میں

☆

کچھ ہاتھ پھر عدوئے گریباں ہے اِن دنوں
ثابت ہوا کہ فصلِ بہاراں ہے اِن دنوں

☆

جلوہ افروز ہو جس بزم میں وہ غیرتِ شمع
ہم بھی پروانے سے ہونے کو نثار آتے ہیں
خود بخود ہاتھ گریباں پہ جو اٹھ جاتا ہے
آہ، شاید کہ پھر ایامِ بہار آتے ہیں

☆

دھیان میں لا کر ترے ربطِ گزشتہ ہردم
دلِ ناشاد کو ہم شاد کیا کرتے ہیں

☆

سفارش مری کی کسی نے تو بولا
کہ یہ ایک ہے، آپ کیا جانتے ہیں

رہِ عشق میں ہوگئے ہیں جو فانی
تو وہ اُس فنا کو بقا جانتے ہیں

☆

دہر میں مجبور اور لاچار ہوں بھی اور نہیں
اپنے میں افعال کا مختار ہوں بھی، اور نہیں
فرقۂ عشاق میں ہوں عاشقِ معشوق طبع
خوبرویوں کو میں کرتا پیار ہوں بھی، اور نہیں
تم اگر چاہو گے مجھ کو، تو میں چاہوں گا تمھیں
آپ کا میں طالبِ دیدار ہوں بھی، اور نہیں
صفحۂ جدول پہ مثلِ خطِّ جدول، اے فگار!
غور گر کیجیے تو میں بے کار ہوں بھی، اور نہیں

☆

اُس مہر لقا کو مہِ کنعاں سے نہ بدلوں
حوروں سے نہ بدلوں کبھی، غلماں سے نہ بدلوں
گر ہندوے زلف اس کی بتادے مجھے کافر
اوس کفر کو، زاہد! کبھی ایماں سے نہ بدلوں

☆

ہوئی، دل پر فگار! اب کثرتِ شوقِ وطن غالب
بس اس مہماں سرا سے اپنا ہم بستر اُوٹھاتے ہیں

☆

اُن کو جو ہے بخار، تو ڈرتا ہوں میں، کہیں
اِس میری آہِ گرم کی تاثیر سے نہ ہو

محشر میں یہ شفیع ہیں دونوں فگار کے
کیوں عشق اس کو شبر و شبیر سے نہ ہو

☆

کرتا ہے غنچہ تیرے دہاں کی برابری
شاید یہ اپنے بھول گیا ہے دہن کی بو

☆

پھرتا نہیں ہے، ہو کے وہ مایوس، اے فگار!
جو بابِ شہرِ علم کے پھیلائے در پہ ہاتھ

☆

غمِ دنیا ہی رہا ہم کو، نہ فکرِ عقبےٰ
واقعی عشقِ نے ہم پر کیے احساں کتنے

☆

جی میں ہے گورِ غریباں میں سکونت کیجیے
کچھ تو تجھ کو دلِ غفلت زدہ عبرت ہوگی

☆

کیا غم ہے مجھ کو، سچ یہ کسی نے کہا تو ہے
جس کا یہاں کوئی نہیں، اس کا خدا تو ہے
غصے ہی کی نظر ہو، تو ہو مجھ کو غم نہیں
ہے یہ بھی جائے شکر کہ، تو دیکھتا تو ہے

☆

ہجر کی شب کو نہ تھا اک دم یقینِ زندگی
صبح تک جیتا رہا، میں، سخت جانی دیکھیے

شمع کی مانند یکسر خود نہ جل جانا فگار!
کیا کرے گی یہ تری آتش زبانی دیکھیے

☆

سُن کے تقریر مطوّل مری، بولا قاصد
کہیے پیغام وہ مجھ سے، جو ذرا یاد رہے
اُبھرے لے غافلو! اس بحر میں کیوں مثلِ حباب
گر تمھیں لطمۂ امواجِ قضا یاد رہے
بادۂ مے کدۂ عشق پلادوں، تو نہ پھر
خضر کو ذائقۂ آبِ بقا یاد رہے

☆

گرچہ ہے ہوش ربا نقشِ و نگارِ دنیا
کچھ اُدھر کی بھی، یہ واجب ہے دلا، یاد رہے
گھونٹ پانی کے نہ کیوں کر ہوں لہو اوس کو فگار!
جس کے دل کو عطشِ آلِ عبا یاد رہے

☆

ہم میں اور اوس میں جو صحبت تھی کبھی، اب وہ کہاں
ہاں، مگر کہنے کو ایک بات چلی جاتی ہے
غیر سے کرتے ہو باتیں، مجھے دکھلا، دکھلا
تم کو کیا چھیڑ مرے سات چلی جاتی ہے
کیوں کر ارشاد سنیں آپ کا، حضرت ناصح!
جاں یہاں، قبلۂ حاجات چلی جاتی ہے
کب تلک آئنے میں دیکھو گے سج دھج اپنی
آپ چلتے نہیں، اور رات چلی جاتی ہے

☆

معشوق ستم، سچ ہے کہ کیا کیا نہیں کرتے
جو ظلم کیا تو نے پر، ایسا نہیں کرتے
ہے موسمِ گل، ابرِ بہاری بھی ہے، زاہد!
مے پی لے کہ غافل! غمِ فردا نہیں کرتے

☆

ہوئی بس اٹھتے ہی یوں اوس کے انجمن خالی
کہ جیسے روح نکل کر، رہے بدن خالی
ہم ایک جام پہ کب مے کدے میں قانع ہوں!
نہ جب تلک ہو خمِ بادۂ کہن خالی

☆

اخلاص زمانے سے ہے اوس رشکِ پری کو
اک ہم سے فقط اس سے لڑائی نہیں جاتی
اس دستِ حنائی کے تصوّر سے جگر میں
یہ آگ لگی ہے کہ بجھائی نہیں جاتی
فکرِ دوجہاں بھول گیا دل کو ہمارے
پر یاد، فگار! اوس کی بھلائی نہیں جاتی

☆

یاں کون سی گرہ تھی، نہ جو سر بسر کھلی
یارانِ رفتگاں کی نہ لیکن خبر کھلی

[گلشنِ بے خار: ۱۵۱۔۱۵۲، سخنِ شعرا: ۳۷۰۔۳۷۲، بزمِ سخن: ۹۳،
طبقات الشعرائے ہند: ۱۴۱۔۳۸۰، عمدۂ منتخبہ: ۴۸۳]

فوق... زین العابدین

''میاں، کل زین العابدین فوق کا خط، مع اشعار کے، ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر، بہ سبیلِ ڈاک بھجوا دیا ہے''۔

(عودِ ہندی: ۱۰۱۔ خط بنامِ مرزا یوسف علی خان عزیز)

فوق... عبدالصّمد میرٹھی

میرٹھ کے عمائدین میں سے تھے پہلے ذوق سے مشورہ رہا، اُن کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے۔

(ماہنامہ اردوئے معلیٰ: دہلی، نومبر ۱۹۲۷ء)

غالبًا یہ وہی صاحب ہیں جن کا ذکر نساخ نے شاگردِ گرم کی حیثیت سے کیا ہے۔ گرم کا نام مظفر علی خان تھا اور وہ رام پور کے رہنے والے تھے، وہ ذوق کے شاگرد تھے اور نواب عبداللہ خان کی رفاقت کے باعث میرٹھ میں مقیم ہوگئے تھے۔ نساخ نے فوق کے یہ چند شعر لکھے ہیں:

دلِ مضطر نہیں ہے قابو میں
ڈھنگ سیکھا ہے اوس ستم گر کا
شورِ محشر سے بھی نہ اوٹھتے ہم
کام تھا یہ تمھاری ٹھوکر کا

☆

دھوکے میں آ کے کرتا ہوں ناحق شکایتیں
میری ہی آہ کا ہے دُھواں، آسماں نہیں
نالے اگر یہی ہیں ہمارے تو دیکھنا
یا ایک روز ہم نہیں، یا آسماں نہیں

[سخن شعرا ۳۷۲-۳۷۳]

فوق ... ڈاکٹر میرزا محمدّ جان اکبر آبادی

میرزا شجاعت علی بیگ کے بیٹے تھے۔ اگرچہ رہنے والے اکبر آباد کے تھے لیکن نقلِ مکان کر کے میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ڈاکٹری کا پیشہ ذریعۂ معاش تھا۔ انگریزی حکومت میں ملازمت تھی، جہاں سے پنشن پائی۔ غالب کے علاوہ صہبائی سے بھی سلسلۂ تلمذ رکھتے تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں زندہ تھے۔

سر پٹکتا ہوں ایک مدت سے
داروے دردِ سر نہیں ملتی
صبح سے شام تک ہے غش اتنا
نبض دو دو پہر نہیں ملتی
دیکھتے وہ جو ہیں، کنکھیوں سے
کیوں نظر سے نظر نہیں ملتی
وائے افسوس، نوجوانی پر
جب گئی عمر، پھر نہیں ملتی
ترکِ الفت ہی کیوں نہ کردو فوق!
ہاں، طبیعت اگر نہیں ملتی

[یادگارِ ضیغم۔ ص ۲۷۶]

فیضی... فیض الحسن سردھنوی

دیکھ انداز اس کے قامت کے
فتنے سو سو گئے قیامت کے
جیسے رخسارِ یار ہیں، زاہد!
پھول ایسے کہاں ہیں جنّت کے
آخرش لے چلے بہا کے مجھے
مثلِ خاشاک اشک حسرت کے
کاشکے، فیضیا! بروزِ ازل
حرف مٹ جاتے میری قسمت کے

[پیامِ یار، لکھنؤ۔ ستمبر ۱۸۸۴ء بحوالہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور، جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۵]

قدر... سیّد غلام حسنین بلگرامی

زیدی سیّد تھے۔ زید بیٹے تھے حضرت زین العابدین سجّاد بن حضرت حسین علیہ السلام کے۔ قدر کے والد سیّد خلف علی بن سیّد کرامت علی بلگرام (محلّہ سلہڑہ) کے رہنے والے بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ قدر جمادی الآخر ۱۲۴۹ھ (اکتوبر ۱۸۳۳ء) میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ''غلام حسنین'' تاریخی نام ہے، جو اُن کے چچا سیّد سلطان علی نے رکھا تھا۔ بعد کو خود قدر نے اپنے نام کا ذکر ایک قطعے میں کیا ہے:

سو جان سے ہیں فدائے نامِ حسنین
ہے چشم و دل و جگر مقامِ حسنین
ہم روزِ ولادت سے ہوئے نام آور
تاریخی نام ہے: غلامِ حسنین
(۱۲۴۹ھ)

یہ خاندان دراصل واسط (عراقِ عرب) کا رہنے والا تھا، جہاں سے اُن کے جدِّ اعلیٰ سیّد محمدؐ الدعوۃ الصغریٰ نے ہجرت کی اور یہاں آ کے بلگرام میں مقیم ہوگئے۔

قدر کی شادی قصبۂ کواتھ (ضلع شاہ آباد) میں ہوئی تھی، جو آرہ سے ۲۵۔۳۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ شادی کے بعد بلگرام اور پھر وہاں سے لکھنؤ گئے اور شیخ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے۔ قدر تخلص انھیں نے دیا تھا۔ اُنھیں ایام میں فتح الدّولہ مرزا محمدؐ رضا برق سے عروض اور قافیے کی تکمیل کی، اس کے بعد غازی الدّین حیدر کی

بیگم سرفراز محل کی ڈیوڑھی میں ملازم ہوگئے۔ اتنے میں سحر اور برق دونوں استاد، اللہ کو پیارے ہوگئے اور اب یہ امداد علی بحر سے اصلاح لینے لگے۔ چنانچہ ایک رباعی میں اپنے چاروں استادوں کا ذکر کیا ہے:

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند
پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر!
"بدنام کنندۂ نکو نامے چند"

۱۸۵۶ء میں لکھنؤ پر تباہی آئی تو یہ بھی یہاں سے نکلے، لیکن قسمت کے دھنی تھے، کہیں سر چھپانے کا آسرا تک نہ ملا۔ پھرتے پھراتے بلگرام آئے۔ غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ ان دنوں یہاں تھے۔ نواب غلام حسنین خان حسین اور مرزا قادر بخش صابر بھی یہیں آپہنچے، یہ بھی ان کے جلیس رہے۔ قیامِ امن کے بعد یہاں سے پنجاب گئے اور چندے فوج میں منشی گیری کی، لیکن دل نہ لگا اور واپس دلّی چلے آئے۔ اُنھی ایام میں غالب سے تلمذ کا سلسلہ قائم ہوا۔ غرض ہر طرف ہاتھ پانو مارنے کے بعد بھی کہیں مستقل ٹھکانے کا سامان نہ ہوا، آخرش مرزا عباس بیگ کی سفارش پر سرکاری محکمۂ تعلیم میں ملازمت ملی اور ہردوئی ہائی اسکول میں مدرّسِ فارسی ہوگئے۔ یہ ہر وقت فکرِ شعر میں غرق رہنے والے، لڑکوں کو بھی اِن کی دیکھا دیکھی شعر گوئی کی عادت پڑ گئی۔ ہیڈ ماسٹر نے اشاروں اشاروں میں توجہ دلائی کہ یہ روش ٹھیک نہیں، لیکن بے سود۔ آخرکار اس نے رپورٹ کی کہ اِنھیں ریاضی نہیں آتی۔ اس پر ریاضی کی تعلیم کے لیے مجبوراً نارمل اسکول میں داخلہ لینا پڑا۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو تحصیلی اسکول، مہونہ (ضلع لکھنؤ) کے صدر مدرّسِ ہوئے اور جلد ہی ان کے بعد کالن براؤننگ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم کی مہربانی سے پھر ہردوئی اسکول میں مدرّسِ فارسی مقرر ہوگئے سال بھر بعد کیننگ کالج لکھنؤ کے مدرّسِ فارسی ظہیر الدّین بلگرامی کا انتقال ہوگیا مرزا عباس بیگ ملازمت سے سبک دوش ہوچکے تھے اور اب لکھنؤ ہی میں مقیم ہوگئے

تھے۔ وہ کالج کی انتظامی کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے سفارش کی اور یہ کیننگ کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوگئے۔ یہاں وہ دسمبر ۱۸۸۳ء تک ساڑھے سات برس کام کرتے رہے۔ یوں ساری عمر مدرّسی اور عسرت میں کٹی، چنانچہ ایک مرتبہ بطور تفنّن صفیر بلگرامی سے کہا کہ میری قسمت میں صرف مدرسہ پڑھانا لکھا ہے، کیوں کہ مدرّس اور قدر کے اعداد برابر ہیں۔

جب ربیع الاوّل ۱۳۰۱ھ (جنوری ۱۸۸۴ء) میں نواب محبوب علی خان بہادر آصف جاہِ ششم کلکتہ نمایش دیکھنے آئے، تو نواب آغا مرزا سرور الملک بہادر کے ایما پر قدر نے ایک قصیدۂ غرّا کہہ کر بنارس میں شرفِ حضوری کے موقعے پر خدمتِ والا میں گزرانا، جس پر نظامِ دکن اُنھیں اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے۔ چار سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ لیکن افسوس، عید ہوئی ذوق و لے شام کو۔ یہ فارغ البالی اُنھیں راس نہ آئی۔ حیدرآباد پہنچتے ہی بہت بیمار ہوگئے۔ ضیق النفس اور ضعفِ معدہ کی پرانی شکایت تھی، یہ عود کر آئی۔ جب طبیعت کسی طرح رُو براہ نہ ہوئی، تو اُسی سال کے اواخر میں علاج کے لیے واپس لکھنؤ آئے۔ یہاں پہنچے تو پہلو میں دنبل نکل آیا۔

اسی تکلیف میں یک شنبہ ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ (۱۴ ستمبر ۱۸۸۴ء) کی سہ پہر کو رہگراے عالمِ جاودانی ہوئے۔ لاولد فوت ہوئے۔ اُن کا اکلوتا بیٹا ان کی زندگی میں فوت ہو چکا تھا۔ کربلائے خدا بخش میں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت صرف ۵۲ برس کی عمر تھی۔ لوحِ مزار پر محمد محمود حمد کا کہا ہوا حسبِ ذیل کتبہ ملتا ہے:

روزِ یکشنبہ بُد و بست و سوم ذی قعدہ را
بردوپہر روز سہ ساعت چو تازیبا بشد
آوخ از واژونیِ چرخ و زآہنگِ ہنرند
کانِ علم از دہر یعنی اوستادِ ما بشد
زد رقم سالِ وفاتش حمد صوری معنوی
دو ہزار و سہ صد و یک قدر از دنیا بشد

اُن کی اپنی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے:

بہار آخر ہوئی، ہے، قدر کی تربت پہ میلا ہے
یہاں بیڑی بڑھانے کو ہر اک دیوانہ آتا ہے

اس کے مصرعِ ثانی سے تاریخِ وفات (۱۳۰۱) برآمد ہوتی ہے۔ ان کے شاگرد ارشد بلگرامی نے استاد کی تاریخِ وفات لکھی:

حضرتِ قدر غلام حسنین اسمِ شریف
بلگرامش وطن و سیّد رتبہ و جاہ
روز یکشنبہ و بست و سومِ ذی القعدہ
فوت کرد آں شہِ اقلیمِ سخن، واویلاہ
سنۂ رحلتِ او ارشدِ مغموم نوشت
"شدرواں قدر بسُوے اِرم، اِنّا للّٰہ!"
(۱۳۰۱ھ)

ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ایک شعر میں اپنے بعض شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔

واہ وا وجد و جواں، صلِّ علیٰ ارشد و صبح
اُنھی لوگوں سے ہوئی ہے مری شہرت کیسی

(وجد کا نام خلیل صاحب تھا، جوان کا ہزاری لال بنارسی، ارشد کا غلام حیدر اور صبح کا منشی شنکر پرشاد)

ان کی بیوی محبّت فاطمہ بنت محمد تقی تھیں۔ قدر کی وفات کے بعد وہ حیدرآباد گئیں اور وہاں کوشش کی کہ اُن کے مرحوم خاوند کا وظیفہ کسی طرح اُن کے نام جاری ہو جائے۔ بدقسمتی سے قدر کی تقرّری وغیرہ کے کاغذات ہی دستیاب نہ ہو سکے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قدر کو حضور نظامِ دکن کلکتہ سے ساتھ لے آئے تھے اور خود ہی اُن کا چار سو مشاہرہ مقرر کر دیا تھا۔ ابھی تک دفتر میں اس کی کوئی باقاعدہ مسل وغیرہ نہیں کھلی تھی کہ

چھ مہینے کے بعد علالت کے باعث علاج کے لیے واپس لکھنؤ چلے گئے، جہاں اُن کا انتقال ہو گیا۔ بڑی تگ و دو کے بعد جناب محبت فاطمہ کو صرف ۲۳ روپے آٹھ آنے مہینہ کا حسنِ حیات وظیفہ ملا۔☆

کُلّیات (مطبع مفید عام، آگرہ ۱۳۰۸ھ) کے علاوہ ایک مثنوی قضا و قدر بھی موجود ہے "قواعد العروض" میں عروض و قوافی کے اصول بیان کیے ہیں۔ اِس کا نام تاریخی ہے، جس سے ۱۲۸۸ برآمد ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ چند درسی رسالے اور بھی ہیں۔ مثلاً مجموعۂ سخن اور اُس کی شرح عطر مجموعہ، رسمِ عرفی، شرح قصائدِ عرفی، نظم الارکان (تقطیع ابیاتِ گلستاں)، مصطلحاتِ اردو وغیرہ۔ بعض اور چیزیں بھی لکھی تھیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ حلیۂ طبع سے مزیّن نہیں ہوئیں۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں:

نہیں جنّت نہ سہی، خیر جہنّم ہی سہی
اتنا تھوڑا ہے، مجھے تُو کسی قابل سمجھا

☆

اے قدر! ایسا آدمی اپنی پسند ہے
جو دل میں آیا کہہ دیا، جو کچھ کہا، کیا

☆

قدر! اِن مردہ پرستوں نے مجھے تڑپا دیا
غم یہی ہے میری شہرت جا بجا تھی میں نہ تھا

☆

آنکھ سے دل تک جلوخانہ ہے اس کے حسن کل
یہ گلی دلچسپ ہے کیسی بسانِ کوئے دوست

☆

ہمارا نام بھی داخل ہے کب سے دفتر میں
کوئی نکالے تو مجنوں کے وقت کا کاغذ

☆

وصل ہو جائے تو جانوں سچ ہے، اے وعدہ خلاف!
ورنہ یہ ہوں ہوں غلط، ہاں ہاں غلط، اچھا غلط

☆

کوئی حکمت نہیں چلتی، خدا کے کارخانے میں
دھری رہتی ہے سب تدبیر، جب تقدیر پھرتی ہے

☆

وہ مجھے دیکھ کے ہنس دیتے ہیں
آنکھ چھپتی نہیں ہے یاری کی

☆

ابھی تھا وصل کا اقرار اور ابھی انکار
چلو ہٹو، انھیں باتوں سے قدر جلتے ہیں

☆

تم اُسی سمت کو جاؤ، تو خدا کو پاؤ
جس طرف لوگ بتائیں، کہ ادھر کچھ بھی نہیں

☆

تو میرے بوسہ لینے پہ، اتنا خفا ہوا!
بوسہ بھی کوئی چیز ہے، تو سو [سو] بار لے

☆

یہ عشق یہ جوانی، کیا روگ لگ گیا ہے!
ہم بھی کبھی کہیں گے، ہم بھی کبھی جواں تھے

[دیباچۂ کلیاتِ قدر: ۲۔ ۸، جلوۂ خضر، ۲: ۲۲۶۔ ۲۳۶، تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم: ۱۴۲۔ ۱۴۳، دو ماہی اکادمی، لکھنؤ۔ شمارہ ۱۰:

۳۴۔ ۳۵، تحریک (ماہنامہ) اپریل ۱۹۵۹ء: ۳۲، ادیب اُردو، جون ۱۹۲۲ء (مضمون ''پورب کے مردم خیز قصبات'' از مظفر حسین سلیمانی]

حواشی

☆۔ اسی سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا غلام قادر گرامی جالندھری کا تقرر انھیں قدر کی جگہ پر ہوا تھا، لیکن اُن کا وظیفہ صرف دوسو روپے ماہانہ مقرر ہوا۔ گرامی نے درخواست دی کہ قدر کو چار سو روپے ملتے تھے، مجھے بھی وہی تنخواہ ملنا چاہیے۔ اس پر تلاش شروع ہوئی کہ قدر کی مسل کہاں ہے۔ چوں کہ یہ دستیاب نہ ہو سکی، اس لیے گرامی ثابت نہ کر سکے کہ قدر کی تنخواہ چار سو تھی۔ چنانچہ ان کی تمام کوششیں بے کار گئیں اور اُنھیں آخر تک دو سو ہی ملا کیے۔

کاشف (سالک، فقیر) سیّد بدر الدّین احمد عرف فقیر صاحب دہلوی

یہ بیٹے تھے، امتیاز الدّولہ، افتخار الملک نواب سیّد احمد میر خان بہادر منصور جنگ وزیر عالمگیر ثانی کے۔ سیّد وحید الدّین احمد بیخود دہلوی اُنھیں کے پوتے تھے۔

(سہ ماہی صحیفہ، لاہور جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۶)

کرم... شیخ کرم الٰہی فیروز پوری

نہرِ جمن میں کسی حیثیت سے ملازم تھے اور گڑھی عبداللہ خان میں قیام تھا
"پیامِ یار" میں اُن کی غزل کا عنوان ہے:

جناب شیخ کرم الٰہی صاحب کرم فیروز پوری شاگردِ جناب غالب دہلوی

وہ بھی اب بے چین رہتے ہیں ہماری یاد میں
یہ اثر آیا ہمارے نالہ و فریاد میں
چین یاں ہم کو نہیں ہے، واں نہیں اُن کو قرار
ہم ہیں اُن کی یاد میں، اور وہ ہماری یاد میں
آپ سے باہر ہوں میں فرطِ خوشی سے اے صنم!
تم اگر آجاؤ میرے خانۂ برباد میں
بے سبب خونِ رگِ گردن نہیں ہے موج زن
باڑھ رکھوائی ہے اس نے خنجرِ فولاد میں
تم اُدھر دشمن کے گھر میں چین سے سوتے رہو
ہم اِدھر روتے رہیں۔ شب میں تمھاری یاد میں
غیر کے آگے یہ پوچھا اُس نے مجھ سے "اے کرم!"
تم بھی کیا بے چین رہتے ہو ہماری یاد میں؟

☆

آبِ حیواں کا مگر چشمہ ہے مے خانوں میں
پی کے کچھ جان سی آجاتی ہے انسانوں میں
شکر، صد شکر کہ مے ہوگئی زاہد کو حرام
ورنہ قطرہ بھی نہ ملتا ہمیں مے خانوں میں
مے کدے میں ہے کرم، دیکھ لو جا کر اس کو
اتقا جس کا ہے مشہور مسلمانوں میں

[ماہنامہ "پیامِ یار" لکھنؤ: فروری ۱۸۸۸ء (ص۱۴) بحوالۂ غالبیات:
چند عنوانات ۱۹۸۔۱۹۹، سہ ماہی اُردو (کراچی، ۴۵: ۲: ۲۳۲]

کلیم... مولانا عبدالصّمد علی گڑھی ثم اجمیری

علی گڑھ کے رہنے والے شیخ فاروقی تھے۔ اُن کی تعلیم پرانے ڈھنگ پر ہوئی، چنانچہ دینیات اور فقہ کی قابلیت بہت اچھی تھی۔ اسی مذہبی لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ عین شباب میں ترکِ وطن کیا اور جا کے اجمیر میں بس گئے۔ مسکنِ خاص اجمیر سے ۱۴ میل دور نصیر آباد چھاؤنی میں تھا، جو جرنیل اختر لونی کا اپنے خطاب (نصیر جنگ) کی رعایت سے بسایا ہوا شہر ہے۔ دینی شغف کے باعث زیادہ طور پر نعتِ نبوی لکھا کیے اور کبھی کبھی اسی باعث عام لوگ انھیں "عاشقِ رسول" کے نام سے پکارتے تھے۔

بہت لمبی عمر پائی، یک شنبہ، ۱۷ رجب ۱۳۱۰ھ (۵ فروری ۱۸۹۳ء) تقریباً ۱۰۵ برس کی عمر میں اجمیر میں انتقال کیا۔ ملوسر (متصل آسا گنج، شرقی اجمیر) میں مزار ہے۔ ان کے شاگرد سیّد شائق علی شائق دہلوی نے تاریخِ وفات کہی:

شاعرِ نعت گو، جنابِ کلیم
فیض میں جو کہ بادشاہ ہوئے
روز یکشنبہ تھا، بماہِ رجب
راہی دارِ فنا سے، آہ ہوئے
ہاتفِ غیب نے کہا! شائق!
کیسے شاگرد اب تباہ ہوئے
حرفِ منقوط میں ہے سالِ وفات
داخلِ قصرِ خلد واہ ہوئے
(۱۳۱۰ھ)

مجموعۂ کلام ''بہارستانِ کلیم موسوم بہ گلزارِ بہشت'' مطبع رضوی میں چھپا تھا۔ اِس کے علاوہ (۱) قصائدِ بہارِ چشت'' (یہ گلزارِ بہشت الموسوم بہ قصیدۂ بہارِ چشت'' کے نام سے بھی شائع ہوا) (۲) گلدستۂ معرفت (حصّہ دوم بہارستانِ کلیم) (۳) صمصام الاسلام مثنوی یعنی تذکرہ میران سیّد حسین خنگ سوار رضی اللہ عنہ'' (۴) گلدستۂ کلیم کے نام سے مختلف کلام شائع ہوا۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

مار ڈالا اک نظر میں عاشقِ دل گیر کو
کیا نشانے پر لگا ہے، آفریں اِس تیر کو
اے مصوّر! تو اگر دل کے ورق پر کھینچ دے
رات دن دیکھا کروں دل دار کی تصویر کو

☆

اب وطن میں نہیں لگتی ہے طبیعت میری
چل مدینے کو، یہی کہتی ہے وحشت میری
اب کہاں ہیں جنھیں کہتے تھے شہِ ملکِ سخن
نوبتِ فتح بجاؤ کہ ہے نوبت میری

☆

پر تو اسی کا ہے، یہ مہ و آفتاب میں
جلوہ دکھا رہا ہے وہ لاکھوں حجاب میں
تو ہے رحیم اور تری رحمت ہے بے حساب
یارب، ہیں پھر گناہ مرے کس حساب میں

☆

رویا کیا ہوں حال پر اپنے تمام عمر
مرجاؤں میں، تو میرا کوئی نوحہ گر نہ ہو

داغِ جگر دیے ہیں تو یارب! دعا یہ ہے
مرہم نہ ہو، علاج نہ ہو، چارہ گر نہ ہو
اہلِ غرض ہیں ہارجِ اوقات، اے کلیم!
چل بیٹھیے کہیں کہ کسی کو خبر نہ ہو

☆

ہے میری عمر کا پیمانہ، ساقیا! لبریز
ہنوز ہے ہوسِ ساغر و سُبو باقی
ہے گل رخوں کو عبث ناز حسنِ صورت پر
ہے چار روزہ فقط، گُل میں رنگ و بو باقی
ہمیشہ میں نہ رہوں گا جو اس جہاں میں کلیم!
رہے گی مجھ سے جہاں میں یہ گفتگو باقی

☆

پہنچا مرقد میں، تو یارانِ عدم میں گزری
بعد مرنے کے ملا خانۂ آباد مجھے
دیکھ کر وجد مرا، گُل نے گریباں پھاڑا
سرو خود رفتہ ہوا، دیکھ کے آزاد مجھے

☆

کیا ملتا دل کو زیست میں آرام، رم کے ساتھ
سودائے زلفِ یار رہا دام، دم کے ساتھ
بھر بھر کے تو نے جام دیے سب کو، ساقیا!
ہم تیری بزم میں رہے ناکام، کم کے ساتھ
اب منحصر ہے وعدۂ دیدار حشر پر
قاصد خوشی کا لایا ہے پیغام، غم کے ساتھ

دو دن کی زندگی پہ، ہے ساقی، عبث غرور
جم چل دیا، مگر نہ گیا جام، جم کے ساتھ
بھاگ اس سے، ہے بلاے سیہ اور اجل کا دام
ہر پیچ اس کی زلف کا ہے خام خم کے ساتھ
کیوں کہ قرار آے مرے دل کو، اے کلیم!
آرام لے گیا وہ دل آرام، رم کے ساتھ

☆

تعیّنات نے گو ایک کو ہزار کیا
موحّدوں نے مگر ایک ہی شمار کیا
کیا نہ خوار و ذلیل اپنے نفس کو جس نے
تو اس کو نفسِ لعیں نے ذلیل و خوار کیا
دکھا کے آئینۂ گل میں کس نے رنگِ جمال
چمن میں بلبلِ بے دل کو بے قرار کیا
بقا کا جامہ نہ کس طرح تن پہ زیبا ہو
کہ ہم نے جامۂ ہستی کو تار تار کیا

☆

ہے مُریدِ گیسوے شب رنگِ احمد پیرِ صبح
مستفیض اس روے روشن سے ہوئی تنویرِ صبح
چہرۂ پُر نورِ شہ سے میں نے جب تشبیہ دی
ہوگئی بیدار کیسی یک بیک تقدیرِ صبح
مُرقدِ پُرنور پر جا کر، جلاتا شب کو شمع
گر نہ ہوتی پاؤں میں خورشید کے زنجیرِ صبح

☆

آپ آئے، تکیہ حور کا ہو عرش پہ فرش
آپ ہیں نورِ خدا، نور کا ہو عرش پہ فرش
جلوہ گہ مظہرِ نورِ ازلی ہو جو کلیم
لمعۂ شمعِ سرِطور کا ہو عرش پہ فرش

فارسی کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:

جانی و غارتگرِ جانی ہنوز
جلوہ ہا دادی و پنہانی ہنوز
گرچہ ہر جاہست منزلگاہِ تو
دردلم، اے ماہ، مہمانی ہنوز
ابر می گرید بحالِ زارِ من
تو مثالِ برق خندانی ہنوز
زلف بکشادی و بُردی جان ودل
ہم بہ فکرِ دین و ایمانی ہنوز
گر نہ درِ خود گشتۂ فانی، کلیم!
سرِّ عرفانی نمی دانی ہنوز

☆

بیک گردش ز چشمِ مست اُو میخواری گردم
زجامِ بیخودی در عشوۂ سرشار می گردم
نقاب از روے خود بکشا، خدارا جلوۂ بنما
زماں باشد کہ در کویت پے دیدار می گردم
بہردم گردشِ چشمش عجب کیفیتے دارد
بگردِ اُو دمے مست و دمے ہشیار می گردم
بیا زاہد! بکش جامے کہ دورِ میکشاں آمد
صراحی در بغل مستانہ در بازار می گردم

پے گلگشتِ باغِ قدس بکشادم درِ دل را
برائے طوفِ آں گُل اندریں گلزار می گردم
طوافِ کعبہ راموقوف فرصت داشتم اکنوں
بگردِ نقشِ پائے احمدِ مختار می گردم
چہ می پرسی کلیم! از قرب آں شاہنشہِ خوباں
غلامِ شاہ جیلانم، سرِ دربار می گردم

☆

زغمزہ برجگرم تیرِ خونچکاں زدۂ
درونِ دل ہمہ خوں شد، چہ برنشاں زدۂ
چہ طُرفہ طائرِ اوجِ حقیقتی، اے روح!
بسانِ گلشنِ لاہوت آشیاں زدۂ
بنارِ عشقِ تو مانندِ عشق سوزانم
زحسنِ خویش عجب آتشے بجاں زدۂ
متاعِ صبر و خرد، جملہ رفت در غارت
بفوجِ عشقِ تو برجانِ ناتواں زدۂ
نہادۂ بدرِ خواجہ خوش جبینِ نیاز
کلیم! سر بزمیں، پا برآسماں زدۂ

(اردو ادب، ۱۹۶۳: ۳ مضمون سید فضل المتین)

کوکب... محمد تفضّل حسین خان دہلوی

افسوس کہ اِن کے حالات نہیں ملے اور جو کچھ معلوم ہوا، وہ بھی اُن کے خواجہ تاش اور یارِ غار میرزا قربان علی بیگ خان سالک دہلوی کے کلام سے، یہ بھی غنیمت ہے۔ کوکب کی وفات پر سالک نے بہت سے قطعاتِ تاریخ کہے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

چوں تفضّل حسین خان افسوس
دہرِ ناپایدار را بگذاشت
''آغا مرزا'' کہ نام تاریخی (۱۲۵۰)
بہر سالِ ظہور خود می داشت
ہم بسالِ وفاتِ اوٗ آں را
کلکِ سالک سرِ مزار نگاشت
(۱۲۹۰=۴۰+۱۲۵۰)

اس سے معلوم ہوا کہ ان کا تاریخی نام ''آغا مرزا'' تھا جس سے (۱۲۵۰) برآمد ہوتے ہیں۔ گویا ان کا ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴۔ ۱۸۳۵ء) سالِ ولادت ہے۔

اُن کی اولاد میں تین یا چار اولادوں کا پتا چلتا ہے: دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ایک بیٹے کا نام افضل حسین تھا، اس کا صغر سنی میں ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸۔ ۱۸۶۹ء) میں انتقال ہوگیا۔ سالک نے تاریخِ وفات کہی:

غمِ مرگِ پسر دادی بہ کوکب
نہ کردی رحم اے گردوں بحالش

ثمر خوردن نداد از باغِ ہستی
بہ خاک آورد از پا نونہالش
گلے نورستہ از شاخ و خزاں دید
مہے طالع نہ گشت و شد زوالش
شب تار است، روزِ او تو گوئی
نہاں گشت از نظر مہر جمالش
خرامش چیست، زیں ہم بیخبر بود
شگفتے رُو نمودہ انتقالش
چوں خوابِ مرگ آں بے شیر را بُرد
مبارک باد بر کوثر زُلالش
چہ می پُرسی ز سالک سال ایں غم
کہ جمعیت نہ باشد درخیالش
مگر ازغیب می آید صدائے
"بمرد افضل حسین" انیست سالش
(۱۲۸۵)

ایک بیٹا ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵۔ ۱۸۶۶ء) میں پیدا ہوا تھا۔ سالک نے اس کی تاریخِ ولادت کہی ہے:

یافت فرّخ پسرے کوکب فرخندہ نژاد
بختِ خوش، طالعِ مسعود مبارک باشد
زآتش مجمر دلہاے حسوداں امروز
بزم را سوختنِ عُود مبارک باشد
سالِ ایں مژدہ بگفتم ز سرِ سُورو سرور
جلوۂ شاہدِ☆ مقصود مبارک باشد
(۶۰+۶۰+۱۱۶۲=۱۲۸۲ھ)

میرا گمان ہے کہ اوپر جس بچے کی تاریخ وفات دی گئی ہے، یہ وہی بچہ تھا۔ تاریخِ وفات کے الفاظ "گلِ نورستہ"، "مہِ طالع نگشت" بھی اسی پردال ہیں۔ واللہ اعلم۔

لڑکیاں دو تھیں۔ ایک کا نام احمدی بیگم تھا۔ اس کا ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳۔ ۱۸۶۴ء) میں انتقال ہوا، تو سالک نے قطعۂ تاریخ کہا:

سالک ز وفاتِ احمدی بیگم آہ
ہر لحظہ دمے شرر فشانشت مرا
تاریخِ وفاتِ اُو سروشے از غیب
گفت "آہ دریغ" بر "زبان ست" مرا
(۱۲۸۰=۶۰+۱۲۲۰)

ابھی اس حادثے کو ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ غریب کو دوسری بیٹی کا صدمہ سہنا پڑا۔

سالک نے پھر ایک قطعہ کہا:

زِفضل اللہ خاں باید کہ پرسی
چہ می پرسی ز سالک حالِ ایں غم
دودختر مُرد کوکب را بہ یک ماہ
شد "اندوہِ دو دختر" سالِ ایں غم
(۱۲۸۰)

کوکب نے جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا، بعمر ۴۰ برس ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا۔ سالک نے تاریخِ وفات میں کئی قطعے کہے تھے، ان میں سے ایک اوپر دیا جا چکا ہے، ایک اور یہ ہے۔ سالک کا ایک طویل مرثیہ بھی ان کے کلّیات میں موجود ہے:

زیں جہاں رفت و بجاشد، سالک!
طاعتی یافتہ قصرِ فردوس

حق او بود کہ گفتم تاریخ
"متقی" یافتہ "قصرِ فردوس"
(۱۲۹۰=۷۴۰+۵۵۰)

اُن کی تعلیم و تربیت سے متعلّق بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ "فغانِ دہلی" کی تقریظ نوشتۂ سالک سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی با استعداد اور صاحبِ علم تھے اور مختلف علوم میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں ہنگامے کے بعد جب شہر میں امن و امان قائم ہو گیا، تو دلّی والوں نے غالباً ایک مشاعرہ کیا تھا، جس میں اُس وقت کے بیش تر اساتذہ نے شہر کی تباہی کا رونا رویا تھا۔ اِن سب منظومات کا مجموعہ کوکب نے مرتّب کر کے "فغانِ دہلی" کے نام سے ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں اکمل المطابع سے شائع کیا تھا۔ "فغانِ دہلی" میں کوکب کی بھی ایک طرحی غزل ہے۔

اُسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مٹ گئے ہائے مکیں، اور مکانِ دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی

سہے سہے نہ رہیں کیوں کہ مقیمانِ فلک
کہ فلک ہے ہدفِ تیرِ فغانِ دہلی

ہم تو انسان ہیں، جی کیوں کہ رہے بن روئے
کہ فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

جیسی فارس میں خلاصہ ہے زبانِ شیراز
ویسی ہی ہند میں ہے پاک زبانِ دہلی

دور سے دیکھ کے ہو کیوں کہ یقیں دلّی کا
آ کے دلّی میں ہو جب یوں ہی گمانِ دہلی

فرطِ کاہیدگیِ درد سے یارب، اب تو
سب کے سب ہو گئے ہیں پیر، جوانِ دہلی

اس کی ویرانی میں اک بات ہے دیکھو اب تک
مٹ گئے پر بھی تو باقی رہی آنِ دہلی

جسدِ چرخ نہ انجم سے بنے آبلہ دار
گر نہ ہو درپے بربادیِ شانِ دہلی

بسکہ ہنگامہ طلب تھا یہ وہاں پہلے سے
فتنۂ حشر بھی ہووے گا میانِ دہلی

جو بکیں رہ گئے بے گور و کفن مر مر کر
ڈھانپنے پردہ گرے ان کا مکانِ دہلی

غالب و ثاقب و سالک ہی نہیں ہیں غمگیں
کوکبِ خستہ بھی کرتا ہے فغانِ دہلی

[کلیاتِ سالک: فغانِ دہلی: ۱۹۱۔۱۹۲، ۲۰۵]

حواشی

☆۔ کلیات میں ''شاہد'' اور ''مقصود'' کے درمیان عاطفہ ہے جو وزن میں تو ٹھیک ہے لیکن زبان کے لحاظ سے کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ اس لیے میں نے عاطفہ کو حذف کر کے (۱۲۸۲) عدد محسوب کیے ہیں۔

گوہر...گوہر جان

کلکتہ کی رہنے والی تھی اور غالباً اربابِ نشاط میں سے۔ اُس کی یہ غزل گلدستہ ''شکوۂ یار''، بجنور میں شائع ہوئی ہے:

دل میں بے چینی سرِبسترِ راحت ہوگی
اس قدر وصل کی مشتاق طبیعت ہوگی

لاکھ ارمان بھرے حشر میں ہوں گے پامال
چھوٹے سے سن میں بھی رفتار قیامت ہوگی

دو بھی بوسے جو مجھے نامِ خدا پر دو گے
اس سے کچھ کم تو نہیں حسن کی دولت ہوگی

چٹکیاں لے کے جو پہنچی کبھی وہ زلفِ سیاہ
دردِ دل اُٹھنے کی ضامنِ شبِ فرقت ہوگی

قیصرِ ہند لقب بخشے گی گوہر امید؟
ہم کو تفویض جو ملکہ کی وزارت ہوگی

(''شکوۂ یار، بجنور شمارۂ جون ۱۹۱۰: ۳۷ بحوالۂ مضمون ''گلدستہ شکوۂ یار، بجنور'' از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، مطبوعہ قومی زبان، کراچی، فروری ۱۹۶۷ء)

لطیف... شیخ لطیف احمد عثمانی

بلگرام کے مولوی زادوں میں سے تھے۔ اُن کے والد کا نام کفایت اللہ تھا اور دادا شیخ باداللہ۔ یاد، غلام علی آزاد کے ہم عصر بتائے جاتے ہیں۔ لطیف نے عربی کی تحصیل لکھنؤ میں کی تھی۔ فنِ مناظرہ سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے مرید تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں کان پور میں بھی ایک مدّت تک رہے۔

پہلے سرور لکھنوی کے شاگرد رہے، پھر غالب سے اصلاح لی۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ کلام میں صرف یہ اُردو غزل ملی:

جب تلک جان میں ہے جان، یہی دھیان رہے
دل رہے یا نہ رہے، یار کا ارمان رہے

یا خدا! موردِ جور اپنی سدا جان رہے
دل میں اُس بت کے نہ باقی کوئی ارمان رہے

حُسن اور عشق کا اٹھ جائے کہیں جلد حجاب
پردہ لیلیٰ کا، نہ مجنوں کا گریبان رہے

یا الٰہی! وہ کسی دن تو ہوں محوِ دیدار
خود بھی حیران ہوں، آئینہ بھی حیران رہے

کس سے وعدہ کیا؟ کی رات کہاں جا کے بسر؟
ہم تڑپتے رہے، تم غیر کے مہمان رہے

جی میں ہے ریت لوں، خود اپنے گلے پر خنجر
میری گردن پہ نہ جلاد کا احسان رہے
بھڑکے سینے میں مرے آتشِ موسیٰ، یارب!
اور آنکھوں سے رواں نوح کا طوفان رہے
واہ کیا فہم! کہ بندے تو بتوں کے ہولطیف
اور خدا سے ہے مناجات کہ، ایمان رہے
(ہندوستانی، ۳: ۴۸۱_۴۸۳)

مائل ... میر عالم علی خان سہسوانی

میر مودود بخش خان کے صاحب زادے تھے۔ بزرگوں کا وطن سہسوان تھا۔ لیکن میر مودود بخش نقلِ مکان کر کے بڑودہ میں مقیم ہوگئے، وہاں کے عمائد میں شمار کیے جاتے تھے۔ ریاست میں بڑے بڑے عہدوں پر متمکن رہے اور سردار بہادر کا خطاب پایا۔ انگریزوں نے بھی اُن کی خدمات کے انعام میں خانی کا خطاب دیا تھا۔ مائل نے عین جوانی میں سہسوان میں گھوڑے سے گر کر ۱۲۹۴ھ اور ۱۲۹۷ھ کے درمیان انتقال کیا۔ لاولد فوت ہوئے۔

چند شعر ملے، بطور نمونہ وہی درج ذیل ہیں:

گل پوش بعدِ مرگ ہمارا مزار ہے
کیا لطف ہے کہ عین خزاں میں بہار ہے

پستاں انار، رشکِ گُلِ تر عذار ہے
پھولا پھلا ہوا چمنِ حُسنِ یار ہے

اتنا غرور حُسنِ دو روزہ پہ کس لیے
غافل! عروج نشّہ کو آخر خمار ہے

چھاتی سے کیوں لگائے نہ رکھوں میں روز و شب
ناسور سینہ دل کا مرے یادگار ہے

کیفیتیں نئی ہیں خراباتِ دہر کی
جو ہوش میں نہیں یہ، وہی ہوشیار ہے

ظالم! کدورتوں کی تری انتہا ہے کچھ
ہم خاک ہوگئے، ترے دل میں غبار ہے
انکار بادہ ساقی سے، ناصح نہ ہو سکا
معذور ہوں کہ طبع مروّت شعار ہے
کیوں کر اٹھا سکے وہ مسی کی دھڑی کا بار
اپنا ہی رنگ جس لب نازک پہ بار ہے
حیلے سے مہندی ملنے کے ہاتھ اس کے چھو لیے
مائل بھی اپنے فن کا بڑا دست کار ہے

☆

منھ رکھ کے میرے منھ پہ، وہ کہتے ہیں پیار سے
مائل! ہے اب بھی جی میں ترے کچھ ہوس رہی

☆

خطا ثابت کریں گے اپنی ہم، اور اُن کو چھیڑیں گے
سُنا ہے، اُن کو غصّے میں چمٹ جانے کی عادت ہے

☆

دلِ مائل کی چندے آپ کو لازم رعایت ہے
یہ میرا ناز پرور تو گرفتارِ مصیبت ہے

☆

کہتے ہیں وہ مدام کہ ہیں تابعِ رضا
مائل! ہے جی میں آج اُنھیں آزمائیے

تاریخ طباعتِ ''چمنستانِ جوش'' (دیوان احمد حسن خان جوش)

ہر اک شعر ہے جوش کا رشکِ شعری
زمینِ غزل غیرتِ اوجِ پرویں

چھپا جب کہ دیواں، عطارد پکارا
یہ تاریخ ہے: "برق جلوہ مضامیں"
(۱۲۸۷ھ)

تاریخ انطباع مثنوی سعدین (از منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی)

مثنوی کے سب ہیں خوش اسلوب شعر
چلبلے مضمون ہیں، محبوب شعر
دل یہ کہتا ہے کہ سالِ دل فروز
آپ لکھیں جلد: "موزوں خوب شعر"

☆

گل پوش بعدِ مرگ بھی، اپنا مزار ہے
کیا لطف ہے، کہ عین خزاں میں بہار ہے

(طورِ کلیم، ص ۸۸، بزمِ سخن، ص ۱۰۲، سخن ورانِ گجرات: ۲۲۹، دوماہی اکادمی، لکھنؤ، شمارہ ۱۰ ص ۳۷۔ ۳۹)

مجروح... میر مہدی حسین دہلوی

میر حسین فگار کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ اُن کا خاندان ولایتی تھا۔ شاہی میں مورچہ جنبانی کی خدمت اُن کے سپرد تھی۔ میر فقیر اللہ فقیر جو شاہ عالمِ ثانی کے عہد میں درباری شاعر تھے، اُن کے جدِّ امجد تھے۔ فگار اُن سے دوسری پشت میں تھے (ان کے حالات کے لیے دیکھیے، کتابِ ہذا:) مجروح کی پیدائش ۱۸۳۳ء کے لگ بھگ ہوئی۔ شاہی زمانے کے اُردو بازار میں جسے انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسمار کردیا تھا، اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں پانی پت چلے گئے تھے۔ یہاں غالب کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی کی محلّۂ انصار میں سکونت تھی۔ مجروح اُنھیں کے ایک مکان میں مقیم رہے۔ جب فساد فرو ہوا تو پانچ سال بعد دہلی چلے آئے لیکن ''ہم نے یہ مانا رہے دلّی میں، پر کھائیں گے کیا!'' اب یہ وہ دلّی نہیں تھی، جسے چھوڑ کے وہ پانی پت گئے تھے۔ ناچار تلاشِ روزگار میں نکلے۔ الور میں مہاراجا شیو دھیان سنگھ قدر دانِ کمال و اہلِ کمال موجود تھے۔ چند دن کے لیے وہاں ٹھکانا مل گیا۔ پہلے نائب تحصیل دار اور بعد کو تحصیل دار رہے۔ لیکن ۱۸۷۳ء میں شیو دھیان سنگھ کی معزولی کے بعد یہاں سے نکلنا پڑا۔ خوش قسمتی سے سوائی رام سنگھ مہاراجا جے پور نے دست گیری کی۔ یہ جے پور پہنچے اور وہاں نائب کوتوالِ شہر مقرر ہوگئے لیکن فلکِ ناہنجار کو ان کا اتنا اطمینان و سکون بھی نہ بھایا۔ ۱۸۸۰ء میں مہاراجا رام سنگھ کا انتقال ہوگیا اور اُنھیں دلّی واپس آنا پڑا۔ بارے، قسمت نے یاوری کی، نواب حامد علی خان بہادر والیِ رام پور نے قدردانی کی اور اپنے

پاس بلا لیا۔ یوں اُن کے آخری ایام آرام سے بسر ہوگئے۔

عقیدے کے لحاظ سے اثنا عشری شیعی تھے۔ قدرتاً کربلا اور دوسرے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کا شوق تھا لیکن خرابیِ صحت اور اضمحلالِ قویٰ کے باعث یکہ و تنہا سفر کرنے سے گھبراتے تھے۔ آخر جب نہ رہ سکے، تو ایک ملازم کو ساتھ لیا اور روانہ ہوگئے اور زیارتِ عتباتِ عالیہ سے فارغ ہوکر واپس آئے۔

صحت جو پہلے سے خراب تھی، اس سفر کی کھکھیڑ کے باعث خراب تر ہوگئی۔ بینائی جو پہلے کم زور تھی اب بالکل زائل ہوگئی۔ کسی سہارے کے بغیر نقل و حرکت تک دشوار ہوگئی۔ اِسی بے بسی اور تکلیف میں بروزِ جمعہ ۱۷ صفر ۱۳۲۱ھ (۱۵ مئی[☆1] ۱۹۰۳ء) وفات پائی۔ اتفاق کی بات، کہ وفات سے پہلے چند بار ''اغفرلی الٰہیٰ'' کہا اور اسی حالت میں جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ یہی ''اغفرلی'' ان کی تاریخِ وفات ہے۔ درگاہِ قدم شریف، دلّی کے صدر دروازے کے باہر فصیل کے متصل جنوب میں قبر ہے۔ لوحِ مزار پر اُن کے شاگرد نواب احمد سعید خان طالب کا کہا ہوا، یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

یادگارِ غالبِ معجز بیاں
میر مہدی، سیّدِ والا تبار
بُد کلامش سربسر آہ و فغاں
چوں تخلّص بود مجروحِ فگار
کرد از دنیا، چو آہنگِ سفر
گفت ''اغفرلی الٰہیٰ'' چند بار
طالبا! دیگر مرنجاں فکر را
سالِ فوتش خود ز ''اغفرلی'' برآر
(۱۳۲۱ھ)

انھوں نے شادی بہت دیر سے، کوئی ۴۰ برس کی عمر میں کی۔ اولاد میں صرف

ایک صاحب زادے سیّد عباس حسین کا نام ملتا ہے، جو ۱۹۰۹ء میں زندہ تھے۔

اُستاد کے نہایت محبوب شاگردوں میں سے تھے۔ اُردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی میں بیسویں خط اُن کے نام ہیں۔ مرزا کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا، وہ خاص پائے کی چیز ہے۔ اُن کا دیوان اُن کے جگری دوست میر افضل علی عرف میرن صاحب کی کوشش سے جولائی ۱۸۹۹ء میں ''مظہرِ معانی'' (۱۳۱۶) کے تاریخی نام سے پہلی بار چھپا تھا (سرفراز پریس، دہلی)۔ اس میں بیش تر غزلیں ہیں۔ اِس کے علاوہ دو نثری رسالے بھی یادگار چھوڑے۔ ایک حضرت رسولِ کریم کے معجزات کے بیان میں ''انوار الاعجاز'' اور دوسرا شیعی اعتقادات کے مطابق حضرت رسولِ کریم کے حالات میں ''ہدیۃ الائمہ'' دونوں اب کم یاب ہیں۔ ایک تذکرہ بھی طلسم راز لکھا تھا، یہ بھی اب نایاب ہے۔ کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں۔ ''گنجِ غرائب'' میں کہانیوں اور قصّوں کی شکل میں پند و نصائح ہیں، اسے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں مرتّب کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہے۔ ایک اور پانچ سو صفحات کی کتاب ''آیاتِ جلی فی شانِ مولیٰ علیٰ'' میں ان آیاتِ قرآنی کا ترجمہ اور تفسیر دی ہے، جو شیعی عقیدے کے مطابق حضرت علی کی شان میں نازل ہوئی تھیں، اس کا خطی نسخہ آغا محمد سلطان مرحوم سابق سشن جج، لاہور کے خاندان مقیم کراچی کے پاس ہے۔

مجروح کا کلام دلّی کی صاف ستھری نکھری ہوئی زبان میں ہے، جس میں کوئی اینچ پیچ اور گنجلک نہیں۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو غزلیں لکھی ہیں وہ بہت دل آویز ہیں۔ اگرچہ موضوع اور طرزِ ادا وہی ہے جو اُن سے پہلے رائج تھا اور جدّت بھی ان کا طرۂ امتیاز نہیں، لیکن اِس کے باوجود اُن کے کلام کی سادگی اور چستی دل نشیں ہے۔

کلام کا مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے:

نہ وہ نالوں کی شورش ہے، نہ غل ہے آہ و زاری کا
وہ اب پہلا سا ہنگامہ نہیں ہے بے قراری کا

طلب کیسی، بلانا کیا، وہاں خود جا پہنچتے ہیں
اگر عالم یہی چندے رہا بے اختیاری کا

☆

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا
کچھ عرضِ تمنا میں، شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

☆

ہجر کے رنج، وصل کی راحت
لطف ہر ایک کا جدا دیکھا
جان بھی مفت میں گئی مجروح!
دل لگانے کا کچھ مزا دیکھا

☆

بھولے بھولے سے جو رہتے ہو، کہو خیر تو ہے؟
یہ تو کچھ عشق کا انداز ہے پایا جاتا

☆

ایذائیں یہ پائی ہیں، مقدور اگر ہوتا
میں رسمِ تعشق کو دنیا سے اٹھا جاتا
اچھا ہوا، محفل میں مجروح نہ کچھ بولا
وہ حال اگر کہتا، سو کس سے سنا جاتا

☆

تُو تو کچھ اور ہو گیا مجروح!
دل تو اٹکا نہیں کہیں، اے یار!

یہی انداز تو ہیں، دل کے اڑا لینے کے
اُن کی تم نیچی نگاہوں پہ نہ جانا ہرگز

☆

اِس کا انجام کس نے دیکھا ہے!
جان جانا ہے، عشق کا آغاز

☆

یوں ہی گزرا بہار کا یہ برس
ہم اُسی طرح ہیں اسیرِ قفس
اس میں طولِ امل، ہزار ہزار
زندگی کا مدار ایک نفس

☆

کیوں میری بود و باش کی پرسش ہے ہر گھڑی
تم تو کہو، کہ رہتے ہو، دو دو پہر کہاں
کچھ کچھ چلن ہے حشر میں رفتارِ یار کا
ہے وہ بھی فتنہ خیز، مگر اِس قدر کہاں

☆

جوشِ وحشت میں مزا، کچھ سرو ساماں میں نہیں
اُس گریبان کی کیا قدر، جو داماں میں نہیں
دل کو شاید تری مژگاں کا تصوّر نہ رہا
اب وہ پہلی سی کھٹک کاوشِ مژگاں میں نہیں
در و دیوار کو توڑا ہے، ترے وحشی نے
اب تو گھر میں وہ مزا ہے، جو بیاباں میں نہیں

☆

دل کی بے چینیاں گئیں نہ کہیں
اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں
مہر کیا چیز ہے؟ وفا کیسی؟
یہ تو باتیں ہی اب رہیں نہ کہیں
بزم سے کب ہیں چھوڑنے والے
ہوں گے مجروح، یاں کہیں نہ کہیں

☆

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں
لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں
یہ بھی کچھ جی میں آگئی ہوگی
کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں

☆

دل میں قوت، جگر میں تاب کہاں!
اب وہ پہلا سا اضطراب کہاں!
وہ سمائے ہوئے ہیں نظروں میں
اپنی آنکھوں میں جانے خواب کہاں!
اُس تغافل شعار کو ہم دم!
خط تو لکھوں، مگر جواب کہاں!
درِ مے خانہ پہ رہا مجروح!
آپ جاتے ہیں، اے جناب کہاں!

☆

جانا زبس ضرور تھا، اُس جلوہ گاہ میں
ہم دیر و کعبہ چھوڑ گئے دونوں راہ میں

اس نے ملائی آنکھ، نہ گھر میں نہ راہ میں
کیا کیا سُبک ہوا ہوں عدو کی نگاہ میں
مجروح! کہیے میں نہ ہنسوں بولوں تابہ کے!
تم تو سدا رہوگے اِسی آہ آہ میں

☆

اس دل ہی نے سب کام بگاڑے ہیں وگرنہ
وہ راہ پر آجائے، اگر صبر کیا جائے
مجروح میں خوش ہوتا ہوں یوں آپ میں ہوکر
اک کھوئی ہوئی چیز کو جیسے کوئی پا جائے

☆

کسی سے عشق اپنا کیا چھپائیں
محبت ٹپکی پڑتی ہے نظر سے
کہاں کی پیروی جب قصد یہ ہو
کہ آگے بڑھ کے چلیے راہبر سے

ق

مری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے
کوئی لادے درِ پیرِمغاں سے
کہ اُن کو جوڑ کر میں توڑ ڈالوں
پھر اک جامِ شرابِ ارغواں سے
میں اِس بے مایگی سے خوش ہوں مجروح!
کہ فارغ ہو گیا سود و زیاں سے

☆

اک کام ہمارا ہے کہ بن جائے تو بگڑے
اک غیر کا مطلب ہے کہ بگڑے تو سنور جائے

اچھا ہے، جو مجروح کو روکے کوئی اُٹھ کر
یہ جینے سے بیزار ہے، کیا جانے کدھر جائے☆۲

☆

رہ کے مسجد میں کیا ہی گھبرایا
رات کاٹی خدا خدا کر کے☆۳

☆

سب ہی کرتے ہیں محبت، پہ یہ شورش کیا ہے
رحم اے عشق! نہ کر جینے سے بیزار مجھے
دل میں مجروح کے کچھ درد سوا ہے شاید
آج تو اس نے پکارا ہے کئی بار مجھے

[گلِ رعنا، ۴۳۱۔ ۴۳۶، گلدستہ مذاقِ سخن، مئی ۱۹۰۳، ماہِ نو (ماہنامہ) کراچی (جنوری۔ فروری ۱۹۶۹ء): ۷۴۔ ۸۷ (مضمون میر مہدی مجروح، (غالب کا سب سے چہیتا شاگرد) از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)، ماہنامہ زبان، دہلی اپریل ۱۹۰۹ء ص ۲۲۶]

حواشی

☆۱۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے تاریخ ۱۵ اپریل ۱۹۰۳ء لکھی ہے، یہ سہو ہے، ۱۵ اپریل کو ۱۷ محرم تھی اور دن چہار شنبہ تھا۔

☆۲۔ ہم سے بھی مل کر گیا، روتا ہوا سالک ابھی　　کیا ارادہ ہے خدا جانے، کدھر جانے کو ہے
(قربان علی بیگ سالک)

☆۳۔ کل جو مسجد میں جا پھنسا مومن　　رات کاٹی خدا خدا کر کے (مومن)
اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ طرح رہی ہو۔

محشر و خانم جان ... مرزا عبداللہ خان رامپوری ثم دہلوی

فقیر منش اور دریا دل آدمی تھے۔ جو آتا لٹا دیتے، یا کسی کو دے ڈالتے۔ تاریخ میں مہارت تھی۔ افیون بلکہ شراب تک سے دلچسپی تھی۔

اصل میں ریختی کے شاعر تھے اور اس میں خانم جان تخلّص کرتے تھے اور پڑھتے بھی خوب بنا بنا کے تھے، ایسا کہ دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ مدّتوں شمالی ہند کے شہروں میں گھوما کیے اور آخر میں کلکتے گئے، جہاں عبدالغفور نساخ سے ملاقاتیں رہیں۔ نساخ لکھتے ہیں کہ اُن میں یہ بہت بڑا عیب تھا، کہ دوسروں کے کلام کو اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے۔

ہجر میں تسکین دیتا میں کہ سر کو پیٹتا
ایک دل پر ہاتھ تھا میرا، جگر پر دوسرا

☆

کہیں تم چو چلے میں، بھید کچھ ان سے نہ کہہ دینا
مری اچھی بُوا، یہ مردوے مطلب کے ہوتے ہیں

☆

کیا مُوئے ہیں یہ، جلے دل کو جلانے والے
اور یہ آگ میں، آگ آئے لگانے والے

ہاتھ باندھا کرو، مہندی نہ لگاؤں گی کبھی
پاؤں پڑ پڑ کے، یہ ہیں رنگ جمانے والے
جاؤ گے ٹنڈیاں کسوا کے، ذرا چھو دیکھو
لو بڑے آئے مرے ہاتھ لگانے والے
کہنے سننے میں کسی کے نہ تم آنا، خانم!
آگ پانی میں لگاتے ہیں لگانے والے

(سخنِ شعرا: ۴۲۰۔ ۴۲۱، مقدمۂ دیوانِ جان صاحب: ۴۳۔ ۴۵،
مقدمۂ دیوانِ باقر: ۱۱۱، ۱۴۰، تذکرۂ ریختی: ۳۷)

محمد نجیب خان

اُن کا ذکر اور اُن کا اپنے اشعار برائے اصلاح غالب کی خدمت میں بھیجنا، غالب کے خطوط بنام منشی حبیب اللہ خان ذکا، حیدرآباد سے معلوم ہوتا ہے اور کچھ تفصیل نہیں مل سکی۔ نہ تخلص معلوم ہوا۔

(اُردوئے معلیٰ: ۲۷، ۳۱)

محمود... محمد حسین نہٹوری (بجنوری)

ضلع بجنور (یو پی) کے مشہور قصبے نہٹور کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے محلۂ کلالاں میں اُن کے مکانات تھے۔ اُن کی ''بارہ دری'' ہنوز اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اُن کے والد امیر اللہ بن محمد وارث تھے۔ خاندان کے لوگ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ محمود رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد والیِ ریاست کپورتھلہ مہاراجا رندھیر سنگھ بہادر کے برادرانِ خرد کنور سوچیت سنگھ بہادر اور کنور بکرما ن سنگھ بہادر اہلو والیہ (سی ایس آئی) رئیسِ جالندھر کی جاداد اور ریاست کے ناظم مقرر ہوگئے تھے۔

غالب کی زمینوں میں ان کے بیش تر شاگردوں نے کم و بیش غزلیں کہی ہیں لیکن یہ امتیاز محمود ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے استاد کی ۵۸ غزلوں پر غزلیں کہیں اور اپنا یہ دیوان اس اہتمام سے شائع کیا کہ پہلے غالب کی غزل دی اور اس کے بعد اپنی۔ اسی لیے اس کا نام ''دو آہنگ'' رکھا، ایک آہنگ غالب کا، دوسرا محمود کا۔ یہ دیوان چار مرتبہ شائع ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں، اس کے ۶۰۰ نسخے محکمۂ تعلیمِ پنجاب نے خرید کر صوبے کے کتاب خانوں میں تقسیم کیے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ مطبع مہرِ نیمروز بجنور میں چھپا (۱۸۹۲ء) تیسری اشاعت سے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ چوتھی مرتبہ یہ دیوان کریم المطابع بجنور میں چھپا، اسی اشاعت کا نسخہ مجھے ڈاکٹر نجم الاسلام (شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو۔ پاکستان) کی مہربانی سے دیکھنے کو ملا۔ چوں کہ کتاب بہت کم یاب ہے اور محمود کا کلام بھی عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا، اس لیے اس کا معتدبہ انتخاب شامل کر رہا ہوں۔ کنور بکرمان سنگھ شہر میں گیارہ مدرسے اپنی

جیب خاص سے چلاتے تھے۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں اُنھوں نے محمود سے فرمایا کہ کیا اچھا ہو، اگر اردو کے طالب علموں کے نصاب کے لیے ایسا نسخۂ جدید مرتب ہو، ''جس کا مضمون دلچسپ اور مطلب شریف ولطیف ہو''۔ اس پر محمود نے فارسی کتبِ اخلاق کی مدد سے ایک مختصر رسالہ قلم بند کیا اور اس کا نام ''حلوائے بے دُوْدْ'' رکھا۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۲۸۸ھ میں مطبع نولکشور، کان پور میں چھپا تھا۔ رسالہ نثر میں ہے، اس میں مختلف اخلاقی موضوعات پر حکایات اور چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں۔ جگہ جگہ محمود نے اپنی غزلوں اور اشعار کا اضافہ کیا ہے، اِس کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہے، تاکہ پڑھنے والے طالب علموں کو جہاں اخلاق کی تعلیم ملے، وہیں اُنھیں صحیح زبان بھی سکھائی جاسکے۔ اُن کی ایک مثنوی ''تحفۂ محمودؔ'' بھی موجود ہے (مطبع آفتابِ ہند، جالندھر ۱۸۹۱ء) ایک مختصر منظوم تصنیف ''محمود نامۂ اردو'' بھی ملتی ہے (مطبع گلزار محمدّی، لکھنؤ۔ یکم رجب ۱۲۹۰ھ) یہ دراصل بیت بازی کے سلسلے کی چیز ہے جس کے مقابلے میں ایسے اشعار کی ضرورت پیش آتی ہے جو کسی حرف سے شروع ہوں یا ختم ہوں۔ البتہ اس سے محمود کے بارے میں ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ غوث علی شاہ کے مُرید تھے، ان کا شعر ہے:

غلامِ غوث علی ہوں، اسد کا ہوں شاگرد
ہو کس طرح نہ مرے نعرۂ جگر کو فروغ

انھوں نے اپنے اشعار میں جا بجا غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے:

حق تو یہ ہے کہ ترازوئے سخن میں محمود!
کوئی ہم پلّۂ غالب نہ سخن داں نکلا

☆

غالب بھی ہے وہ گنجِ معانی کا اک طلسم
محمود جس کے شعر پہ ہے نعرہ زن ہنوز

اُن کے کلام سے تصوّف اور مذہبی شغف اور اولیائے کرام سے گہری

عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ عام غزلوں میں بھی حمد و نعت کے اشعار ملتے ہیں۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

نقش ہے شوریدہ کس کی تابشِ تحریر کا
مشعلِ سوزاں ہے ہر تارِ نظر تصویر کا

☆

کبھی ہم نہ جمع کرتے یہ متاعِ زُہد و طاعت
ترے عشقِ راہزن کا جو نہ انتظار ہوتا

☆

کیا بتاؤں عشق کی آتش میں کیا کیا جل گیا
مزرعۂ دل جل گیا، تخمِ تمنا جل گیا
شکر واجب کیوں نہ ہو، برقِ نگاہِ یار کا
جس کی اک چشمک میں وہمِ لا و اِلاّ جل گیا

☆

ہو کے مجنوں جو ترے عشق میں اے جاں نکلا
چشمِ گریاں، دلِ بریاں، تنِ عریاں نکلا

☆

ثنا خواں ہوں نہ کیوں کر کاوشِ بیدادِ مژگاں کا
مزہ ہے درد میں دل کو، نہیں طالب یہ درماں کا

☆

جگر و دل میں یہ جھگڑا ہے کہ سب سے اوّل
کس کا حق ہے ہدفِ ناوکِ مژگاں ہونا
نالۂ شعلہ فشاں بند جو ہوتا ہے کبھی
چاہتا ہر بنِ مُو ہے شرر افشاں ہونا

☆

عمر فرقت میں ہی کٹنی ہے، تو گھبرائیں گے کیا
آرزوئے وصل میں بن آئی، مرجائیں گے کیا
دین و دنیا کے بکھیڑے جیتے جی کے ہیں فقط
واں سے کیا لائے ہیں ہم، اور یاں سے لے جائیں گے کیا

☆

ذرہ ذرہ ہے ترے حسن کی رویت کا گواہ
روزِ روشن ہے ترا مہر لقا ہو جانا
ہے یہی نسخۂ اکسیر، میسّر ہو اگر!
کشتۂ خنجرِ تسلیم و رضا ہو جانا
نکتہ سنجی سے ہے مقصود ثنا خوانیِ دوست
نہ عبث شاعرِ آشفتہ نوا ہو جانا
اُس کے ہر رنگ میں، محمود! نمایاں ہے جھلک
چشم کو چاہیے مشتاقِ لقا ہوجانا

☆

الزامِ سخت جانی تھا محمود پر، مگر
قاتل کی تیغِ ناز کا بھی کچھ قصور تھا

☆

نہیں معلوم، ہے یہ ماجرا کیا
کہ میں کیا شے ہوں اور تو ہے بھلا کیا
جو اب تک ہو چکا اور ہو رہا ہے
کیا کیا میں نے اور تو نے کیا کیا
جو حادث ہے ظہورِ ہر دو عالم
تو اس کی ابتدا اور انتہا کیا

خدا ہے نام جس کا، ہر زباں میں
وہ کیا شے ہے اور اس کا ہے پتا کیا
کوئی بتلا سکا اتنا نہ اب تک
کہ بندہ چیز کیا ہے، اور خدا کیا
اگر لاشے ہے وہ، جس سے ہے ہر شے
تو پھر ہر شے ہوئی اس سے جُدا کیا
کوئی صانع نہیں ہوتا ہے لاشے
تو صانع صنعتوں سے ہے خفا کیا
حبابِ بحر اگر بولے: انا الماء
تو پھر اُس کی جزا کیا اور سزا کیا
کہو محمود! جو کچھ ہے، وہی ہے
نہ پوچھو عکس کیا ہے، آئنہ کیا

☆

نہ ہوتا گر تنِ خاکی میں جلوہ اُس کی قدرت کا
بتِ آدم کے آگے سر جھکانا کب روا ہوتا
بنایا اس نے جب بندہ، تو بندے نے کہا ربیؔ
اگر بندہ نہ ہوتا، نامزد کیوں کر خدا ہوتا
وہ ہمدم بن کے میرا، مجھ کو اب ملزم بناتا ہے
"ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا"

☆

گر ظہور اپنا نہ ہوتا اسے منظور تو کیوں
مظہرِ ذات پہ یوں شیفتہ انساں ہوتا

بے محبت نہیں ہو سکتی ہے نیکی و بدی
اس سے خالی جو وہ ہوتا، تو نہ انساں ہوتا
اک تجلی میں یہ ہو جاتا نہ یوں خاک سیاہ
طور، محمود! جو ہم رتبۂ انساں ہوتا

☆

واعظا! نہ اس کی دید کا فردا پہ رکھ مدار
دیکھے گا کل وہ کیا جو بشر بے بصر ہے آج
محمود! بعدِ مرگ یہ ثابت ہوا ہمیں
کہتے تھے جس کو گور، وہی اپنا گھر ہے آج

☆

وائے افسوس، یہ کس دل میں رہیں گے مہماں
ناوکِ غمزہ و پیکانِ ادا میرے بعد
کون اب محفلِ خوباں میں غزل خواں ہوگا
کون کہلائے گا آشفتہ نوا میرے بعد
بحر سے نکلا، ہوا بحر میں گم مثلِ حباب
نہ رہا اُس کا، نہ کچھ میرا پتا میرے بعد

☆

ہے شورِ ہوس پیشگیِ عشقِ بتاں اور
ہے سوزِ گراں مایگیِ سوختہ جاں اور
خالی کیا سینہ پہ کماں دار نے ترکش
صیدِ جگر و دل یہی کہتے رہے "ہاں اور"
بے بادۂ الفت، ہے دمِ زندگی بے لطف
دے جام کوئی ہوش ربا، پیرِ مغاں! اور

☆

مژگان و زلفِ یار سے ہے دل کو رابطہ
ہے تو بھی تازہ خواہشِ دار و رسن ہنوز
بیداری میں زمیں پہ ہیں، رویا میں عرش پر
ثابت ہوا نہ ہم کو ہمارا وطن ہنوز

☆

سوزِ جاں بازیِ پروانہ ہے اک چشمکِ برق
شمع جاں دیتی ہے جل جل کے سحر ہونے تک
منع رونے سے نہ کر، ناصحِ ناداں! مجھ کو
آبروِ عشق میں ہے دیدۂ تر ہونے تک

☆

حق پرستی ہے یہی، رکھ خود شناسی کا خیال
خود بخود مٹ جائے گا یہ نقشِ ہستی ایک دن

☆

نظارے کو ہو مژدہ کہ صحنِ چمن میں آج
واکر دیے ہیں شوق نے بندِ قبائے گُل
محمودؔ! نغمہ سنجی میں ہو لطف اپنی کیا
جب عندلیبِ دل ہی نہ ہو آشنائے گُل

☆

مہر ہر ذرّہ و ہر قطرہ ہے دریا لیکن
رازِ سربستہ کے اظہار کا مقدور نہیں
ہے خود آرائی میں اُس جانِ جہاں کا یہ طلسم
کوئی کثرت نہیں، وحدت سے جو معمور نہیں

نحنُ اَقرب کا سمجھنا نہیں ممکن، لیکن
وہمِ ہستی کو فنا ہو تو وہ کچھ دُور نہیں

☆

پیدا ہو دل میں دردِ محبت نہ جب تلک
لذّت سوال میں نہ مزا ہے جواب میں

☆

محمود! لطفِ زندگی و مرگ اس میں ہے
حاصل اگر ہو اک دلِ بے مدّعا مجھے

☆

عاصی ہوں میں، پاداشِ عمل پر نہیں نازاں
ہو فضل سے کم اس کے جو انعام بہت ہے
پینے میں ہے عشق کے کم ظرف نہیں میں
محتاط مگر ساقیِ گلفام بہت ہے

☆

کیا کہوں جینے کو کیا کیا چاہیے
ہے اگر مرنا، تو پھر کیا چاہیے
سنگِ طفلاں کے مزے چکھنے کو کچھ
عاشق کا سر میں سودا چاہیے

☆

ایسی بسی ہے دیدہ و دل میں شبیہِ یار
آیا وہی نظر، جدھر اپنی نظر گئی

☆

اربابِ جہل منکرِ فیضِ مُغاں رہے
اور بادہ نوش صاحبِ ادراک ہوگئے

☆

ماجرا حسن و عشق کا کیا ہے
دل ہے کیا چیز، دل ربا کیا ہے
کیا ہے تنزیہہ و عالمِ تشبیہ
عکس کیا شے ہے آئنہ کیا ہے
اصل ہے ظاہر اور ظہور کی کیا
مظہرِ شانِ کبریا کیا ہے
کیا ہے مقصودِ اینما کُنتم
نحن اقرب کا مقتضا کیا ہے
من عرف نفسہٗ سے کیا ہے مراد
کون جویا ہے، گم ہوا کیا ہے
گر نہیں ذات کا صفات میں دخل
امرِ ربی سے مدعا کیا ہے
نہ کھلا، اور نہ کھل سکے گا یہ طلسم
پردۂ ساز میں صدا کیا ہے
معرفت میں خدا کی، اے محمود!
یاد رکھ قولِ پیشوا کیا ہے

☆

شکایتِ ستمِ چرخِ کینہ جو کیا ہے
جو تجھ سا دوست ہو، پھر حاجتِ عدو کیا ہے

ہماری ہستی، یہ مانا کہ کچھ نہیں، نہ سہی
جو تو ہی تو ہے، تو پھر حکمِ جستجو کیا ہے

☆

نہ نہاں ہے، نہ عیاں جلوۂ جاناں مجھ سے
ہے وہ ہر شان میں الآن کما کاں مجھ سے

☆

کرم، میں جس کے ستم کی ادا نکلتی ہے
ستم میں دیکھیے بات اس کی کیا نکلتی ہے
چلے رقیب پہ خنجر ترا، مرے ہوتے
وفا میں بھی تری، قاتل! جفا نکلتی ہے

☆

خوں گھٹا اپنا، نہ جوشِ ستمِ یار گھٹا
کنڈ کیوں ہو کے دمِ خنجرِ خوں خوار گھٹا
نطق میں ہے مرے، کیا فیضِ زبانِ منصور
دارِ مژگاں پہ اناالحق کا نہ اقرار گھٹا
یادِ گیسو میں جو دل اپنا اُمڈ کر آیا
بن گئی آہ بھی اک رشکِ شبِ تار گھٹا
عین باراں میں جو ساقی نے دکھائیں آنکھیں
ہوگئی مے کے پیاسوں کی عزادار گھٹا
داخلِ خلد ہوئے حضرتِ آدم، محمود!
پر شر و کینۂ ابلیس نہ زنہار گھٹا

[اکمل الاخبار، ۴ : ۳۴ : ۲۵ اگست ۱۸۶۹ء دو آہنگ، ہماری زبان ہفتہ وار دلّی : ۲۲ نومبر و ۲۲ دسمبر ۱۹۶۴ء، دیباچہ تحفۂ محمود، خطوط ڈاکٹر نجم الاسلام بنام مولف]

محمود... حکیم مولوی محمد محمود الحق دہلوی

پرتاب گڑھ میں تحصیل دار تھے۔ ملازمت کے اختتام پر سرکار انگریزی سے پنشن پاتے رہے۔ عالم آدمی تھے اور طب میں بھی اچھی دست گاہ تھی۔ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵۔۱۸۸۶ء) میں زندہ تھے۔

بنا ہے گر یہ مری چشمِ خوں فشاں کے لیے
کبھی بہار کو روئے، کبھی خزاں کے لیے

ہوئی ہے الفتِ دل، دخترِ رز سے اے ساقی!
شراب خانے میں جاتے نہیں مُغاں کے لیے

فراقِ یار میں محمود کا وصال ہوا
تو ہم بھی روئے بہت مرگِ نوجواں کے لیے

[یادگارِ ضیغم: ۳۰۴]

محو... نواب غلام حسن خان دہلوی

نواب الٰہی بخش معروف کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی، امراؤ بیگم غالب کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ چھوٹی صاحب زادی بنیادی بیگم کا نکاح نواب غلام حسین خان مسرور سے ہوا تھا، لیکن بدقسمتی سے اُن میاں بیوی میں نبھ نہ سکی اور ناچاقی ہوگئی۔ چنانچہ اُن سے علیحدگی کے بعد مسرور نے ایک عورت سنگی بیگم سے نکاح کرلیا۔ اِس بیوی سے اُن کے چار صاحب زادے ہوئے، غلام حسن خان محو اُن میں سب سے بڑے تھے۔ اس طرح گویا یہ زین العابدین خان عارف کے علاتی بھائی تھے۔ اُنھیں سرکارِ انگریزی سے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ محو نے ذوق اور غالب دونوں سے استفادہ کیا۔ شطرنج کا بھی شوق تھا۔ یہ بھی اُس سوسائٹی کے رکن تھے، جو ''جلسۂ شطرنج'' کے نام سے نواب علاء الدّین احمد خان نے ۱۸۶۶ء میں قائم کی تھی۔

اُنھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ایک کتاب ''نصرت نامۂ گورنمنٹ'' کے نام سے لکھی تھی۔ اسی کا خلاصہ خواجہ حسن نظامی نے ''غدر کا نتیجہ'' کے عنوان سے چھاپا ہے۔ (اُنھوں نے غلطی سے اِسے اُن کے والد کے نام سے منسوب کردیا ہے)

دل لگانے کا مزا دیکھ لیا آخرِکار
ہم نہ کہتے تھے کہ اے محو! پشیماں ہوگا

☆

قیدِ ہستی سے رہائی غیر ممکن تھی ہمیں
آج دم دے کر اجل کو ہوگئے آزاد ہم

☆

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں، اب بام پہ وہ بھی
اتنا تو ہوا ہے مرے نالوں کے اثر سے

☆

اندازِ جنوں کون سا ہم میں نہیں، مجنوں!
پر تیری طرح عشق کو رُسوا نہیں کرتے

(غدر کا نتیجہ : ۶ـ ۷، بزمِ سخن : ۱۰۴، سخنِ شعرا : ۴۲۲ـ۴۲۳)

مدہوش ... منشی سخاوت حسین انصاری بدایونی

(خان بہادر)

نسباً انصاری تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ کے جن مسلمانوں نے حضرت رسولِ کریم ﷺ کی نصرت اور حمایت کی تھی، وہ مہاجرینِ مکّہ کے مقابلے میں انصار کہلائے، مدہوش اُنھیں میں سے کسی خاندان کے نام لیوا تھے۔ اُن کے بزرگوں میں سے کوئی صاحب خاندانِ غلامان کے دوسرے بادشاہ التمش کے عہد میں ہندوستان آئے اور بدایوں میں بس گئے۔

مدہوش کے دادا میاں جی عبدالملک انصاری مارہرہ کی درگاہِ برکاتیہ (سرکارِ کلاں) کے سجادہ نشین شاہ آلِ احمد اچھے صاحب (ف : ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۳۵ھ/ ۳ جنوری ۱۸۲۰ء) کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ اُن کے زہد و ورع اور مجاہدات کے پیشِ نظر پیرو مرشد نے اُنھیں سندِ خلافت عطا فرمائی تھی، جس پر تاریخ ۱۷ محرم ۱۲۱۵ھ (۱۰ جون ۱۸۰۰ء) ثبت ہے۔ میاں جی عبدالملک کا پیر کے دن ۱۲ رمضان ۱۲۵۸ھ (۱۷ اکتوبر ۱۸۴۲ء) بدایوں میں انتقال ہوا اور وہ قاضی حوض، جانبِ غربِ شہر کے قریب قبرستان میں دفن ہوئے۔ مدہوش مدّتوں اُن کا عُرس کرتے رہے۔ ہر جمعے کو اُن کے مزار پر ختمِ قرآن ہوتا، مزار پر ایک حافظ مقرّر تھا۔ یہ سارے اخراجات مدہوش کرتے۔ خدا معلوم اب کیا حال ہے!

میاں جی عبدالملک کے تین بیٹے ہوئے۔ امان اللہ حسینی عرف خلیفہ تلّو،

میاں امداد حسین، شیخ محمدؐ عنایت حسین۔ منشی سخاوت حسین مدہوش انھیں چھوٹے صاحب زادے محمدؐ عنایت حسین کے خلفِ ارشد تھے۔ مدہوش ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم حسب دستور ہوئی، اگرچہ اُس کی تفصیل یا جن اساتذہ سے استفادہ کیا، اُس سے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ اُنھوں نے ایک جگہ منشی عزیز الدّین عزیز و صادق کے بڑے بھائی حکیم محمدؐ سعید الدّین کا بحیثیتِ استاد ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہو کر یہی پیشہ اختیار کیا۔ کام کا آغاز شاہجہان پور کی عدالتِ ججی سے ہوا، جہاں کے حلقے میں اُس زمانے میں ضلع بدایوں شامل تھا۔ شاہجہان پور کے قیام کے زمانے میں انگریزی سے بھی اچھی واقفیت پیدا کرلی تھی۔

اُن کی وکالت خوب چمکی۔ اُس سے جہاں مالِ دنیا حاصل ہوا، وہیں ہمچشموں میں عزّت اور راج دربار میں وقار بھی ملا۔ حکومت نے خطاب ''خان بہادر'' سے نوازا۔ وہ غالباً بدایوں کے پہلے خان بہادر تھے۔ برسوں شاہجہان پور میونسپل کمیٹی کے نائب صدر رہے۔ آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔

وہ سرسیّد اور ان کے مشن کے سرگرم مؤیّد تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (جو پہلے کانگریس کہلاتی تھی) کے بانیوں میں تھے۔ سرسیّد کی وفات کے بعد بھی وہ اس تحریک کے معاون رہے اور دامے، درمے، قدمے اُس کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ غالب کا ایک خط اُن کے نام ملتا ہے۔ افسوس کہ اُن کا منظوم کلام ضائع ہوگیا۔ اُن کے خطوط کا ایک مجموعہ ''رقعاتِ مدہوش مسمّی بہ شراب الکوثر'' کے عنوان سے اُن کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ (مطبع افضل المطابع و سعید الاخبار، بدایوں۔ ۱۸۷۹ء) اس کا دوسرا ایڈیشن اُن کے نواسوں نے ۱۹۶۳ء میں نظامی پریس بدایوں میں چھپوا کر شائع کیا۔ اُس کے شروع میں مدہوش کے حالات بھی ہیں۔ ایک اور رسالہ بھی ملتا ہے جس میں ''سررشتہ تعلیم'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اِس کا قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد کے کتاب خانے میں موجود ہے۔

مدہوش کا ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔ وہ شاہجہان پور سے بدایوں آرہے تھے کہ عرضِ راہ میں آنولہ (ضلع بریلی) کے ریلوے اسٹیشن پر (بظاہر حرکتِ قلب بند ہو جانے سے) فوت ہوگئے۔ لاش بدایوں آئی اور یہاں اپنے دادا کے قریب دفن ہوئے۔

مدہوش نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکا (شیخ میاں جان) پیدا ہوا تھا، اس کا مدہوش کی زندگی میں انتقال ہوگیا۔ دوسری بیوی سے ایک لڑکی (نیاز رسول) ہوئی، تیسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نیاز رسول کا نکاح فانی بدایونی کے چچا زاد بھائی منشی عبدالحمید خان سے ہوا تھا۔ اُن کی اولاد میں چار بیٹے (حامد سعید خان لودی، عابد سعید خان فنالودی، میجر زاہد سعید خان لودی۔ کرنل لیاقت سعید خان) اور ایک بیٹی امتیاز رسول ہوئی۔ خاندان کے پس ماندگان ہندوستان اور پاکستان میں مقیم ہیں۔

عابد سعید خان فنا نے اپنے کلام پر فانی سے اصلاح لی اور اُن کی وفات (۱۹۴۱ء) کے بعد مجتہد الدّین عیش بدایونی سے رجوع کیا، کچھ دن جعفر علی خان اثر لکھنوی سے بھی مشورہ رہا۔ دیوان ''رنگا رنگ'' چھپ چکا ہے (نظامی پریس، بدایوں۔ ۱۹۵۹ء)۔ ۳۰ نومبر ۱۹۷۲ء کو رحلت کی۔

[رقعاتِ مدہوش، غالب اور عصرِ غالب : ۱۴۶۔ ۱۵۴، خاندانِ برکات : ۹۔ ۱۰، تذکرۃ الواصلین : ۴۵، دید و دریافت : ۴۵۔ ۴۸۔ نیز ۱۶۹۔ ۱۷۲، ماہنامہ آجکل، دلّی (فروری ۱۹۶۰ء) : ۴۳۔ ۴۴، مکتوبِ فنالودی مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۶۰ء]

مشتاق... منشی بہاری لال دہلوی

خاندان کے کائستھ ماتھر تھے۔ والد کا نام راے من بھاون لال تھا، جن کا فروری ۱۸۶۸ء میں انتقال ہوا۔ مشتاق ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی امین الدّین (مؤلفِ قاطع القاطع) سے حاصل کی اور غالباً شاعری شروع کرنے کے بعد کچھ دن تک اُن سے مشورہ بھی کرتے رہے۔ فن خوش نویسی میں بھی مہارت تھی اور اِس میں مرزا عباد اللہ بیگ ''زمرد رقم'' و''اعجاز رقم'' کے شاگرد تھے۔ حکیم محمود خان اور حکیم غلام رضا خان دونوں کی خدمت میں آنا جانا تھا۔ اِسی واسطے سے غالب کے پاس پہنچے۔

حکیم محمود خان نے ایک اخبار ہفتہ وار ''اکمل الاخبار'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ مشتاق اُس میں کاتب اور ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۷ء میں یہاں سے علیحدہ ہوئے تو لالہ سری کرشن داس گڑ والے کے ہاں حساب کتاب رکھنے پر منشی مقرّر ہوگئے۔ گڑ والے دتی کا مشہور اور متموّل کاروباری خاندان تھا۔ ۷۲۔۷۳ برس کی عمر تھی، جب ستمبر ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا۔

مشتاق کے نانا منشی گھنشام لال بھی اچھے شاعر تھے۔ عاصی تخلص تھا اور شاہ نصیر کے ممتاز شاگردوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا، دہلی کائستھ اُردو سبھا کی طرف سے اُن کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اسی سبھا نے ۱۹۳۸ء میں مشتاق کے دیوان کا مختصر انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ مشتاق کے چھوٹے بھائی منشی گوری شنکر قیصر تھے، اور بیٹے منشی چند و لال شفق۔ مشہور اخبار نویس منشی رام رچھپال سنگھ شیدا، اِن ہی مشتاق کے

شاگرد تھے۔

مشتاق نے غالب کی وفات کے بعد حالی سے بھی اصلاح لی۔ اُردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے۔

میں بے وفا کہ غیر! یہ چپکے سے کیا کہا
کُھل کر کہو، کہ تم نے کسے بے وفا کہا

☆

سب جانتے ہیں اُن کے اشاروں کو بزم میں
کہنے کی بات ہے کہ کوئی رازداں نہ تھا

☆

اٹھے شوق میں یوں قدم تیز تیز
کہ رہبر کا میں رہنما ہوگیا

☆

غیروں نے بیٹھنے نہ دیا، جب کہیں مجھے
میں انجمن میں، منتظمِ انجمن ہوا

☆

تم ہو اپنی طرف کیے جاتے
ذکر کرتا ہوں میں زمانے کا

☆

یہ کہنا اور یہ کہنا، یہ کہتے ہوئے ہم آپ
قاصد کے ساتھ ساتھ گئے تا بہ کوئے دوست
مشتاق لاکھ ضبط کرو، رازِ عشق کو
چہرے سے ہے تمھارے عیاں جستجوئے دوست

☆

مدعا گریہ ہے، کچھ عشق کا اظہار نہیں
کیا کہوں تم سے، کہ کہنے میں دلِ زار نہیں
سب طرح سے تو وہ اچھے ہیں، پر اچھے کیا ہیں
اک یہی عیب ہے کیسا کہ وفادار نہیں
یاں یہ منظور، کہ مطلب کو زباں پر لائیں
واں ہے انگشت لبوں پر کہ خبردار، نہیں
سچ تو یہ ہے کہ، ہے مشتاق عدو سے اچھا
ورنہ بندہ تو کسی کا بھی طرف دار نہیں

☆

تو ساتھ ہو ہمارے، تو دوزخ بہشت ہے
گر تو نہیں، تو خلد جہنم سے کم نہیں

☆

ساتھ مشتاق کے چلتے ہو، رفیقو! لیکن
دشتِ وحشت میں نہ کہنا، "کہیں منزل آئے"

☆

تم اپنی تیزیِ رفتار دیکھو
نہ پوچھو کچھ مری عمرِ رواں کی
وہ میرے رازِ دل کو جانتے ہیں
نہیں مشتاق! کچھ حاجت بیاں کی

فارسی کا نمونہ یہ ہے:

رموزِ عشق و اسرارِ مے و معشوق پرس از من
حدیثِ زہد و تقویٰ رانمی دانم، نمی دانم

☆

غم مخور از حشر، پیش از مرگ واویلا چرا
برامیدِ بخششِ حق، شاد باید زیستن

☆

بدیں امید خود را خاک کردم
کہ خاکم گردِ صحراے تو باشد

(دیباچۂ دیوان مشتاق، صحیفۂ خوش نویساں : ۹۵، ۱۲۲، تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود : ۱۲۱)

مظہر... حاجی محمد اسحاق عرف مظہر الحق دہلوی

ہریانہ کے رہنے والے اور مولوی محمد ظہور علی ظہور کے چھوٹے بیٹے تھے۔ سلسلۂ نسب والد کی طرف سے محمد بن ابوبکر صدیق خلیفۂ اول سے اور والدہ کی جانب سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ اُن کی والدہ مولوی فضل علی کی دخترِ نیک اختر تھیں، جو حضرت شیر محمد قادری برہان پوری کے اخلاف میں سے تھے۔

ان کے جدِّ امجد شیخ کریم الدّین سب سے پہلے بخارا سے ہندوستان آئے۔ وہ چند دن روہتک میں قیام کے بعد پہلے جھجر میں اور بالآخر دادری میں ساکن ہوگئے۔ ظہور خود شاہ نصیر دہلوی اور احسان اور مومن کے شاگرد تھے۔ غالب نے مظہر کے تذکرۂ شعرائے فارسی پر جو تقریظ قلم بند کی تھی، اُس میں اُن کی علمی استعداد اور قلمی خدمات کا اعتراف کیا ہے، لکھتے ہیں:

> بمقتضائے فحوائے ''الولد سر لابیہ'' مولانا محمد ظہور علی صاحب زاد مجدہ آں کہ بر نثر ہائے پیشیناں چناں حاشیہ ہائے خرد افزا نوشت کہ ہر ماتن در کنج لحد آفریں گوے اُوست۔ شرح نگاری ایں چنیں ہمہ دان راسزد، نہ آں خیاراز چنار شناساں راکہ چوں خواہند، در شرحِ کلامِ سلف، کوسِ شہرت زنند۔ بچ رقعہ و زنانہ بازار ارادت خان واضح راترا دیدۂ رگِ پردیں نگارد پرن یار مولانا نور الدّین ظہوری وانمایند۔

ظہور علی کے والد فتح علی خان (۱۱۶۵۔۱۲۴۳ھ) تھے خود ظہور کا نام تاریخی ہے، جس سے سالِ ولادت ۱۲۲۱ھ نکلتا ہے۔ اُن کا مطبوعہ دیوان موجود ہے بہادر شاہ

ظفر نے اُنھیں خطاب ''شمس الشعرا'' عطا کیا تھا۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ مفتی صدر الدّین آزردہ کی مشہور تاریخِ وفات اُنھیں کی کہی ہوئی ہے۔ اُن کی ۱۲۸۶ھ میں وفات ہوئی، ''غفور'' مادّہ تاریخ ہے۔ مظہر اِن ظہور کے مجھلے بیٹے تھے۔ یہ دلّی میں ڈپٹی کلکٹر ریٹی گن صاحب☆ کے منشی تھے۔ معلوم نہیں کیسے ریٹی گن صاحب کو شعرائے ہند کا تذکرہ انگریزی زبان میں لکھنے کی سوجھی۔ وہ غالب کو جانتے تھے کیوں کہ اُنھیں ہر مہینے اپنی خاندانی پنشن وصول کرنے کے لیے اُن سے بحیثیت مہتمِ خزانہ ملنا ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر اُنھوں نے تذکرہ مرتب کرنے میں غالب سے مدد چاہی، اور مظہر کو اُن سے مواد حاصل کرنے پر تعینات کردیا۔ غالب نے نیّر رخشاں سے لے کر سات کتابیں (غالباً حالاتِ شعرا پر مشتمل) اُن کے پاس بھیج دیں اور پھر خود اُن کی فرمائش پر ۱۶ شعرا کے حالات، نام، تخلّص، تلمذ وغیرہ لکھ کر بھیج دیے۔ غالب نے اپنے حالات بھی تفصیل سے ایک جگہ لکھے ہیں، یہ اُن کے اپنے خط میں چھپ چکے ہیں، گمان غالب ہے کہ یہ حالات بھی اُنھوں نے اسی تذکرے کے لیے قلم بند کیے تھے۔

ریٹی گن نے غالباً یہ کتاب اشاعت کی خاطر ولایت بھیج دی تھی، لیکن اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بہرحال اُن کے بعد مظہر الحق نے اپنے طور پر اس تذکرے کا کام جاری رکھا اور اس طرح کوئی ۱۶۰۰ شاعروں کے حالات جمع کردیے تھے اور اس کے لیے غالب سے ایک تقریظ بھی لکھوائی تھی جو ان کی کُلّیات نثر فارسی میں شامل ہے۔ لیکن یہ تذکرہ غالباً طبع نہیں ہوا، اور اس کا مسودہ بھی خدا معلوم کیا ہوا!

بشیر نے لکھا ہے کہ مظہر صاحب دیوان بھی تھے۔ اُن کا دیوان کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ اُنھوں نے کلام پر اصلاح اپنے والد اور غالب سے لی۔

مظہر اخیر میں نواب پاٹودی کے ہاں اتالیق ہو کر چلے گئے تھے۔ اسی زمانے میں وہاں تحصیل دار بھی رہے۔ افسوس کہ کلام نہیں ملا۔

[تذکرۂ بشیر، مشمولۂ سہ ماہی اُردو، کراچی ۴۵۔ ۱ : ۲۴۳، قومی

زبان (ماہنامہ، کراچی) فروری ۱۹۸۳ء : ۱۲۔ ۱۳، معاصر (۱): ۱۶۰، معاصر (۲) : ۴، احوالِ غالب : ۲۴۔ ۲۷، کلیاتِ نثرِ غالب (طبع اول) : ۴۵، اردوئے معلّیٰ : ۷۲۔ ۷۳]

حواشی

☆۔ ریٹی گن صاحب (Rattigan) بعد کو پنجاب کے اضلاع میں ڈپٹی کمشنر اور ہائی کورٹ میں رہے۔ بڑے دبدبے اور طنطنے کے آدمی تھے۔ اگر کوئی شخص بارعب اور صاحب حیثیت (اور کسی حد تک نک چڑھا بھی) ہو، تو کسی زمانے میں ایسے آدمی کو پنجاب میں ''راٹی کین'' کہا کرتے تھے (شاید اب بھی کہا کرتے ہیں) یہ لفظ ''ریٹی گن'' ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ پنجاب ہائی کورٹ کی ججی کے زمانے میں اس کے اختیار و وقار اور فیصلوں نے اس لفظ کو جنم دیا تھا۔

معجز... منشی آغا علی سہسوانی

حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کی کہی ہوئی مندرجہ ذیل تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں وفات پائی۔

رفت چوں آغا علی ازدارِ فانی یک بیک
زد رقم تسلیم محزوں بہرِ سالِ ماتمش
طبع بیتابی گرفت و نالہ را بگوید دل
''دست، افسوس'' آشنا شد سربسر اندر غمش
(۱۲۹۷=۲۰۷+۴۶۴+۳۴+۸۶+۴۲۵+۸۱)

[تاریخ سہسوان (از سید اعجاز احمد معجز سہسوانی، بحوالۂ دوماہی، اکادمی، لکھنؤ، ۱۰: ۴۸]

مغلوب... سیّد افتخار الدّین رامپوری

سیّد کفایت اللہ کے بیٹے تھے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ـ ۱۸۶۵ء) میں عین جوانی میں صرف ۲۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔غالب کے علاوہ میر احمد علی رسا☆ سے بھی اصلاح لی تھی۔

کون سے ناز کا مغلوب ہے بسمل، قاتل!
جس کی ہچکی میں بھی آواز ہے قاتل قاتل
ایک مغلوب کا جھگڑا تھا، سو وہ مر ہی گیا
جس سے جی چاہے ترا، اس سے تو اب مل قاتل

☆

کس کے عارض کا تصوّر، دلِ ناداں ہے تجھے
آئنہ کس نے دکھایا ہے کہ حیرانی ہے
تم اگر ایک ہو صورت میں، تو وہ الفت میں
تم جو یکتا ہو، تو مغلوب بھی لاثانی ہے

(انتخابِ یادگار: ۳۴۵ـ ۳۴۶)

حواشی

☆۱۔میر احمد علی رسا، جناب سیّد امام الدّین رامپوری کے صاحب زادے تھے۔ بزرگوں کا وطن بخارا تھا، جہاں سے ان کے پردادا سیّد محمود علی ہندوستان آئے۔ سلسلۂ نسب امام علی نقی سے ملتا ہے نواب کلب علی خان کے عہد میں ریاست سے تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تاریخ میں اچھی مہارت تھی۔ نہایت وارستہ مزاج اور شوقین طبع شخص تھے۔ کلام پر شیخ علی بخش بیمار سے اصلاح لی، لیکن اپنی آزاد طبعی کے اقتضا سے دیوان مرتب نہیں کیا۔ پنج شنبہ ۶ محرم ۱۳۰۹ھ (۱۲ اگست ۱۸۹۱ء) تقریباً ۷۵ برس کی عمر میں عالمِ فانی سے کوچ کیا۔ رام پور میں حضرت جمال اللہ صاحب کے مزار کے باہر دفن ہیں۔ ان کے بیٹے سیّد محمد عابد حسین اوج تخلص کرتے تھے۔ (انتخابِ یادگار: ۱۳۶، مسدسِ بینظیر: ۴۹ـ۵۲، دبدبۂ سکندری، رام پور، ۱۷ اگست ۱۸۹۱ء)

مفتون... پنڈت لچھمی نرائن مشران فرّخ آبادی

پنڈت گوردھن داس مشران کے صاحب زادے اور فرّخ آباد کے روٴسا میں سے تھے۔ اُن کے بزرگ کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے اور طوائف الملوکی کے زمانے میں وہاں سے نقلِ مکان کر کے ہندوستان چلے آئے اور فرّخ آباد میں سکونت اختیار کرلی۔ پنڈت گوردھن داس کلکٹری میں سررشتہ دار مال تھے۔ اُنھوں نے اپنی فرض شناسی اور حسنِ کارکردگی سے بہت نیک نامی حاصل کی۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد تجارت کرنے لگے، اُس میں بھی بہت کامیاب رہے۔ بہادر شاہ کی طرف سے اُنھیں ''انتظام الدّولہ، ممتاز الملک مہاراجا گوردھن داس بہادر دیوانِ اعلیٰ'' خطاب ملا تھا۔ چندے نواب تجمل حسین خان والیِ فرّخ آباد کی سرکار میں مدارالمہامی کے فرائض انجام دیے۔ یہ وہی تجمل حسین خان ہیں جن سے متعلق غالب کا شعر ہے:

دیا ہے خلق کو بھی، تا اسے نظر نہ لگے

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

نواب تجمل حسین خان کے جانشین تفضل حسین خان بھی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے معتوب ہوے تھے۔ اُنھوں نے دیارِ حجاز میں پناہ لی اور وہیں بہت عسرت کی حالت میں وفات پائی۔ ریاست انگریزوں نے ضبط کرلی۔

مفتون بھی اپنے والد کی طرح انگریزی حکام کے حلقے میں بہت معزّز اور صاحب اثر تھے۔ اپنے زمانے میں فرّخ آباد کے میونسپل کمشنر رہے۔ آنریری مجسٹریٹ کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ ۱۸۷۷ء کے دربارِ دہلی میں سندِ خوشنودی عطا ہوئی تھی۔

۶۶ برس کی عمر تھی، جب یکم نومبر ۱۸۸۷ء کو وفات ہوئی۔

مفتون کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ فارسی پر فاضلانہ نظر تھی۔ خوش نویسی اور خطِ نستعلیق میں مشہورِ زمانہ استاد میر علی بخش حسینی کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور غالب سے اصلاح لیتے تھے۔

اُن کے صاحب زادے پنڈت شام نرائن مشران مدّتوں ریاستِ بڑوانی میں تحصیل دار رہے۔ اُردو، فارسی، انگریزی کی اعلیٰ قابلیت کے علاوہ عربی اور سنسکرت میں بھی دخل تھا۔ شاعری ورثے میں پائی، یکتا تخلص تھا۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے اور اپنے والد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ ان کا ۶۲ برس کی عمر میں ۲۸ اگست ۱۹۰۴ء کو انتقال ہوا۔

کلامِ مفتون کا مختصر انتخاب یہ ہے:

لگا ہے زخمِ کاری خنجرِ ابروئے قاتل کا
تماشا خانۂ دل میں ہے رقص مرغِ بسمل کا

نہ سمجھو بے سبب پُرداغ ہونا ماہِ کامل کا
سفیدی پر نشاں ہوتا ہے دودِ شمعِ محفل کا

چبھے ہیں نیشِ غم از بس غمِ خوبانِ عالم میں
مثالِ خانۂ زنبور ہے نقشہ مرے دل کا

دل افسردہ ہوا بے مہریِ خوباں سے اے مفتوں
نہ ہو باور، تو ہے اللہ واقف حق و باطل کا

☆

کیا کیا نہ آئیں دل میں مرے بدگمانیاں
شب دیکھ کر کھلے ہوئے بندِ قبائے دوست

بدخواہ اپنا کون ہے، ہمدم! سوائے دل
دشمن ہمارا کون ہے مفتوں سوائے دوست

☆

عمر گزری کہ تری راہ میں ہم بیٹھے ہیں
پر ابھی شوق یہ کہتا ہے کہ، کم بیٹھے ہیں
واہ قسمت! کہ لبِ بحر پہ ہم مثلِ حباب
خالی کاسہ لیے بادیدۂ نم بیٹھے ہیں
کیوں کہ بیت الصنمِ عشق سے اُٹھیں مفتوں!
اب تو اللہ کی ہم کھا کے قسم بیٹھے ہیں

☆

سامری آخر اسیرِ دامِ الفت ہوگیا
چشمِ فتاں میں تری جادو کا سرمہ دیکھ کر

☆

یک نفس گربگورد، موجِ شمیمِ زلفِ تو
خانۂ عطار گردد رخنۂ دیوارِ ما
دشت از یادِ رُخِ پُرنور روشن کردہ ایم
مشعلِ طوُر است خارِ وادیِ پُرخارِ ما

☆

از نویدِ وصل تا بر خویشتن بالیدہ ام
مثلِ چشمِ اغنیا تنگ است پیراہن مرا

☆

مومن! بیا ببیں، کہ دل افروزِ قدسیاں
چوں شمعِ کعبہ است، چراغِ کنشتِ ما

☆

روے اُو ہر کہ دیدہ می آید
پیرہن را دریدہ می آید

دستِ من کے رسد بدامانش
اُو کہ دامن کشیدہ می آید
چہ خوشا قسمتم کہ قاتلِ من
پے قتلم دویدہ می آید
بتِ بے رحم برسرِ مفتوں
تیغِ ابرو کشیدہ می آید

☆

جاں نثارش کنم اینک ز الم، اے مفتوں!
کارِ امروز چرا باز بفردا افگنم
(بہارِ گلشنِ کشمیر،۲: ۴۰۳۔ ۴۰۸، ایضاً: ۱۱۷۔ ۷۳۰)

مقصود... مولوی مقصود عالم رضوی پہانوی

خاندانِ سادات میں سے تھے۔ اِن کے والد مولوی سیّد صدرِ عالم بھی شاعر تھے، مسرور تخلّص تھا اور لکھنؤ کے مضافات میں قصبۂ پہانی کے رہنے والے تھے۔ یہ وہی پہانی ہے جہاں کے میران صدر جہان تھے، جو اکبر بادشاہ کے عہد میں اوّل ممالکِ محروسہ کے منصبِ افتا پر اور بعد کو عہدۂ صدارت پر مقرّر ہوئے۔ جہانگیر نے ایامِ شاہزادگی میں اُن سے چہل حدیث کا درس لیا تھا۔

مقصود نے فارسی میں اپنے والدِ بزرگوار سے اور اُردو میں نواب عاشور علی خان بہادر لکھنوی سے مشقِ سخن کی۔ سنِ کہولت میں غالب کی خدمت میں اصلاح کی درخواست لے کر دلّی پہنچے۔ غالب نے انھیں ''شمس الشعرا'' خطاب دیا اور اُن کا کلام بنظرِ اصلاح دیکھا۔ پچاس برس کی عمر میں وفات پائی۔

معلوم ہوتا ہے کہ علمی اور ادبی نوک جھونک سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں لکھنؤ میں یہ بحث چھڑی تھی کہ لفظ ابتشار (بشارت سے افتعال کا وزن) درست ہے یا نہیں؟ اس میں بہت لوگوں نے حصّہ لیا۔ ایک استفتا تیار کر کے مجتہد العلما سیّد محمّد صاحب، مفتی میر عبّاس، غالب، دبیر کے پاس بھیجا گیا تھا۔ یہ سارا مجموعہ معارضۃ النثر (مرتبہ مقبول عالم مقبول) کے نام سے ۱۸۶۱ء (۱۲۷۸ھ) میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اِس علمی مباحثے میں مقصود سب سے پیش پیش تھے۔ غالب کے بعض خطوط بھی مقصود کے نام اس مجموعے میں شامل ہیں۔

مثنوی شکرستانِ معنی، سکندرنامہ، مقصود الصنائع وغیرہ پچاس کے قریب کتابیں

لکھیں۔ بقولِ نادر "صاحب دواوین، ہندی و فارسی و مثنویات و انشا و عروض و شرح و دیگر تصانیفِ کثیرہ تھے۔ ان کے صاحب زادے سیّد خورشید عالم بھی شاعر تھے، خورشید اور عبرتی دو تخلص کرتے اور اُنھیں سے اصلاح لیتے تھے۔

مقصود، اُردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

مطلب نہ روم سے ہے، نہ کچھ شام سے غرض
ہے کام رُخ سے، زلفِ سیہ فام سے غرض

وہ ساقیِ ازل نے پلائی ہمیں شراب
آغاز سے غرض ہے، نہ انجام سے غرض

کہنے سے دوستوں کے فقط یہ کہی غزل
مقصود! کچھ نہیں ہے ہمیں نام سے غرض

☆

بے جا نہیں ہے زلف کا ابرو سے ارتباط
اکثر رہا ہے سانپ کا بچھو سے ارتباط

مقصود! کھینچنی ہے مجھے زلف کی شبیہ
رکھتا ہوں اس لیے قلمِ مُو سے ارتباط

☆

نہ کیوں ہو محوِ رُخِ رشکِ بوستاں محظوظ
گلوں کو دیکھ کے ہوتا ہے باغباں محظوظ

خرامِ ناز کی چالیں، ہیں رشکِ بادِ بہار
برنگِ شاہدِ گلشن ہیں باغباں محظوظ

☆

آئے بالیں پر اگر وہ یارِ جانی وقتِ نزع
پھر نئے سر سے ہو میری زندگانی وقتِ نزع
زندگی تک ہے ہر اک فردِ بشر کو افتخار
قیصر و فغفور بھولے لن ترانی وقتِ نزع

☆

وہ مہ جو بام پہ اپنے کبھی جلائے چراغ
تو شمعِ طور سے بڑھ کر فروغ پائے چراغ
مثالِ شمع سحر تک وہ جل بجھے، مقصود!
جو ان کے رُخ سے مری طرح لَو لگائے چراغ

☆

لے چلی تھی الفتِ احباب محفل کی طرف
کھینچ لائی آرزوئے قتل، قاتل کی طرف
بہ گئی طوفانِ دریائے فنا میں، اے اجل!
کشتیِ عمرِ رواں آئی نہ ساحل کی طرف

☆

شب کو جو مرے خواب میں بھی آتے ہیں معشوق
دیدار دکھاتے ہوئے شرماتے ہیں معشوق
رفتار سے، قامت سے، اشارے سے، نگہ سے
انداز قیامت کے دکھا جاتے ہیں معشوق
عشرت کدۂ جشن بنا ہے دلِ مقصود
مضمون کے ہر روز نئے آتے ہیں معشوق

☆

سرو و شمشاد سے ہے وہ قدِ آزاد الگ
جیسے مضموں کسی شاعر کا خداداد الگ

دوست وہ ہے کہ رہے دوست کا مشکل میں شریک
مجھ سے فرقت میں نہ ہو، اے دلِ ناشاد الگ
کشورِ ہند میں مقصود! ہر اک شاعر سے
میرے استاذ میں ہیں وصفِ خداداد الگ

☆

ملائے خاک بھلا، آنکھ آدمی تم سے
خفیف حور ہے تم سے، مخجل پری تم سے
یہ کیا ستم ہے، زمانہ بنا ہے دشمنِ جاں
غضب میں جان پڑی، کی جو دوستی تم سے
ہنسی کی بات پہ تم، اس قدر بگڑتے ہو
تو جاؤ، آج سے موقوف ہے ہنسی تم سے

☆

خارِ بیابانِ جنوں، خاکِ دیارِ بے کسی
گاہے زپا، گاہے زسر، آں ہم گزشت ایں ہم گزشت
گاہے بہار از گلستاں، گاہے خزاں از بوستاں
ہرنگِ آہِ بے اثر، آں ہم گزشت، ایں ہم گزشت
مقصود! آں قیسِ حزیں، ویں قلبِ وحشت آفریں
دروشت بے خوف وخطر آنہم گزشت، ایں ہم گزشت

غالب کی وفات پر دو قطعاتِ تاریخ کہے تھے:

از انتقالِ حضرتِ غالب مپرس حال
غمناک از الم دلِ قدسی مطالب است
اے فکر! سیرِ چرخِ چہارم مقدّم ست
ہر سانحہ نگار پےِ سال طالب است

مقصودا! زد ندا ز نجف عیسیٰ سروش
"صد سال مژدہ با اسد اللہ غالب است"
(۱۸۶۹)

دوسرے قطعے کے آخری تین شعر ہیں:

علم در ہند نامش بود اوستادِ شہِ دہلی
فدائے اہلِ بیت و عاشقِ محبوب سبحانی
دوشنبہ روز و تاریخ دوم بودہ ز ذی القعدہ
زوالے برزوال آمدز مرگِ خسروِ ثانی
بود محشور، یارب! باعلی روزِ جزا مصلح
ہجری ازسرِ ایماں نشانِ رحلتش خوانی
(۱۲۸۵)

[سخنِ شعرا: ۴۵۴، خم خانہ جاوید، ۳: ۸۲، ایضاً ۵: ۵۷۳، صبحِ گلشن: ۴۴۰ـ ۴۴۱، تذکرۂ نادر: ۱۵۰، گلدستۂ شعرا، لکھنؤ جلد ۱، شمارہ ۲۰ـ ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵]

منصور... حافظ مصلح الدّین اکبرآبادی

اُن کے والد آگرہ کمشنری میں محرّر تھے۔ مولوی رحیم الدّین وکیلِ صدر دیوانی اُن کے چھوٹے بھائی تھے۔ منصور نے ۱۳۰۰ھ کے لگ بھگ انتقال کیا۔

اُردو فارسی دونوں میں شوق فرماتے تھے۔ اُردو کلام پر اصلاح غالب سے لی اور فارسی میں محمد امین احسن☆ بلگرامی سے استفادہ کیا۔

منصور کیوں نہ بہکے، ذرا غور کیجیے!
ٹھرّے کے پینے والے کو دے دی کڑی شراب

☆

دار پر کھنچ کے بھی منصور کی عادت نہ گئی
اب رگِ جاں سے بھی آوازِ انا آتی ہے

☆

مرہمِ زنگار را درباغِ زخم
سبزۂ بیگانہ می دانیم ما

(نہالستانِ نثار: ۲۰، روزِ روشن: ۶۵۶)

حواشی

☆۔ مولوی محمدّ احسن احسن خلف محمدّ احمد بلگرامی، سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدّیق تک پہنچتا ہے۔ ۱۲۴۴ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے، لیکن صفی پور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ابتدائی تعلیم ۱۸ برس تک اپنے والدِ ماجد سے پائی اور تکمیل لکھنؤ میں کی۔ اُردو فارسی نظم و نثر میں دست گاہِ کامل تھی اور ان میں علی الترتیب مولوی احسان اللہ ممتاز اُنامی اور گل محمد خان ناطق مکرانی سے اصلاح لی۔ پہلے نواب مختار الملک مدارالمہام حیدرآباد کی سرکار سے وابستہ تھے، پھر بھوپال آکے نواب صدّیق حسن خان بہادر کے صاحب زادوں کی تعلیم پر مقرر ہوئے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی کہتے رہے، لیکن زیادہ مزاولت فارسی سے تھی (صبحِ گلشن: ۱۵۔ ۱۶)

مونس ... پنڈت شیو جی رام دہلوی

اِن کا مختصر دیوان گیان پریس، دہلی سے ۱۸۸۱ء میں چھپا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ جا بجا غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ابتلا کے زمانے میں استاد کے ہمدرد اور جلیس رہے، غالب نے دستنبو میں اُن کا شکریہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ہے سبب کچھ تو! پر نہیں معلوم
کیوں ہے دل آج بے قرار اپنا

☆

شعر کہنا سخت مشکل ہے، مگر غالب گواہ
مونس ہے شاگرد، استادِ زماں مغفور کا!

☆

مونس! نہیں سُنا ہے، کسی کا کسی طرح
حاصل بتوں سے دل کا کبھی مدّعا ہوا

☆

تیرے مرنے کی خبر سُن کر وہ مونس! غیر سے
کہتے ہیں، اچھا ہوا، وہ مرگیا خانہ خراب

یار سے ملنے کی میری کوئی تدبیر نہیں
کیا چلے پیش وہ تدبیر، جو تقدیر نہیں

☆

کافی نگاہِ لطف تری ہے، اگر رہے
تو مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں

☆

کس طرح دل کو غم و رنج سے آزاد کریں
نہ رہی بات وہ جس بات پہ دل شاد کریں
ہم کہیں، تم نہ سنو، تم کہو، ہم دل سے سنیں
جز تمھارے، کہو، کس شخص سے فریاد کریں

☆

جلوہ دِکھا رہے ہیں وہ بیٹھے نقاب میں
معنی میں وہ ظاہر ہیں، بصورت حجاب میں.

☆

ہوگیا عشق میں یہ حال ہمیں
آپ اپنا نہیں خیال ہمیں

☆

کیا بات ہے، کہ دیکھ کے دیدار یار کو
رہتی نہیں ہے تاب دلِ بے قرار کو

☆

تھیں تو سچ ناصح کی باتیں، پر وہ جوشِ عشق میں
خوش نہ آئی ایک بھی اُس نے جو سمجھائی مجھے

☆

ہم نشیں! حالِ شبِ فرقت نہ پوچھ
دل پہ جو گزری، گزر کر رہ گئی

☆

ناصحا! کہہ نہ بار بار مجھے
اُس سے اُلفت ہے بے شمار مجھے

(بہارِ سخن: ۳۴۴۔۳۴۵)

میکش... میر احمد حسین دہلوی

میر کرّار حسین کے خلفِ رشید (روزِ روشن : کرامت حسین۔ غلط) دلّی کے سیّد زادوں میں سے تھے۔ سلسلۂ خاندان نواب شائستہ خان سے ملتا ہے۔ فارسی، عربی کی استعداد اچھی تھی۔ عربی میں اخون فیض احمد کے شاگرد تھے، جو جامع مسجد دہلی میں تعلیم دیتے تھے، شاعری میں پہلے صہبائی سے اور بعد کو غالب سے مشورہ رہا۔ چندے صدر امین اوّل دلّی کی کچہری میں عہدۂ وکالت پر کام کیا۔ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶۔ ۱۸۲۷ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں بعمر ۳۱ سال ایک گورے کی گولی کا شکار ہوئے۔ غالب کی مشہور تصنیف ''پنج آہنگ'' کا میکش کا ۱۲۵۱ھ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور، کے ذخیرۂ شیرانی میں موجود ہے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر کے ترجمے میں غالب کی حسب ذیل رباعی میں میکش سے یہی مراد ہیں:

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم
شانِ دگرو شوکتِ دیگر داریم
درمیکدہ پیریم، کہ میکش ازماست
در معرکہ تیغیم، کہ جوہر داریم

میکش زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

گفتمش دی : باکہ می رفتی خراماں سوے باغ
گفت : ''میکش بودہ باشد، کان گرفتارِ من ست''

☆

اے آں کہ در شب ہاے غم اندر دلِ من بگوری
خون ست ایں جاموجزن، دامن نگہ دار از تری
از ہر دو جانب موے تو، آویختہ بر روے تو
اے بستۂ گیسوے تو ہم زُہرہ وہم مشتری
براوجِ شوقت نارسا، پروازِ عالی فطرتی
در ملکِ عشقت ناروا، پروانۂ نیک اختری
یادِ خرامِ نازِ تو، واں خوبیِ اندازِ تو
درکلبۂ من بوریا گسترده ازبالِ پری
کبکِ دری در رہروی، ناکردہ باتو ہمسری
سرو سہی در راستی، ناختہ با تو ہمسری
[گلستانِ سخن : ۴۴۳، نگارستانِ سخن ۱۱۴، روزِ روشن، ۶۶۸ـ ۶۶۹، طبقات الشعراے ہند : ۴۰۸ـ ۴۰۹، اُردوے معلّیٰ، ۱۶۸، فہرست مخطوطاتِ شیرانی، ۲ : ۲۵۱]

میکش و محوی... ارشاد احمد دہلوی

شیخ عبدالقادر (میر قادر علی۔ آثار الشعرا) ساکن قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر (من مضافات دہلی) کے صاحب زادے تھے لیکن میکش کی ساری عمر دتی میں گزری۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شوق تھا۔ اُردو میں میکش اور فارسی میں محوی تخلص کرتے تھے۔ غالب کے علاوہ صہبائی سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ آخر عمر میں بھوپال چلے گئے تھے اور وہاں نواب نظیر الدّولہ سلطان دولہ میاں احمد علی خان بہادر (عُلیا حضرت نواب سلطان جہان بیگم کے شوہر) کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔

ربطِ نہانِ غیر کا پردہ ہے، ورنہ آپ
دشمن کے ساتھ صرفہ کریں، رسم و راہ میں

☆

ستانے میں فلک کو مشورہ ہے
کسی بے رحم کی چینِ جبیں سے
سرشکِ گرم کی حدّت کو پوچھو
مرے دامن سے، اپنی آستیں سے

☆

سچ سہی فتنے سب قیامت کے
لیکن آگے تمھارے قامت کے!

فارسی کے چند شعر بھی ملاحظہ ہوں :

بازلفِ درازِ اُو، در آویخت
یارب! چہ بلاست، ایں دلِ ما

☆

بارحمت، گناہ نکردن، گناہِ من
دستوریِ گناہ ندادن، گناہِ کیست!

☆

واعظا! زبانِ خویش نداری نگاہ، ہاں
انصاف می دہی، کہ بدارم نگاہِ دل

☆

کہ کردہ است براحوالِ غیر رحم، بگو
گرفتم ایں کہ توہرگز بستم شعار نہ

☆

باش، مطرب! زسرودن، کہ کشودن نتواں
غنچۂ خاطرِ افسردہ، بزورِ نفسے

[صبحِ گلشن: ۳۸۸، آثار الشعرا: ۲۱۰، طورِ کلیم: ۱۰۷۔ ۱۰۸]

مینا... مولانا احمد حسین مرزا پوری

ہوسکتا ہے کہ یہ اور تمنا مرزا پوری (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ایک ہی شخص ہوں۔ یعنی مینا اور تمنا میں تصحیف ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک ہی نام کے دو الگ الگ شخص ہوں۔ صفدر مرزا پوری کے مرتبہ ''مرقعِ ادب'' میں یہ دو شعر نظر پڑے :

ادائے یوسفی ہے لوٹ قاتل کے لڑکپن پر
سوادِ دیدۂ یعقوب کے دھبّے ہیں دامن پر

نزاکت اُن کی وقتِ قتل، مقتل میں یہ کہتی ہے
یہ اتنے خونِ ناحق جس سے اٹھیں اس کی گردن پر

[مرقعِ ادب ۲ : ۱۹۔۲۰]

نادم... فخر الدّین رامپوری

اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شوق کرتے تھے۔ اخبار الصّنادید میں اُن کی مندرجۂ ذیل تاریخیں نظر سے گزریں۔ نواب حامد علی خان بہادر مرحوم والیِ رام پور کے صاحب زادے حسن علی خان کی تاریخِ ولادت ہے:

طلوعِ اخترِ اقبال گردید
بہ برجِ خسروِ جمشیدِ دوراں
فلک شد انجمن آرائے انجم
بہ چرخِ سومیں ناہید رقصاں
عطارد، مشتری رامژدہ بخشید
"بہ برجِ مہر بیں شد ماہِ تاباں"

قلعہ رام پور کی تاریخِ تعمیر کہی:

قلعہ جو بنایا ہے سرکار نے
کہ ہر وقت جس میں برستا ہے نور
لکھی اس کی تاریخ نادم نے یوں
"بنا خوب [جب] قلعۂ رام پور"
(۱۳۳۰ھ)

[اخبار الصّنادید، ۲: ۳۸۰، ۴۵۶، ۴۵۷]

ناصر... سیّد ناصر الدّین حیدر خان عرف یوسف مرزا لکھنوی

نواب حسام الدّین حیدر خان کے نواسے اور ناظر حسین مرزا کے بھانجے تھے۔ ناظر حسین مرزا سے بڑی ایک بہن قدسیہ بیگم عرف حسینی صاحبہ تھیں۔ یہ سیّد محمّد نصیر عرف نواب جان سے بیاہی گئیں۔ (غالب نے مجروح کے نام ایک خط میں غلطی سے ان کا نام نصیر خان لکھا ہے)۔ یہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوئے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں باندہ سے گرفتار ہو کر لکھنؤ لائے گئے۔ پہلے حبسِ دوام کی سزا ملی، جو بعد کو پھانسی میں تبدیل ہوگئی (۱۸۶۰ء) یوسف مرزا اُنھیں کے بیٹے تھے۔

یوسف مرزا بھی ۱۸۵۷ء کے بعد بہت دن تک پریشان حال پھرتے رہے۔ آخر الور میں پناہ ملی۔ یہ مہاراجا کے مزاج میں بہت دخیل ہوگئے تھے اور وہ اُن سے بہت خوش تھے۔ پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر تھا اور اِس کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ لازماً الور ہی میں رہیں۔ البتہ یہ شرط ضرور تھی کہ اگر باہر رہیں تو سال میں دو ایک مرتبہ ضرور یہاں آئیں۔ طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ ایک لطیفہ سنیے۔ اُن کے ایک چچا کا نام سیّد محمّد رضا تھا۔ اُن کے ایک دوست نواب محمّد رضی خان تھے۔ یوسف مرزا نے رضی کی ''ی'' کو یاے تانیث قرار دیا اور چوں کہ سیّد محمّد رضا اُن کے چچا تھے، اِس لیے نواب محمّد رضی خان کو چچی کہنے لگے۔ غریب نواب تمام لکھنؤ میں ''محمّد رضی خان'' چچی

کے نام سے مشہور ہوگئے۔

۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲۔ ۱۸۸۳ء) میں وفات پائی۔ نور باڑی لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ میر مہدی مجروح کی لکھی ہوئی تاریخِ وفات کا آخری شعر ہے:

چنیں گفت رضوان سنینِ وفات
"بیاسیّدم در بہشتِ بریں"
(۱۳۰۰ھ)

افسوس کہ کلام ضائع ہوگیا، اتفاق سے ایک شعر ملا ہے:

ترشنے سے بتوں کے بڑھ گئی توقیر پتھر کی
صنم بن کر ہوئی مشہور یہ تصویر پتھر کی

[خاندانی حالات (قلمی) تذکرۂ بشیر مشمولۂ سہ ماہی، اُردو، کراچی (۱:۴۵) غالب نمبر: ۲۴۳۔۲۴۴]

ناظم ... نواب محمدؐ یوسف علی خان بہادر
فردوس مکان والیِ رام پور

ریاستِ رام پور کی بنیاد نواب علی محمد خان☆[1] بہادر خلد مکان کے ہاتھوں اٹھارویں صدی کے شروع میں رکھی گئی تھی۔ عہدِ محمد شاہی میں اُنھیں منصبِ پنج ہزاری ذات اور علاقہ کٹھیر کی جاگیر عطا ہوئی۔ اپنی دانش مندی اور بہادری سے اپنے ہم عصروں سے گوے سبقت لے گئے اور بہت نام پیدا کیا۔ ۴۴ برس کے تھے جب بمرضِ استسقا ۳ شوال ۱۱۶۲ھ (۵ ستمبر ۱۷۴۹ء) کو انتقال کیا۔ آنولہ میں دفن ہوئے۔ کاظم خان شیدانی نے تاریخ وفات کہی: ''ہے ہے افغاں''۔

اُن کی وفات کے وقت اُن کے دونوں بڑے بیٹے: محمد عبداللہ خان بہادر اور محمد فیض اللہ خان بہادر قندھار میں تھے۔ اس لیے تیسرے صاحب زادے نواب محمد سعد اللہ خان بہادر، اُن کے جانشین ہوئے۔ جب کچھ مدت کے بعد دونوں بھائی واپس آئے، تو بھائیوں میں آپس میں اختلافِ رائے ہونا قدرتی امر تھا۔ آخر تصفیہ یوں ہوا کہ پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر اوجھیانی وغیرہ نواب عبداللہ خان بہادر کے حصّے میں آئی اور اتنی ہی مالیت کا علاقہ رام پور وغیرہ نواب محمد فیض اللہ خان بہادر کو ملا اور باقی حصّۂ ملک پر نواب محمد سعداللہ خان بہادر کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا۔ جب ۲۷ برس کی عمر میں ان کا بھی بعارضۂ سل و دق ۵ شعبان ۱۱۷۵ء (یکم مارچ ۱۷۶۲ء) کو انتقال ہوگیا تو قوم نے بالاتفاق اُن کے بڑے بھائی نواب محمد عبداللہ خان بہادر کو رئیس تسلیم کرلیا۔

افسوس کہ اُن کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور یہ بھی پانچ برس بعد سانپ کے کاٹنے سے ۵ صفر ۱۱۸۱ھ (۳ جولائی ۱۷۶۷ء) کو قصبہ اوجھیانی میں رحلت کر گئے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، عاصی اور آزاد اور مبتلا تین تخلص کرتے تھے۔ اب سب سے چھوٹے بھائی نواب محمدؐ فیض اللہ خان بہادر عرش منزل وسادہ آرائے حکومت ہوئے۔ اُن کے عہد میں ریاست نے بہت ترقی کی اور رام پور بھی اسی زمانے میں دارالحکومت قرار پایا۔ بیس برس تک داد و دہش کے ساتھ حکمرانی کرنے کے بعد ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۱۷ جولائی ۱۷۹۴ء) کو رام پور میں فوت ہوئے اور یہیں عیدگاہ دروازے کے باہر ایک خاص مقبرے میں مدفون ہیں۔ لفظ ''غروب'' سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

نواب عرش منزل کی وفات کے بعد اعیانِ قوم نے چاہا کہ اُن کے دوسرے بیٹے غلام محمدؐ خان بہادر کو گدّی پر بٹھا دیں، لیکن وہ نہیں مانے اور سب کو ہموار کر کے اپنے بڑے سوتیلے بھائی نواب محمدؐ علی خان کو رئیس بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ نواب محمدؐ علی خان کے مزاج میں شورش بہت تھی اور کوئی بھی اُن سے خوش نہیں تھا۔ آخرِ کار وہ ایک سازش کا شکار ہوئے۔ مسند نشینی کے صرف ۲۴ دن بعد مخالفوں نے اُن پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ یارے، جان تو بچ گئی لیکن بہت زخم آئے۔ علاج معالجے سے افاقہ اور صحت کی صورت ہو چلی تھی، کہ دوسری سازش ہوئی اور اب کے وہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اگرچہ اِس ناشدنی حادثے میں غلام محمدؐ خان بہادر کا کوئی ہاتھ نہ تھا اور یقین تھا کہ وہی اُن کے بعد گدّی پر بیٹھیں گے، لیکن اُن کے حاشیہ نشینوں نے اپنی ضد اور کوتاہ اندیشی سے کام بگاڑ دیا۔ اُس وقت تک رام پور کا علاقہ حکومتِ اودھ کے تحت تھا۔ آخر نوبت کشت و خون تک پہنچی۔ نواب آصف الدّولہ نے انگریزوں کی مدد سے اُنھیں شکستِ فاش دی اور فیصلہ یہ ہوا کہ مسند پر نواب محمدؐ علی خان بہادر کے خرد سال فرزند احمد علی خان بہادر کو بٹھایا جائے۔ اُن کی نابالغی کے زمانے میں محمدؐ نصر اللہ خان بہادر (خلف نواب محمدؐ عبداللہ خان بہادر) دارالمہام مقرر ہوئے۔ غلام محمدؐ خان بہادر رام پور کی سکونت [ترک] کر کے بنارس چلے گئے اور وہاں سے حجِ بیت اللہ کے

لیے کلکتہ کے رستے حجاز کی راہ لی۔ انھوں نے منگل ۶ جمادی الثانی ۱۲۳۸ھ (۱۸ فروری ۱۸۲۳ء) فالج سے انتقال کیا۔ نادون میں ایک عالی شان مقبرے میں دفن ہیں۔ ''رضوان مقام'' تاریخِ وفات ہے۔

نواب احمد علی خان بہادر کا ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۶ھ (۲۶ جولائی ۱۸۴۰ء) کو انتقال ہوا۔ وہ اُردو میں شعر بھی کہتے تھے، احمد اور رند تخلّص کرتے تھے چوں کہ ان کے فرزندِ نرینہ نہیں تھا، اِس لیے اُن کی وفات کے بعد انگریزوں نے نواب غلام محمدؐ خان بہادر عرش جناب کے فرزندِ اکبر نواب محمدؐ سعید خان بہادر جنّت آرام گاہ کو بدایوں کی ڈپٹی کلکٹری سے بلا کے رام پور کی گدّی پر بٹھا دیا۔ ایامِ جلاوطنی میں اُنھوں نے بہت دن بنارس اور لکھنؤ میں بسر کیے تھے۔ اپنے خاندانی مقدمے کی پیروی کے لیے کلکتے بھی گئے۔ اس سیر و سیاحت سے بھی آپ نے بہت تجربہ حاصل کرلیا تھا۔ گزشتہ کتنے زمانے سے ریاست کے معاملات بہت ابتر تھے۔ امن نام کو نہیں رہا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کا دور دورہ تھا۔ آپ نے آکے ازسرِ نو امن و امان قائم کیا۔ ریاست کی آمدنی بڑھائی۔ مختلف محکمے قائم کر کے لوگوں کو ایک متمدّن حکومت کی برکتوں سے مالا مال کیا۔ غرض کہ اُن کے عہد میں ریاست کا وقار بہت بڑھ گیا۔ آخر پندرہ برس تک دادِ جہاں بانی دے کر ۷۱ برس کی عمر میں دوشنبہ ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ (یکم اپریل ۱۸۵۵ء) بعارضۂ سل عالمِ فانی سے رحلت فرمائی۔ امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ کوٹھی خورشید منزل کے قریب اپنے تعمیر کردہ امام باڑے میں دفن ہوئے۔ ''غروبِ کوکب ہے'' تاریخ ہے۔ طب میں اچھی مہارت تھی۔ فارسی نثرِ عاری بھی خوب لکھتے تھے اور اس میں قتیل سے مشورہ کرتے تھے۔ اپنے پیچھے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ صاحبِ تذکرہ جناب ناظم ان ہی کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔

نواب سیّد فیض اللہ خان بہادر (خلفِ بانیِ ریاست) کی ایک سوتیلی بہن نیاز بیگم قوم بڑنچ کے خان زادہ شاہ محمد خان کے عقدِ نکاح میں تھی۔ اُن کے صاحب زادے

محمدؐ نور خان کی دخترِ بلند اختر فتح النساء بیگم سے نواب محمد سعید خان بہادر نے نکاح کیا تھا۔ یہی جناب عالیہ فتح النسا بیگم صاحبہ، نواب یوسف علی خان بہادر ناظم کی والدۂ ماجدہ تھیں۔ اُن کی وفات مارچ ۱۸۵۹ء میں ہوئی۔ غالب نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

جنابِ عالیہ از بخششِ حق
بہ فردوسِ بریں چوں کرد آرام
سخن پرداز غالب سالِ رحلت
''خلودِ خلد'' گفت ازروے الہام
(۱۲۷۵=۱+۱۲۷۴)

ناظم ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ (۵ مارچ ۱۸۱۵ء) کو منگل کے دن پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں اُن کے والدِ مرحوم، جنت آرام گاہ انگریزی علاقے میں مقیم تھے۔ ناظم زمانۂ طالب علمی میں دلّی آئے اور میرزا غالب سے فارسی پڑھی۔ اُن ہی ایام میں مفتی صدر الدّین آزردہ اور مولانا فضل الحق خیرآبادی سے عربی اور دیگر علومِ عقلیہ، منطق وغیرہ پڑھے۔ غالب کے علاوہ خلیفہ غیاث الدّین رامپوری سے بھی فارسی پڑھی تھی۔

ناظم اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ ابھی اس پر مشکل سے دو برس گزرے تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں مشہور ہنگامہ ''غدر'' برپا ہوگیا۔ ریاستِ رام پور بھی نرغے میں گھر گئی، لیکن اُنھوں نے نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا اور کسی شورش میں شریک نہیں ہوے، بلکہ انگریزوں کی بہت قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ نینی تال میں مقیم سب انگریزوں مرد اور عورتوں کی جان و مال کو آپ کی بدولت کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا۔ اِن کارگزاریوں کے صلے میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو فتح گڑھ کے دربار میں بیس ہزار روپے کا خلعت عطا کیا اور سلامی گیارہ کی جگہ تیرہ توپ مقرر ہوئی، نیز ''فرزندِ دل پذیر'' کا خطاب ملا اور سرکاری مراسلت میں القاب و آداب مقرر ہوا، ''نواب صاحب مشفق، بسیار مہربان کرم فرماے مخلصاں سلامت بعد از شوقِ ملاقاتِ مسرّت آیات مشہودِ خاطرِ الطاف ذخائر می دارد''۔ اس کے بعد اُنھی خدمات

کے جلد و میں سرکارِ انگریزی نے جون ۱۸۶۰ء میں ۱۴۶ گانو کا ایک علاقہ جدید ضلع بریلی میں بطورِ جاگیر عطا کیا۔ اسی عطیے کے موقعے پر نواب صاحب موصوف نے یہ قطعہ موزوں فرمایا تھا:

جب گورنمنٹ سے ہوا حاصل
ملک مجھ کو بصیغۂ انعام
ناظم ازروئے ہمتِ عالی
سالِ بخشش ہے "بخششِ حکام"
(۵+۱۲۷۱=۱۲۷۶ھ)

غالب نے بھی اس عطیے کی تہنیت میں ایک قطعہ لکھا تھا جو ان کے کلیاتِ فارسی میں شامل ہے (قطعہ ۳۰)، اس کے آخری تین شعر ہیں:

نوابِ مہر مہرِ منوچہر چہررا
حاصل جمالِ یوسف و قربِ کلیم باد
چوں غنچۂ کہ پہلوے گل بشگفد بباغ
ملکِ جدید، شاملِ ملکِ قدیم باد
ہر دم ترا بخلوتِ راز و بزمِ انس
روح الامیں مصاحب و غالب ندیم باد

ملکۂ وکٹوریہ کے عہد میں (جولائی ۱۸۶۱ء) اسٹار آف انڈیا (تمغۂ ستارۂ ہند) کا ایک خاص اعزاز قائم کیا گیا۔ اسی سلسلے میں یکم نومبر ۱۸۶۱ء کو الہ آباد میں ایک عظیم الشان دربار مقرر ہوا تھا۔ اس موقعے پر لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور وائسرائے نے بعض دوسرے والیانِ ریاست کے ساتھ نواب یوسف علی خان بہادر کو بھی نائٹ کا خطاب اور تمغہ دیا۔ ۱۸۶۲ء میں کیننگ کے بعد لارڈ الگن اُن کے جانشین ہوئے، لیکن جلد ہی نومبر ۱۸۶۳ء میں اُن کا بعارضۂ قلب انتقال ہوگیا اور اُن کی جگہ سرجان لارنس مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۴ء میں لارنس نے نواب صاحب موصوف کو اپنی مجلسِ واضعِ قوانین

کارکن مقرر کیا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ کلکتہ تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا اُنھیں راس نہ آئی اور بیمار پڑ گئے۔ مجبوراً گورنر جنرل کی رضامندی سے واپس رام پور چلے آئے لیکن مرض نے طول کھینچا اور بڑھ کر سرطان کی شکل اختیار کرلی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نومبر ۱۸۶۴ء میں ان کی حالت بہت تشویش ناک ہوگئی۔ بارے، صحت ہوئی۔ مرزا غالب نے اِس موقعے پر دو قصیدے کہے: ایک فارسی میں ایک اُردو میں۔

لیکن مرض پورے طور پر رفع نہیں ہوا تھا۔ اُس نے پھر حملہ کیا اور اب کے جان لیوا ثابت ہوا۔ جمعہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء) دوپہر کے وقت خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اپنے والدِ ماجد کی طرح امامیہ مذہب کے پیرو تھے، اِسی مشرب کے مطابق تجہیز و تکفین ہوئی۔ امام باڑے کے بیرونی دالان میں اپنے والدِ بزرگوار کے پہلو میں محوِ خواب ہیں۔ تاریخ وفات ہے:

یوسف زجہاں رفت، سکندر آمد (۱۲۸۱ھ)

امیر مینائی کا قطعۂ تاریخ ہے:

در فراقِ ناظمِ معجزبیاں یوسف لقا
جوش زد سیلابِ خوں از دیدۂ گریانِ من
تاب از دل رفت ودست از کار رفت
رفتنِ اُو جملہ برہم زد سرو سامانِ من
تیرہ شدچوں شامِ ماتم در نظر ایں خاکداں
چاک شد مانندِ دامانِ سحر دامانِ من
شکرِ منتہاے اُو، ایمانِ خود دانستہ ام
ذکرِ اُو، تابودہ ام، بودست حرزِ جانِ من
بسکہ از شورو فغانم محشرے برپاشدہ است
می شود شورِ قیامت ہر نفس قربانِ من
گریہ ام در ماتمش رنگِ فراوانی گرفت
می چکد طوفانِ نوح از گوشۂ دامانِ من

بہر سالِ آں عزیزِ مصرِ دلہا گفت، امیرؔ!
"مسند آرائے جناں شد یوسفِ دورانِ من"
(۱۲۸۱ھ)

ناظم نے فیروز النساء بیگم عرف نواب بہو بیگم سے نکاح کیا تھا، جو اُن کے چچا عبدالعلی خان صاحب (والدِ بے تاب) کی صاحب زادی تھیں۔ اُس بیوی سے تین بچے ہوئے، ایک اُن کے جانشین نواب کلب علی خان بہادر خلد آشیاں اور دو صاحب زادیاں۔ اُن کے علاوہ تین لڑکے اور چار لڑکیاں بعض بیگمات ممنوعہ اور خواصوں کی اولاد یادگار چھوڑے۔

ناظم فروری ۱۸۵۷ء میں غالب کے شاگرد ہوئے۔ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا، دراصل شعر گوئی غالب کی سرپرستی کا بہانہ بن گئی۔ امیر مینائی نے "انتخابِ یادگار" میں لکھا ہے کہ وہ غالب سے پہلے مومن سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ جب پہلی بار نواب صاحب نے اپنا کلام بغرضِ اصلاح غالب کے پاس بھیجا، تو اس کے ساتھ خط میں لکھا کہ مجھے آج تک کبھی ایک مصرع تک موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اگر وہ اس سے پہلے شعر کہتے ہوتے اور مومن سے اصلاح کا سلسلہ ہوتا، تو یہ بات پوشیدہ رہنے والی نہ تھی اور نواب صاحب کو اِس غلط بیانی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ناظم کا دیوان دو مرتبہ شائع ہوا۔ پہلے ۱۲۷۸ھ میں، دوسری مرتبہ ۱۲۸۶ھ میں پہلے دیوان میں سراسر غالب کا اصلاحی کلام ہے اور دوسرے میں اسیر کا دیکھا ہوا بھی موجود ہے، جن سے وہ غالب کے بعد مشورہ کرتے رہے۔ امیر مینائی لکھتے ہیں کہ ناظم نے مجھ سے بھی اصلاح لی۔ واللہ اعلم۔ ناظم کی طبیعت میں شوخی اور رنگینی اور مضمون آفرینی کا مادّہ خوب ہے، بالخصوص جہاں وہ مکالمے کی طرز میں مصرعے موزوں کر جاتے ہیں تو بہت پرلُطف معلوم ہوتا ہے۔

یہ شبہہ عام طور پر وارد کیا گیا ہے کہ ناظم کے دیوان میں غزلوں کی غزلیں

ایسی ہیں جن پر غالب کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی اندازِ فکر، وہی اسلوبِ بیان، وہی مضمون آفرینی اور خاص خاص الفاظ اور ترکیبیں، جو غالب کے کلام کی خصوصیات ہیں، ہمیں ناظم کے دیوان کی کئی غزلوں میں اس حد تک ملتی ہیں کہ ہم انھیں محض استاد کی اصلاح تک محدود نہیں کر سکتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ "کلامِ خوش" استاد نے خود کہہ کے شاگرد کے حوالے کر دیا تھا۔ اس شبہے کی تقویت ایک اور بات سے بھی ہوتی ہے کہ ناظم ۱۸۵۷ء کے شروع میں غالب کے شاگرد ہوئے اور ان کا خاصا ضخیم دیوان چار برس بعد ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ ایک بالکل مبتدی کے لیے جس نے اِس سے پہلے کبھی ایک مصرع تک نہ کہا ہو، اتنی قلیل مدّت میں اتنے وافر کلام کا مالک ہو جانا حیرت ناک ضرور ہے۔

اب مختصر انتخاب ملاحظہ کیجیے:

ہونے دیا نہ شاد، یہ دن پھر کہاں مجھے
ہے ہے تمھیں رقیب کے مرنے کا غم ہوا

☆

تو نہ آیا، پر اجل وقت سے پہلے آئی
آدمی اس کی مگر اتنی تمنا کرتا

☆

ہے یہ ساقی کی کرامت، کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر بزم میں سب نے اُسے چلتے دیکھا
واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں، کیا بتلاؤں!
میں نے مے خانے سے کس کس کو نکلتے دیکھا

☆

کیا تم نہ جانتے تھے کہ بے خانماں ہوں میں
پھرتا ہے نامہ بر مرا گھر پوچھتا ہوا

☆

فقیر بن کے گیا واں، تو کیا سوال کروں
مگر کہوں کہ "بھلا کر ترا بھلا ہوگا!"

☆

ترے گھر وہ آئے ناظم، تو یہ اضطراب کیا ہے؟
کوئی بادشاہ آیا، کوئی شہر یار آیا!

☆

آدمی کے ساتھ سو آزار ہیں، یہ کیا کہ بس
آہ کی اور رازِ اُلفت آشکارا ہوگیا

☆

ہوتے ہی دردِ دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے
یعنی یہ ایسے ہیں، کہ نہ اُن سے سُنا گیا

☆

جب کہا اُن سے کہ ہے کچھ مجھے کہنا، تو کہا
"سُن لیا ہم نے، کوئی شکوۂ بے جا ہوگا"

☆

معتقد ہوں کعبے کا، ناظم! مگر جا کر وہاں
عبرت آتی ہے کہ کیا بت خانہ ویراں ہوگیا

☆

ستم میں شہرہ جو وہ آفتِ زمانہ ہوا
فلک کو عذرِ ستم کے لیے بہانہ ہوا

☆

یہ غصہ ہے کہ دلِ مضطرب نشانہ تھا
ہوا جو تیر خطا، میں گناہ گار ہوا

انداز نیا ہے، دل لگی کا
ہنسنے میں، پتا نہیں ہنسی کا

☆

یہ خوشی کیا ہے کہ ہے ذکر ہمارا ہوتا
ہوتے ہم، اور ہمیں بات کا یارا ہوتا

☆

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے، پر انصاف کرو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

☆

کیوں آ کے کہو در پہ کہ "وہ گھر میں نہیں ہیں"
کیا ہم نہیں پہچانتے، سرکار کی آواز

☆

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط، اور کس قدر غلط

☆

کہتے ہو کہ "وہ بھی یہی کہتے ہیں، کروں کیا"
کہتے ہو کہ "دل جوئی اعدا نہ کرو تم"
ہم تم کو برا کہتے ہیں، یا خو کو تمھاری
لو خو کے بھی اچھے سہی، جھگڑا نہ کرو تم

☆

اب لکھیں گے شکوۂ بیداد، ہم دل کھول کر
نام ان کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں☆۲

☆

فسانۂ ستمِ ہجر ہے، سوال نہیں
نہ دو جواب، سنے جاؤ، کچھ ملال نہیں

☆

میری وفا کی داد، نہ جُرمِ عدو کی بحث
کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

☆

سب کے اس عمر میں ہو جاتے ہیں ایسے ہی حواس
تجھ سے کچھ شکوہ مجھے، اے فلکِ پیر، نہیں

☆

ق

ہوئے ہو ایک بُتِ دل فریب پر عاشق
زبس کہ آپ کو ناکردہ کار سمجھے ہو
صلاح و مشورہ رکھتے ہو مجھ سے، اور مجھے
فنونِ عشق کا آموز گار سمجھے ہو
شریکِ دولتِ ناز و نیاز رکھتے ہو
انیسِ خلوتِ شب ہائے تار سمجھے ہو
اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے رحم بھی تم پر
کہ مجھ سے غم زدہ کو غم گسار سمجھے ہو

☆

کہتے ہو کہ ہم غیر کو آنے نہیں دیتے
سچ ہو یہی، پر میں نے سُنا اور ہی کچھ ہے

☆

وفا کی ہم نے، اور تم نے جفا کی
تم اچھے، ہم بُرے، قدرت خدا کی!

☆

جانتے ہم بھی کہ ہے خُلد میں راحت کیسی
ملتی اس میں سے اگر ہم کو یہاں تھوڑی سی

☆

کہے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے
وہ کیا کہیں گے، مگر یہ کہ ''جا نہیں کرتے''

☆

نہ تھی تم سے توقع، یوں عدو کے دم میں آنے کی
کہاں جاتی رہی وہ خو، محبت آزمانے کی

☆

اس سے کیا بحث کہ ہوگی شبِ فرقت کیسی
موت اس میں نہیں آتی، یہ مصیبت کیسی
نہ گزر دوست تک اپنا، نہ بغیر اُس کے قرار
کس پر آئی ہے اور آئی ہے طبیعت کیسی

☆

حشر کو کھینچوں ترا دامن، بھلا دیکھوں کہ تو
واں بھی جھنجھلا کے کہے ''یوسف علی خاں، چھوڑ دے''

☆

جو کہیے، دردِ دل سنیے، تو کہتے ہیں کہ ''ہاں کہیے!
اسی کو دردِ دل کہتے ہیں، جو گفتار میں آئے''

☆

نالے کے مجھے طور بہت یاد ہیں، لیکن
طاقت کا گماں بھی ہو دلِ غم زدہ پر کچھ

☆

ہو رات، تو جیتے رہیں اُمیدِ سحر پر
یہ روزِ سیہ ہے، شبِ دیجور نہیں ہے

[اخبار الصنادید، انتخابِ یادگار، ۱:۶۹ ـ ۸۲، نقدِ غالب: ۲۸۶ـ

[۳۱۳

حواشی

☆۱ـ محمد نجم الغنی مؤلفِ ''اخبار الصنادید'' کا بیان ہے کہ وہ نسباً حسینی سید تھے اور سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے سید الشہدا حضرت امام حسین سے جا ملتا ہے۔ اس کے برخلاف بعض تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ نواب علی محمد خان کی اصلیت معلوم نہیں۔ (دیکھیے سیر المتاخرین و بوستانِ اودھ و حیاتِ حافظ رحمت خان وغیرہ) کاظم خان شیدائی نے ان کی جو تاریخِ وفات کہی ہے: ہے ہے افغان، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خاندان سید نہیں بلکہ پٹھان تھا۔

☆۲ـ خدا کرے کہ سمجھ جائیں یہ کنایہ وہ
ابھی تو چرخِ بریں کا گلا کیے جاؤں
(سالک)

نامی... دیبی دیال عرف نیب جی لکھنوی

رہنے والے لکھنؤ کے اور بلحاظِ پیشہ صرّاف تھے۔ کسبِ روزگار کے لیے کچھ مدّت گورکھ پور میں بسر کی، ''تذکرہ ''روزِ روشن'' کی تالیف کے زمانے (۱۲۹۶۔۱۲۹۷ھ) میں گورکھ پور ہی میں قیام پذیر تھے۔ لیکن ان کا جو کلام گلدستہ، ''نغمۂ بہار''☆ میں شائع ہوا ہے، اس کے ساتھ عام طور پر سکونت اکبر پور کی لکھی ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔

مختصر کلام ملاحظہ ہو:

آرزو مجھ کو ہے، اے یار، نہایت تیری
دیکھنا چاہتا ہوں چاند سی صورت تیری

ہاتھ سے اپنے، خدا نے ہے بنائی تری شکل
تو ہے بے مثل، حسینوں میں ہے شہرت تیری

رات دن کوچے میں عشاق کھڑے رہتے ہیں
نہیں جاتی ہے کبھی دل سے محبت تیری

ظلم و بیداد و ستم، بہر خدا کم کرتو!
کس سے، کس سے نہیں سنتے ہیں شکایت تیری

نام پر حیدرِ کرّار کے، نامی! ہو فدا
حشر کے روز کریں گے وہ شفاعت تیری

(نغمۂ بہار: ۱۵ نومبر ۱۸۸۶ء)

دشمنِ جاں میرے پہلو میں مرا دل نکلا
جس کو میں دوست سمجھتا تھا، وہ قاتل نکلا
اے پری! عارضِ زیبا پہ ترے تل نکلا
فلکِ حسن پہ گویا مہِ کامل نکلا
نامی! اب جان کسی طرح نہیں بچنے کی
ہاتھ میں تیغ لیے گھر سے وہ قاتل نکلا

(نغمۂ بہار، ۱۵ اپریل ۱۸۸۷ء)

کبھی صبا سے معطر نہ ہو گلوں کا دماغ
طواف تیری گلی کا اگر صبا نہ کرے

(نغمۂ بہار، ۱۵ ستمبر ۱۸۸۷ء)

قہر ہے، ظلم ہے، آفت ہے عداوت دل کی
دل رُباؤں سے میں کرتا ہوں شکایت دل کی
ایک ہی آہِ شرر بار سے افلاک جلے
کہیں دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے حرارت دل کی
کھینچ لایا ہے مجھے کوچۂ دل دار میں وہ
حال پر میرے، بہت رہتی ہے شفقت دل کی
جب سے دیکھا ہے مرے دل نے ترے عارض کو
آئنہ دیکھ کے حیران ہے حیرت دل کی
جان کو کرتا ہوں قربان، میں دل پر اپنے
جان سے بڑھ کے ہے نامی! مجھے الفت دل کی

(نغمۂ بہار: ۱۵ نومبر ۱۸۸۹ء)

جنونے کو کہ باخود آرم آں طفلِ پریرورا
زند او برسرِ من سنگ و من بینم رُخِ اُورا

☆

زاہد قدحے زن کہ دہم پیرِمغاں را
بیعانۂ او مایۂ عقلِ ہمہ داں را

☆

ندانم کشتۂ شمشیرِ ابروے کہ شد، نامی
بجاروبِ مژہ روبند خوباں تربتِ اُورا

[روزِ روشن : ۶۸۱، تماہی صحیفہ، لاہور۔ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۴،
گلدستہ نغمۂ بہار لکھنؤ۔ ۱۵ اپریل ۱۸۸۷ء ص ۲۱۵، ایضاً ۱۵ نومبر
۱۸۸۹ء ص ۱۵]

حواشی:

☆۔ یہ گلدستہ سید مہدی حسن عقیل اور یعقوب علی خان نصرت کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ اُردو پریس میں چھپتا تھا، دفتر راجا بازار میں تھا۔

نحیف... غلام محمد خان

شوقِ وصلِ یار ہے، اور غم نہیں اغیار کا
گل سے ہم پہلو ہوں میں، کیا خار کھانا خار کا

[تذکرۂ بشیر مشمولہ سہ ماہی اُردو، کراچی ۴۵:۱:۲۴۴]

نامی ... محمدّ علی خان مونگھیری

مونگھیر کے رؤسا میں سے تھے۔ اُن کے کلام میں صرف ایک فارسی قطعۂ تاریخ مل سکا، جو اُنھوں نے غالب کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ فخر الدّین حسین سخن کے دیوان کے لیے لکھا تھا:

جنابِ خواجہ فخر الدّیں بہادر
کہ زندہ باز ازو نامِ سخن شد
بطرزِ عاشقانہ گفت دیواں
کہ مطبوعِ دلِ ہر اہلِ فن شد
زمینِ شعرِ او، ہم اوجِ گردوں
نقاطش رشکِ پروین و پرن شد
بفکرِ تازہ، دادِ نظم دادہ
کزو متروک مضمونِ کہن شد
بہ گل بندیِ الفاظِ نگاریں
بیاضِ صفحہ صد رشکِ چمن شد
ببیں سحرِ حلالش بہرِ حاسد
کہ درِ وصفش زبانِ قفلِ دہن شد
سرِ اعدا زدہ تاریخ گفتم
ز دل مقبول دیوانِ سخن شد

(۱۳۰۳-۱=۱۳۰۲ھ)

(دیوانِ سخن)

نسیم... نواب محمد حسین علی سلطان

گلدستۂ شعرا، مدراس کے جون و جولائی ۱۸۷۶ء کے دو شماروں میں دو غزلیں حسب ذیل عنوان کے تحت ملتی ہیں:

عالی جناب معلّٰی القاب نواب محمد حسین علی سلطان متخلّص بہ نسیم جاگیردار ہرپور نبیرۂ ٹیپو سلطان دام اقبالہم شاگردِ غالب دہلوی از مقام مدراس۔

دونوں غزلیں طویل ہیں اور بے مزہ، بعض شعر عریاں بھی ہیں۔ بطور نمونہ چند شعر دیکھیے:

جب زلف و رخ کا چرچا ہوا ہے
شب ہوگئی ہے، تڑکا ہوا ہے

یہ گیسو ہیں جانے یا مشک، بولو
عاشق ہوا ہوں، سودا ہوا ہے

طوفاں نما ہے آنسو ہمارا
دریا سمٹ کر قطرا ہوا ہے

پہنا ہے زیور وہ سر سے پا تک
سروِ چراغاں طوبیٰ ہوا ہے

اے شورِ محشر، سونے دے دم بھر
بے چارہ مجنوں جاگا ہوا ہے

ہے ہے نسیم اب پیتا نہیں ہے
زاہد بنا ہے، مُلّا ہوا ہے

☆

پیام بر کا ہے ناتا کسی پیمبر سے
ہے جبرئیل کو رشتہ ترے کبوتر سے
قدِ خمیدہ ہے مردود بزمِ دل بر سے
اشارہ ہے یہ ہمیں چشمِ حلقۂ در سے
جگائیں لیلیٰ و شیریں جو قیس و خسرو کو
اٹھیں گے حشر میں ہم بھی کسی کی ٹھوکر سے
پسینا ابرو سے اترا تو گال لال ہوا
ہے دہکی آتشِ خورشید آبِ خنجر سے
تمھارے گال سے گلشن یہ پانی پانی ہے
رگِ سحاب خجل ہے رگِ گلِ تر سے
وہ سن کے کہتے ہیں موزوں کلامِ لطف آمیز
نسیم، آپ نظر آتے ہیں سخن ور سے

[مکتوب جناب عبدالصمد خان، حیدرآباد، بنام مؤلف]

نشاط ... بابو ہرگوبند سہائے اکبرآبادی

والد کا نام منشی خوب لال تھا۔ قوم کے ماتھر کائستھ تھے۔ ۸ دسمبر ۱۸۲۸ء کول ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ بزرگوں کا اصلی وطن پٹنہ تھا، لیکن ۱۸۰۳ء میں منشی خوب لال وہاں سے کول ضلع علی گڑھ آ گئے۔ بعد کو یہاں سے بھی نقلِ مکان کر کے آگرے آ رہے۔ اُن کے والد علی گڑھ اور متھرا میں اچھی خاصی جاداد چھوڑ مرے تھے، جس میں زمین معافی، مکانات، باغات وغیرہ تھے۔ جب یہ آگرے آئے تو یہاں جان بیٹس صاحب کی کوٹھی اور باغ خرید کر اُسی جگہ اپنے نام پر ''ہرگوبند گنج'' آباد کیا۔ آج کل آگرہ میونسپل کمیٹی کے دفتر اور سمسن گنج اسی جگہ میں ہیں۔

پہلے پانچ برس تک دلّی صدر امینی میں عہدۂ نظارت پر مامور رہے۔ لیکن ۱۸۵۵ء میں یہاں سے استعفا دے کر گوالیار چلے گئے اور وہاں میر منشی ہو گئے۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور انقلاب ہو گیا۔ اس لیے یہ نوکری چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے۔ یہاں ۱۸۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک عدالتِ دیوانی میں نائب سر رشتہ دار رہے۔ یہیں اُنھوں نے انگریز سیشن جج مسٹر جان شور کے کہنے پر وکالت کا امتحان دیا، جس میں کامیاب ہو گئے اور پھر ۱۸۶۲ء میں وکیل دیوانی بن گئے۔ آگرے آئے اور یہ شہر کچھ ایسا پسند آیا کہ یہیں کے ہو رہے۔ ۱۸۶۸ء میں آگرے میں میونسپل کمشنر چنے گئے۔ اُسی زمانے میں لاٹ صاحب کے درباروں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اپنے حسنِ لیاقت کے باعث ۱۸۷۵ء میں ریاست کوٹہ میں جج مقرر ہوئے تھے لیکن چوں کہ صحت خراب رہنے لگی تھی، سال بھر بعد وہاں سے مستعفی ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔

آخری زمانے میں خیالات زیادہ تر مذہب کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ چنانچہ دریائے گنگا کے کنارے راج گھاٹ میں ایک دھرم شالہ تعمیر کی اور اس کی غور و پرداخت اور خرچ کے لیے ایک وقف قائم کیا۔ یہاں ۱۸۷۷ء میں اُنھوں نے دور نزدیک سے ۸۰۰ عالموں اور پنڈتوں کو جمع کر کے بڑے پیمانے پر ایک یگیہ بھی کیا تھا۔

اسی جگہ ۳ مئی ۱۸۹۱ء کو انتقال کیا۔ اولادِ جسمانی میں کئی لڑکیاں اور دو صاحب زادے بابو رام نرائن اور بابو برج نرائن یادگار چھوڑے دونوں کی اولاد موجود ہے۔ آج کل اس خاندان کے اکثر افراد ڈیرہ دون میں مقیم ہیں۔

۱۸۵۰ء میں جب عمر تقریباً ۲۱۔ ۲۲ برس کی تھی شعر گوئی شروع کی۔ اُردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ تصنیفات میں نشاط المحاسبین، مبادی الحساب منظوم، تالیف ہرگوبند (نول کشور کان پور۔ ۱۸۷۱ء) تعلیمِ اخلاق اور اُردو فارسی کا مشترکہ دیوان ''نشاط الاحباب'' (۱۸۷۷ء) کائستھ کتاولی و سندھیو پاسن (۱۸۷۷ء)، الہامِ ضمیر (۱۸۸۹ء) وغیرہ یادگار ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

آہ کہ ہم سائے کی فریاد سے
رات کا سونا بھی بلا ہوگیا

☆

ذکرِ خیر غیروں کا، اور ہے گِلا اپنا
بات پاگئے ہم بھی، گم ہے مدّعا اپنا
درد کی حکایت ہے، وقت کی شکایت ہے
یار بے وفا اپنا، بخت نارسا اپنا
رنج ہے، عداوت ہے، حسن بھی قیامت ہے
ہوگیا حریف اپنا، تھا جو آشنا اپنا
سرگزشتِ کلفت ہے، جو بیانِ اُلفت ہے
روَیدادِ حیرت ہے، آہ ماجرا اپنا

جوشِ بحر قلزم ہے، کشتی و تلاطم ہے
ناخدا بھی یاں گم ہے، ہے مگر خدا اپنا
ہو نشاط یا غم ہو، اپنی اپنی قسمت ہے
چاہیے بُرا کس کا، گرچہ ہو بھلا اپنا

☆

غیر کا بھی وہ آشنا نہ ہوا
یہ بھی اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
اس کی قدرت کے ہیں یہی معنی
اس کا چاہا ہوا، برا نہ ہوا
ہنستے ہیں سن کے حال رونے کا
میرا رونا مگر فسانا ہوا

☆

کہو تو، غیر نے تم سے کہا کیا؟
سناؤ تو مجھے، تم نے سُنا کیا؟
تبسّم گل کا ہے یا خندۂ برق
وجودِ عشرتِ اہلِ فنا، کیا؟

☆

ان کے جاتے ہی ہوگئی کچھ اور
دلِ بے اختیار کی صورت

☆

اک ذرا سے دل میں، یہ گنجائشیں
محو ہوں طرزِ تمنا دیکھ کر

☆

اُن لبوں سے مرا گِلا نکلا
منھ کو تکتا ہوں میں، یہ کیا نکلا
ہم نے سجدے کو سر جھکایا تھا
بارے واں اُن کا نقشِ پا نکلا

☆

غیر سے مذکور ہمارا کیا
خوب کیا آپ نے، اچھا کیا

☆

شیشۂ مے نہاں بغل میں، نشاط!
اور دعویٰ ہے پارسائی کا

☆

نشاط انگیز ہے یہ طرزِ گفتار
"پیو مے، اب بنو گے پارسا کیا"

☆

خواہشوں کا چھوٹ جانا ہے نشاط
روتے ہیں ناداں کو دانا دیکھ کر
یہ دلِ دیوانہ بس مسرور ہے
اپنے گھر میں شکلِ صحرا دیکھ کر

☆

وعدوں ہی کو تمھارے نہ سمجھے ہیں ہم دروغ
تم جھوٹے، عہد جھوٹے، تمھاری قسم دروغ
آئینہ رونمائے سکندر ہی گرچہ ہو
ہستی باعتبارِ وجود و عدم دروغ

دشمن کی مرگ کی بھی نہ ہم آرزو کریں
کس طرح لوحِ زیست پہ کھینچیں قلم دروغ

☆

نشاط! ہم دل سے پہنچے تا در کعبہ، ولے واں بھی
نشانِ یار گم پایا، پڑا تھا صاف ویرانہ

☆

بے جرم پائمال عدو کو نہ کیجیے
اتنا خیال بس، مرے سر کی قسم رہے

☆

تبسم پر اگر چینِ جبیں کا فیصلہ ٹھہرے
ادائے معنیِ دع ماکدر، خُذ ما صفا ٹھہرے
غم واندوہ وحسرت یا نشاط و شادی و فرحت
وہی تسلیم ہے ہم کو، تری جس میں رضا ٹھہرے

☆

ہم نکتہ دانِ عشق ہیں، کرتے ہیں عرضِ حال
لفظِ قلیل و معنیِ بسیار دیکھ کر

☆

کیسی تقدیر اپنی بگڑی ہے
کوئی تدبیر بن نہیں آتی
خانۂ دل کو منہدم نہ کرو
پھر یہ تعمیر بن نہیں آتی

☆

گردشِ چشم نے ساقی کی کیا ہے بدمست
ہم بہکتے تھے کبھی نشۂ مے سے ایسے

☆

مت سوچو، یہ کام کس طرح سے ہوگا
اِس طرح سے یا اُس طرح سے ہوگا
ہووے گا وہی، جو کچھ ہے منظورِ خدا
واقف بھی وہی ہے، جس طرح سے ہوگا

[شعر و سخن : ۱۲۴۔ ۱۲۶، ماتھر پتر کا، اپریل ۱۹۲۶، آج کل، دلّی، فروری ۱۹۵۵ء، زمانہ، کان پور، دسمبر ۱۹۴۱ء : ۲۸۶۔ ۲۸۸]

نظام (مضطر، رعنا)... نواب محمد مردانِ علی خان مراد آبادی

قوم کے یوسف زئی افغان تھے۔ اُن کا خاندان مراد آباد کے روؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ بزرگ خاندانِ مغلیہ اور شاہانِ اودھ کے زمانے میں مناصب جلیلہ پر متمکن رہے۔ اُن کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں سرکار انگریزی کی ملازمت میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے راولپنڈی (حال پاکستان) میں کمشنر صاحب بہادر کے دفتر میں پیش کاری ملی۔ بتدریج ترقی کر کے تھانے داری اور پھر تحصیل داری کا عہدہ پایا۔۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں یہ حسن ابدال (ضلع اٹک، (پاکستان) میں تحصیل دار تھے۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے مری کے علاقے کا انتظام خاطر خواہ حکام کیا، جس کے لیے بعد کو سندِ خوشنودی عطا ہوئی۔ لیکن یہ اپنی ملازمت اور قلیل معاش سے خوش نہ تھے، اِس لیے اگلے ہی برس یعنی دسمبر ۱۸۵۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا، جو منظور کرلیا گیا۔

سال بھر بعد ریاست مالیر کوٹلہ میں نواب صاحب کے مدارالمہام مقرر ہوئے۔ یہاں چار برس بہت نیک نامی سے رہے۔ جنوری ۱۸۶۱ء میں راجا رندھیر سنگھ والیِ ریاست کپور تھلہ کے چھوٹے بھائی کنور بکرماں سنگھ کے سکتر بن کے چلے گئے، تین سال تک یہاں بھی معتمد علیہ رہے۔ اِس دوران میں حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ انھیں مہاراجا شیو دھیان سنگھ والیِ الور کی طرف سے توقع دلائی گئی کہ اگر آئیں تو کسی

معقول عہدے پر مقرر کردیئے جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپریل ۱۸۶۴ء میں کپور تھلہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اتفاق سے وہ توقع پوری نہ ہوئی اور یہ بے روزگار ہوگئے۔ تگ و دو کے بعد ۱۸۶۷ء میں مارواڑ میں نائب دیوان مقرر ہوئے، بعد کو وہیں دیوان ہوگئے۔ اسی زمانے میں مہاراجا بہادر کی طرف سے ''نظام الدولہ، منتظم الملک نواب محمد مردان علی خان بہادر تخت قائم جنگ'' خطاب☆ عطا ہوا۔ ساتھ ہی جاگیر اور نقارہ و نشان کا اعزاز بھی ملا، اوّل درجے کے سرداروں کی تعظیم مقرر ہوئی۔ غرض کہ یہاں بہت تزک و احتشام اوراعزاز و اکرام سے رہے۔

اُنھوں نے ریاست کا انتظام ایسا عمدگی سے کیا کہ ہر شعبے میں ترقی ہوئی۔ شروع سے اُنھیں معدنیات سے دلچسپی تھی۔ پنجاب کے قیام کے دوران میں بھی چند مفید چیزیں مثلاً ثعلب مصری، سنگِ غربال، سنگِ طبع وغیرہ برآمد کیے تھے۔ لیکن مارواڑ کی دیوانی کے زمانے میں بارہ مختلف کانیں دریافت کیں، ان میں چاندی اور لوہا اور مس زیادہ اہم تھیں۔ اِس کے علاوہ سڑکیں بنوائیں۔ ٹکسال قائم کی۔ اُن کے حُسنِ انتظام سے ریاست نے بہت ترقی کی۔ میو کالج اجمیر میں جو گھنٹہ ہے، وہ بھی ساڑھے تین ہزار کے خرچ پر انھیں نے لگوایا تھا۔

ریاست جودھ پور کی ملازمت سے فارغ ہو کر ۱۸۷۶ء (۱۲۹۳ھ) میں حج بیت اللہ و زیارتِ مدینہ منورہ سے مشرّف ہوے، اس کی تاریخ نکالی ''نظام حاجی الحرم''۔ ساری عمر مجرّد رہے۔ بروز دوشنبہ ۲ جون ۱۸۷۹ء (۱۱ جمادی الثّانی ۱۲۹۶ھ) کو سری نگر (کشمیر) میں ہیضے سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ تاریخ مرزا محمد علی بیگ عاقل نے کہی:

تھی فکر مجھے ہو سال رحلت
ہاتف نے معاً مجھے بتایا
عاقل لکھو یہ بے سر ہیم
''داغِ دلِ دوستانِ رعنا''

(۲۔ ۱۸۸۱=۱۸۷۹)

علم دوست آدمی تھے۔ شروع میں مضطر تخلّص کیا، بعد کو اُسے بدل کر رعنا کرلیا۔ جب نوابی کا خطاب ملا، تو نظام لکھنے لگے: چنانچہ ایک رباعی میں اِن تینوں کا ذکر کیا ہے:

آغازِ سخن وری میں مضطر تھا نام
رعنا تھا شبابِ شاعری کے ہنگام
ہے زیرِ نگیں جو کشورِ نظم، تو اب
نوّاب خطاب اور تخلّص ہے نظام

صاحبِ تصنیف تھے۔ علمِ جفر میں جفرِ جامع اور جفرِ کبیر کے علاوہ ایک ضخیم کتاب شاہِ ایران کے نام پر ظلِ ناصری (۱۲۸۱ھ) تالیف کی۔ تاریخ میں ایک مبسوط کتاب، تاریخ البلاد (۱۲۷۹ھ) لکھی۔ علمِ موسیقی میں بھی دو کتابیں یادگار ہیں، نغمۂ صنم (۱۲۷۹ھ) اور غنچۂ راگ۔ ریاست جودھ پور کی تاریخ، تواریخِ راج مارواڑ (۱۸۶۹ء) کے نام سے لکھی۔ دو کتابیں مسمریزم کے مضمون پر لکھیں: سیرِ غایب (۱۲۸۳ھ) اور طلسمِ نظر (۱۲۸۹ھ) اُردو میں اس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتابیں ہیں۔ انگریزی کی مشہور کتاب ٹاڈ راجستھان کا اُردو ترجمہ بھی اُنھیں کی توجہ سے چھپا تھا۔

اُن کی مدح میں مختلف شاعروں نے جو قصیدے لکھے تھے، اُن کا انتخاب منشی غلام محمدّ خان تپش نے مرتّب کر کے "قصاید مدحیہ نظام" کے نام سے مطبع نول کشور لکھنؤ میں ۱۸۷۱ء میں چھاپا تھا۔ اس کے شروع میں مختصر سوانح عمری بھی ہے۔ اُن کے اپنے اُردو فارسی کلام کا مجموعہ بھی اِسی مطبع سے کلیّاتِ نظام کے نام سے دسمبر ۱۸۷۵ء میں چھپا۔ یہ مشتمل ہے دیوانِ اوّل و دوم اور مُہرِ نبوت (نعت، منقبت و سلام وغیرہ) اور واسوخت (مسدّس) ضبطِ عشق پر، اس واسوخت کا نام تاریخی ہے (۱۲۸۱ھ) اور اس میں ۳۲۴ بند ہیں۔ منشی فدا علی عیش نے ۱۸۶۹ء میں لکھنؤ سے دو جلدوں میں واسوختوں کا ایک مجموعہ شعلۂ جوّالہ کے نام سے شائع کیا تھا۔ نظام کا یہ واسوخت (ضبطِ عشق) اس کی دوسری جلد میں شامل ہے۔ یہ پہلی بار ۱۲۸۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ مذہباً شیعہ تھے۔

چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں :

طالب اسد اللہ کا ہوں، غالب کا ہوں شاگرد
بیعت مجھے بے واسطہ ہے شیرِ خدا سے

اسی لیے جب ۱۸۷۶ء میں زیارتِ حرمین شریفین سے مشرّف ہوئے، تو واپسی میں کربلائے معلیٰ میں بھی حاضری دی۔

کلام پر غالب کے بعد دبیر الدولہ منشی مظفر علی خان اسیر مرحوم سے بھی اصلاح لی۔ اگرچہ بہت پُرگو تھے، لیکن کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہی پُرانا ناسخی رنگ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

کٹا تھا روزِ مصیبت خدا خدا کر کے
یہ رات آئی، کہ سر پر مرے عذاب آیا
وہ زُود رنج ہے، اُس کو نہ چھیڑنا، رعنا!
ملو گے ہاتھ، اگر برسرِ عتاب آیا

☆

ہجرِ محبوب میں کیا کیا نہ اذیت کھینچی
موت آجاتی تو اِس زیست سے بہتر ہوتا

☆

جلوہ ہر رنگ میں دیکھا ترا گل رُو پیدا
ہر گلِ باغِ جہاں سے ہے تری بُو پیدا

☆

میں دل سے بے نیاز ہوں، دل مجھ سے بے نیاز
دل میرا آشنا ہے، نہ میں آشنائے دل

☆

یادِ آں روز کہ در کوئے تو گریاں رفتم
بہ گلستاں بصفتِ ابرِ بہاراں رفتم

سربکف، آہ بدل، بارِ ندامت بردوش
بردرِ جانِ جہاں، وہ بہ چہ ساماں رفتم

☆

کھو چکے پہلے ہی ناموس کو اور نام کو ہم
پہنچے آغازِ محبت میں ہی انجام کو ہم

☆

گزرا ہے مرا نالۂ دل چرخِ کہن سے
تھا روح کا ہمدم، نہ پھرا جا کے وطن سے
گھٹ گھٹ کے غمِ ہجر میں، جی نکلا ہے تن سے
اب جانِ حزیں چھوٹ گئی رنج و محن سے

☆

کہو خیال میں کس کے اداس ہو رعنا!
کسی سے تم جو نہیں آج گفتگو کرتے

☆

غم سوا عشق کا مآل نہیں
کون دل ہے، جو پائمال نہیں

(مقدمۂ ردوکد ملازمتِ الور (رعنا) : ۳۸۔۴۰، مقدمۂ قصائدِ مدحیہ نظام، اودھ اخبار ۱۳؍۱۷ جون ۱۸۷۹ء، مقدمۂ کلیاتِ نظام، شعلۂ جوالہ ۲ : ۴۰۱۔۴۰۲)

حواشی

☆۔یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے، چوں کہ یہ خطابات آصف جاہ نظامِ حیدرآباد (دکن) کے خطابات سے ملتے جلتے تھے، اس لیے نظامِ دکن اور انگریزی حکومت دونوں نے ان پر اعتراض کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجا کے عذر معذرت کرنے پر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

نیّر... حکیم محبّ علی کاکوروی

محمدؐ بن الحنفیہ کی ۳۲ ویں پشت میں تھے۔ اُن کے آباو اجداد میں متعدّد صوفیۂ کرام اور علمائے باعمل ہوئے ہیں۔ پردادا شیخ محبوب عالم اٹاوہ کے چکلہ دار تھے، دادا شیخ عاشق علی ملازمت کے دوران میں اور جگہوں کے علاوہ گلاؤٹھی (ضلع میرٹھ) میں بھی تھانے دار رہے، اُن کے والد حکیم مشتاق علی دہلوی اپنے زمانے کے مشہور اور حاذق حکیم تھے۔

حکیم مشتاق علی ۲۴ جمادی الاوّل ۱۲۳۷ھ (۱۶ فروری ۱۸۲۲ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد طب درجہ بدرجہ حسین احمد محدّث ملیح آبادی اور حکیم محبوب علی گلاؤٹھوی اور حاذق الزماں حکیم عبدالقادر خان دہلوی سے پڑھی۔ تکمیل کے بعد ریاستِ آوا (ضلع ایٹہ) میں طبیب کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ پھر چندے بھوپال میں رہے۔ یہاں سے نکلے تو مین پوری میں مطب شروع کیا اور بقیۂ عمر یہیں گزار دی۔ علمِ طب میں دو کتابیں، تفریح الاطبا اور مفرح المشتاقین لکھی تھیں، جو غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ ۲۶ ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ / ۱۳ جنوری ۱۸۸۵ء کو انتقال کیا۔ محسن کاکوروی نے تاریخ کہی ''مہتاب قریں آفتاب'' (۱۳۰۲ھ) عیدگاہِ مین پوری میں محسن کاکوروی کے والد کے پائین دفن ہوئے۔

حکیم مشتاق علی شعر بھی کہتے تھے۔ اُن کا کہا ہوا ایک قطعۂ تاریخ خاندانِ شروانی (دتاولی) کی عمارت موسومہ بنگلہ فیض آباد کے ساتھ کی حویلی کے بڑے دروازے پر موجود ہے، جس سے (۱۲۶۹ھ) برآمد ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ کہا جاتا

ہے کہ معین الدّین علوی (بن مشکور علی بن حکیم محبّ علی بن حکیم مشتاق علی) کے پاس ایک بیاض میں ان کا بہت سا کلام موجود ہے۔ ان کے تین بیٹے تھے، بڑے حکیم محبّ علی، منجھلے حکیم طالب علی اور چھوٹے حکیم حبیب علی۔ حکیم محبّ علی ۲۹ ربیع الاوّل ۱۲۵۴ھ (۲۳ جون ۱۸۳۸ء) کو پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی اور طب کی تعلیم اپنے والدِ بزرگوار سے پائی۔ میرٹھ میں نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کے ہمسایے میں رہتے تھے اور اُن ہی سے تلمّذ بھی تھا۔ مرزا غالب دو تین مرتبہ میرٹھ بھی گئے اور نواب شیفتہ کے ہاں ٹھہرے تھے۔ نیّر کی یہیں اُن سے ملاقات ہوئی اور اُنھیں بھی اپنے مسودے دکھائے لیکن شعر بہت کم کہتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں نیّر میرٹھ کی عدالت میں اپنے والد کی جگہ ناظرِ سرشتہ تھے۔ ہنگامے کے فرو ہونے کے بعد مین پوری میں وکالت اور مطب دونوں کرنے لگے۔

۱۸ جمادی الآخر ۱۳۲۲ھ (۳۱ اگست ۱۹۰۴ء) کو انتقال کیا اور عیدگاہ، مین پوری کے صحن میں اپنے والد کے پائین دفن ہوئے۔ کلام کہیں سے نہیں مل سکا۔

اُن کے چھوٹے بھائی حکیم حبیب علی بھی شعر کہتے تھے۔ حبیب تخلّص تھا۔ مدت العمر اٹاوہ میں مطب اور وکالت کرتے رہے۔ ۶۴ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج ۵ نومبر ۱۹۱۲ء (۲۵ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ) کو وہیں انتقال کیا اور بادشاہ قلی کے باغ میں دفن ہوئے۔

[تذکرۂ مشاہیر کاکوروی: ۴۰۳-۴۰۴، ایضاً: ۱۲۲-۱۲۵، ہندوستانی (الہ آباد)، ۴: ۹۰، ۱۳۲]

نیّر رخشاں... نواب ضیاء الدّین احمد خان بہادر دہلوی

چھٹی صدی ہجری میں ساداتِ علوی میں سے ایک بزرگ خواجہ احمد یسوی (ف : ۵۳۴ھ) باب ارسلان (ترکستان) کے مشہور ولی اللہ گزرے ہیں (یہ حضرت علی کے چھوٹے صاحب زادے محمدؐ بن الحنفیہ کی نسل میں سے تھے) انھوں نے سلسلۂ نقش بندیہ کے مشہور شیخ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی سے اکتسابِ فیض کیا اور انھیں سے سندِ خلافت لی۔ ترک اُنھیں ادب اور عقیدت سے ''اتایسوی'' سے خطاب کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں دین و دنیا کے مشاہیر پیدا ہوئے۔ اُنھیں میں سے ایک خواجہ محمدؐ امین حکومتِ بخارا میں سلطان بیگی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ خواجہ محمدؐ امین کے صاحب زادے خواجہ عبدالرحمٰن بلخ میں منتظمِ دیہات اور مہتممِ دارالضربِ شاہی رہے۔ اگرچہ یہ خاندان نسب کے لحاظ سے طبقۂ سادات میں سے تھا، مگر شاہی منصب دار ہونے کے باعث مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر مرزا اور خان کے القاب سے کیا ہے۔

خواجہ عبدالرحمٰن کے تین صاحب زادے تھے، قاسم جان، عالم جان، عارف جان۔ مرزا عارف جان سب سے چھوٹے تھے۔ یہ تینوں بھائی احمد شاہ (۱۷۴۸۔ ۱۷۵۴ء) کے عہد میں ترکوں کا ایک مسلّح دستہ ساتھ لیے بخارا سے ۱۷۵۰ء کے قریب ہندوستان آئے۔ اُس زمانے میں وسطی ایشیا (ماوراء النہر) کی سکونت انتہائی سیاسی

افراتفری کے باعث ناممکن ہوگئی تھی۔ اِسی سے یہ خاندان ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ اُن دنوں حکومتِ دہلی کی طرف سے مرزا محمدؔ بیگ اٹک کے صوبے دار تھے۔ یہ قافلہ چند دن اُن کے پاس ٹھہرا۔ اِسی اثنا میں صوبے دار موصوف نے مرزا عارف جان کو اپنی فرزندی میں لے لیا اور اپنی دخترِ بلند اختر اُن کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا عارف جان یہاں رہ کر علاقے کے نظم و نسق میں مرزا محمدؔ بیگ کی مدد کرتے رہے۔ آخر اُن کی شجاعت اور قابلیت کی شہرت اس دُور دست علاقے سے نکل کر پایۂ تخت دہلی تک جا پہنچی اور یہ حسبِ طلب شاہ عالم کے عہد میں (۱۷۵۹ء۔ ۱۸۰۶ء) دارالخلافے میں حاضر ہوئے۔

مرزا عارف جان کے چار بیٹے ہوئے۔ نبی بخش خان، احمد بخش خان، الٰہی بخش خان اور محمدؔعلی خان، اُن میں سے احمد بخش خان اور الٰہی بخش خان نے شہرتِ دوام کے خلعت حاصل کیے۔ یہی وہ الٰہی بخش خان ہیں جو اُردو زبان میں معروف کے تخلص سے مشہور ہیں، وہ حضرت مولانا فخر الدّین چشتی (ف ۱۱۹۹ھ) کے مریدِ خاص اور خلیفہ تھے۔ معروف نے اگر علم و فضل اور تصوّف و سلوک کے میدان میں شہرت حاصل کی، تو اُن کے بڑے بھائی احمد بخش خان نے ریاست و جہاں بانی کی دنیا میں اپنا سکّہ جاری کیا۔

احمد بخش خان اٹک میں ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ جب خاندان دلّی منتقل ہوا، تو یہ بھی یہاں آگئے۔ جوانی کا زمانہ یہیں گزرا۔ پہلے گوالیار میں بزمرۂ سواراں ملازم ہوئے۔ معقول بسر اوقات تھی، لیکن کسی سبب سے یہ روزگار ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کے بعد گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ ایک دفعہ اِسی سلسلے میں دلّی آرہے تھے کہ راستے میں مہاراجا بختاور سنگھ بہادر والیِ الور سے ملاقات ہوگئی، جس کے نتیجے میں اُنھوں نے دربارِ الور کی ملازمت قبول کرلی۔

مہاراجا بختاور سنگھ اُن کی فرض شناسی اور حُسنِ کارکردگی سے بہت خوش ہوئے اور اُنھیں دلّی میں لارڈ لیک کے یہاں اپنا وکیل مقرر کردیا، یہ عہدہ آج کل کی سفارت

کے مرادف تھا۔ یہاں بھی اُنھوں نے اپنے فرائضِ منصبی کو اس خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ ایک طرف انگریز اُن کی معاملہ فہمی کے مدّاح تھے تو دوسری طرف مہاراجا بہادر بھی اُن کی وفاداری سے ہر طرح مطمئن تھے۔ ۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے ریاست بھرت پور میں قلعۂ ڈیگ پر چڑھائی کی۔ احمد بخش کی درخواست پر دربار الور نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یہ بڑی گھمسان کی لڑائی تھی۔ ایک موقعے پر انگریز جرنیل فریزر کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ احمد بخش خان اپنی جان پر کھیل کر اُسے دشمنوں کے نرغے میں سے نکال لائے۔ میدان تو انگریزوں کے ہاتھ رہا لیکن جرنیل فریزر کے زخم مہلک ثابت ہوئے اور وہ جاں بر نہ ہوسکے۔ مرنے سے پہلے اُنھوں نے احمد بخش خان کو ایک سندِ خوشنودی لکھ دی جس میں حکومتِ انگریزی سے سفارش کی کہ احمد بخش خان کی خدمات کا مناسب صلہ دیا جائے۔ چنانچہ دلّی میں فتح کا دربار ہوا، تو لارڈ لیک نے اُنھیں فیروز پور جھرکہ، سانگرس، پوناہانہ، بچھور، اور نگینہ کا علاقہ استمراری جاگیر میں عطا کیااور فرمان میں اُن کا نام لکھوایا: ''فخر الدّولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر، رستم جنگ'' مہاراجا بختاور سنگھ نے اُس پر اپنی طرف سے پرگنہ لوہارو کا .ضافہ کردیا۔

نواب احمد بخش خان نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔ ایک بیوی سے نواب شمس الدّین احمد خان، (ف، ۱۸۳۵ء) اور ابراہیم علی خان اور دوسری سے نواب امین الدّین احمد خان اور نواب ضیاء الدّین احمد خان۔ شمس الدّین احمد خان اپنے والد کی حینِ حیات ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکہ کے حکمران ہوگئے تھے۔ لوہارو کی جاگیر نواب احمد بخش خان نے اپنے دوسرے بیٹوں کے نام لکھ دی۔ ہماری زبان کے مشہور شاعر نواب مرزا داغ اُن ہی نواب شمس الدّین احمد خان کے بیٹے تھے۔

نواب احمد بخش خان اکتوبر ۱۸۲۷ء (ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ) میں فوت ہوئے۔ ''مینو مقام فخر الدّولہ'' تاریخِ وفات ہے۔ دلّی کے باہر مہرولی میں درگاہِ حضرت خواجہ بختیار کاکی (ف: ۶۳۳ھ) میں مولانا فخر الدّین کے مزار کے پائین مدفون ہیں۔

نواب ضیاء الدّین احمد خان اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کے وقت ۶ برس

کے تھے، یہ فیروز پور جھرکہ میں اکتوبر ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ جاداد کی رُو سے پرگنہ لوہارو اُن کے ساتھ، اُن کے بڑے بھائی نواب امین الدّین احمد خان دونوں کے حصّے میں آیا تھا۔ جب تک ضیاء الدّین خاں سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے، جاداد کا نظم و نسق بڑے بھائی کے ہاتھ میں رہا اور اِن کے حصّے کی آمدنی خزانے میں جمع ہوتی رہی۔ بالغ ہونے پر نواب ضیاء الدّین احمد خان نے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی ریاست میں برابر کا شریک بنایا جائے۔ ورنہ ریاست دو حصوں میں تقسیم کردی جائے۔ حکومتِ انگریزی نے یہ تجویزیں نامنظور کیں اور چوں کہ بھائیوں میں کش مکش روز بروز بڑھتی جارہی تھی، اس لیے ۱۸۴۸ء میں فیصلہ کیا کہ آئندہ نواب ضیاء الدّین احمد خان کو خزانۂ ریاست سے اٹھارہ ہزار روپیہ نقد سالانہ وظیفہ ملتا رہے، اور وہ ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اِس پر یہ لوہارو سے نقلِ مکان کر کے مستقلاً دہلی میں مقیم ہوگئے۔ اُن کی وفات کے بعد یہ وظیفہ گھٹا کر بارہ ہزار سالانہ کردیا گیا تھا، جو ملک کی آزادی تک اُن کے خاندان میں جاری رہا۔

نواب ضیاء الدّین احمد خان کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ علمِ تفسیر و حدیث حضرت شاہ عبدالقادر (بن حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی) کے شاگردِ رشید مولوی کریم اللہ سے، ادب و فقہ جناب مفتی صدر الدّین آزردہ سے، اور فلسفہ و منطق مولانا فضلِ حق خیرآبادی سے حاصل کیے۔ فارسی میں غالب کے شاگرد تھے اور مشق سے خود اس زبان کے استادِ بے بدل ہوگئے۔ عربی اور ترکی بھی اچھی جانتے تھے۔ اُن کی فارسی میں استادانہ حیثیت کا اعتراف اُن کے معاصرین کو بھی تھا جس کا ثبوت مولانا شبلی مرحوم کی زندگی کے ایک واقعے سے ہوتا ہے۔

مولانا شبلی نے علی گڑھ کے قیام کے ابتدائی زمانے میں (۱۸۸۴ء) شیخ علی حزیں کی ایک زمین میں غزل کہی : حیراں چہ کنم، فراواں چہ کنم۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنے سے حاصل۔ آخر یہ ٹھہری کی حزیں اور شبلی دونوں کی غزلیں اہلِ رائے حضرات کے پاس محاکے کے لیے بھیجی جائیں۔

خواجہ عزیز الدّین عزیزؔ لکھنوی اور نواب ضیاء الدّین احمد خاں نیّر رخشاں (اور غالبًا ذوالقدر خان بہادر غلام غوث خان بےخبر بھی) حکَم ٹھہرے۔ دونوں غزلیں مقطعے حذف کر کے اِن اصحاب کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ سب نے فیصلہ کیا کہ شبلی کا کلام اہلِ زبان کی شان رکھتا ہے اور سلف کے کلام کا ہم پلّہ ہے۔

نواب ضیاء الدّین احمد خان نجوم اور ہیئت میں بھی اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں ان کی دست گاہ کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ بالخصوص ایشیا کے مختلف ممالک کی تاریخ پر ایسا عبور تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ تمام عمر مطالعۂ کتب میں گزری۔ اُن کے کتاب خانے میں مختلف علوم کی مستند اور بلند پایہ کتابیں موجود تھیں۔افسوس کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء میں وقفِ تاراج ہوگیا۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ بیس ہزار سے کم مالیت کا نہ ہوگا۔ غدر کے بعد پھر جمع کرنے لگے۔ مشہور مستشرق چارلس شیفر نے ناصر خسرو علوی کا سفرنامہ اور اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا تھا۔ اس نے فارسی مخطوطہ نیّر رخشاں کے کتاب خانے میں سے حکومتِ ہند کی وساطت سے حاصل کیا تھا۔ جب حکومتِ ہند کے سیکریٹری ایلیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ لکھی، جس میں ہندوستان کے فارسی اور عربی مؤرخوں کی کتابوں کے ترجمے شائع کیے، تو نواب ضیاء الدّین احمد خان نے اُنھیں فراہمیِ کتب اور ترجمے میں بہت مدد دی تھی، جس کا اعتراف صاحب موصوف نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ نواب صاحب کا یہ کتاب خانہ جو غدر کے بعد جمع ہوا تھا، اُن کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے نواب سعید الدّین احمد خان نے ندوۃ العلما کو دے دیا۔

غالب کے جو تعلّقات اِس خاندان سے تھے، اس کا اندازہ اِس سے ہوسکتا ہے کہ غالب کی بیوی امراؤ بیگم نواب الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی صاحب زادی تھیں۔ جس زمانے میں نواب شمس الدّین احمد خان فیروز پور جھرکہ کے حکمران تھے، انھوں نے کوشش کی کہ کسی طرح لوہارو بھی مجھے مل جائے۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگئے اور یہ پرگنہ بھی اُنھیں مل گیا۔ اِس معاملے میں غالب نے اِن دونوں

بھائیوں کا ساتھ دیا اور لوہارو کے نواب شمس الدّین احمد خان کی تحویل میں دیے جانے کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ اِس علاقے کی اِن دونوں بھائیوں کے نام بحالی میں غالب کی مساعی کا بھی کچھ دخل تھا۔

نواب ضیاء الدّین احمد خان کی تعلیم و تربیت میں قدرتاً غالب نے بہت دلچسپی لی۔ فارسیؔ اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلّص تھا۔ اپنے استاد کے مایۂ ناز شاگرد ثابت ہوئے اور میرزا کو اُن پر فخر تھا۔ اُنھوں نے ایک زور دار فارسی قصیدہ نیّر رخشاں کی مدح میں کہا ہے (قصیدہ ۶۲) غالب نے اپنی زندگی میں سندِ خلافت لکھ دی تھی۔ خلیفۂ اوّل نیّر رخشاں مقرر ہوئے اور خلیفۂ دوم نواب علاء الدّین احمد خان علائی۔ نیّر رخشاں کا تمام کلام نظم و نثر بھی غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ بعد کو جو کچھ جمع ہو سکا، اُسے ان کے صاحب زادے نواب سعید الدّین احمد خان طالب نے ''جلوۂ صحیفۂ زرّیں نیّر رخشاں'' کے تاریخی نام سے شائع کرایا تھا (۱۹۱۵ء)

مدّت سے ضیق النفس کا عارضہ تھا جس سے آخر عمر میں بہت مضمحل ہو گئے تھے۔ ''موت سے پہلے صرف دو تین روز تپ رہی، تیسرے دن شدّت اور اس کے ساتھ بے ہوشی بھی ہوگئی۔ ایک رات اور آدھے دن یہی حالت رہی''۔ آخر شنبہ ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ (مطابق ۲۷ جون ۱۸۸۵ء) دوپہر کے وقت رحلت فرمائی۔ اُسی دن شام کے پانچ بجے اجمیری دروازے کے باہر نمازِ جنازہ ہوئی اور مہر ولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی قدس سرہ، کی درگاہ میں اپنے والدِ ماجد اور برادرِ بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اِنّا للّٰہِ واِنّا اِلیہِ راجعُون۔

مولوی رضی الدّین احمد خان دہلوی نے بے مثل مادّۂ تاریخ بہم پہنچایا۔ جس پر مولانا حالی نے مصرعے لگائے۔

چوں ضیاء الدّین احمد خاں کشید
رخت از دنیا سوئے دارالسّلام

گفت ہاتف با رضیؔ، سالِ وفات
"روزِ شنبہ، سیزدہ شہرِ صیامؔ"
(۱۳۰۲)

یہی کتبہ لوحِ قبر پر کندہ ہے۔ خود مولانا حالی نے اِس موقعے پر دو رباعیاں کہی تھیں۔

غالب ہے، نہ شیفتہ، نہ نیّر باقی
وحشت ہے، نہ سالک ہے، نہ انور باقی
حالی، اب اِسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

☆

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز
آتے ہی خزاں کے سب کر گئے پرواز
تھی باغ کی یادگار، اک بلبلِ زار
سو اُس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز

شمس العلماء مولانا شبلی نے فارسی زبان میں مرثیہ لکھا تھا، جو اُن کے کُلّیات میں موجود ہے۔ نواب ضیاء الدّین احمد خان کا نکاح شرف الدّولہ قاسم جان کی پوتی اور مرزا قدرت اللہ خان کی صاحبزادی امتیاز زمانی بیگم عرف حاجی بیگم (وفات ۵ اکتوبر ۱۸۹۵ء) سے ہوا تھا۔ اولاد میں ایک صاحب زادی معظّم زمانی بیگم صاحبہ اور دو صاحب زادے شہاب الدّین احمد خان ثاقب اور احمد سعید خان طالب تھے۔ ثاقب زندگی ہی میں اُنھیں جوانا مرگی کا داغ دے گئے۔ طالب ۱۹۱۹ء تک زندہ رہے۔ دونوں کے حالات لکھے جا چکے ہیں۔ معظّم زمانی بیگم عرف بگّا بیگم کا نکاح زین العابدین خان عارف کے بڑے صاحب زادے باقر علی خان کامل سے ہوا تھا۔ اُن کا بھی ۱۰ مئی ۱۹۴۵ء کو انتقال ہوگیا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

تخلص کے لحاظ سے پہلے چند شعر فارسی کے لکھتا ہوں:

مکن ہلاک کہ شادم بہ ناروائی خویش
بروے من بکشا، چشمِ اعتبار مرا
دلش بسوخت چو برکارہاے بے مزدم
وفا نتیجہ بہ از مزد داد کار مرا
نمودہ سعی بہ بے برگیِ من و خجلم
بکیسہ نیست چو پا مزد روزگار مرا
زتیرہ روزی و آشفتگی و رنجوری
بسنج خالِ رخ زلف و چشمِ یارِ مرا

☆

جامِ شراب برکف و نوشیں لبے ببر
دیگر ز حق بگو، کہ ترا التماس چیست
نیر! نقاب گرنفگنداز رخش نسیم
وجہ بباددادنِ ہوش و حواس چیست

☆

شکستہ طرفِ کلاہ وکشودہ بندِ قبا
چہ بے خودانہ بتِ مے گسار می آید

☆

روشِ دہر بیک گونہ نباشد نیّر!
نہ چنیں بود کہ ہست وچناں است کہ بود

☆

ہر نفس تازہ سپاسے بزباں می آید
کہ غمے تازہ نوازندۂ جاں می آید

بدروں خستگیم بیشتر ہست ازبیروں
کہ فزوں تر دلم ازلب بفغاں می آید
اے اجل! مہلتِ نظارہ کہ اندہ خواراں
می سرایند کہ می آیدو ہاں می آید
باشد آزاد زہفتاد و دو ملت نیّر
ہر کہ در سلسلۂ پیرِ مغاں می آید

☆

گوئی کہ فضلِ حق رسد و ناگہاں رسد
خوش طالعی کہ جذبۂ شوقے بجاں رسد
بررغمِ محتسب سرِ بازار درکشیم
گرساغرے ز پیرِ مغاں ارمغاں رسد
نیّر! بہ آسماں نہ نہم بازپاے ناز
گرایں سرِ نیاز، برآں آستاں رسد

☆

اشکے کہ نہ در یادِ تو، از چشمِ تر اُفتاد
دردیدۂ صاحب نظراں از نظر اُفتاد
عطاد و دمِ دشنہ و حلّاج و سرِدار
در موقفِ تسلیم، چہ خونہا بدر اُفتاد
گردم سرِ پا لغزِ تو، اے ساقیِ بدمست!
مے درقدحم از دِگراں بیشتر افتاد

☆

پیشِ در میکدہ سرخمیدن دہیم
نشۂ اقبال را اوجِ رسیدن دہیم

وعدہ بفرداست گر، مرحلۂ بیش نیست
شوقِ سبک تازرا، گامِ دویدن دہیم

☆

ازنالہاے زار بتابم بکہ دوست را
بیخواب کردہ دوش بآوا گریستن
غیر بہ پردہ داریِ دردِ تو داشت سعی
افشاے راز می کند، لتا گریستن

☆

باشم بدہر تاکجا شاد
بینم بخواب، خواب تاکے
حرماں بامید نسیۂ شہد
ازنقدِ شرابِ ناب تاکے
نشناختہ بوالہوس ز جانباز
بے مصرفیِ عتاب تاکے

اُردو کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں :

شاید بہار آئی کہ جو پنجۂ جنوں
پھر کر رہا ہے جامۂ دستار تارتار
سر پیٹے، سینہ کوٹے، کہ افسوس میں ملے
عاشق کو ہاتھ چاہییں ناچار، چار چار
رخشاں پہ غصے قیس کے ملنے سے کیوں ہوے
ملتے ہی ہیں بہم بُتِ عیار یار یار

☆

فلک گر نہ تھا، بار اٹھانے کے قابل
تو کیا تھے ہمیں، آزمانے کے قابل

☆

حیرت میں ہوں، کہ نوکِ مژہ نیشتر مثال
کھبتی ہے گر جگر میں، تو کیوں خوں چکاں نہیں
گر انتہا نہیں، ستم و جورِ یار کو
شوقِ زیادہ جُو کو مرے بھی کراں نہیں

☆

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں
میرے غصّے نے ایک دم میں کیا
مُردۂ صد ہزار سال ہمیں
طالعِ بد سے نیّرِ رخشاں!
اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں
دل میں مضمر ہیں معنیِ باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں
نقص سے رنج کچھ نہیں، رخشاں!
حق نے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

☆

پیری و مفلسی میں نہ لو نام مے کہ، اب
لطف ارتکاب میں ہے، نہ اجر اجتناب میں

☆

کیا پہنچے تو، فرشتے کا جس جا گزر نہ ہو
بیت الصنم ہے، شیخ! خدا کا یہ گھر نہ ہو

رخشاں! جو آتے آتے ابھی رُک گئے ہیں اشک
آنکھوں میں آگیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

☆

بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش
لے کے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجئے

مندرجۂ ذیل غزل انڈیا آفس لائبریری کی ایک قلمی بیاض☆[1] سے لی گئی ہے (ص ۵٦) یہ بیاض فہرست میں، بیاضِ بسمل، مرتبہ سیّد اصغر علی کے عنوان سے درج ہے۔ یہ غزل آج تک کہیں شائع نہیں ہوئی۔

لے خبر میری کہ اب غم کی مجھے تاب نہیں
آدمی ہوں، نہ ملک، گرچہ خورو خواب نہیں

آنکھ سے نکلے، وہیں جذب ہوئے دامن میں
بجز اشکوں کے کوئی گوہرِ نایاب نہیں

یاس ہے رجعتِ ایّامِ گزشتہ☆[2] سے ہمیں
گردشِ دہر ہے، یہ گردشِ دولاب نہیں

خون کرنے میں☆[3] عدو نے کہیں واں دھویا ہاتھ
یاں ٹپکتا مری آنکھوں سے جو خوناب نہیں

آبِ شمشیر کے اک قطرے سے کیا تر ہو وہ حلق
سات دریا سے جو ہوتا کبھی سیراب نہیں

ایک قطرہ نہ ملے گا تمھیں، منہ دھو رکھو!
زاہد و! بادہ ہے، زمزم کا یہ شوراب نہیں

ہم ہی جب پھک چکے، پھر کیا، ہمیں پروائے جہاں
نکل اے آہ کہ بس ضبط کی اب تاب نہیں

جتنے ہو نغمہ سرا، اتنے ہی خوں ریز بھی ہو
چھیڑ نشتر کی چلی جائے جو مضراب نہیں
اے دلِ شاد! الگ ہو، مرے سینے میں نہ رہ
مجھ کو معلوم عزا خانے کے آداب نہیں
چلے آؤ شبِ تاریک میں، کیسی شبِ ماہ
کیا ہوا، ایک اگر کرمکِ شب تاب نہیں
ناز میں زلف کمر میں نہ لپیٹا کیجے
سرو کو کیا خطرِ پیچشِ لب لاب نہیں
نیلوفر ہے ترے خورشیدِ رُخِ روشن سے
گریے میں چشم جو بیٹھی، یہ تہِ آب نہیں
کن کو احباب سمجھتے ہیں یہ غم ہے رخشاں
یہ نہیں ہے کہ اُنھیں خاطرِ احباب نہیں

(دیباچۂ جلوۂ صحیفۂ زرّیں نیّر رخشاں، دیباچۂ دیوانِ معروف، مرقعِ الور، ذکرِ غالب، بیاض کتابخانہ انڈیا آفس)

حواشی

☆۱-(B)59 I.O.L-F : B-66 ☆۲-بیاض میں ''بھی'' لکھا ہے ☆۳-بیاض: سے

واجد علی شاہجہانپوری

[دیکھیے زیرِ نظر کتاب میں ترجمۂ نگار (منشی، سیّد آلِ نبی شاہجہانپوری]

وحید... وحید الدّین احمد خان بہادر دہلوی ثم حیدرآبادی

بڑے عالی نسب شخص تھے۔ اُن کا خاندان شاہی میں صاحبِ جاگیر و منصب اور مختلف عہدوں پر ممتاز رہا۔ وحید کے والد عمدۃ الامرا ضیاء الدّولہ حافظ الملک سعد الدّین احمد خان بہادر اور جدِ امجد رکن الدّولہ مشیر الملک رکن الدّین خان تھے۔

وحید ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱۔۱۸۵۲ء) میں دلّی میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ حیدرآباد دکن منتقل ہوگئے۔ جہاں ان کے بڑے بھائی جناب مولوی بشیر الدّین احمد خان بہادر ناظمِ جمعیت سرکارِ نظام تھے۔ وحید بھی مدّتوں اضلاع کی تعلقہ داری کے عہدے پر فائز رہے۔ دلّی بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ ۱۳۲۱ھ میں زندہ تھے۔

شاعری بہت کم عمری میں شروع کی۔ غالب سے مشورہ کیا اور اُن کے علاوہ کسی اور کو کلام نہیں دکھایا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

نہ چاہی ضبط نے رسوائیِ عشق
نہ آیا رازِ دل ہرگز زباں تک

جفا کی بھی نہ ہو جب تجھ سے اُمید
وفا کوئی کرے آخر کہاں تک

ملامت کر نہ واعظ! مے کشوں کو
یہاں بدمست ہے پیرِ مغاں تک
چمن میں حشر برپا ہو رہا ہے
بچے گا کون، پایانِ خزاں تک

☆

تھا یوں تو غمِ عشق سے دل ریش، جگر چاک
وحشت میں ہے اب باعثِ آرایشِ سر چاک
اے دشنۂ غم! کیوں شبِ فرقت میں کمی کی
سینہ نہ ہوا مثلِ گریبانِ سحر چاک
ہرچند اثرِ داغ سے محروم نہیں دل
منجملۂ اسبابِ تسلّی ہے مگر چاک
کس طرح چلا آتا ہے دیکھو تو وحید آج
دامن ہے اِدھر چاک، گریباں ہے اُدھر چاک

☆

سراپا زخم ہوں، صد آفریں اُس ناوک افگن کو
سیے کیا خاک، حیرت ہوگئی ہے چشمِ سوزن کو
نہ ترکش ہو کہیں خالی، نہ رحم آجائے، یہ ڈر ہے
کبھی ناوک فگن کو دیکھتا ہوں میں، کبھی تن کو
نمودِ خاک سے بھی ہے ہماری خستگی پیدا
غبارِ راہِ مجنوں جانتے ہیں لوگ مدفن کو
غضب ہے بے ارادہ حسرتِ دشمن نکلتی ہے
وحید! اس کی گلی میں کیوں بنایا میرے مدفن کو

☆

منھ سے ہنوز اس نے اٹھایا نہ تھا نقاب
پامالِ ناز ہوگئے ہم اک ادا کے ساتھ
ہے آرزوئے خاطرِ جاناں عزیز تر
یا رب نہ ہو حصولِ تمنّا دعا کے ساتھ

[تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم : ۱۷۳-۱۷۴، یادگارِ ضیغم (قلمی)]

وفا و طالب... میر ابراہیم علی خان سہسوانی

نقوی حسینی سیّد تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت خواجہ قطب الدّین مودودی کے واسطے سے حضرت امام حسین علیہ السّلام تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان سہسوان (ضلع بدایوں) کا رہنے والا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں اُن کے جدِّ اعلیٰ میر سرفراز علی خان یہاں سے نقلِ مکان کر کے بڑودہ چلے گئے۔ یہ مہاراجا گووند راؤ گایکواڑ کا عہد تھا۔ میر صاحب موصوف آدمی قابل اور باہوش تھے۔ بہت جلد ترقی کی اور انگریزوں اور ریاست دونوں کے ہاں رسوخ پیدا کرلیا۔ مہاراجا نے اُن کی کارکردگی سے خوش ہو کر اُنھیں کاٹھیا واڑ میں کھانڈیا اور دراوڑی اضلاع جاگیرداری میں عطا کیے۔

میر سرفراز علی خان کے دو بیٹے تھے، بڑے میر اکبر علی خان اور چھوٹے میر جعفر علی خان۔ میر اکبر علی خان ریاست میں سلح دار تھے، وفا اُنھیں کے خلفِ اکبر تھے۔ یہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں پیدا ہوئے۔ (ان کے خواجہ تاش حکیم سیّد احمد حسن فدا نے ان کا تاریخی نام "سیّد غلام حسن" لکھا ہے)۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور تکمیل سورت میں جناب منشی لطف اللہ فریدی سے کی۔ جب ۱۸۶۰ء میں اُن کے والد میر اکبر علی خان کا انتقال ہو گیا تو یہ اُن کے جانشین ہوئے اور سلح داری کا عہدہ اُن کے سپرد ہو گیا۔

وفا کے پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا۔ اس پر تصوّف کے شغف نے رنگ اور چوکھا کر دیا وہ احمد آباد کے صوفی بزرگ محمود میاں چشتی سے بیعت تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر سال اپنے مکان پر محفلِ میلاد منعقد کرتے اور خود نعتیہ کلام سُناتے۔ کچھ اُن

کی پرسوز و اثر انگیز آواز اور بہت حد تک ان کے حسنِ تیع کے باعث حاضرین مبہوت ہو جاتے۔

بڑودہ کے تعلق سلحداری کے باعث وہاں کے سردار درجۂ اوّل تو تھے ہی، انگریزی حکومت کی طرف سے بھی اُنھیں سی آئی ای کا اعزاز عطا ہوا تھا۔ یہ تمغہ اُنھیں دلّی دربار منعقدہ ۲۸ نومبر ۱۸۸۱ء (۶ محرم ۱۲۹۹ھ) کے موقعے پر بڑودہ میں ملا سیّد احمد حسن فدا نے تاریخ کہی:

قیصرِ ہند نے جو دہلی میں
بہرِ دربار سب کو بلوایا
شاہِ کلکتہ نے براہِ کرم
تمغہ بھی اکثروں کو دلوایا
دوسروں کو ملا جو واں جا کر
میر صاحب کا بخت یاں لایا
ہم سروں میں بفضلِ ربِّ وَدُود
تیرا، گھر بیٹھے، بڑھ گیا پایا
کیوں نہ بڑھ جائے مرتبہ تیرا
تیرے پیروں کا تجھ پہ ہے سایا
تجھ کو کیا اعتقادِ کامل کا
ہوگیا ہے نصیب سرمایا
حشمت و جاہ و عزّت و اقبال
منھ سے بن مانگے، تو نے سب پایا
فکر تاریخ کی ہوئی جو فدا!
ہاتفِ غیب نے یہ فرمایا

پائے محمود☆ چوم لے اور لکھ
''آج تمغائے قیصری آیا''
(۱۸۸۱=۱۸۷۷+۴)

وفا نے بڑودہ کے منشی غلام قادر کی صاحب زادی سے عقدِ نکاح کیا۔ جس سے چار بیٹے ہوئے، میر احتشام علی خان، میر یوسف علی خان، میر ناصر علی خان اور میر محمود علی خان۔ میر احتشام علی خان بہادر بھی شاعر تھے، جادو تخلّص تھا اور پہلوانِ سخن مولانا نجم الدّین احمد ثاقب بد ایونی کے شاگرد تھے، ظہیر دہلوی سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔

جادو یک شنبہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ (۱۶ اگست ۱۸۶۸ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ جب حکیم سیّد احمد حسن فدا نے غالب کو اُن کی ولادت کی خبر لکھی، تو میرزا نے اس پر ایک رباعی اور ایک قطعہ کہا۔ رباعی یہ تھی:

حق داد بہ سیّد ز پےِ انعامش
فرّخ پسرے کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولادتش بود بے کم و بیش
''ارشاد حسین خان'' کہ باشد نامش

گویا غالب نے ''ارشاد حسین خان'' ان کا تاریخی نام تجویز کیا تھا۔ لیکن چوں کہ خاندان میں سب نام ''علی خان'' کے لاحقے سے چلے آرہے تھے، اس لیے کسی نے یہ نام منظور نہ کیا اور احتشام علی خان نام رکھا گیا۔ غالب نے اسی موقعے پر یہ قطعہ بھی کہا تھا:

غالب حالِ سنینِ ہجری
معلوم کن از ''خجستہ فرزند''
چوں یک صدوبست و چار ماند
این است شمارِ عمرِ دلبند

اس کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''یہ تو ظاہر ہے کہ سنہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب

''فجستہ فرزند'' میں سے ۱۲۸۵ھ ''لیے'' تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں، اِن کو میں نے دعاے عمرِ مولود قرار دیا''۔

اسی موقع پر انھوں نے ''ایک عبارتِ رنگین بھی مرتب کر کے ''اکمل الاخبار'' میں چھپوائی تھی۔ کسی نے یہ عبارت میرزا کے نثری مجموعوں میں شامل نہیں کی، خدا معلوم، کیوں!

میر ابراہیم علی خان نے اگست ۱۸۸۸ء کے بعد کسی وقت بڑودہ ہی میں انتقال کیا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

بجالاؤ، وفا! شکرِ خدا، ہو صاحبِ قسمت
کیا استاد اپنا تم نے غالب سے سخن داں کو

☆

بہت دم بھی دیے، کیں التجائیں، پر نہ آئے وہ
وفا! ہم کو نہایت ناز تھا، جادو بیانی پر

☆

وہاں نہ جانے کا لیتے ہو وعدہ مجھ سے ولے
زباں سے لاکھ کہوں، دل پر اختیار نہیں
نہ دو دل اُس گلِ رعنا کو، اے وفا! دیکھو
گلوں کے حُسنِ دو روزہ کا اعتبار نہیں

☆

کب لبوں پر مرے نالے نہیں، فریاد نہیں
کب تری وعدہ فراموشی مجھے یاد نہیں
شاد ہوں، سینے میں جب سے دلِ ناشاد نہیں
اب وہ شیون نہیں، وہ نالہ و فریاد نہیں
رنجِ عشاق سے کب چین ہے معشوقوں کو
صید کی فکر میں صیاد بھی آزاد نہیں

چھیڑنے کو یہ جفا اُس کی، وفا ہے، ورنہ
طبع اُس شوخ کی کچھ مائلِ بیداد نہیں

☆

ہوئی آخر تمھارے ہجر میں یہ جوششِ وحشت
اجاڑا ہم نے بستی کو، بسایا جا کے ویرانہ
بیانِ دردِ فرقت کر کے، تم احساں جتاتے ہو
کہانی آپ کی سُن لی، مرا اب سنیے افسانہ

☆

ارمان کچھ اِرم کے نہ باغِ جناں کے ہیں
ہم تو نثار سیّدِ کون و مکاں کے ہیں
تیرِ نگاہِ یار کا آماجگاہ ہوا
یہ حوصلے ہمارے دلِ ناتواں کے ہیں
کہتے ہیں آسماں پہ ملائک بھی الحفیظ
شعلے بلند یہ مری آہ و فغاں کے ہیں
بس ہے، بسر ہو عمرِ دو روزہ جو چین سے
ارمان کس کو زندگیِ جاوداں کے ہیں
کیا غم جو ہو وسیلۂ محمود حشر میں
طالب! مرید آپ تو قطبِ زماں کے ہیں

(خم خانۂ جاوید، ۲ :۱۹۴، معاصر، پٹنہ، ۴ : ۱۴۰۔۱۴۳، سخن ورانِ گجرات : ۲۲۳، ۲۲۷۔ دو ماہی اکادمی، لکھنؤ، ۱۰ : ۱۴۱۔۴۴، اردوئے معلیٰ : ۱۷۷)

حواشی

☆۔ اشارہ ہے ان کے مرشد حضرت محمود چشتی کی طرف۔

وفا و اختر و نزاکت... خواجہ عبدالغفار جہانگیر نگری

ڈھاکہ کا خاندانِ خواجگان بہت مشہور ہے۔ اس میں دین و دُنیا دونوں کے مشاہیر پیدا ہوئے۔ اصل میں یہ خاندان کشمیر کا تھا، جہاں سے یہ لوگ تجارت کے سلسلے میں نقلِ مکان کر کے ڈھاکہ میں بس گئے۔ سب سے پہلے جو شخص یہاں آئے وہ خواجہ مولوی حفیظ اللہ تھے۔ اسی سلسلۂ طلاے ناب کی ایک کڑی خواجہ عبدالغفار تھے۔ اُن کے والد کا نام خواجہ عبدالغفور تھا۔ خواجہ عبدالغفار فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ پہلے چندے اپنے ایک بزرگ خواجہ عبدالرحیم صبا سے مشورہ کیا، دیوان بھی مرتب کرلیا تھا، جو ضائع ہوگیا۔ پھر مرزا رجب علی اثیر کے ڈھاکے آنے کے بعد شاعری کا خفتہ شوق بیدار ہوگیا اور ازسرِ نو اس میں دلچسپی لینے لگے۔ فارسی میں تخلص وفا تھا، اور اُردو میں اختر۔ غالب کے علاوہ کلام پر اصلاح حافظ اکرام الدّین☆ احمد ضیغم سے بھی لی۔ ریختی بھی کہتے تھے اور اس میں نزاکت تخلص کرتے تھے۔ آخر عمر میں نعت کا شوق پیدا ہوا اور اس میں بھی اپنی طبیعت اور عقیدت کے جوہر خوب خوب دکھائے اور مقبول ہوئے۔ کبھی کبھی ''شیخ بنگالی عاصی'' کے قلمی نام سے بھی لکھتے تھے۔ اُن کی زندگی بھر یہ راز نہیں کھلا کہ اس پردے میں کون ''معشوق'' ہے۔ اُن کی وفات کے بعد جب ان کا مجموعۂ کلام حکیم حبیب الرحمٰن (مصنف ثلاثہ غسالہ) نے وفا کے صاحب زادے خواجہ عطاء اللہ سے دیکھنے کو لیا تو پتا چلا کہ ''شیخ بنگالی عاصی'' یہی ہمارے وفا ہیں کیوں کہ عاصی کے نام کا کلام اس غیر مطبوعہ مجموعے میں موجود تھا۔

دیوان شائع نہیں ہوا، اگرچہ اُن کے خاندان میں محفوظ ہے۔ پچھلے دنوں اُن

کے نعتیہ کلام کا ایک مختصر مجموعہ "منظومۂ اختر" ڈھاکا یونی ورسٹی کے کتاب خانے میں دستیاب ہوا تھا۔ اسے پروفیسر کلیم سہسرامی (راج شاہی یونی ورسٹی۔ بنگلا دیش) نے شائع کر دیا ہے۔

۱۲۹۷ھ (۱۸۸۱ء) میں انتقال ہوا۔ نساخ نے تاریخ کہی:

اختر آں مہرِ آسمانِ سخن
رفت چوں ازسرائے رنج و ملال
قلمِ دلفگار، اے نساخ!
"اخترِ نیکوئی" رقم زد سال
(۱۲۹۷ھ)

کلام کا انتخاب یہ ہے:

چشم بکشا، کہ ابرِ گوہر بار
قطرہ زن شد، بساحتِ گلزار
تیغ کوہ، از دمیدنِ سبزہ
ہمچو فولاد، گشت جوہر دار
سبزہ صد پیرہن بخود بالا
سرو آید بوجد در رفتار

☆

آب بخشد بحر را ایں چشمِ طوفاں خیزِ ما
تاب آتش را دہد، آہِ شرر انگیزِ ما
جیب و داماں شد گلستاں ز اشک خوں بہا ببیں
بو العجب، نیرنگ ہائے دیدۂ گلریزِ ما

☆

اے روح و رواں! داروے دل، چارہ گرِ جاں!
اے ختمِ رسل، قبلۂ دیں، کعبۂ ایماں

اے نور ز تو عکسِ قلمِ آئینۂ توحید
در وصفِ تو اندیشہ خجل، ناطقہ حیراں
گردِ رہِ رہوارِ توکحل البصرِ دل
خاکِ تہِ نعلینِ تو نورِ نظرِ جاں

☆

شکوہ بزمِ غیر میں جانے کا کیجے، تو وہ شوخ
ہنس کے کہتا ہے کہ "واں میری بلا تھی، میں نہ تھا"
جی میں ہے، کہیے بوقتِ مے کشی، منھ چوم کر
اے صنم! یہ نشۂ مے کی خطا تھی، میں نہ تھا

☆

آئی نہ قیامت، ترے اصرار سے اب تک
جی اُٹھے نہ مُردے، تری گفتار سے اب تک

☆

آج اُس کا رُوئے تاباں دیکھیے
دیکھیے، مہرِ درخشاں دیکھیے
پرتوِ انجم پہ کیوں کیجے نظر
کیوں نہ اپنے گھر چراغاں دیکھیے

☆

حیرت ہے اس کے آنے پر کیا پیش کش کروں
سینے میں دل رہا ہے، نہ جان اپنے تن میں ہے
پھولا ہوا خوشی سے، ہر اک گل ہے، اے نسیم!
کس تو بہارِ حسن کی آمد، چمن میں ہے

☆

نہ دل اپنا ہوا، نہ یار اپنا
دیکھیں کیا ہو مآلِ کار اپنا
آنکھیں جاتی رہیں گی آخرِ کار
یہ دکھاتا ہے انتظار اپنا
کعبہ و بت کدے کو جا دیکھا
ہووے کس جا برآر کار اپنا
گئے صبر و قرار، تاب و تواں
نہ رہا کوئی غم گسار اپنا

☆

کوئے جاناں میں ہم تو جا نہ سکے
حال اپنا اُسے سُنا نہ سکے
صحبتِ بد، حجابِ کار ہوئی
وہ طبیعت اِدھر کو لا نہ سکے
دل کا پوچھا نشاں تو شرمائے
جانتے تھے، مگر بتا نہ سکے
تیغ سے اُس کی ہم گلے نہ ملے
اپنا جوہر اُسے دکھا نہ سکے
زور ناطاقتی نے دکھلایا
سر کو بالیں سے ہم اُٹھا نہ سکے

☆

جنوں! شورش فزائی ہو چکی بس
بہار آشنائی ہو چکی بس
چلے مے خانے کو، کعبے سے، ناصح
اب ان کی پارسائی ہو چکی بس

جو ہے یہ خوش نوائی تیری، اختر!
تو پھر یاں سے رہائی ہو چکی بس

رُباعیات

اک عمر یہ میں نے خوش معاشی کی ہے
اشکوں سے چمن میں آب پاشی کی ہے
دشوار ہے اب سانس بھی لینا، ہمدم!
آہوں نے مری یہ دل خراشی کی ہے

☆

گر خضر نے عمر جاودانی پائی
یا آبِ حیات کی نشانی پائی
کیا ناز کرے اُس پہ کہ جب آخر کار
مرنے کے لیے نہ زندگانی پائی

☆

دنیا ہے طلسمِ رنج و حسرت، اختر
اور زندگی آئینۂ حیرت اختر!
سب سانگ کا عالم ہے جو یاں دیکھے تو
شادی و غم و کلفت و الفت، اختر!

☆

شکرانہ ادا حق کا کرتی ہوں دوگانہ میں
سایہ ہے مرے سر پہ آج اس کی عنایت کا
رنگیں کے نُوا ڈھب پر یہ ریختی لکھی ہے
بنگالہ میں ہوونے گا، اب نام نزاکت کا

[شمعِ انجمن : ۵۲۷، سخنِ شعرا : ۱۶، مشرقی بنگال میں اُردو : ۵۰۔
۵۳، تواریخ ڈھاکہ : ۳۴۱۔ ۳۴۲، مشرقی پاکستان کے ادیب :
۲۹۔۳۲، غالب نامہ، ۴ : ۲ : ۷۰۔۱۰۲]

حواشی

☆۔حافظ اکرام الدین احمد ضیغم۔ حافظ میاں قطب الدین کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان سے تھے۔ ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸۔ ۱۷۸۹ء) میں پیدا ہوئے۔ شروع میں حشمت تخلص کرتے تھے، بعد کو ضیغم کرلیا۔ ہزل اور ریختی اور مرثیہ میں تخلص مہمان رکھا۔ کلام پر اصلاح میاں احمد حسین راحت اور جناب رؤف احمد راحت سے لی، جناب راحت کے خویش بھی تھے۔ بڑے قادرالکلام شخص تھے اور جمیع اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی، تاریخ گوئی میں بھی یدِ طولی حاصل تھا۔ نساخ نے اپنے تذکرے میں ان کی غزل دی ہے جو متعدد بحروں میں ہے اور ان میں سے ۱۹ بحروں کے مطابق تو انھوں نے خود تقطیع بھی کی ہے، اس سے ضیغم کی عروض میں مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ شاعری کے علاوہ طب، ڈاکٹری اور دوسرے علوم وفنون میں بھی خاصی دست گاہ تھی۔ کیمیا گر مشہور تھے۔ مختلف ملکوں کی سیر بھی خوب کی تھی۔ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۰۔ ۱۸۷۱ء) میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔

(سخنِ شعرا: ۲۹۲، شمیم سخن ۱۵۷۔ ۱۵۸، انتخابِ یادگار : ۲۰۷، تذکرۂ کاملانِ رام پور: ۴۹)

وکیل ... منشی شکور احمد پانی پتی

اِن کی صرف یہ ایک غزل رسالہ کمال (دہلی) سے ملی:

ملے یوں لطف میکشوں کو پیرِ مے خانہ (کذا)
گرے جو بوند ساغر سے بنے تصویرِ مے خانہ
بجائے خانۂ کعبہ ہوئی تعمیرِ مے خانہ
زہے توقیرِ مے خانہ، زہے تقدیرِ مے خانہ
نظر آجائے اُس خورشیدِ وحدت کا مجھے جلوہ
کوئی ایسا بھی ساغر دے کبھی، اے پیرِ مے خانہ!
ملا ہے دیدۂ حق بیں جسے، وہ دیکھ لیتا ہے
نظر آتی ہے اُس کو دُور سے تنویرِ مے خانہ
سمجھتے ہیں اِسی کو کعبۂ مقصود سب اپنا
کہاں تک عاشقوں کے دل میں ہے توقیرِ مے خانہ
پسِ مُردن بھی اُلفت دخترِ رز سے نہ جائے گی
مری بِگل سے بنے گی ایک دن تعمیرِ مے خانہ
بے گل رنگ سے دل کی دورنگی دور ہو جائے
کوئی ساغر خدا کی راہ کا دے، پیرِ مے خانہ!
الٰہی! کیا ہوا پلٹی، یہ کیسا انقلاب آیا!
جہاں مسجد تھی کل تک، آج ہے تعمیرِ مے خانہ

[رسالہ کمال (دہلی) اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۱۲ء]

ولی ... مولوی امّو جان دہلوی

مدرّسی پیشہ تھے۔ پہلے مدّت تک دلّی میں ملازم رہے، اس کے بعد فیروز پور جھرکہ کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں پنشن پر ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ حضرت سیّد محمد غوث علی شاہ سے بیعت تھے۔ اُردو فارسی دونوں میں شوق فرماتے تھے۔ ۱۸۷۷ء کے دربار قیصری کے حالات میں مسٹر اسٹوک نے ایک انگریزی نظم (Lay of Empress) لکھی تھی۔ ولی نے اس کا ترجمہ فارسی نظم میں "زمزمۂ قیصری" کے نام سے کیا۔ ۱۳۱۸ھ میں "رُباعیات عجائبات امّو جان ولی" کے تاریخی نام سے مجموعۂ رُباعیات شائع ہوا تھا۔

پردہ جیبی تنک ہے کہ پردے میں ہے وہ شوخ
چہرہ کھُلا، تو راز چھپایا نہ جائے گا
محشر میں روبرو مرے آ کے کھڑا ہوا
جانا کہ اس سے شور مچایا نہ جائے گا
غم بے ستوں نہیں ہے، کہ آگے سے ٹال دوں
سینے کا سنگ ہے یہ ہٹایا نہ جائے گا

رُباعی

برسوں میں جو کل رہ میں ملا وہ طنّاز
منہ پھیر چلا تیز، بصد شوخی و ناز

افسوس نہ ہم دوڑ کے، قدموں پہ گرے
سوچا کیے دنیا کے نشیب و افراز

☆

حالِ دلِ شیدا تو چھپائے نہ بنے
سُن کر اسے بن میرے ستائے نہ بنے
کہنا بھی، نہ کہنا بھی، ہیں دونوں آفت
اب بات کوئی موت بن آئے نہ بنے

(سخنِ شعرا: ۵۵۷، دیباچۂ رباعیاتِ ولی)

ہوشیار (بیمار) ... مولوی حکیم محمدؐ مراد علی

پنجابی الاصل اور سجادہ نشینانِ ڈھوڈہ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے دادا سیّد احسان علی طبابت کا پیشہ بھی کرتے تھے اور اِسی حیثیت سے مہاراجا صورت سنگھ والیِ بیکانیر نے انھیں مہارانی صاحبہ کے معالجے کے لیے بیکانیر طلب کیا۔ خدا نے اُن کے علاج سے مہارانی کو شفا بخشی۔ انعام میں مہاراجا نے اُنھیں موضع دولت پورہ (معروف بہ رائے سنگھ پورہ) کی جاگیر عطا کی اور وہ یہیں بس گئے۔ سیّد احسان علی نے اپنا خاندانی پیری مریدی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رکھا۔

ہوشیار کے والد کا نام سیّد کرم علی عرف میاں کریم جی تھا۔ ہوشیار سولہ سال کے تھے، جب تعلیم کے لیے دلّی آئے۔ عربی، فارسی نواب محمدؐ قطب الدّین خان سے پڑھی اور اُسی زمانے میں غالب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد ہندوستان اور بیرونی ممالک کی سیر کے لیے نکل گئے اور اس دوران میں کشمیر اور کاشغر اور ختن تک کا چکّر کاٹ آئے۔ واپس لوٹے تو محکمۂ پولیس میں سرشتہ داری اور انسپکٹری کے عہدوں پر فائز ہوگئے۔ اپنے خاندانی پیشۂ طب میں بھی اچھی دست گاہ تھی۔ جنگ نامۂ روم و روس، مسائلِ خمسہ اور حصۂ نثری مضامین اُن سے یادگار ہیں۔ اودھ پنچ اور دہلی پنچ کے نامہ نگاروں میں سے تھے۔

مراد علی جوانی کے عالم میں ۱۷ جولائی ۱۸۷۰ء کو اجمیر آئے اور یہاں ہفتہ وار اخبار راجپوتانہ گزٹ، کی ایڈیٹری کرنے لگے، جس کے بانی کرنیل کیٹنگ (Keating) تھے۔ اُنھوں نے اُسی زمانے میں اپنا ایک مطبع بھی ''چراغِ راجستھان'' کے نام سے

قائم کرلیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ''راجپوتانہ گزٹ'' اُن کی اپنی ملکیت میں آگیا تھا۔ یہ اخبار اس صدی کے شروع تک شائع ہوتا رہا۔ اُنھیں دنوں انجمنِ حامیِ اسلام کی طرف سے ایک ماہنامہ ''رہنما'' جاری ہوا تھا، اِس کی ادارت بھی ہوشیار کے سپرد ہوگئی۔

اُن کا طرزِ تحریر مزاحیہ بلکہ سوقیانہ اور حد درجہ جارحانہ ہوتا تھا۔ ہر ایک پر اعتراض کرنا اور معزز اور صاحبِ وجاہت لوگوں کی پگڑی اچھالنا ان کا وتیرہ تھا۔

ابتدا میں تخلص بیمار تھا اور اخیر میں اسے بدل کر ہوشیار کرلیا تھا۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری ''یادگارِ مراد علی'' میں لکھتے ہیں کہ میرا دیوان میرے مطبع کے ایک کاپی نویس نے چُرالیا تھا۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ اشارۃً چرانے والے کا تخلص شگفتہ لکھا ہے۔ نثر میں ''بوستانِ خواجہ'' میں حضرت خواجہ معین الدّین چشتی کے حالات لکھے ہیں۔ ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ (۱۸ اگست ۱۹۰۰ء) میں اجمیر ہی میں انتقال کیا۔ فرحتی نے تاریخ کہی :

هزار و سه صد و هژده، گزشته از هجرت
که کرد عزمِ حضوریِ سیّدالابرار

اجمیر کے باہر کوہ مدار کے دامن میں مدفون ہوئے۔

ان کی بیوی موتی بیگم بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں، وہ انتظامی امور اور صحافتی ذمہ داریوں سے بھی خوب واقف تھیں۔ سیّد مراد علی کے انتقال کے بعد ''راجپوتانہ گزٹ'' اُنھوں نے اپنی نگرانی میں جاری رکھا اور اسے خوب فروغ دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ بیمار کو سنجیدہ کلام کے علاوہ ہزل میں بھی مہارت تھی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :

چڑھ گئے رندوں کے ڈھب پر آج حضرت شیخ جی
کھل گیا چٹھا، میاں کے زہدِ بے بنیاد کا

☆

عاشقِ زار کو ہرگز نہ ستاتا، ظالم!
خوف کچھ بھی جو تجھے ہائے خدا کا ہوتا

☆

ہم مرگئے، تس پر بھی خطاوار ہی ٹھہرے
اندھیر یہ ہم نے تری سرکار میں دیکھا

☆

اس ہستیِ موہوم پہ نازاں نہ ہو، ناداں!
اک دم کا بھروسا نہیں، بیمار! یہاں کا

☆

دل نہ رکھے ہاتھ میں وہ صاحبِ دل کیا ہوا
جس کے قابو میں نہ ہو دل، پھر وہ کامل کیا ہوا!
نام والوں کے مٹائے، وائے سب نام و نشاں
اے فلکِ بے پیر! بتلا تجھ کو حاصل کیا ہوا!
واں اٹھی تیغِ نگاہ، یاں ہو گیا عاشق کا کام
جو نہ سمجھا اس کے تیور کو، وہ بسمل کیا ہوا!
کون تھا جو لے گیا، کیوں کر گیا، حیراں ہوں میں
تھا ابھی پہلو میں میرے، ہائے وہ دل کیا ہوا!
تیغ تو مجھ پر لگائی تھی، ولے اوچھی پڑی
پیش تر جو زور تھا تجھ میں وہ قاتل، کیا ہوا!
موجزن ہے اس قدر، چاروں طرف طوفانِ اشک
پوچھتے ہیں خضر بھی گھبرا کے: ''ساحل کیا ہوا!''
وہ مسیحا جب مجھے نہ آیا، ہم تڑپ کر رہ گئے
جان دینا ہم کو، اے بیمار! مشکل کیا ہوا

کرتا ہے یاد ہم کو وہ صاحب جمال کب!
رہتا ہے اُس پری کو ہمارا خیال کب!
شرمندہ چاند ہے ترے چہرے کے سامنے
پایا ہے تجھ سا مہر نے حسن و جمال کب!
ڈسنے کو عاشقوں کے لیے سانپ ہیں پلے
دوشِ صنم پہ لٹکے ہیں کاکل کے بال کب!
صورت بنائے سے بھی بڑھا ہے کہیں شرف
محرابِ سجدہ ہے خمِ تیغِ ہلال کب!
بیمار مرگیا، تو رقیبوں سے یہ کہا:
''ہوتا ہے ایسی باتوں کا ہم کو خیال کب!''

ان کا ایک مختصر مجموعہ ''گلدستۂ ہوشیار'' (مطبع چراغِ راجھستان، اجمیر: ۱۸۹۵ء) نظر سے گزرا۔ بیش تر کلام مزاحیہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

آسماں پر شور پہنچے گر مری فریاد کا
رنگ مثلِ دُود، اُڑ جائے ستم ایجاد کا
باغ میں آتا ہے شاید آج وہ رشکِ قمر
قمریوں میں ہر طرف غل ہے مبارک باد کا
کوچۂ عشقِ بتاں میں آکے جو رکھتے قدم
حوصلہ کیا میرے آگے قیس کا، فرہاد کا
دیکھ کر رخسارِ جاناں پر پسینے کی بہار
بہ گیا پانی میں ایماں سیکڑوں زُہّاد کا
تو رہا محروم زاہد، مجھ کو حوریں مل گئیں
مرتبہ آدم کا مجھ کو ہے تجھے شدّاد کا
جان نکلی تن سے دل دھڑکا جگر تک پھٹ گیا
تیر سینے میں لگا جب آکے تیری یاد کا

شعر گوئی سے یہ مطلب ہے کہ دل بہلا رہے
ورنہ میں شاباش کا بھوکا، نہ خواہاں داد کا
اُٹھ گئے دلّی کے دل والے جہاں سے ہوشیار
نام باقی رہ گیا، شاہِ جہان آباد کا

☆

اک روز ڈرتے ڈرتے کہا میں نے جانِ من
میں تو تمھارا بندۂ بے دام ہو چکا
بولے وہ مسکرا کے، کرو ہوش کی دوا
معلوم ہو کہ آپ کو سرسام ہو چکا

☆

کل تک جو مرے سامنے اورنگ نشیں تھے
وہ بیٹھے ہیں اب خاک رمائے مرے آگے
ملکِ عدم سے پھر کے نہ آیا کوئی یہاں
کیا کیا حسیں زمیں میں سمائے مرے آگے

☆

عمر بھر رویا کیے جن کے لیے
وہ نہ آئے ہائے اک دن کے لیے
کر کے وعدہ پھر "ولیکن"، واہ جی
لڑ مریں گے ہم، "ولیکن" کے لیے
زندگی دم بھر کی ہے مہماں یہاں
گھر بنائے کون، دو دن کے لیے

☆

قابو میں کب آیا وہ دل آرام ہمارا
اس دہر میں نکلا نہ کبھی کام ہمارا
منھ پھیر ہی لیتا ہے عجب ناز و ادا سے
سنتا ہے کبھی جب وہ کہیں نام ہمارا
تیغ نگہِ یار نے جو کام کیا ہے
کرتی نہ کبھی کام وہ صمصام ہمارا
پہنچایا ہمیں اپنی ہی شہرت نے یہاں تک
کہتے ہیں جسے عرش وہ ہے بام ہمارا

☆

نکلی نہ ترے منھ سے کبھی پیار کی آواز
سنتا رہا ہنس ہنس کے دلِ زار کی آواز
تیرے ہی مبتلا ہیں یہاں شیخ و برہمن
تسبیح کی جو ہے، وہی زنار کی آواز

☆

اڑد کی دال گلے جس سے، جلد وہ شے لا
لیا لپک کے ملاین سے بینگ کا تھیلا
پکائے رات تھے ہم نے وہ کوفتہ بریاں
کہ جن کو دیکھ برہمن بھی منھ کو دے پھیلا
بس اب رفو ہو کہ باتوں میں پی گیا بوتل
ہمارے ٹھرے کی خاطر تو پاؤں مت پھیلا
کدھر چلا ہے تو رندوں کو چھوڑ کر ہشیار!
بنا کے چھوڑیں تجھے دیکھ دال کا تھیلا

☆

قحط نے لٹیا ڈبودی، جو چنا ملتا نہیں
گیہوں کیسے، اب تو موٹھ اور باجرا ملتا نہیں
میں تو مفلس بن گیا، اب ڈھونڈ لو تم دوسرا
کیا جہاں میں کوئی مجھ سا ...... تیا ملتا نہیں
زیرِ راں رہتے تھے جن کے ترکی و تازی بدام
آج چڑھنے کو انھیں لنڈا گدھا ملتا نہیں
آزمایا خوب ہے یاروں کو ہم نے ہوشیار!
مطلبی ملتے ہیں کوئی باوفا ملتا نہیں

☆

قطعۂ تاریخ در تہنیتِ کتخدائی
مہاراج کنور عالی جناب امید سنگھ جی صاحب بہادر
ولی عہد ریاست شاہ پورہ دام اقبالہٗ

ہوئی شادی مہاراجا کنور کی
خوشی کا ہر طرف ہے جوش سا جوش
رعیت شہ پورہ کی سچ تو یہ ہے
عروسِ عیش و عشرت سے ہم آغوش
خوشی کا ہے یہ گویا دور دورہ
دکھاتی ہے مسرّت غم کو پاپوش
مچا ہے تہنیت کا شور ہر سُو
زباں زد ہے ہر اک کے نوش، ے نوش
ہر اک کوچہ ہے رشکِ مے کدہ اب
کوئی مدہوش ہے اور کوئی بے ہوش

کوئی محوِ مسرّت ہو رہا ہے
کوئی مستانہ باہم دوش بدوش
کسی کی گل رخوں سے چار آنکھیں
ترانے پر کوئی رکھے ہوئے گوش
کلی باہم کلی سے ہے چٹختی
کھلی جاتی ہے غنچوں کی بناگوش
مبارک ہے مہینہ ماہ، شدھ چوتھ
خوشی سے ہے تنِ امید گل پوش
اٹھوں میں بھی مبارک باد کو اب
شرابِ عیش سے گرچہ ہوں مدہوش
مہاراجا کو یہ شادی مبارک
کنور صاحب کے ہو عشرت ہم آغوش
جو پوچھے سال سمبت کوئی، ہشیار!
تو کہہ دوں میں بھی ''فردِ غم فراموش''

(۱۹۵۱)

کسی مس سے الفت مدامی کریں گے
لگا ٹرکی دُم نام نامی کریں گے
اجی آپ کی ہم غلامی کریں گے
کبھی اس میں ہرگز نہ خامی کریں گے
رکھیں آپ در پر ہمیں اپنے درباں
ادا آتے جاتے سلامی کریں گے
ہمارے بھی منہ سے نکل جائے گا کچھ
اگر آپ یوں بد لگامی کریں گے

گیا ہوشیار ان کے دم پہ ہے ناحق
بھلا کب وہ ملنے کی ہامی کریں گے

☆

ممبر بنے کمیٹی کے بابو نئے نئے
آئے جناب فیض مآبو نئے نئے
بھرتی ہوا ہے شہر میں اک مسخروں کا غول
کھاؤ نئے نئے ہیں، تو دلاؤ نئے نئے
لوٹا کرو رعایا کو، ہاتھوں سے، پاؤں سے
فرماتے ہوئے آئے، شتابو نئے نئے (کذا)
ہے بخش، کوئی چند، کوئی مل ہے، کوئی رائے
نظر آنے لگے روز خطابو نئے نئے (کذا)
انکم پہ ٹیکس، فنڈ پولیس، چنگی سایر (کذا)
پیدا ہوئے ہیں مال کے لاگو نئے نئے

☆

کہکشاں کیوں کر نہ بل کھائے بے چاری ان دنوں
مانگ اُس بت نے ہے کوٹھے پر سنواری ان دنوں
ہم جدھر جاتے ہیں، اٹھ جاتی ہیں لاکھوں انگلیاں
شہر بھر میں دُھوم ہے، یارو! ہماری ان دنوں

☆

چھیڑ دیکھو کہتے ہیں جلاد سے
تجھ کو بلوایا ہے بس ان کے لیے

[خم خانۂ جاوید، ۱ : ۶۸۶ ـ ۶۸۷، یادگارِ ضیغم : ۷۸، خطباتِ گارساں دتاسی : ۷۸۲، ہماری زبان (ہفتہ وار، دلّی) یکم فروری ۱۹۶۳ء، ایضاً ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ایضاً، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء]

یکتا... خواجہ معین الدّین خان دہلوی

لال کنواں، دتی میں سکونت تھی اور یہاں کے رئیسوں میں گنے جاتے تھے۔ شاہی میں خانی کے خطاب سے مفتخر تھے۔ پہلے حافظ عبدالرحمٰن احسان سے اصلاح لیتے رہے، پھر میرزا سے مشورہ کیا۔ افسوس کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد بینائی سے محروم ہوگئے تھے۔ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲۔۱۸۷۳ء) میں فوت ہوئے۔ شاہ بہاء الدّین بشیر نے تاریخ کہی:

شاعرِ یکتا ز جہاں شد بخلد
لطفِ سخن ہمرہِ خویش آہ، بُرد
گفت خرد سالِ وفاتش بشیر
"آہ دلا، شاعرِ یکتا بمُرد"
(۱۲۸۹)

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دل گیا، صبر گیا، چین گیا، جی بھی گیا
لب ہو! اور کا اُلفت میں ضرر اپنا ہوا

☆

جو دم میں ہو کچھ، لمحے میں کچھ، آن میں کچھ ہو
ایسے سے بھروسا ہے کسے مہر و وفا کا

عالم کو کیا قتل، تری تیغِ نگہ نے
اور مفت میں بدنام ہوا نام قضا کا

☆

ہے کس کو تابِ شکوۂ دشمن کہ ضعف سے
لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جینا فراقِ یار میں، وعدے کی لاگ پر
آسان گر نہیں ہے، تو دشوار بھی نہیں

☆

برسات میں کہے ہے کہ ''یکتا نہ پی شراب''
واعظ! تجھے کچھ ابر و ہوا پر نظر نہیں
کیا محوِ بے خودی ہوں، کہ جنّت میں بار بار
رضواں سے پوچھتا ہوں کہ اس کا تو گھر نہیں

☆

غافل ہیں اہلِ دہر، وگرنہ ہزار بار
واں مقبرہ بنا ہے، جہاں خواب گاہ تھی

(طبقات الشعرائے ہند : ۴۱۲۔ ۴۱۳، گلستانِ سخن : ۴۸۳، گلستانِ بے خزاں : ۲۸۸، تذکرۂ بشیر مشمولہ سہ ماہی اُردو، کراچی، ۴۵ : ۱ : ۲۴۴)

ضمیمہ

حکیم غلام مولیٰ عرف مولا بخش قلق میرٹھی

گارساں دتاسی اپنے ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کے خطبے میں کہتا ہے:

> سنہ ۱۸۶۴ء میں الٰہ آباد میں "جواہرِ منظوم" کے نام سے ایک مجموعۂ نظم شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں بعض انگریزی نظموں کا اُردو ترجمہ درج ہے، ترجمہ بھی نظم میں ہے۔ حواشی میں عروض کے مسائل کے متعلق اشارات ہیں ... اردو ترجمے کے مقابل اصل انگریزی بھی ہے تاکہ طالب علموں کو سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ اُردو اور انگریزی دونوں میں ترقی کر سکیں (خطباتِ گارساں دتاسی: ۵۲۸)

میرے سامنے جواہر منظوم کا دوسرا ۱۸۶۷ء کا مطبوعہ ایڈیشن ہے۔ اس میں صرف اُردو نظمیں ہیں، ۱۸۶۴ء کے ایڈیشن کی انگریزی نظمیں، جن کا دتاسی نے ذکر کیا ہے، اس ایڈیشن میں نہیں ملتیں۔

اس کے صرف ۲۲ صفحات ہیں، اور یہ ۱۵ نظموں کو محیط ہے، اُن کے عنوانات یہ ہیں: (۱) اوصافِ اخلاقِ شتر (۲) بیانِ کرمک (۳) حکایتِ پسرِ ناخدا (۴) بیانِ جنت (۵) میرا باپ کشتی بان ہے (۶) بیانِ ہندوستان (۷) داستان اندھے لڑکے کی (۸) داستانِ شاہ کینیوٹ (۹) قصۂ ولیم ٹیل ساکن سوئٹزرلینڈ (۱۰) خواہشِ طفل

(۱۱) عرضیِ مُوشِ محبوس (۱۲) لڑکپن کی پہلی مصیبت (۱۳) دربیانِ تمیزِ حق و باطل (۱۴) ذکر ابابتیل بدلیسی کا (۱۵) سادگیِ طبیعت کی خواہش۔

اس مختصر مجموعے کا دیباچہ یو پی کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے ہے۔ اس کی ابتدائی سطریں مندرجۂ ذیل ہیں :

> یہ ترجمہ جو طبع ہوا ہے۔ اس کو منشی غلام مولیٰ سابق ملازم سرشتۂ تعلیم نے حسب الحکم صاحب انسپکٹر بہادر قسمتِ اول میرٹھ کے منتخباتِ نظمِ انگریزی حصہ اوّل سے نظم میں بزبانِ اردو ترجمہ کیا تھا اور بعد اِس کے یہ ترجمہ واسطے اصلاح کے دہلی میں میرزا اسد اللہ خان غالب کے پاس، جو شاعرِ نامی گرامی ہیں، بھیجا گیا اور بعدہٗ واسطے ملاحظہ اور منظوری صاحب ڈائریکٹر بہادر سرشتۂ تعلیم ممالک مغربی کے پیش ہوا... الخ

یہاں منشی غلام مولیٰ سے ہمارے آخری دور کے مشہور شاعر غلام مولیٰ قلق مراد ہیں۔ یہ کتابچہ غالباً بچوں کے نصاب کے لیے شائع ہوا تھا، انگریزی نظمیں تو یقیناً نصاب میں شامل تھیں۔ حکیم غلام مولیٰ قلق اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے لیکن افسوس کہ تذکرہ نگاروں کی غفلت کے صدقے نہ اُن کے تفصیلی حالات محفوظ رہے، نہ اُن کو وہ شہرت ملی، جس کے وہ مستحق تھے۔

قلق ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲۔۱۸۳۳ء) میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام غلام مولیٰ رکھا تھا لیکن وہ اپنے عرف مولا بخش سے زیادہ مشہور ہوئے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۲ برس کی عمر میں (یعنی تقریباً ۱۸۴۴۔ ۱۸۴۵ء میں) دلّی آگئے۔ یہاں اُنھوں نے نجی طور پر ملّا انتظام علی سہارنپوری سے عربی کی تعلیم پائی اور اس کے بعد "دلّی کالج" میں داخلہ لے لیا۔ مولانا امام بخش صہبائی کے چھوٹے بیٹے عبدالکریم سوز اُن کے ہم جماعت تھے۔ گمان بہ یقین ہے کہ وہ کالج کی انگریزی جماعت کے بھی طالبِ علم تھے۔

دلّی کالج میں تکمیل کے بعد اُنھوں نے طب کی تعلیم حکیم غلام نقشبند خان دہلوی سے پائی اور اِس میں پوری مہارت حاصل کرلی۔ اُسی زمانے میں ماحول سے متاثر ہو کر انھیں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اُن کے یارِ غار عبدالکریم (خلف صہبائی) نے تخلّص سوز رکھا تھا، اُنھوں نے قلق رکھ لیا اور مشورۂ سخن مومن سے کرنے لگے۔ لیکن ظاہراً انھیں استاد سے زیادہ استفادے کا موقع نہیں ملا کیوں کہ مومن کا ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوگیا۔

قلق تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی دلّی ہی میں مقیم رہے۔ اُنھوں نے یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لیا اور بحیثیتِ شاعر خاصی شہرت حاصل کرلی۔

۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کے بعد اُنھیں دلّی کی سکونت ترک کرنا پڑی اور وہ واپس میرٹھ چلے گئے۔ قیامِ دلّی کے زمانے سے متعلق کوئی یقینی اطلاع نہیں ملتی کہ یہاں اُن کا ذریعۂ معاش کیا تھا۔ قیاس ہے کہ چوں کہ وہ دلّی کالج کے فارغ التحصیل تھے، اس لیے شاید کسی جگہ مدرّسی کی اسامی مل گئی ہو۔ بہرحال میرٹھ واپس چلے جانے کے بعد وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے اور اُن کا بطورِ مدرّسِ فارسی تقرر ہوگیا۔ اس سے پہلے وہ چندے راجا کچیسر کی ملازمت میں بھی رہے یہاں پچاس روپے مشاہرہ تھا لیکن کسی وجہ سے وہ الگ ہوگئے اور میرٹھ آکے مدرّسی قبول کرلی۔ یوں بقیہ زندگی مدرّسی اور مطب میں گزار دی۔ ظاہر ہے کہ بہت تنگی ترشی سے بسر ہوتی ہوگی۔

بعارضۂ سل کم عمری میں یعنی تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں پنج شنبہ ۷ شعبان ۱۲۹۷ھ (۱۵ جولائی ۱۸۸۰ء) رحلت کی۔ محمد امداد حسین ظہور میرٹھی نے تاریخ کہی :

قلق شاعرِ خوش لب و خوش خیال
ز دنیا سوے دارِ جنت برفت
بہ بیماریِ سِل کہ بُد جاں گسل
بہ تسلیم شاد و بہ ہمت برفت

سروش از پے سال گفت از ظہور
''قلق شاعرِ ما بجنت'' برفت
(۱۲۹۷)

قلق کا دیوان اُن کی زندگی میں نہیں چھپا۔ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنے برادرِ خرد عبداللہ (اکاؤنٹنٹ نہرِ جمن) کو وصیت کی تھی کہ میرا کلام جمع کر کے چھپوا دینا۔ چنانچہ ان کے اہتمام میں کلیاتِ قلق پہلی مرتبہ مطبع انصاری، دلّی میں ۱۳۰۰ھ میں چھپا۔ اِس کے ساتھ حالی کی تقریظ فارسی میں اور سیّد احمد (مؤلفِ فرہنگِ آصفیہ) کی اُردو میں شائع ہوئی ہیں، دونوں سے قلق کی سوانح پر بہت مفید روشنی پڑتی ہے۔

یہ کلیات نایاب تھا۔ چنانچہ جناب کلب علی خان فائق کا مرتبہ دوسرا ایڈیشن مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور نے مطبع عالیہ، لاہور میں چھپوا کر دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔

قلق کی لکھی ہوئی ایک تقریظ غالب کی ''عودِ ہندی'' کے ساتھ چھپی ملتی ہے۔ جو اُنھوں نے ناشر منشی ممتاز علی خان میرٹھی کی فرمایش پر لکھی تھی۔

''جواہرِ منظوم'' کے دیباچے کی جو عبارت اوپر نقل ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ قلق نے نہ کسی مرحلے پر غالب کی شاگردی اختیار کی، نہ اپنے کلام پر اُن سے اصلاح لی، لیکن اس کے باوجود (غالباً قلق سے استصواب کیے بغیر) غالب نے اُن کے کلام پر اصلاح دی تھی۔ ان نظموں میں سے دو بطورِ نمونہ درج ذیل ہے:

سادگیِ طبیعت کی خواہش ☆[۱]

خندہ زن لوگ مسکراتے ہیں
اور ہنسی میں مجھے ستاتے ہیں
کہو، انسان کب بنو گے تم!
یا سدا طفل ہی رہو گے تم

کس قدر سال عمر کے گزرے
اور ابھی آپ ہیں وہی لڑکے
ہوں یہ بیزار تنگِ پیری سے
کہ ہوں خوش ان کی خردہ گیری سے
وہ تبسّم جو کرتے ہیں باہم
مجھ کو ہوتی ہے فرحتِ پیہم
شکر اپنے خدا کا کرتا ہوں
گو میں بوڑھا ہوں، دل سے لڑکا ہوں
کیا ہے وہ چیز جس کو کہتے ہیں
کہ کروں میں حصول اب اس کو
یعنی اب میں وہ فائدہ چاہوں
جس کی نفرت سے چونک پڑتا ہوں
یعنی اک پیش و پس کا صرف دماغ
رنجِ آسودگی و خارِ فراغ
اور دلِ سرد اگر ہوا حاصل
جز زیاں، نفع اس سے کیا حاصل
ہیں زمانے میں دو ہی شے نایاب
حظِ طفلی و زیرکیِ شباب
غرض اک شے نصیب ہے مجھ کو
دل تو رکھتا ہوں، گو دماغ نہ ہو
یہی طفلانہ بے غمی ہے قبول
نہ ہو عقلِ شباب گو کہ حصول

خوش ہوں، پھنستا نہیں ہوں میں غم میں
رہنے دو مجھ کو میرے عالم میں

☆

میرا باپ کشتی بان ہے☆[۲]

بحرِ مواج ہول ناک میں تھی
ایک کشتی بہی چلی جاتی
جملہ کشتی نشیں تھے سرتاپا
غرقِ دریائے خوفِ ہوش ربا
لیک تھا ایک طفلِ کشتی بان
عین طوفاں میں با لبِ خنداں
ترش ابروے موج جو دیکھی
آئی بے ساختہ کچھ اُس کو ہنسی
تب لگا اس سے کہنے اک ملاح
یہ تو وقت، اور یہ خوف اور یہ مزاح
طفل بولا، میں کیوں ڈروں، ناداں!
جب کہ ہے باپ میرا کشتی باں
سچ ہے جب ڈوبنے لگے بیڑا
ہے سہارا خدا کے لنگر کا
مشکلیں سخت جو کرے آساں
اور دعا کو سُنے ہے جو ہر آں

دے ہے ہر رنج کے عوض راحت
گریۂ غم میں خندۂ عشرت
متوجہ ہو اس کی جانب جو
غرقِ دریائے رنج و غم کیوں ہو
یاد لڑکے کی مثل ہے ہر آن
کہ ہے ہم سب کا باپ کشتی بان

حواشی

☆۱۔ شاعرانہ ابیات میں بجائے حصولِ پیش بینی و دور اندیشی و مخالطہ وہی جو طریقہ مردمانِ زمانہ ہے، تعریف سادہ دلی کی کر کے تمنائے خیالاتِ طفلی کی کرتا ہے۔

☆۲۔ ان ابیات سے یہ غرض ہے جیسے اس لڑکے کو اپنے باپ پر اطمینان اور اعتقاد تھا، اسی طرح ہر انسان کو اپنے اللہ جل شانہ پر اعتقاد و توکل رکھنا چاہیے۔

تلامذۂ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر

"تلامذۂ غالب" کا تازہ ایڈیشن مئی ۱۹۸۴ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا ہے، اِس کا پہلا ایڈیشن فروری ۱۹۵۷ء میں مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر (پنجاب) سے شائع ہوا تھا۔ ۲۶ برس کے اس درمیانی عرصے میں اِس کتاب پر متعدد تبصرے لکھے گئے اور غالب کے بعض شاگردوں کے بارے میں کئی اہم مضامین بھی شائع ہوئے جن کی وساطت سے اس موضوع سے متعلق نیا مواد بھی سامنے آیا اور سابقہ معلومات کی بہت سی خامیاں بھی دور ہوئیں۔ متذکرہ تبصروں میں ایک تبصرہ راقم السطور کا بھی تھا۔ جو دو ماہی "اکادمی" لکھنؤ کے جنوری، فروری ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ خود مالک رام صاحب کے الفاظ میں یہ اِس سلسلے کا "سب سے مفصّل اور مفید مضمون" تھا چنانچہ اِس کے بیش تر معروضات یا تو اِس کتاب میں شامل کرلئے گئے ہیں یا اُن کے مطابق متن میں مناسب ردّوبدل کردیا گیا ہے۔ اس طرح مختلف تبصروں کی روشنی میں اور بعض نئے مآخذ کی مدد سے اِس تازہ ایڈیشن میں جو اضافے، ترمیمیں اور تبدیلیاں ہوئی ہیں، اُنھوں نے اِس کتاب کو زیادہ جامع اور زیادہ مفید بنا دیا ہے۔ تاہم چوں کہ لغزش خاصۂ بشری ہے، اِس لیے کسی بھی تحقیقی کارنامے کے صد فی صد درست یا مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ "تلامذۂ غالب" کے اس دوسرے ایڈیشن میں بھی بعض ایسے بیانات موجود ہیں جو ترمیم و تصحیح کے طالب ہیں یا جن کے متعلق مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پیشِ نظر سطور کی تحریر کا مقصد انھی قابلِ ترمیم اور وضاحت طلب مقامات کی نشان دہی کرنا ہے۔

(۱) انجم... محمد علی خاں شیخ پوری

انجم کو غالباً ''بیاضِ جابر علی خاں'' کے حوالے سے غالب کے شاگردوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اُن کے نمونۂ کلام میں راقم السطور کے مضمون سے فارسی کے جو دو قطعاتِ تاریخ نقل کیے گئے ہیں، ''اودھ اخبار'' میں اُن کے عنوان سے انجم کا شاگردِ غالب ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ محترم مصنف کے بقول انجم ضلع مونگیر (بہار) کے قصبہ شیخ پور کے رہنے والے تھے (ص ۵۷) ہمارا خیال یہ ہے کہ مذکورہ محمد علی خان انجم اور محمد علی خاں نامی مونگھیری (کذا) جو بقول مصنف ''مونگھیر کے رؤسا میں سے تھے'' شخصِ واحد ہیں۔ موخر الذکر کے نمونۂ کلام میں بھی فارسی کا ایک قطعۂ تاریخ ہی نقل کیا گیا ہے۔ یہ قطعہ خواجہ فخر الدین حسین سخن شاگردِ غالب کے مجموعۂ کلام ''دیوانِ سخن'' کی تاریخِ طباعت ہے۔ اِس کے عنوان میں قطعہ نگار کو ''شاگردِ جناب نواب اسد اللہ خاں غالب مرحوم'' لکھا گیا ہے لیکن اس قطعے میں اُنھوں نے اپنا تخلص نظم نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود ممکن ہے کہ صاحبِ دیوان کا بیان درست ہو اور وہ نامی اور انجم دونوں تخلص کرتے ہوں۔

انجم کے نمونۂ کلام میں تفتہ کی وفات کے جو دو قطعاتِ تاریخ نقل کیے گئے ہیں۔ اُن میں سے پہلا قطعہ مکمل نہیں۔ راقم السطور نے حسبِ ضرورت اُس کے صرف دو شعر نقل کیے تھے۔ اصلاً یہ پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

انتقال از تپِ وبائی کرد
تفتہ، شاگردِ حضرتِ غالب
شعر فہمانِ آمل و شیراز
نظمِ او راہمہ بہ جاں طالب
درفنِ شعر گوے سبقت بُرد
از کلیم و نظیری و صائب

ریخت در پیکرِ معانی جان
داشت نطق مسیح در قالب
گفت سالِ وفاتِ او انجم
واے صد حیف تائبِ غالب
(۱۲۹۶ھ)

(۲) بے صبر... منشی بال مکند سکندر آبادی

(الف) بے صبر کے سال ولادت سے متعلق قطعے کا آخری مصرع "ہزار وحشت صدو نہ آوے" (ص ۹۸) کی بجائے "ہزار وحشت و نہ آوے" ہونا چاہیے۔

(ب) بے صبر کی اولاد کے ذکر میں اُن کے چار بیٹوں میں سے سب سے پہلے "چوتھے بیٹے سری کرشن سروپ" کی ولادت کا قطعہ تاریخ نقل کیا گیا ہے جس کے مصرع چہارم سے ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) برآمد ہوتا ہے (ص ۹۹) بعد میں جب علیحدہ علیحدہ اُن چاروں بیٹوں کے نام اور دیگر تفصیلات بیان کی گئی ہیں تو اُن میں سری کرشن سروپ کا نام نہیں ملتا۔ اس کی بجائے تیسرے بیٹے کا نام کرشن چند سروپ اور چوتھے کا نام بنی سروپ بتایا گیا ہے۔ ہری کرشن راز کی تحریر کے مطابق اوّل الذکر کا صحیح نام کرشن سروپ تھا۔☆[1] اُن کا سال ولادت معلوم نہیں۔ ثانی الذکر خود مالک رام صاحب کے بقول ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اِس لیے محوّلہ بالا قطعہ تاریخ انھی کی ولادت سے متعلق ہوسکتا ہے۔

(ج) بے صبر کی بعض تصانیف کے بارے میں محترم مصنّف کی پیش کردہ تفصیلات میں مزید اضافوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ اضافے اس اعتبار سے اہم ہیں کہ اُن کتابوں تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں۔

(۱) مثنوی لختِ جگر: منشی گوکل پرشاد کے بقول "اس میں منشی صاحب نے اصلاحِ سخن کا حاصل کرنا غالب دہلوی سے تحریر فرمایا ہے۔"☆[2] گارساں دتاسی کی تحریر

کے مطابق یہ مثنوی ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔[☆۳] جناب ہری کرشن راز نے اسے "مطبوعہ ۱۸۷۱ء قرار دیا ہے۔[☆۴] ہو سکتا ہے، یہ اِس مثنوی کا دوسرا ایڈیشن ہو۔ راز صاحب نے اِسے اردو کی مثنوی بتایا ہے۔

(۲) اخگرِ عشق : جناب ہری کرشن راز کے بقول یہ مثنوی بھی چھپ چکی ہے لیکن اب نایاب ہے[☆۵] "تلامذۂ غالب" میں اس کی جو تاریخ تصنیف نقل کی گئی ہے، اس کے مصرعِ ثانی میں "بسرِ باغ ہوا" کی بجائے "بسرِ باغ ملا" ہونا چاہیے۔

(۳) ادیب البنات: جناب ہری کرشن راز کی تحریر کے مطابق یہ کتاب ۱۸۷۰ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ اردو میں ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔[☆۶]

(۴) گلستان ہندِ : یہ کتاب گلستانِ سعدی کے تتبع میں لکھی گئی ہے، لیکن اردو میں ہے سالِ تصنیف ۱۸۷۱ء ہے۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔

(۳) تفتہ ... منشی ہرگوپال

(الف) مالک رام صاحب نے تفتہ کے دہلی میں انتقال کے متعلق، محمد علی خاں انجم مونگیری کے بیان کو غلط ٹھہراتے ہوئے فرمایا ہے کہ "وفات سکندر آباد میں ہوئی جیسا کہ "تواریخ بلند شہر" میں ہے۔ (حاشیہ ص ۱۱٦) لیکن "تواریخ بلند شہر" کے جس نسخے کا حوالہ دیا ہے۔ اِس کا سالِ طباعت ۱۸٦۲ء ہے۔ (ص۵٦۹) تفتہ کی وفات (۱۸۷۹ء) سے سترہ برس پیش تر چھپی ہوئی کسی کتاب میں اِس واقعے کا تذکرہ کس طرح ممکن ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ انجم کو انتقال کی تفصیلات "اودھ اخبار" سے معلوم ہوئی ہوں گی جس کے ایک شمارے میں ان کے اور دوسرے متعدد شعرا کے قطعات تاریخ شائع ہوئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ تفتہ کا انتقال دہلی میں ہوا ہو اور اُن کی آخری رسوم سکندر آباد میں ادا کی گئی ہوں۔ انجم کے بیان کو اِس لیے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اُنھی کے ایک قطعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کا انتقال تپ وبائی سے ہوا تھا۔

(ب) مالک رام صاحب نے تفتہ کی تصانیف کے ذیل میں ''تضمینِ گلستان'' کا ذکر فرمایا ہے لیکن اُس کی طباعت و عدم طباعت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ گارساں دتاسی کی تحریر کے مطابق یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔☆۷ مرزا حاتم علی مہر نے اِس کی تاریخِ طباعت کہی ہے جس کے آخری مصرعے ''گلدستۂ لائق از گلستاں آمد'' سے ۱۲۷۴ھ برآمد ہوتا ہے۔

(ج) دیوانِ دوم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مطبع کوہِ نور لاہور (میں) ۱۸۵۷ء میں چھپا تھا۔ (ص ۱۲۰) منشی نول کشور نے اِس کے بارے میں یہ اطلاع دی ہے کہ ''باہتمام خاکسار مطبع کوہ نور لاہور میں اختتام کو پہنچا۔☆۸

(د) سُنبلستان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ''یہ کتاب پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی'' (ص ۱۲۲) حقیقت یہ ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۰ء میں مطبع مرآت الصحائف میرٹھ سے شائع ہوا تھا چنانچہ منشی نول کشور کا بیان ہے کہ ''مثنوی سُنبلستان کہ قبل ازیں میرٹھ میں طبع ہوئی تھی ... اس مطبع میں پھر طبع ہوتی ہے۔''☆۹ غالب کے ایک خط موسومہ تفتہ مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۸۶۱ء میں بھی اِس پہلے ایڈیشن کا ذکر بہ ایں الفاظ موجود ہے کہ ''تمھارا خط میرٹھ سے آیا۔ مرآۃ الصحائف کا تماشا دیکھا۔ سُنبلستان کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے۔''

(ہ) تفتہ نے مثنوی نلدمن کے وزن پر ایک اور مثنوی بھی کہی تھی جس کا ذکر ''تلامذۂ غالب'' میں موجود نہیں۔ ۲ر مئی ۱۸۶۵ء کے ''اودھ اخبار'' میں منشی نول کشور نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ مثنوی بروزن نلدمن... میں کچھ حضرت یوسفؑ اور برادران یوسف کا سا بیان ہے۔ بعد مثنوی سُنبلستان... طبع ہونا اس کا مطبع میں شروع ہوگا۔''☆۱۰

(و) دیوان اول مطبوعہ مطبع اسد الاخبار، آگرہ کے سلسلے میں مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ ''منشی محمد ظہور علی خاں صاحب بہادر نائب اور مختارِ کُل سرکار ٹونک نے ازراہِ قدر دانی اس کے مصارفِ طبع میں اعانت فرمائی تھی۔'' (ص ۱۱۹، ۱۲۰!) آگے چل

کر ایک جگہ مولوی محمد ظہور علی صدر الصدور کول کا ذکر آیا ہے (ص ۱۲۱) نام کے تھوڑے سے فرق کے باوجود یہ دونوں شخص واحد معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی ظہور علی صدر الصدور کول کی قدر دانی و فیض رسانی کے سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ انھی کی توجہ سے تفتہ کے بیٹے امراؤ سنگھ کو محکمۂ دیوانی میں ایک اچھی ملازمت مل گئی تھی۔☆۱۱

(۴) حباب ... پنڈت امراؤ سنگھ

محترم مصنف نے "تلامذۂ غالب" کے تازہ ایڈیشن میں حباب کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات کا اضافہ فرمایا ہے۔

غالب نے مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں امراؤ سنگھ کا یوں ذکر کیا ہے۔

> "امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس ہے (کذا = سے) جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ ہی دم نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچّوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں مصیبت میں پھنستا ہے۔"

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں :

جس زمانے میں غالب نے یہ خط لکھا ہے، تفتہ اس زمانے میں سکندر آباد میں مقیم تھے۔ فحوائے عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ سنگھ بھی ان دنوں سکندر آباد ہی میں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امراؤ سنگھ کی دو بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہوئیں اور دوسری بیوی چھوٹے چھوٹے بچّے چھوڑ کر مری تھیں" (ص ۱۵۳)

حقیقت یہ ہے کہ اِس خط میں جن امراؤ سنگھ کا ذکر ہے، وہ امراؤ سنگھ حباب نہیں، تفتہ کے بیٹے ہیں۔ خود مالک رام صاحب نے تفتہ کی اولاد کے سلسلے میں اُن کا ذکر فرمایا ہے۔

(۵) حسین علی بیگ مرزا

مرزا صاحب موصوف کے بارے میں محترم مصنف کا ارشاد ہے:
ان کا تخلص معلوم نہیں ہوسکا "ارمغان گوکل پرشاد" میں ہے:
"عاقل: محمدؐ علی دہلوی خلف مرزا حسین علی بیگ مرحوم شاگرد غالب و ذوق دہلوی ..." اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین علی بیگ نے غالب اور ذوق دونوں سے مشورہ کیا تھا۔ ان کے بیٹے محمد علی عاقل کے حالات تو گوکل پرشاد کے مندرجہ صدر اقتباس میں آہی گئے ہیں۔" (ص ۱۵۷)

راقم السطور نے اپنے مضمون میں غالب کے پانچ نئے شاگردوں کی نشان دہی کرتے ہوئے آئندہ ایڈیشن میں اُن کے ناموں کے اضافے کی گزارش کی تھی۔ ان شاگردوں میں محمدؐ علی عاقل کا نام بھی شامل تھا۔ مالک رام صاحب نے اس کے برعکس عاقل کے والد کو تلامذۂ غالب میں شامل فرما لیا ہے جو یقیناً درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ گوکل پرشاد کے بیان کے مطابق غالب اور ذوق کے شاگرد محمدؐ علی عاقل تھے، ان کے والد حسین علی بیگ نہیں۔ گوکل پرشاد کا طریق کار یہ ہے کہ وہ شاعر کے نام کے بعد پہلے اس کے باپ کا اور اس کے بعد استاد کا نام لکھتا ہے۔ چند مثالوں سے اِس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(الف) جلال: "ضامن علی خلف حکیم اصغر علی داستان گو لکھنوی، شاگرد امیر علی خاں ہلال و برق (۲۴)۔"

(ب) داغ: "نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدّین احمد خاں، شاگرد ذوق" (ص۳۲)

(ج) سرور: "مرزا رجب علی بیگ خلف الرشید مرزا اصغر علی شاگرد رشید نوازش حسین خاں نوازش" (ص ۴۱)

(د) سحر: "شیخ امان علی ولد محمدؐ امین لکھنوی، شاگرد برق" (ص ۴۱)

(ہ) شیفتہ: "نواب حاجی محمدؐ مصطفےٰ خاں بہادر دہلوی خلف عظیم الدّولہ

سرفراز الملک مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ، شاگرد مومن خاں مومنؔ" (ص ۴۹)

(و) صادق : "محمد عزیز الدین برادر محمد سعید الدین خلف مولوی اساس الدین بدایونی، شاگرد مرزا نوشہ غالب۔" (ص ۵۳)

(ز) صبا : "میر وزیر علی خلف میر بندہ علی شاگرد خواجہ آتش مرحوم لکھنوی۔" (ص ۵۳) ۔

(ح) نادر : "مرزا کلب حسین خاں بہادر خلف نواب کلب علی خاں بنارسی شاگرد ناسخ" (ص ۸۷)

ان شعرا میں سے کسی کا سلسلۂ شاگردی نامعلوم یا مشکوک نہیں۔ اگر مالک رام صاحب کے استدلال کے مطابق محمد علی عاقل کی بجائے اُن کے والد مرزا حسین علی بیگ کو شاگردِ غالب و ذوق مان لیا جائے تو اُن تمام شاعروں کو بھی ان کے اساتذہ کے شاگردوں کی فہرست سے خارج کر کے اُن کی جگہ اُن کے والدین کے نام داخل کرنا پڑیں گے۔

مرزا غالب نے منشی نبی بخش حقیر کے نام کئی خطوط میں اپنے ایک شناسا مرزا حسین علی بیگ رسالہ دار کا ذکر کیا ہے جو دہلی سے برابر کول (علی گڑھ) جاتے رہتے تھے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہی مرزا حسن علی بیگ رسالہ دار محمد علی عاقل دہلوی کے والد تھے۔ گوکل پرشاد یا اُن کے تذکرے کے کاتب سے اُن کے صحیح نام کے انضباط میں غلطی ہوئی ہے۔

اودھ اخبار کے ۱۳رجون ۱۸۷۹ء کے شمارے میں مردان علی خاں رعنا کے انتقال سے متعلق خبروں کے تحت "ہاتھرس میں ماتم" کے زیرِ عنوان عاقل کا ایک قطعۂ تاریخ بھی شائع ہوا ہے جس کے عنوان اور آخری شعر کے پہلے مصرعے میں تخلص عاقل کی بجائے غافل لکھا ہوا ہے۔ یہ بہ ظاہر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(۶) خاور... مرزا محمد اکبر خاں قزلباش

خاور کا نام "مرزا محمد اکبر خاں" بتایا گیا ہے (ص ۱۶۸) "فہرست ممبران کمیٹی

خواست گار ترقیِ تعلیم مسلمانان" مرتبہ ۱۵/ اپریل ۱۸۷۲ء کے مطابق اُن کا صحیح نام "مرزا علی اکبر خاں" تھا۔ اِس فہرست میں اُن کا نام اُن تفصیلات کے ساتھ درج ہے:

"سلطان اشعرا مرزا علی اکبر خاں صاحب سیستانی متخلّص بہ خادر، ملازم سرکار پٹیالہ"☆[۱۲] ہمارے نزدیک تذکروں کے اندرجات کے مقابلے میں فہرست متذکرہ کا یہ اندراج زیادہ معتبر ہے۔

(۷) ذکا ... مولوی حبیب اللہ مدراسی

ذکا کے استاد میر شمس الدّین فیض کے بارے میں مالک رام صاحب کا ارشاد ہے:

"فیض ۱۲۱۵ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت "وجود مظہر کل" ہے" (ص ۱۸۲ حاشیہ)

"وجود مظہر کل" سے ۱۲۱۵ھ نہیں، ۱۲۱۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ قطع نظر اِس سے "عروس افکار" مرتبہ (۱۲۸۹ھ) کے مطابق فیض ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔☆[۱۳]

(۸) رند... جانی بانکے لال

(الف) تفتہ کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے۔

"کل ایک دوست کا خط اکبر آباد سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ... صورتِ انتظام جانی بیج ناتھ کے آنے پر موقوف ہے... ظاہراً اُس کو بابو صاحب کا نام نہیں معلوم، اُن کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔"☆[۱۴]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانی بانکے لال رند جانی بہاری لال اکبر آبادی متخلّص بہ راضی شاگرد غالب کے والد جانی بیج ناتھ کے بھائی تھے۔ مالک رام صاحب نے تفتہ کے مرثیۂ رند کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ رند اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ (ص ۲۲۶) ممکن ہے کہ جانی بانکے لال اور جانی بیج ناتھ چچا زاد بھائی ہوں۔

بہرصورت اِس بیان کی روشنی میں اُن کے حالات میں وطن اور خاندان کے بارے میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

(ب) غالب منشی نبی بخش حقیر کے نام ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"کچھ اشعار جانی بانکے لال کے تفتہ نے میرے پاس بھیجے اور ایک خط اُن کا یعنی جانی جی کا اکبر آباد سے بے توسط تفتہ مجھ کو آیا... نظم و نثر اِس شخص کی مربوط ہے۔ میں اس کو اتنا نہیں جانتا تھا۔"

اِس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رندا اور غالب کے درمیان شاگردی و استادی کا رشتہ مارچ ۱۸۵۱ء میں قائم ہوا تھا۔

(۹) سرور ... شیخ امیر اللہ اکبر آبادی

سرور کے بارے میں ماہنامہ "شاعر" آگرہ نمبر کے حوالے سے مختصراً صرف اس قدر لکھا گیا ہے :

"بیٹے تھے شیخ عبداللہ کے۔ ۱۲۴۳ھ میں دہلی میں تھے۔ غالب کے علاوہ شیخ رحمت اللہ مجرم اکبر آبادی سے بھی اصلاح لی۔" (ص ۲۸۱)

"بزم غالب" کے مصنف جناب عبدالرؤف عروج نے سرور کے نام غالب کے ایک خط کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے بعد کہ غالب نے اصلاحِ کلام کے بارے میں اُن کی درخواست پر معذرت ظاہر کردی تھی، "تلامذۂ غالب" میں اُن کی شمولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ بات کسی ثبوت کے بغیر درست نہیں کہی جاسکتی۔"☆۱۵ جناب عروج کا یہ خیال درست نہیں کہ غالب نے سرور کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کردیا تھا۔ غالب کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

"خواستہ اید کہ نتائجِ طبعِ والاے شما بنگرم ... اوراق اشعار بہ نظرِ اجمالی نگرستہ ام"☆۱۶

اوراقِ اشعار کا بہ نظرِ اجمالی دیکھنا تلمذ کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ مالک رام صاحب نے اُن کے تعارف میں غالب کا یہ جملہ بھی نقل کردیا ہوتا تو یہ غلط فہمی نہ پیدا ہوتی۔

(۱۰) طرزی... مولانا سیّد قطب الدّین دلاور علی جعفری ہاپوڑی

طرزی کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں مالک رام صاحب نے مولانا اطہر ہاپوڑی اور سیّد محمد جمیل ہاپوڑی صاحب کے خطوط کے علاوہ ''یادگارِ ضیغم'' اور ''دودِ چراغِ محفل'' سے بھی استفادہ فرمایا ہے۔ غالب سے تلمذ کے سلسلے میں موصوف کا ارشاد ہے:

> ''دلّی کی تعلیم کے دوران ہی میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا...
> آغاز میں ثاقب تخلص کرتے اور آزردہ سے اصلاح لیتے رہے۔
> استاد نے ثاقب بدل کر تخلص طرزی کردیا... اِسی زمانے میں
> غالب سے مشورہ کرنے لگے۔'' (ص ۳۷۶)

غالب سے مشورۂ سخن کے متعلق اس بیان پر حاشیے کے تحت لکھا گیا ہے:

''تذکرۂ ضیغم'' میں ہے۔ فن شعر میں غالب مرحوم دہلوی اور ہرگوپال تفتہ سکندر آبادی کے شاگرد ہیں۔'' اطہر ہاپوڑی مرحوم جو طرزی کے ملنے والے بلکہ اُن کے کچھ رشتے دار بھی تھے، تفتہ کے تلمذ کے منکر تھے۔''

(حاشیہ ص ۳۷۶)

مالک رام صاحب نے مولانا اطہر ہاپوڑی کے حوالے سے اپنے ایک ماخذ ''یادگارِ ضیغم'' کے تفتہ سے تلمذ کے متعلق بیان کی تو تردید فرما دی لیکن ایک دوسرے ماخذ ''دودِ چراغِ محفل'' کے اس نکتۂ اعتراض کی طرف توجہ نہیں فرمائی کہ:

> ''طرزی نے اپنے اشعار میں آزردہ اور اپنے دیگر اساتذہ کا ذکر
> کیا ہے لیکن غالب سے تلمذ کا کہیں اشارہ تک موجود نہیں۔ نہیں

کہا جاسکتا کہ مالک رام صاحب نے ''یادگارِ ضیغم'' کے لکھنے پر
شاگردِ غالب لکھا ہے یا کوئی اور ماخذ بھی اِس بات کی تائید میں
ملاحظہ فرمایا ہے۔ دیوان میں معاصرین کے لیے جو نو قصیدے
کہے ہیں، اُن میں پہلا اپنے استاد آزردہ کی تعریف میں اور دوسرا
غالب کی مدح و ثنا میں ہے۔ بقیہ اشعار میں بھی جہاں کہیں
(غالب کا) ذکر آیا ہے، اپنی شاگردی کا کہیں بھی اشارہ
نہیں کیا۔''☆[۱۷]

غالب کا بہ کثرت ذکر کرنے کے باوجود اُن کی شاگردی کی طرف اشارہ تک نہ کرنا ہرگوپال تفتہ سے تلمذ کی طرح غالب سے مشورۂ سخن کے متعلق بھی صاحبِ ''یادگارِ ضیغم'' کے بیان کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ آزردہ اور غالب کے زمانۂ وفات میں زیادہ فرق نہیں۔ آزردہ کا انتقال پنج شنبہ، ۲۴ر ربیع الاول ۱۲۸۵ھ (۱۶ر جولائی ۱۸۶۸ء) کو ہوا، غالب نے اس کے سات ماہ بعد ۲ر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء) کو وفات پائی۔ ضیغم کا آزردہ سے نسبتِ تلمذ کا حوالہ نہ دینا بھی ان کے نقصِ معلومات پر دلالت کرتا ہے۔

(۱۱) عرشی ... احمد حسن

(الف) عرشی کے والد مولانا سیّد اولاد حسن کا زمانۂ حیات ۱۸۰۵ء تا ۱۸۳۸ء متعین کیا گیا ہے (۴۰۴) جناب نثار احمد فاروقی نے عرشی کے چھوٹے بھائی نواب سیّد صدیق حسن خاں کی تصنیف ''اتحاف النبلاء'' کے حوالے سے ان کا سال ولادت ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء بتایا ہے۔☆[۱۸] بہ ظاہر موخر الذکر روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن مالک رام صاحب نے نہ تو اسے قبول کیا اور نہ اس کی تردید فرمائی ہے۔

(ب) عرشی کے بارے میں ایک بیان یہ ہے کہ اُنھوں نے ''کتاب و سنّت کی سند مولانا سیّد عبدالغنی سے لی'' (۴۰۵) مولانا عبدالغنی کے نام کے ساتھ سید لکھنا صحیح نہیں۔ وہ نسباً شیخ فاروقی تھے۔☆[۱۹] ان کا اور اُن کے بعض بزرگوں کا تفصیلی

ذکر ''تلامذۂ غالب'' ہی میں صفحات ۲۳۱، ۲۳۲ کے حاشیوں میں موجود ہے۔

(۱۴) عزیز... مرزا یوسف علی خاں بنارسی

عزیز کی زندگی کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، اُن میں بعض غلطیاں بھی در آئی ہیں اور تاریخی اعتبار سے اُن کی ترتیب بھی درست نہیں۔ یہاں بہ نظر اختصار اِن نقائص کی تفصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ واقعات تاریخی صحت اور تسلسل کے ساتھ بیان کیے جارہے ہیں:

عزیز کے والد مرزا نجف علی خاں جنوں کی علی گڑھ میں ''دو ایک حویلیاں'' ضرور تھیں لیکن بہ گمانِ غالب اُن کا قیام زیادہ تر دہلی ہی میں رہتا تھا۔ چنانچہ اُن کا انتقال بھی دہلی ہی میں ہوا۔[☆۲۰] عزیز بھی اپنے والد کی طرح برابر علی گڑھ جاتے رہتے تھے لیکن رہتے دہلی ہی میں تھے۔ دہلی میں وہ سوز خواں کی حیثیت سے بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے اور تیس روپیہ ماہنامہ وظیفہ پاتے تھے۔ غدر کے نتیجے میں ''جہاں سلطنت گئی وہاں (اُن کی) تنخواہ بھی گئی۔'' اس کے بعد کچھ دنوں بلّی ماران کے ایک ہندو رئیس کے لڑکوں کو پڑھایا۔ جب یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا تو غالب نے ''بقدر اپنی دست گاہ کے کچھ مہینہ مقرر کردیا، مگر بہ سبب کثرتِ عیال وہ ان کو مکتفی نہیں'' تھا۔[☆۲۱] اس لیے اولاً اُنھوں نے حیدرآباد میں سلسلہ جنبانی کی لیکن وہاں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو وہ بھوپال کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''عمدۃ الاخبار'' بھوپال مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۸۷۱ء (ج ۱ شمارہ ۲۵) میں ان کا ایک قصیدہ شائع ہوا تھا جو اُنھوں نے محلّہ بلّی ماران دہلی سے معتمد المہام صاحب بہادر کی معرفت نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیۂ بھوپال کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور رئیسہ موصوفہ کی خدمت میں ''نیاز ملازمت'' حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔[☆۲۲] انھیں اِس عرضداشت کا حوصلہ افزا جواب ملا چنانچہ وہ دہلی سے ترکِ سکونت کر کے بھوپال چلے گئے لیکن ابھی روزگار کی کوئی مستقل صورت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ پیغامِ مرگ آپہنچا اور ۱۲۸۹ھ کے اواخر یا ۱۲۹۰ھ کے اوائل (بہ گمانِ غالب فروری/ مارچ ۱۸۷۳ء) میں وہیں اُن کا

انتقال ہوگیا۔

(۱۳) علی ... نواب علی بہادر

(الف) مالک رام صاحب کا ارشاد ہے۔" اورنگ خاں (اوزبک خاں) غالب کے ماموں کے بیٹے بھائی علی بہادر کے چچا ہیں تو خود غالب بھی علی بہادر ثانی کے چچا ہوئے۔" (ص ۴۲۹)

چوں کہ علی بہادر کے والد نواب ذوالفقار بہادر اورنگ خاں کے خالہ زاد بھائی تھے اس لیے اُن (ذوالفقار بہادر) کے اور غالب کے درمیان بھائی کا رشتہ ہونا قطعاً ضروری نہیں۔

(ب)نواب علی بہادر کی اولاد کے ذکر میں اُن کے بڑے بیٹے کا نام نواب بہادر اور علی بہادر کی وفات (۱۴ اگست ۱۸۷۳ء) کے وقت اُن کی عمر انیس سال بتائی گئی ہے (ص ۴۳۱)... "یادگار ضیغم" کے مطابق نواب بہادر کا اصل نام ذوالفقار بہادر (ثانی) تھا اور نواب بہادر اُن کا عرف تھا۔ وہ ۱۲۷۲ھ میں بہ مقام باندہ پیدا ہوئے تھے لیکن تذکرے کی تالیف کے وقت (۱۳۰۲ھ) اندور میں مقیم تھے۔ شعر بھی کہتے تھے تخلص نوشہ تھا اور اصلاح نواب کلب علی خاں نواب والیِ رام پور سے لیتے تھے۔☆[۲۳]

(ج) علی کی مثنوی "مہر و ماہ کا سالِ طباعت ۱۲۹۷ھ لکھا گیا ہے ہمارے سامنے اِس مثنوی کا جو نسخہ ہے، اُس کے مطابق یہ "بست ونہم رجب المرجب ۱۲۶۷ھ" کو مولوی محمد حسین کے مطبع محمدی واقع کان پور میں طبع ہوئی تھی۔ ۱۲۹۷ھ بہ ظاہر ۱۲۶۷ھ کی تصحیف ہے۔

(۱۴) فدا ... حکیم سیّد احمد حسین مودودی سہسوانی

راقم السطور نے اپنے تبصرے میں فدا کے متعلق جو چند باتیں عرض کی تھیں محترم مصنف نے اُنھیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے ایڈیشن کی بعض غلطیاں اِس ایڈیشن میں بھی جوں کی توں موجود ہیں۔ مثلاً۔

(الف) مالک رام صاحب کا ارشاد ہے۔

"تکمیل (علم) کے لیے دلّی پہنچے... تو یہاں مرزا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں حاضر ہوے اور اُن سے مشورہ کرنے لگے ... دلّی سے وطن واپس چلے جانے کے بعد اُن کی استاد سے خط و کتابت رہی۔" (ص ۴۳۸)

یہ بیان "حیٰوۃ العلما" پر مبنی ہے لیکن درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فدا اور غالب کے درمیان شاگردی و استادی کا رشتہ سیّد احمد حسین عرشی کی وساطت سے ستمبر ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا تھا۔☆[۲۴] فدا اُس زمانے میں بڑودے میں قیام پذیر تھے۔ اُن کے نام غالب کے جتنے خطوط دستیاب ہوئے ہیں، وہ سب ستمبر ۱۸۶۰ء کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اُن میں قدیم ترین خط ۱۹/ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

(ب) مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"اُن (فدا) کے خاندان کے بعض اصحاب کا تعلّق ریاست بڑودہ سے تھا۔ اُنھیں کی ترغیب پر فدا نے بھی بڑودہ کی راہ لی" (ص۴۳۸)

راقم السطور نے اپنے تبصرے میں اِس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی کہ فدا کی والدہ مسماۃ امیر النسا سیّد باسط علی ساکن بڑودہ کی صاحب زادی تھیں۔ اس لیے اُن کا "خاندان کے بعض اصحاب" کی ترغیب پر بڑودہ پہنچنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے والد سیّد محمّد حسن بھی ریاست بڑودہ کے متوسّل تھے۔ فدا کی اہلیہ قادری بیگم بھی بڑودہ کے سیّد دیوان جی (؟) کی بیٹی تھیں۔ سیّد دیوان جی اور سیّد باسط علی (فدا کے نانا) دونوں سادات بارہہ کے سلسلے سے تعلّق رکھتے تھے۔☆[۲۵]

(۱۵) قدر... سیّد غلام حسنین بلگرامی

قدر کی مثنوی "قضا و قدر" پہلی بار ۱۲۷۴ھ (۵۸-۱۸۵۷ء) میں شائع ہوئی تھی۔ سرورق پر مطبع کا نام مطبع شعلۂ طور، کان پور لکھا ہوا ہے لیکن آخری صفحے

(ص ۳۸) کے اندراج اور مہر کے مطابق یہ محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں کے مطبع نظامی میں طبع ہوئی تھی۔ ''اودھ اخبار'' کے ۲۰ر مئی ۱۸۶۳ء کے شمارے میں اس مثنوی کے اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا۔

(۱۶) محمود... محمد حسین نہٹوری

مالک رام صاحب نے محمود کی چار تصانیف ''دو آہنگ'' (دیوان اردو کے رسالہ ''حلوائے بے دود''، مثنوی ''تحفۂ محمود'' اور ''محمود نامہ'' کا ذکر فرمایا ہے (ص ۴۸۲) جناب نثار احمد فاروقی نے اُن کی ایک اور تصنیف ''قولِ فیصل'' کی نشان دہی کی تھی☆[۲۶] جو اِس فہرست میں موجود نہیں۔ اس رسالے کا ایک نسخہ راقم السطور کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں بھی محفوظ ہے۔ سرورق کے اندراجات کے مطابق اِس کا پورا نام ''نئی شاعری اور پرانی شاعری کے مباحثہ پر قولِ فیصل'' ہے لیکن ''قولِ فیصل'' کو صفحے کے وسط میں جلی قلم سے اِس طرح لکھا گیا ہے کہ اُسے اصل نام قرار دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ رسالہ مطبع ریاضِ ہند امرت سر سے ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بہ صورت قطعات اردو شاعری پر آزاد اور حالی کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو شاعری کا دامن سادگی کے اُس جوہر سے کبھی خالی نہیں رہا جس کے فقدان کا یہ حضرات شکوہ کرتے ہیں۔ آخر میں نمونے کے طور پر چند غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

مثنوی ''تحفۂ محمود'' جناب مالک رام کی تحریر کے مطابق مطبع آفتابِ ہند جالندھر سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ رضا لائبریری رام پور میں اِس مثنوی کا ایک قدیم تر ایڈیشن موجود ہے جو ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ (نومبر ۱۸۸۰ء) میں مطبع نظامی کان پور سے شائع ہوا تھا۔ محمود اُس وقت جناب کنور سوچیت سنگھ صاحب بہادر و جناب کنور بکرمان سنگھ صاحب بہادر اہلو والیہ رئیس جالندھر کی ریاست کے ناظم تھے۔ اِس مثنوی میں اشعار کی کل تعداد ۵۶۵ ہے، اور نثری رسالے ''حلوائے بے دود'' کی طرح یہ بھی

تعلیمِ اطفال وتہذیب اخلاق کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔

(۱۷) محو... نواب غلام حسن خاں دہلوی

محو کے حالات میں ان کے اخلاف کا ذکر نہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق اُن کے ایک بیٹے محمد حسین خاں بھی شاعر تھے اور شرر تخلص کرتے تھے۔ ☆۲۷

(۱۸) معجز... منشی آغا علی سہسوانی

محترم مصنف نے اِس ایڈیشن میں منشی آغا علی کے نام کا اضافہ محرر سطور کے تبصرے (مطبوعہ دو ماہی ''اکاڈمی'' لکھنؤ) کے حوالے سے فرمایا ہے (ص ۴۹۷) لیکن اس تبصرے میں کہیں بھی اُن کا تخلص معجز نہیں بتایا گیا۔ یہ تخلص دراصل ''تاریخِ سہسوان'' کے مصنف کا ہے جنھوں نے منشی آغا علی کو شاگردِ غالب لکھا ہے۔ تبصرے کی اشاعت کے بعد اُن کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہے وہ درج ذیل ہے:

منشی شیخ آغا علی کے والد کا نام منشی نادر علی تھا جو حضرت غلام علی شاہ عباسی کے فرزند تھے۔ غلام علی شاہ صاحب یا اُن کے والد مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہد میں منڈوڑہ سے ترکِ وطن کر کے سہسوان میں آباد ہوئے تھے۔ سیّد آل حسن امروہوی نے ''نخبۃ التواریخ'' میں منشی آغا علی کو ساداتِ مودودیِ سہسوان میں شامل کرلیا ہے۔ جو صحیح نہیں۔ اِس کتاب کی تصنیف کے زمانے (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) میں موصوف امروہہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ سہسوان میں آپ کے دادا کی بنوائی ہوئی مسجد نہایت پُرفضا مقام پر واقع ہے اور غلام علی شاہ کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ معجز سہسوانی نے ''تاریخِ سہسوان'' میں تیرھویں صدی ہجری کے نام ور علما و فضلا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اِس دور کے مشہور فارسی دانوں میں جو استاد سمجھے جاتے تھے، مولوی علیم اللہ، مولوی شیخ فضل حسین، مولوی سیّد غلام امام، مولوی شیخ امداد حسین، مولوی احمد حسن شربی و منشی شیخ آغا علی ڈپٹی مدارس کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ اُن میں دو

مؤخرالذکر بزرگ عمدہ ناظم و ناثر تھے۔''[28]

(۱۹) میکش... میر احمد حسین دہلوی

مالک رام صاحب کا ارشاد ہے کہ (الف) میکش ۱۲۴۲ھ (۲۷-۱۸۲۶ء) میں پیدا ہوئے تھے اور (ب) زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ (ص ۵۰۵) میکش کے سالِ ولادت کا تعین غالباً مولوی کریم الدّین کے اِس بیان کی بنیاد پر کیا گیا ہے کہ ''عمر اُس کی بائیس برس کی اِس سال میں یعنی ۱۲۶۴ھ میں ہے۔''[29] اس حساب سے پیدائش کا صحیح سال ۱۲۴۱ھ قرار پاتا ہے جسے بربنائے احتیاط ''تقریباً'' کے التزام کے ساتھ لکھنا مناسب ہوگا۔ مولوی کریم الدّین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''فارسی شعر کہتا ہے، اردو شعر نہیں کہتا۔'' اِسی کے ساتھ اُنھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ میکش نے ۱۲۶۳ھ سے سات برس پہلے یعنی ۱۲۵۶ھ (۴۱-۱۸۴۰ء) میں غالب سے اصلاح لینا شروع کیا تھا۔

(۲۰) میکش... ارشاد احمد دہلوی

مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ''میکش کی ساری عمر دلّی میں گزری'' (ص ۶۰۶) یہ اطلاع غالباً نواب علی حسن خاں کے بیان ''عمرے خاک بیزِ کوے زبانِ دہلوی ماندہ''[30] پر مبنی ہے۔ اوّلاً ہمارے خیال میں ''عمرے'' کا ترجمہ ''ساری عمر'' کرنا مناسب نہیں۔ بہ ظاہر اس سے عمر کا ایک بڑا حصّہ مراد ہے۔ ثانیاً صاحبِ ''صبحِ گلشن'' کے مطابق میکش نے عمر کا ایک قابلِ لحاظ حصّہ زبانِ دہلوی کی تحصیل میں صرف کیا تھا نہ کہ شہر دہلی کی خاک بیزی میں۔ خیال رہے کہ میکش کا اصل وطن قصبہ پھلت ضلع مظفّر نگر تھا اور اُنھوں نے عمر کے آخری ایام بھوپال میں بسر کیے۔

(۲۱) نسیم... نواب محمّد حسین علی سلطان

مالک رام صاحب کو نسیم کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ اُن کا ذکر تذکرۂ ''یادگارِ ضیغم'' میں موجود ہے۔ صاحبِ تذکرہ نے اُن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے،

اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نسیم کے دادا ٹیپو سلطان کے بھانجے تھے اور نانا بنگلے نواب (کذا) تھے۔ نسلاً یہ شیوخ قریشی کا خاندان تھا جسے میسور سے وطنی نسبت تھی۔ نسیم کئی زبانیں جانتے تھے اور اُن میں طبع آزمائی کرتے تھے اکثر نعت شریف کہتے تھے۔ مختلف لوگوں سے مشورۂ سخن کیا تھا۔ اردو میں میر شمس الدّین فیض حیدر آبادی کے شاگرد تھے۔ تالیف تذکرہ کے وقت (۱۳۰۲ھ) اُن کی عمر پچاس برس تھی۔☆۳۱

مالک رام صاحب نے نسیم کا ذکر ''گلدستۂ شعرا'' مدراس کے حوالے سے کیا ہے۔ (ص ۵۲۱) ہمارے علم کے مطابق ''گلدستۂ شعرا'' لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ یہ ظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ نسیم نے اس کے لیے اپنا کلام مدراس سے بھیجا ہوگا۔ چنانچہ ''گلدستۂ ناز'' کے جون ۱۸۵۵ء کے شمارے میں ان کی ایک غزل اس عنوان سے شامل ہے:

''عالی جناب معلّی القاب نواب محمّد حسین علی خاں سلطان متخلّص بہ نسیم جاگیردار مولور (کذا=ہرپور) نبیرۂ ٹیپو سلطان دام اقبالہم، شاگردِ غالب دہلوی از مدراس''

(۲۲) نشاط... ہرگوبند سہائے

محرّر سطور نے اپنے تبصرے میں عرض کیا تھا کہ نشاط کے دیوان کا نام ''نشاط الاحباب'' نہیں ''نشاطِ احباب'' ہے۔ اِس ایڈیشن میں اُس کا نام حسب سابق ''نشاط الاحباب'' لکھا گیا ہے جو یقیناً درست نہیں۔

(۲۳) نظام... نواب محمّد مردان علی خاں

نظام (رعنا) کی تصانیف میں ''نوائے غریب'' کا نام شامل نہیں۔ کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۷۹ھ برآمد ہوتا ہے فنِ موسیقی سے متعلّق ان کی دو تصانیف میں سے ''نغمۂ صنم'' کا سال تصنیف ۱۲۷۹ھ بتایا گیا ہے کہ جب کہ دوسری کتاب ''غنچۂ راگ'' کا سنہ تصنیف مذکور نہیں۔ اوّل الذکر جیسا کہ اُس

کے نام کے اعداد سے ظاہر ہے، ۱۲۷۵ھ کی تصنیف ہے جب کہ آخر الذکر کے نام سے اُس کا سال تصنیف ۱۲۷۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ اِن امور کی طرف گزشتہ تبصرے میں بھی توجہ دلائی گئی تھی جسے محترم مصنف نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ''غنچۂ راگ'' کا اشتہار ''اودھ اخبار'' کے ۱۱؍ مارچ ۱۸۶۳ء مطابق ۲۰؍رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اِس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اُسی سال مطبع نول کشور سے شائع ہوئی ہوگی۔

(۲۴) نیّر ... حکیم محبّ علی کاکوروی

مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ''تکمیل کے بعد ریاست آوا (ضلع ایٹہ) میں طبیب کی حیثیت سے ملازم ہوگئے (ص ۵۳۱) ضلع ایٹہ میں راقم السطور کے علم کے مطابق ''آوا'' نام کا کوئی مقام موجود نہیں۔ یہ بہ ظاہر ''اوا گڑھ'' ہے جسے بعض لوگ ''آوا گڑھ'' بھی کہتے ہیں۔

(۲۵) وحید ... وحید الدّین احمد خاں

راقم السطور نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ گلدستہ ''مشاعرہ دہلی'' بابت ماہ جون ۱۸۷۸ء مطابق جمادی الآخر ۱۲۹۵ھ... کے بموجب وحید اُس زمانے میں دہلی میں موجود اور مشاعرے میں شریک تھے، اس لیے ۱۲۹۴ھ میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ ان کا حیدرآباد منتقل ہو جانا قابلِ قبول نہیں۔ یہ بیان کسی مزید وضاحت کے بغیر اس ایڈیشن میں بھی بدستور موجود ہے (ص ۵۴۲)

(۲۶) ہوشیار... مولوی حکیم محمدؐ مراد علی

ہوشیار کے حالات میں اُن کے زمانۂ ولادت کا ذکر نہیں ''یادگارِ ضیغم'' کی تالیف کے وقت (۱۳۰۲ھ میں) ان کی عمر پینتالیس برس تھی۔☆[۳۲] اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے۔

(۲۷) قلق... حکیم غلام مولیٰ میرٹھی

(الف) گارساں دتاسی کی یہ روایت درست نہیں کہ ''جواہر منظوم کے ۱۸۶۴ء کے'' ایڈیشن میں اردو ترجمے کے مقابل اصل انگریزی نظمیں بھی درج تھیں (ص ۵۶۲) یہ بیان کسی غلط فہمی یا اصل فرانسیسی عبارت کے غلط ترجمے پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ پریس الہٰ آباد سے شائع شدہ نسخہ موجود ہے۔ اِس کے سرورق پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ''دفعہ اوّل'' اور ''فرسٹ ایڈیشن'' ''تعداد اشاعت ۵۰۰'' اور ''قیمت تین آنہ'' درج ہے۔ اِس ایڈیشن کی جملہ تفصیلات ۱۸۶۷ء کے ایڈیشن کے مطابق ہیں۔

(ب) قلق کا نام غلام مولیٰ اور سال ولادت ۱۲۴۸ھ بتایا گیا ہے (ص ۵۶۳) ہمارا قیاس یہ ہے کہ ان کا پورا نام ''محمدؐ غلام مولیٰ'' ہوگا۔ حسابِ جمل کے مطابق اِس سے ۱۲۴۹ھ برآمد ہوتا ہے جو ۳۴-۱۸۳۳ء کے مطابق ہے۔ یہی اُن کا سالِ ولادت قرار پائے گا۔

''تلامذۂ غالب'' کے اِس تازہ ایڈیشن میں غالب کے شاگردوں کی فہرست میں متعدد نئے ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ پچھلے ایڈیشن کے بعض تبصرہ نگاروں نے کچھ شاعروں کے غالب سے رشتۂ تلمذ پر شبہے کا اظہار کیا تھا، ان میں سے ''دو ایک نام'' اس لیے حذف کر دیے گئے ہیں کہ ''ان کے تلمذ کے لیے کافی ثقہ شہادت موجود نہیں'' لیکن باقی شاعروں کو اِس اصول کے تحت کہ ''اگر کسی تذکرہ نگار یا ثقہ راوی نے تلمذ کا ذکر کیا ہے تو اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا'' بدستور زمرۂ تلامذہ میں شامل رکھا گیا ہے۔ محترم مصنف کے اِس معیارِ ترجیح کو مدِّنظر رکھتے ہوئے شاگردانِ غالب کی موجودہ فہرست میں مندرجہ ذیل افراد کے ناموں کے لیے مزید گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے۔ غالب سے ان لوگوں کا رشتۂ تلمذ حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی کی نسبتِ شاگردی کے مقابلے میں بہ ہرحال قوی تر ہے۔

(۱) میر افضل علی ابر

اصل وطن موضع سیکری، تحصیل جانسٹھ ضلع مظفر نگر تھا لیکن مدرسۂ بلند شہر سے بہ حیثیت ہیڈ مولوی وابستگی کی بنا پر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ صاحب "یادگارِ ضیغم" کا بیان ہے کہ فارسی میں اسد اللہ خاں غالب مرحوم دہلوی کے شاگرد ہیں۔ اردو میں مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم دہلوی سے... تلمذ ہے۔☆[۳۳] تذکرے کی تالیف کے وقت یعنی ۱۳۰۲ھ میں اُن کی عمر اڑتالیس برس تھی۔

(۲) منشی منصور علی خاں بسمل

ان کی ایک غزل ماہنامہ "جلوۂ یار" میرٹھ کے ماہِ جولائی ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اِس غزل کے سرِ عنوان بسمل کا تعارف اِن الفاظ میں کرایا گیا ہے:

جناب منشی منصور علی خاں صاحب بسمل، خوشہ چینِ گلزارِ اسدی حضرت غالب چوں کہ "جلوۂ یار" تک ہر قاری کی رسائی آسانی کے ساتھ ممکن نہیں، اس لیے اس غزل کے یہ تین اشعار سطور ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

فلک سے داد چاہیں گے تو ایک حسرت سوالیں گے
اسیرانِ بلاجز رنج و محنت اور کیا لیں گے

ترے دیوانے ہر سو کعبہ ودیرو گلستاں میں
پکاریں گے تجھی کو نام تیرا جا بجالیں گے

ہجومِ بے خودی ہے ہم پہ یارب! کچھ نہیں کھلتا
اٹھے ہیں کس لیے، کیا جانے کیا دستِ دعا لیں گے

(۳) قاضی شریف حسین خاں شریف دہلوی

مولانا ابو الفضل محمد عباس رفعت شیروانی نے جو غالب کے ایک معروف شاگرد ہیں، اپنی ایک بیاض میں شریف کے چار فارسی قصیدے نقل کیے ہیں جن میں

سے ایک نواب تجمل حسین خاں شوکت جنگ کی مدح میں اور تین نواب نصیر الدولہ کی تعریف میں ہیں۔ چوتھا قصیدہ اس بیاض میں حسب ذیل عنوان کے تحت منقول ہے:

''قصیدہ چہارم شریف حسن (کذا) دہلوی تلمذ (کذا) غالب۔''☆۳۴

رفعت کی اس تحریر سے جس پر اعتبار نہ کرنے کی بہ ظاہر کوئی معقول وجہ موجود نہیں، شریف کا مرزا غالب سے اصلاح لینا ثابت ہوتا ہے۔ ''بیاضِ رفعت'' کے اِس اندراج اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی☆۳۵ رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قاضی وجدی الحسینی نے شریف کا صحیح نام شریف حسین بتایا ہے۔ وجدی صاحب کے بیان کے مطابق قاضی شریف حسین ۱۷۹۷ء میں محلہ بلّی ماران دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن کٹرہ الہ آباد میں پائی۔ بعد ازاں علمائے ٹونک سے استفادہ کیا۔ ۲۹ سال کی عمر میں مفتی اکرام الدّین خاں نائب صدر الصّد ور دہلی کی صاحب زادی سے اُن کی شادی ہوئی۔ ۱۲۵۴ھ میں نواب جہانگیر محمّد خان نے اُنھیں دہلی سے بھوپال طلب کر کے عہدۂ قضا پر مامور کیا۔

قاضی صاحب فارسی شعر گوئی میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ اردو میں بھی صاحب دیوان تھے۔ یہ دیوان جس پر مولانا سیف الحق ادیب دہلوی (شاگرد غالب) نے جا بجا تعریفی نوٹ لکھے تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا۔ اِسی زمانے یعنی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں انھوں نے دہلی میں وفات پائی اور مہرولی میں اندرون احاطۂ حضرت عبدالحق محدث دہلوی واقع شمسی تالاب دفن ہوئے۔ قبر پر کتبہ نصب ہے۔''☆۳۶

(۴) میجر جان جیکب

گوالیار میں فوجی خدمت پر مامور تھے۔ ۱۸۵۸ء کے ''فتنہ و فساد'' کے دوران وہیں ''جوان مارے گئے۔'' ''پنج آہنگ'' اور ''باغ دودر'' میں اُن کے نام غالب کے خطوط دونوں کے درمیان رابطۂ اخلاص کے شاہد ہیں۔ غالب نے اُن کے مرتّب کیے

ہوے ''دیوان حافظ'' پر تقریظ اور اُن کی فرمائش پر بعض قطعاتِ تاریخ بھی لکھے ہیں۔
''باغِ دودر'' میں شامل ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جیکب شاعر بھی تھے اور مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ غالب اس خط میں لکھتے ہیں۔

پری روز کہ سہ شنبہ بست و ہشتم فروری (۱۸۴۳ء) بودنامہ بہ گرامی خدمت در ڈاک فرستادہ شد و قطعاتِ تاریخ درست و ہموار ساختہ وانچہ درست بود، ہمچناں گذاشتہ ورق کہ فرستادہ بودند، ہماں ورق درنوردِ نامہ فرو پیچدہ است۔ بہ ہنگامِ خود از نظر خواہد گذشت۔ غزل ہاہنوز بہ پرکار اندیشۂ تیز گردنہ پیمودہ ام۔ ہمانا پس از روزے چند خواہم نگرست۔

(۵) چودھری عنایت الٰہی ماہروی

غالب نے چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھا ہے :

''عنایتِ الٰہی کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا، اس کی پرسش زائد۔ میں خدمت گزاری کو حاضر ہوں۔ وہ جب چاہیں اپنا کلام بھیج دیں۔''☆۳۷ اس بیان کے پیشِ نظر اس امر کا قوی امکان ہے کہ چودھری صاحب نے اپنے کلام پر مرزا غالب سے اصلاح لی ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر محمدؐ ایوب قادری نے انھیں بجاطور پر تلامذۂ غالب میں شمار کیا ہے۔ قادری صاحب کی تحریر کے مطابق چودھری صاحب موصوف چودھری غلام آلِ محمدؐ عرف جیون علی (متوفی ۱۲۴۳ھ) کے صاحب زادے اور چودھری غلام رسول کے بھتیجے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام ور رجسٹرار چودھری عظمت الٰہی زبیری انھی چودھری عنایت علی مارہروی کے فرزند تھے۔☆۳۸

(۶) حکیم غلام نجف خاں

حکیم صاحب غالب سے قریبی تعلق رکھنے والے اُن لوگوں میں سے تھے جنھیں وہ بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی ولادت اپنے آبائی وطن شیخوپور، بدایوں میں ہوئی تھی لیکن پانچ برس کے سن سے آخر عمر تک زندگی کا بیش تر حصّہ دہلی میں گزرا۔☆۳۹

فارسی کی تعلیم اُنھوں نے مرزا غالب سے حاصل کی تھی۔ شاگردی و استادی کا یہ تعلق اس قدر قوی تھا کہ یہ مرزا غالب کو مستقلاً استاد اور ان کی اہلیہ امراؤ بیگم کو استانی کہتے تھے اور دونوں کو بمنزلہ اپنے والدین کے سمجھتے تھے۔☆[۴۰] غالب نے ایک خط میں اُن کے کسی مسودے کی اصلاح کے لیے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''تم نے وہ مسودہ کیوں نہیں بھیجا۔ میں خدمت گزاری کو آمادہ ہوں۔☆[۴۱] اِس بیان سے اُن کا اپنے مسودات پر غالب سے اصلاح لینا بھی ثابت ہے لیکن عام طور پر خیال یہ کیا جاتا ہے کہ حکیم صاحب شاعر نہیں تھے۔ شعر گوئی سے اُن کے شغف کا واحد ثبوت وہ ''اشتہارِ منظومِ طبع پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب'' ہے جو ''اسعد الاخبار'' آگرہ کے ۱۲ر مارچ ۱۸۴۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ۳۳ اشعار پر مشتمل اس اشتہار کے اکتیسویں شعر میں ان کا نام اس طرح نظم ہوا ہے۔

میں جو ہوں در پےِ حصولِ شرف
نام عاصی کا ہے غلامِ نجف

اس شعر کی روشنی میں ان اشعار کی ملکیت کے متعلق کسی قسم کا شبہہ نہ ہونا چاہیے لیکن قاضی عبدالودود اِس نظم کو حکیم غلام نجف کی تصنیف ماننے کے لیے تیار نہیں۔ موصوف کا ارشاد ہے۔

> غلام نجف خاں جن کے نام سے یہ اشتہار ہے، غالب کے شاگرد تھے لیکن یہ تلمذ ظاہرا فارسی پڑھنے تک محدود تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا۔ اشتہار غالب کی طرز میں ہے اور قریب بہ یقین ہے کہ اُنھیں کا لکھا ہوا ہے۔☆[۴۲]

اپنے اِس قیاس کی بنا پر قاضی صاحب نے اس اشتہار کو کلامِ غالب میں شامل کرلیا ہے لیکن ہمارے نزدیک شاعر کی حیثیت سے کسی شخص کا کہیں ذکر نہ آنا ہرگز اِس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ شعر گوئی کی قدرت نہیں رکھتا تھا یا کوئی نظم جو اُس کی طرف منسوب ہے، اس کی طبع زاد نہیں۔ چنانچہ جب تک کوئی حتمی ثبوت دستیاب

نہ ہو، زیرِ بحث اشتہار کو حکیم غلام نجف کی بجائے مرزا غالب کی تصنیف قرار دینا درست نہیں۔

(۷) قاضی عابد علی خاں فریاد

قاضی عابد علی قصبہ کاکوری کے متوطن اور قاضی محفوظ علی خاں ابن احتشام الدولہ، ممتاز الملک عالی جاہ قاضی حافظ علی خان بہادر کے فرزند تھے۔ آپ کا مفصل ذکر ''تذکرۂ مشاہیر کاکوری'' میں موجود ہے۔ اِس تذکرے کے مطابق فریاد اردو میں نواب سیّد محمد خاں رند سے اصلاح لیتے تھے... اور فن انشا پردازی میں غالب کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے ۲۵ر شوال ۱۲۹۲ھ (۱۲ر اکتوبر ۱۸۷۹ء) کو بہ عارضۂ تپ دلرزہ کاکوری ہی میں وفات پائی۔[☆۴۳] ''کلیاتِ نثرِ غالب'' میں پنج شنبہ ہفتم اپریل ۱۸۵۳ء کا لکھا ہوا ایک خط شامل ہے جس کے مکتوب الیہ عابد علی خاں صاحب ''تذکرۂ مشاہیر کاکوری'' کے بقول یہی قاضی عابد علی خان فریاد کاکوری ہیں۔ اِس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے غالب کی خدمت میں اپنی نگارشات بھیجنے کے لیے اُن سے اجازت طلب کی تھی۔[☆۴۴] یہ اطلاع دونوں کے درمیان استادی و شاگردی کے رشتے کے امکان پر دلالت کرتی ہے۔

(۸) منشی سیل چند منشی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریر کے مطابق ''منشی سیل چند دارالانشا (رام پور) کے افسر تھے۔ شعر گوئی کا بھی شوق تھا اور منشی تخلص کرتے تھے۔ نواب فردوس مکاں (یوسف علی خاں ناظم) کے غسلِ صحت کی تاریخ کا ایک شعر لکھ کر مرزا صاحب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا تھا۔ اِس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔''[☆۴۵] ہمیں مولانا عرشی کی اس رائے سے اختلاف کی بہ ظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آئی کیوں کہ ایک شعر پر اصلاح کا ثبوت بہرحال موجود ہے اور اس قسم کی کسی

اور شہادت کی عدم موجودگی کی بنا پر مزید کلام کے غالب کی نظر سے گزرنے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

(۹) سیّد محمدؐ زکریا شاہ نظام رامپوری

نظام اصلاً شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد تھے۔ بعض روایات کے مطابق اُنھوں نے اپنے مرشد میاں احمد علی احمد اور نواب یوسف علی خاں ناظم سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا لیکن خواجہ عبدالرؤف عشرت نے اُن کے استادوں میں غالب کا بھی نام لیا ہے۔ چنانچہ اُن کا بیان ہے کہ ''جس زمانے میں مرزا غالب رام پور میں تھے، (نظام نے) ان کو اپنا کلام دکھایا''[☆۴۶] عشرت ثقہ راوی نہیں، اس کے باوجود اُن کے اِس بیان کو اِس لیے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بعض دوسرے ذرائع سے بھی اِس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ جناب شبیر علی خاں صاحب شکیب رامپوری اپنے ایک مضمون ''نظام رامپوری پرشاد عارفی کی تحقیقات'' میں بیمار، احمد اور ناظم سے نظام کے کسب فیض کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

> ''نظام کے استادوں کے ذکر میں اِس امر کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ متذکرۂ بالا تین استادوں کے علاوہ ان کے چوتھے استاد مرزا غالب بھی تھے۔ حال ہی میں اِس کا انکشاف جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے رضا لائبریری رام پور میں نظام کے مسودات پر بعض اصلاحات کو دیکھ کر کیا ہے۔ اُن کی رائے میں اِن اصلاحوں کی تحریر مرزا غالب کے ہاتھ کی ہے۔''[☆۴۷]

فی الوقت رضا لائبریری کے مسودات تک رسائی ممکن نہیں اُس لیے نظام کے مسودات سے اِس دعوے کی تصدیق نہیں کی جاسکتی لیکن غالب کی شہرت و عظمت اور رام پور سے اُن کے تعلق کے پیشِ نظر نظام کا اُن سے اصلاح لینا بظاہر خارج از امکان نہیں معلوم ہوتا۔

(۱۰) نواب کلب علی خاں نواب

نواب صاحب اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے فارسی نثر میں بھی کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ فارسی شاعری میں مرزا محمد تقی سپہر سے مشورۂ سخن تھا جب کہ اردو میں اصلاح کلام کی خدمت امیر مینائی کے سپرد تھی۔ دستیاب معلومات کے مطابق ایک فارسی نثر مرزا غالب کی خدمت میں بھی بہ غرضِ اصلاح بھیجی تھی۔ چنانچہ اُنھیں بھی وہ اپنے اساتذہ میں شمار کرتے تھے۔ غالب کے نام ۲/اکتوبر ۱۸۶۶ء کے خط میں انھوں نے یہ لکھ کر کہ "مرا ازاں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است۔"[۴۸] واضح طور پر اِس امر کا اعتراف بھی کیا ہے، اس لیے ہمارے نزدیک اُن کا نام بھی تلامذۂ غالب کی فہرست میں شامل ہونا چاہیے۔

"تلامذۂ غالب" بنیادی طور پر شاعروں کا تذکرہ ہے ہم نے سطور بالا میں اِس کتاب میں مزید جن ناموں کے اضافے کی گزارش کی ہے، ان میں کم از کم دو (قاضی عابد علی خاں فریاد اور نواب کلب علی خاں نواب) کا شاعر ہونے کے باوجود اپنے کلام پر غالب سے اصلاح لینا ثابت نہیں لیکن ہمارے نزدیک نہ تو اصلاح و تلمذ کے سلسلے میں نظم و نثر کی تفریق مناسب ہے اور نہ نثر میں غالب سے اصلاح لینے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اُن کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت محسوس ہو، اس لیے اِس کتاب میں اِن دو ناموں یا بہ شرطِ دریافت اِس قسم کے مزید چند ناموں کا اضافہ بے محل نہ ہوگا۔

حواشی

☆ ا۔ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ شمارہ ستمبر ۱۹۵۹ء۔
☆ ۲۔"ارمغان گوکل پرشاد" مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، (۱۹۷۵ء) ص ۷۔
☆ ۳۔خطبات گارساں دتاسی، (انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ۱۹۷۹ء۔ جلد اول ص ۴۰)۔
☆ ۴،۵،۶۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ شمارہ ستمبر ۱۹۵۹ء۔

☆۷۔ خطبات گارساں دتاسی (طبع کراچی) جلد اول، ص ۳۰

☆۸،۹،۱۰ اودھ اخبار مورخہ ۲؍ مئی ۱۸۶۵ء بہ حوالہ "تحقیقی نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری شائع کردہ اردو پبلشرز "تکٹ مارگ" لکھنؤ (۱۹۷۴ء)

☆۱۱۔ "تلاشِ غالب" از نثار احمد فاروقی (مطبوعہ مئی ۱۹۶۹ء) ص ۱۳۲

☆ ۱۲۔ "روئداد اجلاس ممبران کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقدہ ۱۲؍ مئی ۱۸۷۲ء" (مطبوعہ میڈیکل ہال پریس بنارس (۱۸۷۲ء) ص ۲۳

☆ ۱۳۔ "عروس الاذکار" از نصیر الدین نقش حیدرآبادی مرتبہ افسر صدیقی امروہوی (انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی) ص ۱۲۹

☆ ۱۴۔ "مخطوط غالب" مرتبہ مالک رام" (انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ ۱۹۶۲ء) ص ۲۱۔

☆ ۱۵۔ "بزم غالب، از عبدالرؤف عروج (ادارۂ یادگار غالب، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء) ص ۱۸۹

☆ ۱۶۔ "کلیات نثر غالب" (طبع چہارم اپریل ۱۸۸۸ء) ص ۱۲۳، ۱۲۵

☆ ۱۷۔ "دود چراغ محفل" از سید حسام الدین راشدی (ادارہ یادگار غالب، کراچی) ص ۲۲۹، ۲۴۷

☆ ۱۸۔۱۹۔ "تلاشِ غالب" ص ۱۵۲، ۱۵۳۔

☆۲۰۔ "مخطوط غالب" مرتبہ مالک رام ص ۱۳۶ (مکتوب بہ نام منشی نبی بخش حقیر مورخہ ۲۳؍ جنوری ۱۸۵۴ء)

☆ ۲۱۔ "اردوے معلیٰ" طبع اول (۱۸۶۹ء) ص ۳۵ (مکتوب بہ نام ذکا، مورخہ ۱۶؍ شعبان ۱۲۸۳ھ/ ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء)

☆ ۲۲۔ بہ حوالہ "بھوپال اور غالب" از پروفیسر عبدالقوی دسنوی (مطبوعہ بھوپال پریس، بھوپال، فروری ۱۹۶۹ء) ص ۶۷ تا ۷۳۔

☆ ۲۳۔ "یادگار ضیغم" از نواب عبداللہ خاں ضیغم (مطبع گلزار دکن، حیدرآباد ۱۸۸۵ء) ص ۳۵۰، ۳۵۱۔

☆ ۲۴۔ "اردوے معلیٰ" طبع اول ص ۲۳۹ (مکتوب بہ نام عرشی، مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء)

☆ ۲۵۔ "شجرۃ الانساب" از ابو العلا سید نظر احمد افسوں سہوانی، (نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۹ء) ص ۲۵۔

☆ ۲۶۔ "تلاشِ غالب" ص ۱۵۴۔

☆۲۷۔ بہ حوالہ گلدستہ "مشاعرۂ دہلی" بابت ماہ جون ۱۸۷۷ء۔

☆۲۸۔ "تاریخ سہوان" قلمی (مملوکہ راقم) ص ۵۵۔ منشی آغا علی کے بارے میں باقی معلومات (۱) شجرۃ الانساب، حاشیہ ص ۱۹ (۲) "تحفۃ التواریخ" از سید آل حسن امروہوی (مطبوعہ مطبع عمدۃ المطابع امروہہ مارچ ۱۸۸۰ء) ص ۳۹ اور (۳) بعض بزرگوں کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی ہیں۔

☆ ۲۹۔ "طبقاتِ شعراے ہند" عکسی ایڈیشن (شائع کردہ اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ) ص ۳۰۸۔

☆۳۰۔ "صبح گلشن" مطبوعہ مطبع شاہجہانی بھوپال (۱۲۹۵ھ) ص ۲۸۸۔

☆ ۳۱۔ "یادگار ضیغم" ص ۳۲۹۔

☆ ۳۲۔ "یادگار ضیغم" ص ۸۔

☆ ۳۳۔ "یادگار ضیغم" ص ۳۶۔

☆ ۳۴۔ بہ حوالہ "بھوپال اور غالب" ص ۸۵۔

☆ ۳۵۔ "بھوپال اور غالب" ص ۸۳۔

☆ ۳۶۔ "تاریخ قضاۃ و مفتیان، بھوپال" از سید عابد علی وجدی الحسینی (شائع کردہ بھوپال بک ہاؤس، بھوپال، ۱۹۸۶ء)۔

☆ ۳۷۔ "اردوئے معلی طبع اوّل ص ۱۳۶۔

☆ ۳۸۔ "غالب اور عصر غالب" (مقتدرہ اکیڈمی پاکستان، کراچی، ۱۹۸۲ء) ص ۱۰۵۔

☆ ۳۹۔ حکیم غلام نجف خاں کے مفصل حالات کے لیے "آثار الصنادید" از سر سید احمد خاں اور "غالب اور عصر غالب" از ڈاکٹر ایوب قادری کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

☆ ۴۰۔ "اردوئے معلی، (طبع اوّل) ص ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۲۔

☆ ۴۱۔ ایضاً ص ۲۲۳۔

☆ ۴۲۔ "آثارِ غالب" (طبع چہارم) ص ۲۲۷۔

☆ ۴۳۔ "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" از حافظ محمد علی حیدر کاکوروی (مطبع اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء) صفحات ۲۲۶، ۲۲۷۔

☆ ۴۴۔ "کلیاتِ نثر غالب" (طبع چہارم) ص ۲۲۷۔

☆ ۴۵۔ "مکاتیب غالب" (طبع دوم ۱۹۴۳ء) مقدمۂ مرتب ص ۳۸۔

☆ ۴۶۔ "آپ بیتی" (نامی پریس لکھنؤ، طبع اوّل ۱۹۱۸ء)، ص ۱۲۸۔

☆ ۴۷۔ ماہنامہ "تحریک" دہلی، شمارہ اپریل ۱۹۷۵ء۔

☆ ۴۸۔ "مکاتیب غالب (طبع دوم) متن ص ۶۰، حواشی ص ۳۳۔

کتابیات

احوالِ غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	۱۹۵۳ء
اخبار الصنادید	حکیم محمد نجم الغنی	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
اختر تاباں	ابو القاسم محتشم	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۹ھ
ادب عزیز	ڈاکٹر سالک	مشہور آفسٹ پریس، کراچی	۱۹۶۶ء
اُردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن پریس، کراچی	۱۹۵۴ء
اُردوئے معلی	میرزا غالب	کریمی پریس، لاہور	۱۹۲۲ء
ارمغان گوکل پرشاد	مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری	انجمن پریس، کراچی	۱۹۷۵ء
اکمل التاریخ	محمد یعقوب ضیاء القادری بدایونی	مطبع قادری، بدایوں	۱۹۱۷ء
المشاہیر	فیض احمد	نامی پریس، میرٹھ	۱۹۰۰ء
انتخاب زریں	سر سید راس مسعود	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۷ء
انتخاب یادگار	منشی امیر احمد مینائی	تاج المطابع، رام پور	۱۲۹۰ء
انشائے بیخبر	مرتبہ انتظام اللہ شہابی	مرتضائی پریس، آگرہ	۱۹۳۰ء
انشائے نورچشم	یار محمد خان شوکت	مطبع نظامی، کان پور	۱۲۸۹ھ
ایک شخص، ایک کارواں	مرتبہ مجیب الرحمان شامی	مکتبۂ نشانِ راہ، نئی دلّی	۱۹۸۱ء
آبِ بقا	خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	سرفراز پریس، لکھنؤ	۱۹۵۳ء
آثار الشعراء	سید محمد ممتاز علی حافظ	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۳۰۴ھ
بزمِ سخن	سید علی حسن خان	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۸۱ء
بزمِ فروغ (دیوان)	بدری کرشن فروغ	نامی پریس، دہلی	۱۹۱۸ء
بساطِ فرنگ	میرزا شمشاد علی بیگ رضوان	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۶۷ء
بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	۱۹۵۵ء

بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ	مؤلفہ خواجہ حسن نظامی	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۴۷ء
بہارِ بوستانِ شعرا	محمد فضل اکرم	مطبع صبح، بدایوں	۱۲۹۹ھ
بہارِ سخن	بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری	مطبع یل، بی، سیتاپور	۱۹۳۲ء
بہارِ گلشنِ کشمیر	برج کشن کول بے خبر و جگ موہن ناتھ شوق	انڈین پریس، الہٰ آباد	۱۹۳۱-۱۹۳۲ء
بیاضِ بسمل (قلمی)	مرتبہ سید اصغر علی	(انڈیا آفس لائبریری، لندن مخطوطہ "B.66"	
بیاضِ علائی (قلمی)	نواب علاء الدین احمد خان	رضا لائبریری، رام پور	
بیان الحقائق	محمد عامر عباس عالی عباسی	انصار پریس، کان پور	۱۹۲۸ء
تاج التواریخ	مولوی نصرت علی قیصر	نصرت المطابع، دہلی	۱۹۰۵ء
تاریخِ دلچسپ (قلمی)	ابو الفضل محمد عباس شیروانی	مملوکہ کتب خانہ سالار جنگ	۵۴۱
تاریخِ پٹیالہ	خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر	سفیرِ ہند پریس، امرت سر	۱۸۷۸ء
تاریخِ شاہجہان پور	محمد صبیح الدین صاحب خلیل شاہجہانپوری	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۳۲ء
تاریخِ شعرائے بہار	سید عزیز الدین احمد بلخی راز	قومی پریس، بانکی پور پٹنہ	۱۹۳۱ء
تاریخِ عروجِ عہدِ انگلشیہ	منشی ذکاء اللہ	شمس المطابع، دہلی	۱۹۰۴ء
تجلیاتِ سخن	(دیوان نظامی بدایونی)	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۰ء
تذکرۃ النسا	درگا پرشاد نادر	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۸۴ء
تذکرۃ الواصلین	محمد رضی الدین فرشوری	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۵ء
تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود	منشی دیبی پرشاد بشاش	مطبع رضوی، دہلی	۱۸۸۵ء
تذکرۂ اہلِ دہلی	سر سید احمد خان (مرتبہ قاضی احمد میاں جوناگڑھی)	انجمن پریس، کراچی	۱۹۵۵ء
تذکرۂ حالی	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	گیلانی پریس، لاہور	۱۹۳۵ء
تذکرۂ ذوقِ مذاق (بہارِ بوستانِ شعرا)	محمد فضل اکرم	مطبع صبح، بدایوں	۱۲۹۹ھ
تذکرہ رسول پور برشط	(المعروف برست) سید نظیر حسنین زیدی	المسرور آفسٹ پریس، کراچی	۱۹۸۱ء

تذکرۂ ریختی	سیدتمکین کاظمی	شمس الاسلام پریس، حیدرآباد دکن	۱۹۳۰ء
تذکرۂ شعرائے جے پور	مولوی احترام الدین احمد شاغل	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۵۸ء
تذکرہ شعرائے دکن (محبوب الزمن)	محمد عبدالجبار خان ملکاپوری	مطبع رحمانی، حیدرآباد	۱۳۲۹ء
تذکرۂ علمائے ہند	مولوی رحمان علی	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۹۱۴ء
تذکرۂ غوثیہ	شاہ گل حسن (محمد اسمٰعیل میرٹھی)	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۶۵ء
تذکرۂ کاملانِ رام پور	حافظ احمد علی خان شوق	ہمدرد پریس، دہلی	۱۹۲۹ء
تذکرۂ مشاہیر کاکوری	حافظ محمد علی حیدر	اصح المطابع، لکھنؤ	۱۹۲۷ء
تذکرۂ نادر	کلب حسین خان (مرتبہ سیّد مسعود حسن رضوی ادیب)	سرفراز پریس، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
تزک محبوبیہ (۲)	غلام صمدنی خان گوہر	نظام المطابع، حیدرآباد	۱۹۰۳ء
تواریخِ بلند شہر	دوارکا پرشاد	مطبع جلوۂ طور، بلند شہر	۱۸۶۲ء
تواریخِ ڈھاکہ	رحمان علی طیش	اسٹار پریس آف انڈیا، آرہ	۱۹۱۰ء
جلوۂ تحیفۂ زریں	نیرّ رخشاں (دیوان)	حقانی پریس، دہلی	۱۹۱۶ء
جلوۂ خضر	سیدصفیر احمد صفیر بلگرامی	مطبع نور الانوار، آرہ	۱۸۸۵ء
جوہر	مرزا عصمت اللہ بیگ عصمت	صحیفہ مشین پریس، حیدرآباد	۱۹۵۶ء
چمن انداز	منشی درگا پرشاد نادر، دہلوی	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۸۳ء
چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	ناظر پریس، کراچی	۱۹۵۰ء
حالی (انگریزی)	مالک رام	روپابھ پرنٹرز، دلّی	۱۹۸۲ء
حیاتِ اسمٰعیل	خان بہادر محمد اسلم سیفی	دیال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۳۹ء
حیاتِ بشیر	(خان بہادر بشیرالدین میرٹھی) (سید حبیب الرحمان شاہ)	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	؟
حیاتِ جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	لطیفی پریس، دہلی	۱۹۳۹ء
حیاتِ فریاد	سید علی محمد شاد عظیم آبادی	مطبع معارف دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۸ء
حیواۃ العلما	سید محمد عبدالباقی سہسوانی	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۹۲۲ء

خاتمۂ مرأت احمدی	مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خان بہادر	مشن پریس، کلکتہ	۱۹۳۰ء
خاندانِ برکات	سید محمد الملقب بہ اولاد رسول قادری	گلشنِ فیض، لکھنؤ	۱۳۲۹ھ
خزینۃ الانساب	سید نظر احمد افسوں سہسوانی	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۵۹ء
خاندانی حالات نواب حسام الدین حیدر خان (قلمی)	مؤلفہ اکبر مرزا	(مملوکہ خاندان مقیم کراچی)	
خطباتِ گارساں دتاسی		انجمن ترقی اردو پریس، اورنگ آباد	۱۹۳۵ء
خطوطِ غالب	مرتبہ مہیش پرشاد (مالک رام)	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	۱۹۶۲ء
خطوط غالب (۲)	مرتبہ مولانا غلام رسول مہر	پاکستان ٹائمز پریس، لاہور	۱۹۵۱ء
خم خانۂ جاوید (پانچ حصے)	لالہ سری رام و برجموہن دتاتریہ کیفی		۱۹۰۸_۹۴۰
خیابانِ غالب	نادم سیتاپوری	مشہور آفسٹ لیتھو پریس، کراچی	۱۹۷۰ء
دار العلوم کے سپوت	مولوی حافظ محمد مظہر	طارق برقی پریس، حیدرآباد	۱۹۵۳ء
داغ	نور اللہ محمد نوری	اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن	۱۳۵۵ء
دید و دریافت	شمس بدایونی	اعلیٰ پریس، دہلی	۱۹۸۱ء
دودِ چراغ محفل	سید حسام الدین راشدی	ایجوکیشنل پریس، کراچی	۱۹۶۹ء
دو نایاب زمانہ بیاضیں	عبدالباری آسی الدنی	ہندوستانی اکیڈمی (کراؤن پریس الہ آباد)	۱۹۳۲ء
دیوانِ باقر	شاہ باقر علی بہاری	شمس الاسلام پریس، حیدرآباد	۱۳۵۵ھ
دیوانِ بیدل (قلمی)	محمد حبیب الرحمٰن انصاری	(مرتبہ عقیل ندوی) مملوکہ مؤلف	
دیوانِ جان صاحب	مرتبہ سید محمد مبین نقوی	مطبع انوار احمدی، الہ آباد	
دیوانِ سخن	سید فخر الدین حسین سخن	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۸۶ء
دیوانِ فدا	مرتبہ سید وحید اشرف و مالک رام	عثمانی پریس، مدراس	۱۹۷۹ء
دیوانِ معروف	نواب الٰہی بخش خان	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۵ء
ذکرِ غالب	مالک رام	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۷۶ء
راحتِ روح	صوفی منیری (مرتبہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی)	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	

راحِ روح (قلمی)	ابو الفضل محمد عباس شروانی	(مملوکہ کتب خانہ سالار جنگ فارسی، دیوان نمبر ۵۴۱)	
رباعیات عجائبات	اموجان دلی	تحفۂ ہند پریس، دہلی	۱۳۱۸ھ
رقعات مدہوش	مرتبہ حامد سعید خان لودی	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۶۳ء
روزِ روشن	مولوی محمد مظفر حسین صبا	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۷ھ
رونقِ سخن	دیوان صاحب زادہ محمد احمد علی خان رونق	مطبع فاروقی، دہلی	۱۸۹۰ء
سخنِ شعرا	مولوی عبدالغفور خان نساخ	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۷۴ء
سخن ورانِ گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	کلدیپ آرٹ پریس، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
سخن ورانِ چشم دیدہ	مولوی ترکی علی شاہ ترکی	مطبع شمس الاسلام، حیدرآباد	۱۳۳۳ھ
سراپا سخن	سید محسن علی محسن	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۶۰ء
سروشِ سخن	سید فخر الدین حسین سخن	مطبع نول کشور، کان پور	۱۸۷۷ء
سرطاس منکاف کی ڈائری	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۵۰ء
سلسلۂ عالیہ	حکیم عنایت حسین وفیض احمد مارہروی	مطبع ہاشمی، میرٹھ	۱۳۰۶ھ
سیرِ سیاح	میاں داد خاں سیاح	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۷۲ء
شعر و سخن	محمد نیاز علی پریشان	مطبع نور العلم، آگرہ	۱۲۸۶ھ
شمعِ انجمن	نواب سید محمد صدیق حسن خان	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۳ھ
شمیمِ سخن	محمد عبدالحی صفا بدایونی	مطبع امداد الہند، مراد آباد	۱۸۸۴ء
شہنشاہ نامہ	یار محمد خان شوکت	مطبع حسنی، رام پور	۱۲۹۲ھ
صبحِ گلشن	سید علی حسن خان	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۵ھ
صبحِ وطن	نواب محمد غوث خان اعظم	چھاپا خانہ کشن راج مدراس	۱۸۴۲ء
صحیفۂ خوش نویساں	احترام الدین احمد شاغل عثمانی	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	۱۹۶۳ء
صحیفۂ زرّیں	مرتبہ پراگ نرائن بھارگو	نول کشور پریس، لکھنؤ	۱۹۰۲ء
طبقات الشعرائے ہند	مولوی کریم الدین	مطبع العلوم، دہلی	۱۸۴۸ء
طورِ کلیم	سید نور الحسن خان	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۲۹۸ھ
عرفانِ عزیز	(دیوان محمد ولایت علی خان عزیز صفی پوری)	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۴۶ء
عقدِ ثریا	غلام ہمدانی مصحفی	جامع برقی پریس، دہلی	۱۹۳۴ء

عودِ ہندی	میرزا غالب	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
غالب وعصرِ غالب	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	اسحاقیہ پریس، کراچی	۱۹۸۲ء
غالبیات: چند عنوانات	کالی داس گپتا رضا	مہاراشٹر پرنٹنگ اسکول، پونا	۱۹۸۲ء
غدر کا نتیجہ	غلام حسن خان محو (مرتبہ خواجہ حسن نظامی)	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	۱۹۳۰ء
فرح بخش	میاں یار محمد خان شوکت	مطبع نظامی، کانپور	۱۲۸۸ھ
فغانِ دہلی	مرتبہ تفضل حسین خان کوکب	اکادمی پنجاب، لاہور	۱۹۵۴ء
فیضانِ غالب	عرش ملسیانی	اردو لیتھو پریس، شاہدرہ، دلّی	۱۹۷۷ء
قاطعِ برہان	غالب	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۶۲ء
قاموس المشاہیر	مرتبہ نظامی بدایونی	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۲۶ء
قصاید مدحیہ نظام	مرتبہ منشی غلام محمد خان تپش	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۷۱ء
کارنامۂ سروری	سرور الملک آغا میرزا بیگ خان	مطبع مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ	۱۹۳۳ء
کلیاتِ خلیل وذوق	محمد ابراہیم	مطبع نور الانوار، آرہ	۱۲۹۰ھ
کلیاتِ سالک (قربان علی بیگ)	مرتبہ کلب علی خاں فائق	مطبع عالیہ، لاہور	۱۹۶۶ء
کلیاتِ شیفتہ	نواب محمد مصطفیٰ خان	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۱۶ء
کلیاتِ قلق (غلام مولیٰ)	مرتبہ کلب علی خان فائق	مطبع عالیہ، لاہور	۱۹۶۶ء
کلیاتِ نثر غالب (فارسی)	غالب	مطبع نول کشور، کان پور	۱۸۷۵ء
کلیاتِ نظام	نواب محمد مردان علی خان	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۷۵ء
گلدستۂ سخن	مرتبہ منشی نول کشور	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۷۵ء
گلدستۂ نازنیناں	مولوی کریم الدین پانی پتی	مطبع رفاہِ عام، دہلی	۱۸۴۵ء
گلِ رعنا	مولانا سیّد عبدالحیؒ	مطبع معارف، اعظم گڑھ	۱۳۶۴ھ
گلزارِ اعظم	نواب محمد غوث خان اعظم	مطبع سرکاری، مدراس	۱۲۷۲ھ
گلستانِ بے خزاں	حکیم قطب الدین باطن	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۲۹۱ھ
گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش، صابر دہلوی	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۲۷۱ھ
گلشنِ بے خار	نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۹۱۰ء
گلشنِ ناز	منشی درگاہ پرشاد نادر دہلوی		
گلشنِ ہمیشہ بہار	نصر اللہ خان خویشگی	انجمن پریس، کراچی	۱۹۶۷ء
مآثرِ غالب	مرتبہ قاضی عبدالودود		

مآثرِ صدیقی	سیّد محمد علی حسن خان	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۹۲۴ء
متعلقاتِ غالب	کالی داس گپتا رضا	اجمل پریس، بمبئی	۱۹۷۸ء
مجموعۂ نغز	میر قدرت اللہ قاسم (مرتبہ محمود شیرانی)	کریمی پریس، لاہور	۱۹۳۳ء
محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن	محمد عبدالجبار خان ملکاپوری	مطبع رحمانی، حیدرآباد	۱۳۲۹ھ
مخزنِ فصاحت	(دیوان فصیح الدین رنج وطبیب)	مطبع ہاشمی، میرٹھ	۱۳۰۷ھ
مراۃ الحقائق	منشی برکت علی	مطبع عزیزی، رام پور	۱۹۰۲ء
مرقعِ ادب (۲)	مرتبہ صفدر مرزا پوری	مجتبائی پریس، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
مرقعِ سخن (تین حصے)	مرتبہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو	مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس، حیدرآباد	۱۹۳۵ـ ۱۹۳۹ء
مسلم شعرائے بہار	حکیم سیّد احمد اللہ ندوی	انٹرنیشنل پریس، کراچی	
مشاطۂ سخن (۱)	صفدر مرزا پوری	میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ	۱۹۱۸ء
مشاطۂ سخن (۲)	صفدر مرزا پوری	گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور	۱۹۲۸ء
مشرقی بنگال میں اُردو	سیّد اقبال اعظم	کوہِ نور الیکٹرک پریس، چاٹگام	۱۹۵۴ء
مشرقی پاکستان کے ادیب	مرتبہ حفیظ ہوشیار پوری	ناظر پرنٹنگ پریس، کراچی	۱۹۵۱ء
مضامینِ فرحت (۵)	میرزا فرحت اللہ بیگ	انتظامی پریس، حیدرآباد	
مقالاتِ حالی (۱)	مولانا الطاف حسین حالی	جامعہ پریس، دہلی	۱۹۱۴ء
مقدمہ روکد ملازمت الور	نواب محمد مردان علی خان رعنا	مطبع نول کشور، لکھنؤ	۱۸۶۵ء
مکاتیب غالب	مرتبہ امتیاز علی خان عرشی	ناظم پریس، رام پور	۱۹۴۹ء
منتخب اللطائف	رحم علی خان ایمان (مرتبہ رضا نائینی و امیر حسن عابدی)	مطبع تابان، تہران	۱۳۴۹ھ
میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام	مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	۱۹۵۷ء
نادراتِ غالب	مرتبہ آفاق حسین آفاق	مشہور پریس، کراچی	۱۹۴۹ء
نزہتہ الخواطر (عربی جلد ۸)	مولوی سیّد عبدالحی	مطبع دائرۃ المعارف، حیدرآباد	۱۹۷۰ء

نسخۂ دل کشا (حصہ اول) — جے متر اارمان — گنیش پریس، کلکتہ — ۱۸۷۰ء

نشترِ عشق (قلمی) — حسین قلی خان

نشیدِ کاظم — شیخ کاظم حسین صدیقی کاظم — مطبع اسرار کریمی پریس الہ آباد — ۱۹۰۸ء

نظمِ دل فروز — (دیوانِ اسراؤ میرزا انور) — مطبع رفاہ عام، لاہور — ۱۸۹۹ء

نگارستانِ سخن — سید نور الحسن خان — مطبع شاہجہانی، بھوپال — ۱۲۹۳ھ

نقدِ غالب — مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد — دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی — ۱۹۵۶ء

نقشِ آزاد — مرتبہ غلام رسول مہر — علمی پرنٹنگ پریس، لاہور — ۱۹۵۸ء

نورِ ایمان — مولوی عبدالسمیع بیدل رامپوری — شرف المطابع، میرٹھ — ۱۳۱۲ھ

نہالستانِ نثار — مولفہ محمد جمال الدین طور اکبرآبادی، — آگرہ اخبار پریس، آگرہ — ۱۹۲۵ء

واقعات دار الحکومت دہلی، — مولوی بشیر الدین احمد — شمسی مشین پریس، آگرہ — ۱۹۱۹ء

ہنگامۂ دل آشوب (دو حصے) — مرتبہ باقر و سخن — مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ — ۱۸۶۷ء

یادگارِ بریلی — محمد ایوب قادری — کراچی — ۱۹۷۷ء

یادگارِ حالی — صالحہ عابد حسین — کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلی — ۱۹۷۵ء

یادگارِ ضیغم (قلمی) — محمد عبداللہ خان ضیغم — مملوکہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد — (مخطوطہ ۵۶۳)

یادگارِ ضیغم — محمد عبداللہ خان ضیغم — مطبع قادری، حیدرآباد (دکن) — ۱۳۰۳ھ

یادگارِ غالب — الطاف حسین حالی (مرتبہ مالک رام) — لبرٹی آرٹ پریس، دلی — ۱۹۷۱ء

۲۔ رسائل و جرائد

آج کل — (ماہانہ، دہلی) نومبر ۱۹۵۲ء، فروری ۱۹۵۵ء، فروری ۱۹۶۰ء

ادیب — (ماہانہ، الہ آباد) فروری و مارچ ۱۹۱۳ء

اُردو — (سہ ماہی، دہلی)، جولائی ۱۹۳۳ء

اُردو — (سہ ماہی، کراچی) جولائی ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء، ۱۹۶۹ء

اُردو ادب — (سہ ماہی۔ علی گڑھ) اکتوبر/دسمبر ۱۹۵۴ء، جولائی/ستمبر ۱۹۶۳ء

اردوئے معلی — دلی (شمارۂ اوّل) ۱۹۶۰ء

اردوئے معلی — (ماہانہ۔ علی گڑھ) دسمبر ۱۹۱۲ء

اکادمی — (دو ماہی، لکھنؤ) ستمبر ۱۹۸۱ء، جنوری۔فروری ۱۹۸۳ء

اکمل الاخبار — (ہفتہ وار، دہلی) ۴، ۱۶ (۲۶ اپریل، ۱۸۶۹ء)، ۴، ۳۰:۳۴ (۲۵ اگست ۱۸۶۹ء)

العلم	(سہ ماہی، کراچی) غالب نمبر ۱۹۶۹ء
اودھ اخبار	(روزانہ۔ لکھنؤ)۔ ۱۳/۱۷ جون ۱۸۷۹ء
پیامِ یار	(ماہانہ گلدستہ۔ لکھنؤ) دسمبر، ۱۸۸۹ء
تحریک	(ماہنامہ۔ دہلی) اپریل ۱۹۵۹ء
جامعہ	(ماہنامہ، دتی) (غالب نمبر فروری/مارچ ۱۹۶۹ء) ۵۹: ۲-۳: ۱۰۷-۱۱۳
حیاتِ نو	(ماہانہ۔ پانی پت) ۱۹۳۳- ۱۹۳۵ء
ریاضِ سخن	(گلدستہ) فروری ۱۸۸۵ء
زمانہ	(ماہانہ۔ کان پور) اکتوبر، ۱۹۲۷ء، جولائی ۱۹۳۳ء، جنوری ۱۹۴۹ء
ساقی	(ماہانہ۔دہلی) جنوری، ۱۹۳۶ء
سب رس	(ماہانہ۔ حیدرآباد) غالب نمبر ۱۹۶۹ء
شاعر	(ماہانہ۔ آگرہ) آگرہ نمبر (جون/ جولائی ۱۹۳۶ء)
صحیفہ لاہور	(غالب نمبر (۳) اکتوبر ۱۹۶۹ء
صلائے عام	(ماہانہ۔ دہلی)، دسمبر ۱۹۳۹ء
کمال	(ماہانہ۔ دہلی) جنوری، اکتوبر، دسمبر ۱۹۱۲ء
ماتھر پتر کا	(ماہانہ انگریزی۔ آگرہ) دسمبر ۱۹۲۵ء، جنوری، فروری، اپریل ۱۹۲۶ء
مذاقِ سخن	(ماہانہ گلدستہ۔ دہلی) مئی ۱۹۰۳ء
معارف	(ماہانہ۔ اعظم گڑھ) جون، ۱۹۳۲ء، اپریل، ۱۹۴۸ء، اپریل/ستمبر ۱۹۵۴ء
معاصر	[پٹنہ (۲) و (۴)]
نقوش	(ماہانہ، لاہور) جون ۱۹۵۶ء
نگار	(ماہانہ۔ لکھنؤ) جنوری/فروری ۱۹۴۱ء، اپریل ۱۹۵۳ء
نوائے ادب	(سہ ماہی۔ بمبئی) جولائی ۱۹۵۰ء
ہندوستانی	(سہ ماہی۔ الہ آباد) ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۷ء

کتاب میں ہجری اور عیسوی کے تطابق کے لیے Indian Ephemeris مصنفہ ایل۔ ڈی۔ ایس۔ پلائی (مدراس، ۱۹۱۵ء) استعمال کی گئی ہے۔ میرے خیال میں موجودہ جنتریوں میں یہ سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔

فہرست مطبوعات

ادارۂ یادگارِ غالب

تذکرۃ الشعرا

مولانا حسرت موہانی — یہ تذکرہ پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔

مرتبہ: شفقت رضوی — صفحات: ۶۸۸، قیمت: ۳۰۰ روپے

مآثر غالب

مرتبہ: قاضی عبدالودود — غالب کی غیر مدون اردو فارسی تحریروں کا مجموعہ۔

تدوین نو: ڈاکٹر حنیف نقوی — مع ترجمہ مخطوطہ فارسی از پرتو روہیلہ، صفحات: ۲۵۶، قیمت: ۱۵۰ روپے

تصحیح و تحقیق متن

ڈاکٹر نذیر احمد — صفحات: ۹۶، قیمت: ۸۰ روپے

املائے غالب

رشید حسن خاں — غالب کے طرز املا کا مفصل مطالعہ۔ صفحات: ۲۲۰، قیمت: ۱۳۰ روپے

انشائے غالب

مرتبہ: رشید حسن خاں — غالب کے کلام نظم و نثر کا انتخاب جو خود غالب نے کیا تھا۔

صفحات: ۱۸۰، قیمت: ۱۵۰ روپے

آئینۂ افکار غالب

شان الحق حقی — غالب سے متعلق مقالات کا مجموعہ۔ صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۱۳۰ روپے

نوادر غالب

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری — مجموعۂ مقالات۔ صفحات: ۲۶۴، قیمت: ۲۰۰ روپے

غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری — مجموعۂ مقالات۔ صفحات ۲۸۰، قیمت: ۲۰۰ روپے

اردو کے ضرب المثل اشعار

محمد شمس الحق — صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۳۰۰ روپے

حسین بن منصور حلاج — ایک تحقیقی جائزہ

پروفیسر لطیف اللہ — صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۱۲۰ روپے

اشاریہ کلام فیض

ڈاکٹر معین الدین عقیل — صفحات: ۱۳۶، قیمت: ۴۰ روپے

عمر گزشتہ کی کتاب

مرزا ظفر الحسن — صفحات: ۵۴۴، قیمت: ۷۵ روپے

دکن اداس ہے یارو

مرزا ظفر الحسن — صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۴۰ روپے

معربات رشیدی

سید عبدالرشید تتوی — عربی میں دخیل الفاظ کے بارے میں ایک اہم تصنیف۔

مرتبہ: ڈاکٹر الستار صدیقی — تدوین نو مع ترجمۂ اردو، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

صفحات: ۲۸۰، قیمت: ۲۲۰ روپے

چراغ حسن حسرت — احوال و آثار

ڈاکٹر طیب منیر — صفحات: ۶۵۶، قیمت: ۴۰۰ روپے

خرمن جاں

مجید ملک — مجموعہ نظم و نثر۔ صفحات: ۲۹۶، قیمت: ۲۵۰ روپے

آہنگ پنجم (ترجمہ خطوط غالب)

پرتو روہیلہ — پنج آہنگ میں شامل حکوہ کا اردو ترجمہ۔ صفحات: ۲۸۴، قیمت: ۲۵۰ روپے

مصطلحات الشعرا

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی — قیمت: ۱۰۰۰ روپے

تلامذۂ غالب

مالک رام کا یہ کام اولاً ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا جس میں انھوں نے غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کے حالات تحریر کیے۔ غالب کے شاگردوں کے بارے میں یہ اس وقت تک کی تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ تھا، لیکن متعدد محققین نے اس کتاب پر لکھے جانے والے تبصروں میں اور اس کے ردِ عمل میں تحریر کیے جانے والے مقالات میں مالک رام کی اس تصنیف میں تلامذہ کے تعلق سے ان کی تحقیق کی کمزوریوں، اغلاط اور خامیوں کی نشاندہی کی اور پھر تحقیقات کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلا جس میں ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر وحید قریشی، تمکین کاظمی، کلب علی خاں فائق، مشفق خواجہ، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، مرتضیٰ حسین فاضل، عبدالقوی دسنوی، اسمٰعیل پانی پتی، لطیف حسین ادیب، مرتضیٰ حسین بلگرامی وغیرہ کے مقالات نے ''تلامذۂ غالب'' کے ضمن میں ایک وقیع مواد فراہم کر دیا۔ اس ضمن میں خصوصاً ڈاکٹر حنیف نقوی نے جو تحقیقی مقالات تحریر کیے اور مالک رام کے اس کام کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی اور تصحیح کے ساتھ ساتھ نئے مصادر و ماخذ اور تحقیقی مواد سے بھی متعارف کرایا، ان کی بنیاد پر مالک رام نے، جو خود بھی اس موضوع پر اپنی مزید تلاش و تحقیق میں مصروف رہے تھے، اپنی اس کتاب پر نظر ثانی و اضافے کو ضروری سمجھا اور اس کی دوسری اشاعت کا اہتمام کیا، جو ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آئی۔

ان تحقیقات کے نتیجے میں ''تلامذۂ غالب'' پر اس قدر عمدہ معلومات فراہم ہو گئی ہیں کہ اب بمشکل ہی کسی اضافے یا ترمیم کا امکان ہے۔

معین الدین عقیل